اسلام کا نظامِ حکومت

تالیف

مولانا حامد الانصاری غازی

رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

باہتمام منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات ندوۃ المصنفین (۱۹)

اسلام کا نظامِ حکومت

یعنی

اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور ضابطۂ حکومت

جس میں اسلام کے نظام حکومت کے تمام شعبوں، اس کے نظریۂ سیاست، سیادت کے تمام گوشوں، ریاست و مملکت اور اس کے متعلقات اور تمام دستوری معلومات کو وقت کی نکھری ہوئی زبان اور جدید تقاضوں کی روشنی میں نہایت تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ حکومت الٰہی کی تاریخ، انبیاء علیہم السلام کی حکومتوں کی سرگذشت دلچسپ اور مؤثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہے

تالیف

مولانا حامد الانصاری غازی

رفیق ندوۃ المصنفین

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

سنہ ۱۳۶۲ھ

قیمت غیر مجلد
چھ روپے

قیمت مجلد
سات روپے

فہرست مضامین

تصحیح صفحہ ۵۱ و ۵۵

صفحہ ۵۰ کے بعد بجائے ۵۱ کے ۵۵ اور ۵۵ کی جگہ ۵۱ چھپ گیا ہے، پڑھتے وقت اسے ملحوظ رکھیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ربنا لک الحمد

ہمارے پروردگار! ہر ایک تعریف و تحسین تیرے ہی لیے ہے۔

الحمد للہ رب العٰلمین ○ الرحمن الرحیم ○ ملک یوم الدین ○
ایاک نعبد و ایاک نستعین ○ اھدنا الصراط المستقیم ○ صراط
الذین انعمت علیھم ○ غیر المغضوب علیھم و لا الضالین ○

عرشِ عظیم کے پروردگار!

(ربُّ الناس!) اے انسانیتِ عامہ کے مُربی! (ملک الناس) اے بنی نوع انسان کے فرمانروا (اِلٰہ الناس!) اے انسانوں کے معبود! ہر قسم کی ستائش، خوبی، تعریف تیرے ہی لیے ہے، تو کائنات عالم کا پروردگار، بڑا مہربان، بڑا محسن اور جزا و سزا کے دن کا مالک اور بادشاہ ہے، ہم تیری عبادت کے حکمبردار، تیرے پرستار، تیرے عبادتگذار ہیں اور تجھ سے خاص تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔ (ہمارے آقا!) تو ہی صراطِ مستقیم پر ہماری رہنمائی فرما — ہم کو سیدھی سچی راہ دکھا، اُن لوگوں کی راہ جن کو تو نے اپنی نعمت سے سرفراز کیا نہ کہ اُن کی جو تیرے غصہ کی آماجگاہ بنے اور جو راہِ راست سے بھٹک گئے۔

⁘

(مالک الملک) اے مملکت اور سلطنت کے فرمانروا! ہم تیرے ہیں اور تیرے لیے ہیں، تیرے فرمانبردار اور تیری حکومت کے علمبردار ہیں اور تیرے حکم کی قوت کو توحید کا سب سے بڑا مطمحِ نظر تصور کرتے ہیں۔

عرشِ عظیم کے شہنشاہ! ہمیں پھر اپنے لیے منتخب فرما، ہمیں اپنے اقتدار کے ماتحت متمکن کر اور اپنی حکومت کو ہمارا نصب العین بنا، تاکہ انسانیتِ عامہ کی محفل میں ہماری جدوجہد کا فانوس ازسرِنو روشن ہو سکے اور ہم اپنی سچی کوششوں کے آئینہ میں دنیا کو اسلام کے اقتدار کی حقیقی صورت دکھا سکیں۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم، ربنا امین!

شیرازۂ عنوان

میں اس کتاب کو تاریخی اشخاص اور تاریخی قوموں کے نام معنون کرتا ہوں
ان قوموں کے نام جنہوں نے حکومت و مملکت کے ترقی پذیر نظریہ کو ایک پُرشوکت اور
قوی حکمت عملی کے طور پر قبول کیا اور اس کو رائج کرنے میں اپنا خون اور پسینہ ایک کر دیا
وہ اشخاص جنہوں نے دنیوی طرز کی حکومتوں کے قیام میں پہل کی اور حکومت کو ایک
زندہ طاقت بنانے میں دنیا داری کا پورا پورا ثبوت پیش کیا

یہ کتاب معنون ہے :-

(۱) (امریکہ) —— ابراہام لنکن، واشنگٹن، ولسن، روزویلٹ اور اس کی قوم کے نام

(۲) (انگلستان) ملکہ وکٹوریہ، جارج برنارڈشا، لائڈ جارج، میکڈانلڈ، چرچل اور اس کی قوم کے —— نام

(۳) (فرانس) چارلس اعظم، نپولین، برائنڈ، فوش، ڈلاڈیہ، پیتان اور اس کی قوم کے نام

(۴) (جرمنی) اوٹو اعظم، بسمارک، قیصر ولیم، ہنڈنبرگ، ہٹلر اور اس کی قوم کے نام

(۵) (روم) کلاڈیس، انٹونیس، سسرو، قسطنطین، ہرکلس، مسولینی اور اس کی قوم کے نام -

(۶) (جاپان) میکاڈو، اراکی، ٹوجو، اور اس کی قوم کے نام -

(۷) (روس) پیٹر اعظم، لینن، کالینن، اسٹالن اور اس کی اشتراکی جماعت کے نام

(۸) (چین) کنفیوشش، فاہیان، سن یاٹ سن، ہیگم سن یاٹ سن، چیانگ کی شک اور اس کی قوم کے ۔۔۔ نام

(۹) (یونان) افلاطون، ارسطو، سکندر اعظم اور اس کی قوم کے ۔۔۔ نام

(۱۰) (افریقہ) نجاشی، ہیلا سلاسی اور اس کی قوم کے ۔۔۔ نام

یہ کتاب ایک پیغام ہے خدا کی حکومت کا پیغام ظلوم وجہول انسانوں کی ساختہ پرداختہ حکومتوں کے نام ۔۔۔ عالمگیر انسانیت اور ہمہ گیر امن وسلامتی کا پیغام ملکوں، قوموں، نسلوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی جنگجو طاقتوں کے نام!

اسلام کا نظامِ حکومت سیاسی دنیا کے لیے ناموسِ اکبر ہے حاکمیت کی جان ہے۔ اس حکومت کا مآخذ خدا کا آخری قانون ہے جو تمام برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے اور تمام بھلائیوں کا حکم دیتا ہے جو انسانِ کامل کو خدا کا نائب بناتا ہے اور انسانوں کو انسانیتِ عامہ کی فلاح اور بہتری کے لیے اپنے سایہ میں بلاتا ہے۔ شوریٰ (مرضی عامہ) کو سیاسی ارتقاء کے لیے فیصلہ کن قوت قرار دیتا ہے اور خدا کی دنیا کو ہزاروں وطنوں کی جگہ انسانیت کا وطنِ اکبر بناتا ہے

یہ وقت ہے کہ اس فطری نظام کو علم وتحقیق کے حوصلہ کے ساتھ قبول کیا جائے۔ نئی اور پرانی دنیا نے سیاسی ترقی کے لاجواب ارتقائی دور (اسلامی دور) کو درمیان سے ہٹا کر اور یونان، روما، اسپارٹا اور کریٹ کے سیاسی نظریوں سے راست رشتہ ملا کر دیکھ لیا۔ اس عالمگیر تباہی اور صدیوں کی ناکام آزمائش کا یہ نتیجہ ضرور ہونا چاہیے کہ اسلام کے نظامِ سیاست اور طرزِ حکومت کو تحقیق کے لیے انتخاب کیا جائے۔ نپولین کا قول ہے کہ مسلمانوں نے نصف صدی میں نصف دنیا کو فتح کر ڈالا۔[۲] یہ تھا اسلام کا اثر اور اسلام کے ابتدائی نظام کا اثر۔ آج آدھی دنیا کی جگہ پوری دنیا پر یہی اثر ہونا چاہیے کیونکہ تباہ حال انسانیت کی نجات کے لیے یہی آخری چارہ کار ہے اور یہی ترقی پسند انسانیت کی معراج ہے

[۱] ان نظریوں کے نقائص کے لیے دیکھو نظریۂ سلطنت ہنجلی ۱۹۴۰ء ج ۱ ص ۳۵۱۔

[۲] حاضر العالم الاسلامی (جدید دنیائے اسلام ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرد) امیر شکیب ارسلان ج ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

اللہ اکبر آج کتنی عظیم و جلیل ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہا ہوں! احکم الحاکمین کا کتنا بڑا احسان ہے کہ ایک ظلوم و جہول انسان اپنے دل کی امانت کو سالہا سال کی سچی عزیمت کے بعد اسلامی دنیا کے کروڑوں پریشاں حال مسلمانوں اور اس بدحال دنیا کے دو ارب سے زیادہ پامال انسانوں کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

کتنی خوش آئند ہے وہ توفیق جس کی قوت سے دنیا کے بڑے بڑے کام انجام تک پہنچتے ہیں۔ کس قدر خوشگوار ہے وہ تائید جس کی طاقت سے تاریخ عظیم کارناموں کو منظرِ عام پر لاتی ہے اور کس درجہ خوش وقت و خوش قسمت ہے علم و تحقیق کا وہ حوصلہ جو دنیا کی تمام نظر فریب اور دلگداز باطل داستانوں کو رد کر کے تنہا اُس ایک حقیقت کو اپنے لیے پسند کرتا ہے جو تمام اجتماعی ارادوں کی اصل اور حکومت کے فطری مطمحِ نظر کی حیثیت سے اصل الاصول ہے۔

"اسلام کا نظامِ حکومت" یعنی یہ کتاب اوّل سے آخر تک خدا کی عطا کردہ توفیق و تائید کا سرمایہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ کہنا انسانی کوششوں کی حقیقی تصویر کو مسخ کرنا ہوگا، کیونکہ دنیا کی تاریخ خدا کی مرضی ہی کی تاریخ ہے

ہر کام خدا کی قدرت سے پورا ہوتا ہے اور خدا ہی کے قانون کے ماتحت اپنی صورت کا صحیح عکس دنیا کو دکھاتا ہے۔

یہ مجموعہ اگر عنوان اور نام کے اعتبار سے "اسلام کا نظامِ حکومت" ہے تو موضوع و معنون کے اعتبار سے اسلام کا نظامِ حکومت، دستورِ سلطنت اور نظریۂ سیاست ہے! نام کے اعتبار سے کسی قدر محدود اور موضوع کے لحاظ سے بڑی حد تک وسیع۔ یہ اس لیے کہ اصطلاح میں حکومت (گورنمنٹ) نام ہے قانون کی متحرک قوت کا، سلطنت (STATE) ریاست سے مراد وہ رقبہ زمین (LAND - ارض) ہے جہاں انسانوں کی سیاسی تنظیم ایک اجتماعی ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔ سیاست؛ وہ حکمتِ ادادی یا حکمت عملی ہے جس سے حکومت کا کارخانہ چلتا ہے۔ یہ تینوں مفہوم اس کتاب کا موضوع ہیں اور اسلامی مطمحِ نظر کے اِن تینوں پہلوؤں سے کتاب کو یکساں تعلق ہے۔

جہاں تک حکومت کے قواعد و ضوابط اور طور طریقوں کا تعلق ہے اسلام پہلے دن سے انسانیتِ عامہ کے مناسبِ وقت فطری واجبات کو پورا کرتا رہا ہے، اس نے اجتماعی خدمت اور سیاسی حوصلہ مندی کے کئی دور دیکھے اور ہر دور میں اپنی ذمہ داریوں کا ساتھ دیا۔

ہماری اس بوڑھی دنیا کے زمانۂ طفلی میں اس کی ابتدا ہوئی اس کو پھلنا پھولنا نصیب ہوا، بالآخر وہ زمانہ آیا جس کو تکمیل و ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔ ایک عام اور قوی الاثر سچے نصب العین کی حیثیت سے اسلام کے ابتدائی رجحانات اور آخری دور کے ترقی یافتہ فاتح میلانات ایک ہی سلسلۂ تنظیم کے دو سرے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق حسنِ آغاز سے ہے تو دوسرے کا تعلق حسنِ انجام سے۔

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اسلامی طرزِ حکومت، حکومت کی تخلیق کی ایک معروف

تاریخی مثال ہے جو عصر آدم سے سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ تک اپنے ارتقائی مدارج کے ساتھ معراج کمال پر نظر آتی ہے۔ اس کو فلسفہ و منطق کے پُر پیچ نظریات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ فہم انسانی کے لیے ایسی ہی سادہ سی شے ہے جیسا کہ اسلام فطرتِ انسانی کے لیے عام فہم اور سہل الحصول ہے۔

دنیا میں سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو خداوند عرش کے قوانین کی تعمیل کرے جو سب سے زیادہ انسانوں کی بہتری کا کام انجام دے۔ جس کا مدار ایسے پسندیدہ اصولوں پر ہو جو انسانی فطرت اور قدرت کے ابدی قوانین سے مکمل مطابقت پیدا کرسکیں جس کے اصولوں اور سیاسی اعمال میں عدل و اعتدال اور یکسانیت پائی جائے۔ اس قسم کی حکومت کے قیام کے متعلق اسلام کے علاوہ آج تک کسی مذہب، کسی سوسائٹی، کسی قوم نے دعویٰ نہیں کیا۔ اسلام اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے اور دنیا کے ان انسانوں کو اپنے دعوے کی صداقت پر جمع کرسکتا ہے جو مثالی معیاری اور اچھی حکومت کے طالب ہوں۔ عالمگیر امن اور عالمگیر بہتری کے لیے تڑپ رکھتے ہوں اور ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی تعصبات سے پاک و صاف ہوکر اس کے دعوے کی تنقیح کے لیے آگے آئیں۔

نئے زمانہ کا نظریہ کیا ہے؟ "یہ کہ سلطنت کا تخیل عالمِ خیال میں ایک اہم اور اکمل سلطنت کی جگمگاتی ہوئی تصویر پیش کرتا ہے جو ابھی تک عالمِ وجود میں نہیں آئی، مگر جس کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔"[۱]

اسلام اس نظریہ کے مقابلہ میں آکر یہ کہتا ہے کہ یہ اہم و اکمل سلطنت عالمِ وجود میں آچکی ہے۔ اس کی جگمگاتی ہوئی تصویر موجود ہے اگر اس کو دیکھنا مطلوب ہو تو علم و تحقیق کے سچے حوصلہ سے بے تعصبی کا چشمہ لے کر اس تصویر کو دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس جگمگاتی ہوئی تصویر کا نقش دنیا کی عقل کے صفحات پر پیش کیا جائے چونکہ یہاں اس تصویر کے تصوری دائروں کو زیرِ قلم لانا مناسب ہوگا اس لیے اس طرف بھی مختصراً توجہ کرنا ضروری ہے۔

اسلامی نظام اور قدیم نظریے — ایک پاک نفس ضمیرِ عام انسانی تعقل کی گمراہی کے باوجود تحقیق کے اولیں مرحلہ پر یہ محسوس کرسکتا ہے کہ اسلام کے اجتماعی تقاضوں میں ابتداء سے انتہا تک خدا پرستی، خدا ترسی نظم انسانیت، عدل اور اعتدال کارفرما نظر آتا ہے۔ ہزار سال تک اسلامی نظریات کا ایک مسلّمہ طرز پر قائم و باقی رہنا ان کی صداقت کی ایسی دلیل ہے جس کی بنیاد محکم اور غیر متحرک نظر آتی ہے اور جس کے مقابلہ میں دنیاداری کے بے لگام اجتماعی تصورات نہیں آسکتے۔

عصرِ نمرود — تاریخ کے قدیم ترین نظریوں کو دیکھیے ۲۰۰۰ قبل مسیح بابل میں ایک متمدن[۱] حکومت نے اپنا جاہ و جلال دکھایا لیکن نتیجہ کیا ہوا فرمانروا نے اپنے سیاسی تشخصات میں الوہیت کا رنگ پیدا کرکے تمام رعایا کو عذاب میں مبتلا کردیا اور وقت کے مصلح کو آگ کے غار میں جھونک دیا۔ کیا اسلام اس قسم کے باطل انسانی استبداد کو برداشت کرسکتا ہے؟ کبھی نہیں!

یونانی نظریہ — آج سے دو ہزار سال قبل یونانی فلسفی ارسطو نے یہ تسلیم کیا کہ انسان ایک سیاسی حیوان ہے اس دور میں اسکندر (یونانی) کے تصورِ حکومت پر غور کیجیے: تاریخ کا بیان ہے کہ "وہ یونانیوں کے مردانہ جوش کا عقد ایشیائیوں کی زنانہ جستی سے کرنا چاہتا تھا"[۲] ایک براعظم پر دوسرے براعظم کے تفوق کی یہ مضحکہ انگیز مثال اسلام کے دور میں تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتی مزید براں "یونانی سلطنت کو خود سلطنت کی غایت تصور کرتے تھے" سلطنت اصل تھی اور جمہور اس کے ماتحت اجزاء، ہر فرد سلطنت کا خدمتگذار تھا سلطنت افراد کی خدمتگذار نہ تھی[۳]۔ اسلام

---

[۱] تاریخ الامم طبری ج ۱ ص ۱۱۹ (حسینیہ مصر) رحمۃ للعالمین جسٹس سلیمان منصور پوری مقدمہ جلد ۱ ص ۲۳

[۲] نظریہ سلطنت منجلی ص ۲۷۔ [۳] حوالہ بالا ص ۳۲۱۔

اس طرزِ فکر کو بھی ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کرتا۔

چین اور ہند | چین کے قدیم پیشوا کنفیوشش[1] اور ہندوستان کے روحانی مہاتما بدھ[2] کے تصورات حکومت میں کچھ باتیں اچھی نظر آتی ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان میں تخلیقی یا تنظیمی دور کے فطری احکام کا اثر ہو لیکن بعد کے زمانہ میں ان نظریات میں باطل تصورات کی اتنی آمیزش ہوچکی ہے کہ ان کو اس قانون کی برابر نہیں رکھا جاسکتا جس کا دامن اصل اصول کی حد تک پاک صاف ہے اور جس کی تاریخ کا بہترین دور آج تک مکمل اور محفوظ ہے۔

نظریۂ عجم | قدیم ایرانی حکومت کو آسمانی منصب جانتے تھے لیکن ان کے تصورات کے قلعہ پر کمزور سمت سے باطل نظریوں نے اس طرح حملہ کیا جس سے آسمانی تصور زمین کی تہ میں اتر گیا، پستی کی انتہا کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایرانی سکندر کو خدا کا برتر فرزند ماننے کے لیے تیار تھے[3]

یہود و نصاریٰ | بنی اسرائیل کے تاریخی ادوار اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اسلام کی تاریخ سے متعلق ہیں، رہا عیسائیوں کا یہ تصور کہ خدا کی بادشاہت ابھی آئی نہیں آنیوالی ہے اور یہود

---

[1] کنفیوشش کے نظریۂ سیاسی کی رو سے مملکت کے سردار (فرمانروا) کو بیک وقت امیر اور حکیم (سلطان اور عارف) ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں معاشرہ کی اصلاح کا جو طریقہ ہے وہ اس طریقہ کے مطابق ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلعم نے آج سے تیرہ سو برس پہلے پیغمبر کی حیثیت سے اختیار فرمایا جس میں اصلاح گھر سے شروع ہوکر اجتماعی نظام اور تنظیم مملکت تک پہنچتی ہے۔ (دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس (دائرۃ المعارف مذہب و اخلاق) ج ۴ ص ۱۶)

(Jemes Hastings. Incyclopaedia of Religion and Ethics. Vol 4 - P. 16)

[2] دیکھو پاکٹ تاریخ ہندوستان۔ دسنداس ایم اے سینیر پروفیسر تاریخ ڈی پی کالج ڈیرہ اسمٰعیل خاں طبع لاہور ص ۳۲-۴۱

مہاتما بدھ نے ۵۶۷ قبل مسیح برہمنی دور کی انانیت کو توڑ کر عوام الناس کے فائدوں کو مقدم رکھا سنسکرت کو پالی کر کے عام لوگوں کے لیے عام فہم پالی زبان کو رواج دیا۔ اس مذہب کے حکمرانوں، اشوک (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق م) اور کنشک (۳۰ ق م) نے پرہیزگاری اور انصاف کی حکومت کا اعلان کیا اور یہ اصول قائم کیا کہ کسی دوسرے کے مذہب پر سب و شتم نہیں کرنا چاہیے۔ [3] نظریۂ سلطنت بلخی ص ۲۷۔

نصاریٰ کے خیالاتِ مابعد تو ان کی تردید تاریخ کے حوادث پوری طرح کر چکے ہیں[1]۔

نظریۂ عصرِ حاضر زمانۂ موجودہ کے جبلی نظریوں اور نمائشی طرز کو اسلام کے مقابلہ میں لانا بھی اصلاً غلط ہے کیونکہ اس طرزِ حکومت کی ہر شاخ، ہر شعبے اور ہر فیصلے میں قول و عمل کا اتنا اختلاف ہے جس نے دنیا کو نفاق سے بھر دیا ہے اور خدا کے آزاد بندوں کو غلامی اور بربادی کے عذاب میں دھکیل دیا ہے، اس زمانہ کی ستم ظریفی کی داد دینا مشکل ہے۔ عام انسانی فراست پر ماضی و مستقبل سے زیادہ حال کا اثر پڑتا ہے۔ زمانۂ حال کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے اس کے دعووں کی نمائش ایسے طریقوں سے ہو رہی ہے جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مغرور نظامِ حکومت کی تاریخ میں اسلامی نظامِ سلطنت اور طرزِ حکومت کا شایانِ شان ذکر نہیں پایا جاتا۔

ترتیب و تدوین کے محرکات مغربی مصنفوں نے سلطنت اور نظامِ سلطنت پر جو کتابیں ترتیب دی ہیں اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معلومات کا رُخ دنیا بھر کے نظامہائے حکومت کی طرف ہے مگر معمولی غور و فکر کے بعد ہی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر مصنف تنگ نظری کے ساتھ ایک بہت ہی محدود دائرہ میں خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ اس کو دنیا اور اقوامِ دنیا کے نظاموں اور نظریوں سے عمومی لگاؤ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یونان، روما کے چھٹے آثار سے گذر کر موجودہ یورپ کے نظر فریب قوانین اور ضابطوں کی تشریح اور ترتیب ہے۔ یورپ کے فضلا (مستشرقین) نے ہم زبان ہو کر مختلف لہجوں میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ عصرِ حاضر کے علمی، صنعتی، سیاسی اور اجتماعی تنظیمات اسلامی دور کے اجتماعی عوامل کا ناگزیر نتیجہ ہیں[2]۔ اس عام اعتراف کے بعد نہیں کوئی

---

[1] دیکھو اسلام اور مسلمانوں کی حکومت (خلافت ارضی) تفسیر القرآن العظیم حافظ امام الدین ابن کثیر ج ۳ ص ۳۰۰

[2] دائرۃ المعارف علامہ وجدی ج ۱۱ ص ۲۵۸ - ۲۷۱ - الاسلام والحضارۃ العربیہ ڈاکٹر کرد علی (تعلیقات) ضمیمہ زج ا ص ۵۵) بحوالہ Jolivel Castelat : La loi de l'Histoire (قانون التاریخ جولیفٹ کسٹلاٹ)

ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یورپ کے نظامِ حکومت میں کتنے ضابطے ایسے ہیں جو اسلام کی عالمانہ قوت اور سیاسی تاریخ کا عطیہ ہیں اس مرحلہ پر بیشتر مصنفین ایک سازشی بخل کا شکار نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسی فروگذاشت ہے جس نے علم و تحقیق کے دائرہ میں تصنیفی صداقتوں کو پامال کر دیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب کا ایک مقصد اس کمی کو پورا کرنا ہے، اس کے علاوہ حسب ذیل امور بھی اساسی وجوہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۱) صدیاں گذرنے کے باوجود اسلام کے نظامِ حکومت کا کوئی مکمل خاکہ مرتب نہیں کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں نے سالہا سال سے اجتماعی میدان کو دوسری طاقتوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے علمی دائرہ میں الٰہیات کی درس و تدریس ہمارا اصل نصب العین تھا۔ اس کے لیے ہم نے قابلِ تعریف کوشش کی لیکن ہمارے افکار و اعمال کی جولانگاہ میں اجتماعیات کو وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو خدا کے پیغمبروں ؑ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں (خلفائے راشدین رضؓ) کے عہدِ حق سے حاصل ہوا تھا۔ غالباً ایسا ہونا قدرتی حالات کے تابع تھا۔ جب ہمارے اجتماعی اقتدار کے عالمگیر اختیارات ختم ہو گئے اور بیرونی دباؤ زیادہ ہو گیا تو ہمارے علماء کو مذہب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) ضمیمہ ۵ ج ۱ ص ۹۵) بحوالہ غزوات العرب موسیو رینو۔۔۔ ضمیمہ ۷ (ج ۱ ص ۲۱۱)

ضمیمہ ۸ (ج ۱ ص ۲۲۴) بحوالہ السفر الفرانسیسی رینہ مارشل Rene Martial La ruce Francaise

ضمیمہ ۹ ج ۱ ص ۲۲۸ بحوالہ نظریات یورپ اور تمدن یورپ۔ ڈاوسن

Dawsan. Les origines del Europe et de la civilisatian Europeenne Chrislopher.

ضمیمہ ۱۱ امریکہ میں عربوں کی نوآبادیاں۔

اور سیاست کے درمیان مصنوعی فرق پیدا کرنے کے لیے اپنے مجبور و معذور ہاتھوں سے خط کھینچنا پڑا۔

(۳) خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کے دور حکومت نے فرمانروائی کا جو شخصی عنوان اختیار کیا اُس نے اسلامیت کی حقیقت پر پردہ ڈال دیا۔ علماء کو جزئی قوانین کا وسیع میدان ملا جس میں اُنھوں نے شاندار، قابل تعریف اور یادگار کارنامے کر کے دکھائے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت و سلطنت کے متعلق خلافت نبوی اور ریاست عامہ کے جو اصولی احکام تھے وہ آنکھوں سے اوجھل اور علم و تحقیق کی دسترس سے باہر ہو گئے۔ یہاں تک کہ صدیوں سے اس طرف کافی توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔

(۴) یورپ نے سلطنت روما کی شکست کا انتقام مسلمانوں سے لیا۔ مادی ارتقاء نے روحانیت کے قلعہ کے دروازوں کو بند کر دیا۔ سب سے پہلے سیاسی ارتقاء ایشیا[۱] اور شمالی افریقہ میں ہوا تھا پھر یونان و روما کے زوال کے بعد مسلمان ہی تھے جنھوں نے یورپ کو علمی اور سیاسی میدان میں لا کھڑا کیا۔ یورپ نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا۔ اس کو یاد ہی نہ رہا کہ اسلام کا نظام کوئی محدود ملکی، قومی نظام نہیں بلکہ انسانیت عامہ کا مقصد و منشا رہے۔ یورپ نے پہلے مسلمان حکومتوں کی قوت کو ختم کیا اور اس کے بعد اپنے اجتماعی طور طریقوں کی اس طرح نمائش کی کہ اسلامی حکومت اور طرز حکومت کا داعیہ خواب و خیال ہو گیا۔ ان طریقوں کے اجراء کے لیے جو حیلے وسیلے اختیار کیے گئے اُنھوں نے ہماری زبان و قلم کو اجتماعیات کے میدان سے نکال دیا۔ قول و عمل کی احتیاط نے ایک مستقل بہانہ کی صورت اختیار کر لی۔ اس طرح جہادِ حق کے محاذ پر ہماری مقاومت کمزور ہو کر ختم ہو گئی اور ہم قانونِ عافیت کی پناہ لے کر جسم و جان کی حفاظت میں لگ گئے۔

---

[۱] نظریۂ سلطنت۔ بلیغی مقالہ (۶) ج ص ۳۶۳

(۵) اس زمانہ تک کسی کتب خانہ میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو گذشتہ چند صدیوں کے مطالبہ کے جواب میں پیش کیا جائے۔ اور جس کو اسلام کے مکمل دستور حکومت کا نام دیا جاسکے۔

زمانۂ حال کا خیال یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان مذہبی حکومت کے جس طرز سے وابستہ ہیں ان کو اس زمانہ کا دماغ کبھی قبول نہیں کرسکتا۔ اسی زمانہ کا ایک لائق مصنف دورِ قدیم کے علماءِ سیاست پر یہ اعتراض کرتا ہے

"متقدمین سلطنت کے اس اہم فرض کی طرف توجہ کرنے میں ناکام رہے کہ شخصی آزادی اور بنی نوع انسان کے سوادِ اعظم کی بہتری کو ترقی دینا سلطنت کا فرض ہے۔ متاخرین ارباب سیاست یہ فخر کرسکتے ہیں کہ انہوں نے سلطنت کی اس ذمہ داری کو محسوس کیا۔"

(نظریہ سلطنت بلنچلی۔ ص ۲۲۴)

یقین کیجیے فخر کے اس جذبہ میں جن متاخرین کا ذکر ہے اس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ کیونکہ مصنف کے متاخرین وہ مسلمان نہیں ہیں جنہوں نے اس دور سے پہلے سلطنت کی دنیاوی غائت انسانی صلاح وفلاح کو قرار دیا بلکہ یورپ کے علماءِ سیاست ہیں جن کے کارناموں کا ثمرہ آج کے کارناموں کی صورت میں عذاب کی طرح نازل ہو رہا ہے۔

یہ وہ اسباب اور خیالات ہیں جو کتاب کے لیے داعیہ بنے اور جنہوں نے اس مجموعۂ آئین ودستور کی شکل اختیار کی۔

اسلامی حکومت کے تکوینی اور ارتقائی دور

اسلام کی نظر میں انسان ایک تکوینی وجود ہے اور سلطنت ایک تکوینی شے۔ انسان اور سلطنت کا تصور ایک ساتھ اور ایک زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ جس برتر وجود نے انسان کو پیدا

کیا ہے اسی نے سلطنت کو پیدا کیا ہے، جو کارخانۂ عالم کا موجد ہے وہی کارخانۂ حکومت کا موجد ہے۔ یہ نظریہ ہمارے اجتماعی تصور کی پہلی شاخ ہے، اس کا دوسرا پہلو جو پہلے سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ انسان اور حکومت کے وجود کی غائت درجۂ اول پر اسی برتر وجود کی مرضی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور ایسی غائت ہے جس کا تعلق انسان کی بہتری سے ہے تو اس کا متعین کرنا بھی اسی بالادست وجود کا کام ہے۔ جہاں تک اسلام کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے ہم انسان اور حکومت کے تعلق پر اجتماعیاتِ قرآن کے مستند عالم امام راغب اصفہانی کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "انسان[1] بحیثیت انسان افضل ہے۔ صحیح علم اور عاقلانہ تدبر یہ دو ایسے ستون ہیں جس سے انسان اخلاق و عمل کے دائرہ میں معراج کمال پر پہنچتا ہے۔ خدا کی حکومت کی غایت (اطاعت احکام) کو پورا کرتا ہے اور منجانب اللہ حکومت کی ذمہ داریوں کا مستحق ہوتا ہے"

انسان اور حکومت کا یہ تعلق ابتدا سے انتہا تک ایک ہی عنوان کے ماتحت نظر آتا ہے۔ دنیا کے ہر نظریہ میں تغیر ہو سکتا ہے مگر اس تعلق میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ ہمیں جس بات کا علم ہے وہ یہی ہے کہ حکومت کے لیے جتنے عوامل کا ہونا ضروری تھا وہ سب سیاستِ الٰہی سے ایک ایک کر کے موجود ہو گئے۔ چونکہ حکومت انسانوں کی باہمی تنظیم سے بنتی ہے، اس لیے انسان پیدا ہوا، بانی حکومت کے لیے رقبہ کی ضرورت تھی اس لیے روئے زمین نے صورت وجود حاصل کی۔ حکومت کے استحکام کے لیے وحدت و وفاق ضروری تھا اس لیے نظریۂ توحید نے اپنے عالمگیر اوصاف کو ظاہر کیا۔ حکومت کے کام اور نظام کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے صلاحیت مند افراد کی ضرورت تھی اس لیے پیغمبر کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے دنیا میں آئے جن میں سے ہر پیغمبر خلیفۃ اللہ تھا[2]۔ (حکومت کے کام میں اللہ کا نائب!)

---

[1] الذریعہ الی مکارم الشریعہ، امام ابوالقاسم الحسین بن محمد بن المفضل الراغب الاصفہانی ص ۱۵-۱۶۔ [2] بحر المحیط ج ۱ ص ۱۴۰

اس سلسلہ کی جو بات ہم نہیں جانتے اس کے متعلق باخبری کا دعویٰ کرنا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ آج تک کسی کو یہ معلوم نہیں کہ دنیا کب پیدا ہوئی اور حکومت نے کتنے قرن پہلے اپنا چہرہ دنیا کو دکھایا۔ حقیقۃً تخلیق کے آثار کی پیمائش مشکل بھی ہے، البتہ جس حد تک الہامی کتابیں تاریخی آثار اور علماء کے تاریخی قیاسات فیصلہ کرسکتے ہیں ہم بھی اپنا فیصلہ دینے اور اسلامی حکومت کے تصوری اور عملی ادوار کو متعین کرنے میں حق بجانب ہیں۔

بیشک ہم انسان اور حکومت کی تخلیق کا وقت متعین نہیں کرسکتے لیکن انسانی زندگی کے اچھے زمانوں کو مقصد کی وضاحت کے لیے مناسب عنوان سے تقسیم کرسکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں انسان اور مذہب۔ انسان اور حکومت تخلیقی حقیقتیں ہیں اور ایک ساتھ تخلیق کی نمودگاہ میں ظاہر ہوئی ہیں۔ ہم اس اعتبار سے اسلامی حکومت کے زمانوں[1] کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں۔

ابتدائی دور | عصر آدمؑ سے عصر نوحؑ تک[2]، ولادت آدمؑ سے عہد نوحؑ تک ایک ہزار چھپن[۱۰۵۶] سال کا فصل ہے۔ ہم اس دور کو تخلیقی، فطری اور تصوری دور بھی کہتے ہیں۔ ابتدائی اس لیے کہ اس زمانہ میں انسانیت اور حکومت کے اجتماعی دور کی ابتدا تھی۔ تخلیقی اس لیے کہ اس دور میں انسان عالم تخلیق میں آیا۔ فطری اس لیے کہ اس عصر میں انسانی فطرت احسن تقویم (معیار شرافت) پر بروئے کار تھی۔ تصوری اس لیے کہ درحقیقت یہ حکومت کی قابلِ لحاظ تنظیم کا زمانہ نہ تھا بلکہ اسلام کے اجتماعی تصورات کا دور تھا، جن میں سے خال خال کسی خاص تصور ہی کو میدانِ عمل میں آنے کا موقع ملا۔ اس دور میں آدمؑ، شیثؑ ابن آدمؑ۔ ادریسؑ ابن شیثؑ جامعہ انسانی

---

[1] اسلام کے پیغمبروں کے تاریخی اور سیاسی آثار کے لیے دیکھو (الف) البدایۃ والنہایۃ۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر۔ (ب) قصص الانبیاء استاذ عبدالوہاب النجار۔ جامع ازہر۔

[2] تاریخ الکامل۔ علامہ ابن الاثیر ۶۲۳ھ جلد ۱ صفحہ ۱۰-۲۹۔

کے برگزیدہ مذہبی اور سیاسی رہنما تھے۔

تنظیمی دور | عصر نوحؑ سے عصر ابراہیمؑ تک[1]: عام روایت کے مطابق ولادت نوح (علیہ السلام) سے ولادت سیدنا ابراہیم علیہ السلام تک (۸۹۰) سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ ہم اس دور کو تنظیمی دور کہتے ہیں اور اصلاحی دور بھی کہہ سکتے ہیں تنظیمی اس لیے کہ اجتماعی معاشرہ کی تنظیم کے آثار اس دور میں پوری طرح نمایاں ہیں۔ اصلاحی اس لیے کہ جامعۂ انسانی میں فساد پیدا ہو چکا تھا، انسانیت احسن تقویم سے اسفل السافلین میں (معیار شرافت سے پستی کے عمیق ترین گڑھے میں) گرنے کے لیے تیار تھی۔ اور اسلام کے اصلاحی تصرفات نے بھی ان کے مقابلہ میں اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

اجتماعی دور | عصر ابراہیمؑ سے عصر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تک ہماری اصطلاح میں اجتماعی دور ہے۔ حضرت ابراہیم بابل کے عصر تمدن میں (۲۰۰۰ ق م) میں پیدا ہوئے۔ اور ولادت مسیح کے چھ سو سال بعد سردار کائنات سیدنا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہم اس طویل عرصہ کو اس لیے اجتماعی دور کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں "ملت ابراہیمی" نے اجتماعی ہیئت اختیار کی ملی تنظیمات نے ایک شاندار سیاسی شکل کو قبول کیا۔ اسلامی طرز حکومت نے شخصی استیلا اور جابر شہنشاہیت کے مقابلہ میں عام محاذ قائم کیا۔ اور حکومت کے کام کو حکومت کی حیثیت سے شروع کیا البتہ حکومت کا یہ دائرہ خاص قطعۂ زمین اور قومیت کے خاص تصور سے متعلق تھا۔ اس دائرہ میں ایک طرف بنی اسمٰعیل نظر آتے ہیں جنہوں نے عرب اور اطراف عرب میں حکومتیں قائم کیں تو دوسری طرف بنی اسحٰق موجود ہیں جنہوں نے شام فلسطین اور مصر پر اپنا سیاسی اثر ڈالا۔

اسلامی دور حکومت | سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عصر ظہور (۵۷۱ء) سے

---

[1] تاریخ الکامل ابن الاثیر ج ۱ ص ۲۹-۴۳ [2] البدایۃ والنہایۃ۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی جلد اول ص ۳۳۹۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے دور تک اسلامی حکومت کا حقیقی اور اصطلاحی[1] دور ہے۔ اس عرصہ میں اسلام کی حکمبرداری کے قوانین، حاکمیت کے اصول اور حکومت کے طرز سے دنیا کو مکمل طور پر تعارف حاصل ہوا۔ گویا حکومت کا وہ نازک پودا جو عصر آدمؑ میں زمین پر قائم کیا گیا تھا اُس نے تجربات سے پورے طور پر نشو ونما حاصل کرنے کے بعد ایک پُر ثمر اور بار آور درخت کی صورت اختیار کر لی حکومت وسلطنت کا تصور ترقی کرتے کرتے درجۂ کمال پر پہنچ گیا۔ پُرانی دنیا کے مرکز سے ایک ایسی حکومت اور قوم کا ظہور ہوا۔ جو تمام قوموں اور حکومتوں کے مقابلہ میں بے مثال تھی یا اپنی مثال آپ! حکومت کے دائرۂ عمل میں۔ ارتقائی عمل نے اپنا آخری کارنامہ دکھایا۔ آبائی معاشرے اور محدود قومیت نے وسیع حلقہ میں قدم رکھا۔ ساری دنیا کے لیے ایک نظری مذہب۔ ایک، قدرتی نصب العین ایک ربانی حکومت کا خیال اس طرح نمایاں ہوا کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایک عالمگیر نظام حکومت، عالمگیر تحریری قانون، عالمگیر قوم، عالمگیر صلاح وفلاح کے لیے بر روئے کار آیا، جس کی قوت سے نپولین کے قول کے مطابق "نصف صدی میں نصف دنیا کو فتح کر لیا گیا"، اور ایک ایسی حکومت قائم کی گئی جس کے اصول اور عمل میں مکمل مطابقت تھی۔

چونکہ اخلاق واعمال کی جولانگاہ میں اسلام کو اسی زمانہ میں مکمل طور سے ظاہر ہونے اور اپنے طرز حکومت کو ظاہر کرنے کا موقع ملا اس لیے ہم اس دور کو اسلامی حکومت کا دور کہتے ہیں۔

مسلمانوں کا دورِ حکومت

دنیا نے سنہ ٦٦٢ء / ٤١ھ سے سنہ ١٩١٨ء / ١٣٣٩ھ (عہد بنی اُمیہ سے عہد خلافت عثمانیہ) تک حکومت کے جو شاندار اور قابلِ رشک مظاہرے دیکھے ہیں ہم ان کو مسلمانوں کا دورِ حکومت کہتے ہیں۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۲۔ ۳۵۶ ج ۴-۵-۶-۷-۸۰

اسلامی دور اور مسلمانوں کے دور کی حدود تاریخی اعتبار سے حسب ذیل ہیں۔

اسلامی دور | خلافت الٰہی[1]:- سید کونین پیغمبر اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابتی حکومت کا عہد باسعادت (سنہ ۶۱۰ء سے سنہ ۶۳۲ء / ۱۱ھ تک)

خلافت محمدی[2] دور اول:- سیدنا صدیق اکبرؓ کا عہد حکومت (سنہ ۶۳۲ء / ۱۱ھ سے سنہ ۶۳۴ء / ۱۳ھ تک)

خلافت محمدی دور دوم:- سیدنا عمر فاروق اعظمؓ کا زمانۂ امارت (سنہ ۶۳۴ء / ۱۳ھ سے سنہ ۶۴۴ء / ۲۴ھ تک)

خلافت محمدی دور سوم:- سیدنا عثمان غنی کا زمانۂ امارت (سنہ ۶۴۴ء / ۲۴ھ سے سنہ ۶۵۵ء / ۳۵ھ تک)

خلافت محمدی دور چہارم:- سیدنا علیؓ کا زمانۂ امارت (سنہ ۶۵۵ء / ۳۵ھ سے سنہ ۶۶۱ء / ۴۱ھ تک)

مسلمانوں کا دور | خلافت بنی امیہ:- خاندان بنی امیہ کی حکومت دمشق میں (سنہ ۶۶۱ء / ۴۱ھ سے سنہ ۷۵۰ء / ۱۳۲ھ تک)

امارت بنی امیہ اندلس میں (سنہ ۷۵۶ء / ۱۳۹ھ سے سنہ ۱۰۳۱ء / ۴۲۲ھ تک)۔

خلافت عباسیہ عباسیوں کی حکومت (سنہ ۷۵۰ء / ۱۳۳ھ سے سنہ ۱۲۰۸ء / ۶۰۵ھ تک)

خلافت فاطمیہ۔ فاطمی شیعان علی کی حکومت مصر اور ممالک بربر میں سنہ ۲۹۷ھ سے سنہ ۵۶۷ھ تک۔

خلافت عثمانیہ عثمانی ترکوں کی حکومت سنہ ۱۲۹۹ء / ۶۹۹ھ سے سنہ ۱۹۱۸ء / ۱۳۳۹ھ تک

مغلیہ سلطنت:- ہندوستان میں مغلوں کی حکومت سنہ ۱۵۲۶ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک

موجودہ دور کی مسلم حکومتیں بھی اس تاریخی سلسلہ میں داخل ہیں۔

اسلام اپنے ابتدائی دور سے اسلامی دور تک جن سیاسی نظریات کو پیش کرتا رہا ہے ان سب کا تعلق اس کتاب کے موضوع سے ہے اس تعلق کے پُرجوش اور حاصل خیز نظارے جا بجا

---

[1] عربی انسائیکلوپیڈیا۔ دائرۃ المعارف بستانی ج ۷ ص ۳۰۴ لفظ خلافت۔ دائرۃ المعارف وجدی ج ۶۔ الخلافۃ فی الاسلام ج ۶ ص ۴۳، ۷-۷۶۳ طبع سنہ ۱۹۲۳ء مصر۔

[2] دائرۃ المعارف بستانی ج ۶ ص ۹۶ طبع بیروت سنہ ۱۸۸۲ء۔

صفحات پر نظر آئینگے لیکن اصل اور اساسی موضوع یہ ہے کہ اسلامی دور کے طرز حکومت کا خاکہ پیش کیا جائے اور یہ نمایاں کیا جائے کہ اس منزل میں اسلامی نظریات کیا ہیں اور دنیا کے نظریات کے مقابلہ میں اسلام کے اساسی دستور کا کیا درجہ ہے۔ مسلمان حکومتوں کا دور نہ تو پوری طرح موضوع کتاب کا حصہ ہے اور نہ موضوع کتاب سے بالکل خارج۔ بلکہ یہ دور اسلامی دور کے آثار مابعد میں داخل ہے۔ ان آثار کو قطعاً نظر انداز کرنا نامناسب ہوتا، اس لیے مناسب مواقع پر ان سے بھی امداد لی گئی ہے۔

ترتیب کی تاریخ

آج سے ۱۸ سال پہلے جبکہ میں اپنی زندگی کے اٹھارہ سال پورے کر رہا تھا۔ مجھے ۱۳۴۲ھ اور ۱۹۲۳ء میں پہلی بار افغانستان کی سیاحت کا موقعہ ملا۔ ۱۹۱۴ء کی ہولناک جنگ کے خاتمہ کو صرف پانچ سال گذرے تھے۔ دنیا کی سیاست اُس تھکے ہوئے مسافر کی طرح سو رہی تھی جو قزاقوں کے حملے سے شکستہ پا بھی ہو چکا ہو اور زخمی بھی۔ انگلستان اور فرانس تاوانِ جنگ کے سکے گن رہے تھے۔ ولسن کے اصول جانبداری کے پیمانہ سے ناپے جا رہے تھے۔ جرمن چانسلر ہنڈنبرگ اُسی مہم کو سر کرنے میں مصروف تھا جس کو آج ۱۹۴۱ء میں فرانس کا بوڑھا جرنیل پیٹان نہ بجھے ہوئے دل سے کر رہا ہے۔ جمعیتہ اقوام "انسداد جنگ کے لیے جنگ" کے نظریہ کی بنیاد قائم کر رہی تھی۔ ہر قوم کی آزادی کا وہ اصول جو مجلس اقوام کے ضابطۂ قوانین کے دیباچہ میں درج کیا گیا تھا۔ دبلقان اور بالٹک کی ریاستوں میں بغیر کسی پختہ بنیاد کے اپنا وہ محل تیار کر رہا تھا جس کو ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کی جنگ کے پہلے گولے نے گرا دیا۔

روس کی حکومت خون میں نہا چکی تھی اور روسی شہریت انسانیت عامہ کے اشتراکی

مطمحِ نظر تک پہنچنے کے لیے خون کے سمندر سے گذر رہی تھی۔ ترکی، یونان کی لگائی ہوئی آگ کے بجھے ہوئے خاک کے تودوں سے اپنی تعمیر کے لیے سیمنٹ تیار کر رہا تھا۔ عرب رہنما، وحدتِ عرب کی قبر پر نشانِ مزار نصب کرنے کے لیے جمع تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مکموہن اور لارنس کی دستاویزیں تھیں اور قدموں میں جزیرۃ العرب۔ ایران طلوعِ آفتاب کے انتظار میں تھا اور اپنے ماضی و مستقبل کی ترکیب کی پیچیدگیوں سے پریشان، اس سارے ماحول میں افغانستان ہی ایک ایسا خوش قسمت ملک تھا جس نے صرف چار سال پہلے شدید مقاومت اور جارحانہ حملے کے بعد دنیا کی سب سے بڑی حکومت سے اپنی آزادی کی دستاویز پر دستخط کرائے تھے۔ غازی امیر امان اللہ خاں کا ابتدائی ارادہ، ہندوستانی مہاجرین کی ایمانی عزیمت اور صادق کوششیں اور جنرل نادر خاں ایسے تجربہ کار فوجی مدبر، شجاع مسلمان نجات دہندۂ افغانستان اور ایشیا کے مانے ہوئے سپہ سالار کی وہ آخری مہم جس سے قلعہ تھل کی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں، جدید افغانستان کی روح بنے ہوئے تھے۔

اگرچہ تحریکِ خلافت کے ساتھ خلافت کا نظام دنیائے اسلام کے اندرونی دباؤ اور وسیع الاثر بیرونی سازشوں کی نذر ہو چکا تھا تاہم نئے افغانستان کے طرزِ حکومت کا رابطہ اسلام کے اجتماعی قانون کے ساتھ بہ نظرِ ظاہر قائم تھا[1]۔ خاص کر ایسے نوجوان کے لیے جس نے نہ اس سے پہلے آزاد ماحول دیکھا تھا نہ آزاد مسلمانوں کی آزاد حکومت، غیور و شجاع افغانوں کے ملک میں اسلام اور حکومت کا یہ رسمی تعلق کم حیرت انگیز نہ تھا۔ سفر کی غایت اُس گرامی مرتبہ مردِ مجاہد اور دنیائے اسلام کے اُس خاموش خادم کی خدمت میں حاضر ہونا تھا جو اس دنیا میں میری طبعی

---

[1] دیکھو دستورِ اساسی افغانستان (نظامنامہ تشکیلات اساسی افغانستان) ف چہارم دفعہ ۲۲۶۔ سنہ ۱۳۰۵ شمسی طبع شرکت رفیق۔ اصولِ[2] اساسی دولت علیہ افغانستان ۱/۵ طبع ۲۰ عقرب سنہ ۱۳۱۰ شمسی۔ ریاست مطابع۔ عہدنامہ ہای دولتی ۱۰۵-۱۰۶ (۱/۳)

محبت اور فطری عقیدت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور جس کو افغانستان کے دور آزادی کے اول درجہ
کے سیاستداں اپنا سیاسی استاذ تسلیم کرتے ہیں۔ اس مرد مجاہد کا نام ہے —— ابوالحامد۔
محمد بن عبداللہ انصاری۔ جو ہندوستان میں محمد میاں کے نام سے اور افغانستان میں منصور
انصاری کے نام سے مشہور و متعارف ہیں۔ مولانائے محترم ہندوستان کی سیاسی زندگی کے ان
محرکات سے بہت متاثر تھے جن کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی حیات۔ دنیائے اسلام کی آزاد
قوتوں اور ہندوستان کی مذہبی و سیاسی آزادی پر پڑ رہا تھا۔ ان کو دارالعلوم دیوبند کے شہرۂ آفاق
بانی ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کے سخت کوش قائداعظم، اسلامی ہند کے مصلح و مجدد مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے
نواسے ہونے کی وجہ سے علم و عزیمت کا جو بھرپور خزانہ ملا تھا وہ سینہ میں محفوظ تھا۔ (۱۳۳۳ھ
۱۹۱۴ء) کی جنگ عظیم کے زمانہ کے سب سے بڑے عالم، قاسمی فلسفہ و سیاست کے امین
امام اور شیر دل مجاہد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی مجلس علم و سیاست میں اعتماد
کا منصب مل جانا آنے والے یادگار زمانہ واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جنگ عظیم سے پہلے
آخری سفر حج میں اپنے شیخ اور استاذ کی معیت اور معتمد کی حیثیت سے معیت نصیب شاگرد ہوئی۔
شریف حسین کا عہد تھا۔ شیخ الہند کو حرم امن میں کبھی امن میسر نہ ہوا۔ استاذ سے پہلے شاگرد
ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان سے سرحد، سرحد سے سرحد آزاد اور سرحد آزاد سے افغانستان
کی حد میں داخل ہو گیا۔ استاذ نے شک و شبہ کی پاداش میں اس کی جزا پائی۔ اسارت؟
مالٹا کی قید اور نظر بندی!

تاریخی دن مجھے وہ پہلا دن یاد ہے جب میں نے شیخ الہندؒ کی بقیۃ السیف فوج کے ایک جلا
وطن سپاہی کو افغانستان کے کسٹم ہاؤس (گمرک) میں دیکھا۔ آپ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں افغانستان
پہنچے تھے اور آج کا دن ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء کا ایک تاریخی دن تھا نو سال کے بعد ایک پُر اثر ماحول میں

ایک سترہ سالہ آرزومند نوجوان نے اپنے بزرگوار باپ کے ہاتھ چومے اور داڑھی کو بوسہ دیا۔

یہ پہلی ملاقات باپ بیٹے کی ملاقات تھی لیکن سفر کے آثار سے سبکسار ہوتے ہی ایک ہفتہ کے اندر جو دوسری ملاقات ہوئی تو یہ صاف نظر آرہا تھا کہ حکومتِ الٰہی کا مُبلّغِ اعظم "اسلامی نظامِ حکومت" کے مصنف سے مل کر "امامت کبریٰ" کی علمی امانت سپرد کر رہا ہے۔ میرے کانوں نے پہلی مرتبہ یہ سنگین الفاظ سُنے جن کا دباؤ اب تک میرے دل، دماغ اور کانوں پر برابر بڑھ رہا ہے

(۱) الا لہ الحکم (۲) إن الحکم إلا للہ (۳) لا یشرك فی حکمہ احداً (۴) کل لہ قانتون (۵) ونحن لہ مسلمون۔

"آگاہ ہوجاؤ! حکومت اُسی کی ہے۔ اللہ کے حق حکومت میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا سب اُسی کی فرمانبردار رعایا اور حکم کے بندے ہیں اور ہم اسی کے حکمبردار ہیں۔ خدا ایک ہے، توحید یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ نہ اس کی ہستی میں کوئی شریک ہے، نہ اس کی حکومت میں۔ جو خدا کو ایک نہیں مانتا باغی ہے، اور جو حکومت کے دائرہ میں اس کی وحدانیت کا قائل نہیں سرکش اور غدار ہے"

ان جملوں کے بعد جو جملے سُنے اُن سے عرش الٰہی کی سطوت وجبروت اور خدائے واحد کی حکومت کا وہ یقین حاصل ہوا جس کو دل کی لوح سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی"۔

"عقیدۂ توحید کا ایک قالب ہے اور ایک روح۔ لا الٰہ الا اللہ قالبِ توحید ہے اور ان الحکم الا للہ روحِ توحید۔ لا الٰہ الا اللہ ایک مکمل کلمہ ہے صرف اس لیے کہ اس میں ہر وقت توحید الٰہی کا اقتدار کارفرما نظر آتا ہے"۔ اگر کونین کا پیغمبرِ اعظم، اور اس کے چار برگزیدہ جانشین (صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ) اعلیحضرت، جلالۃ الملک، سلطان المعظم، بادشاہ، فرمانروا، تاجدارِ اسلام اور حکمراں کا لقب نہیں حاصل کرسکے تو دنیا میں کس مسلمان کی یہ جرأت ہے کہ خدا کی توحید کی چٹان سے ٹکرائے اور خدا کے حقِ حکومت کو اپنا حقِ حکومت قرار دے"۔

ان جملوں کے بعد آخری جملے وہ تھے جن میں سے ہر لفظ اس کتاب کی عمارت کا ستون ہے[1]
اسلام کا مقصد ایک ایسا عظیم الشان اجتماع بر روئے کار لانا ہے جس کو بغیر شک و شبہ فطری کہا جا سکے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ علم و تبلیغ کی راہ میں خدا کے اجتماعی نظریہ کو مرتب کر کے پیش کرو۔ کاش یہ کام میری زندگی میں اتمام تک پہنچے۔

ایک دوسری مجلس میں ایک اور نکتہ کانوں سے گذر کر دل کی امانت بنا۔

"جانتے ہو اسلام کے نظامِ حکومت کی بنیاد کیا ہے۔ خدائے واحد کی حکومت کا اقرار اور حکومت کے ہر دوسرے نظام کا انکار۔ خدا ہے اور اُس کا اختیار ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔ یہی دعا کی مقبولیت کی اصل ہے۔ یہی نماز اور عبادت گذاری کی روح، اور یہی اسلام کے نظامِ حکومت کی حقیقت ہے۔ خدا کو اقتدارِ اعلیٰ سمجھنا اور ہر اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا۔ یہ ہے خدا کے قانونِ حکومت کی اولین دفعہ۔ جب مسلمان دنیا میں اس یقین کے ساتھ ہاتھ بلند کریگا۔ ہاتھوں میں حکومت کی زمام لے کر واپس ہوگا۔ خدا کا وعدہ حق ہے مگر ان لوگوں کے لیے حق ہے جو خدا کو مانتے ہیں اور اس کی قدرت و اختیار کے بعد کسی دوسرے اختیار اور اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے۔"

تاریخ دستور اور علامہ منصور

اٹھارہ سال قبل کانوں سے یہ الفاظ سُنے تھے۔ جو آج دل کی لوح کا نوشتہ بنے ہوئے ہیں۔ جو کام آج پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے اُس کا آغاز قیامِ کابل کے دورِ اوّل میں ہو چکا تھا۔ مجھے پہلے سفر کے بعد دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے سفر کا موقعہ حاصل ہوا دل و دماغ کی بیداری کے لیے اوّل سے آخر تک جو ذرائع میسر ہوئے ان میں دنیائے اسلام کے ان ممتاز اعیان کی ملاقاتیں، مجلسیں، آزاد صحبتیں اہم ذریعہ بنیں۔ جن میں سے ہر ایک زمانہ

[1] بینچلی نے بھی اس نظریہ کی تنقید میں حصہ لیا ہے۔ دیکھو نظریۂ سلطنت جے کے بلنچلی۔ مقالہ ۵ باب ۲ ص ۳۲۸

کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ماضی و مستقبل کے مہلک امراض سے باخبر ہوچکا تھا۔ ان میں سے مدینہ کے سابق گورنر فخری پاشا (سفیر کبیر دولت ترکیہ) سردار معظم ہاشم خاں صدر اعظم افغانستان، سردار فیض محمد خاں وزیر خارجہ افغانستان، افغانستان کے سنوسی اعظم حضرت مولانا عبدالرازق صاحب قاضی القضاۃ و امیر المجاہدین جنگ وزیرستان، منیر بے مُشیر قانونی افغانستان (رکن اوّل سفارتِ ترکیہ) شوکت بے (رکن سفارت ترکیہ) مولانا سیف الرحمٰن صدر عدالت عالیہ تمیز (شاہی کونسل) کے اسمائے گرامی آسمان علم و سیاست کے منور ستاروں کی طرح آج بھی میرے مطلعِ قلب پر روشن ہیں۔

ان تمام برگزیدہ اصحاب کی شخصیتوں کا جو اثر ایک نوجوان دماغ پر پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ میں سیاسی حکمت عملی اور سیاسی عمل سے ناآشنا تھا۔ البتہ دنیا کے معاملات پر غور کرنے میں اپنا ایک خاص طرز رکھتا تھا۔ علمی دائرۂ فکر میں ایک علمی کام کا فیصلہ میرا پہلا کام تھا۔ اور اُس سے میرا دماغ فارغ ہوچکا تھا۔ ان حضرات سے بار بار ملاقات کا اتنا فائدہ ہوا کہ حکومت و سلطنت کے دستوری واجبات کی اہمیت دلنشین ہوگئی اور میرے دماغ میں دوسرے نظریوں کے لیے کوئی اہم جگہ نہ رہی۔ البتہ یہ امر ہر حالت میں قابل لحاظ ہے کہ اس سارے تسلسل میں مولانا منصور انصاری کی روزانہ کی حکیمانہ گفتگو اصل الاصول تھی۔ اجتماعی علم کے اس ایوان کا دروازہ جتنا صحیح تھا وہ بجائے خود ایک نمونہ تھا کیونکہ مولانائے محترم کے ہاتھ میں جو موتی تھا اس کو ۱۹۱۴ء ۱۳۳۳ھ سے لے کر ۱۹۲۳ء ۱۳۴۲ھ تک سیاسی طوفان کی دھار سے حاصل کیا گیا تھا۔

ممدوح اپنی نو سال کی جلاوطنی میں دنیا کے کئی بڑے انقلاب دیکھ چکے تھے اور متعدد انقلاب ایک سیاسی نتیجہ کے طور پر ان کے دماغ میں جاگزیں تھے۔

افغانستان کے سیاسی انقلاب ۱۹۱۹ء کی بنیاد ان کے سامنے رکھی گئی۔ بخارا، خیوہ کے انقلاب کے وقت وہ خود موجود تھے۔ روس کے دورِ انقلاب میں ان کا قیام تاشقند۔ ماسکو۔ باکو، طفلس میں رہا۔ ترکی کا انقلاب، خلافت کا سقوط، سمرنا کی فتح۔ جدید ترکی کا قیام اس وقت ہوا جب وہ افغانستان کے وزیرِ مختار کے قائم مقام کی حیثیت سے انگورہ میں بذاتِ خود قیام فرما تھے۔ انگورہ میں شیخ سنوسی کئی ماہ آپ کے مہمان رہے، اور انہوں نے طرابلس کے انقلابات کا مکمل نقشہ سمجھایا۔ علامہ عبدالعزیز چاویش بھی سفارت خانہ میں مہمان ہوئے اور انہوں نے مصر کے انقلابی محرکات اور تفصیلات کا تعارف کرایا۔

۱۹۱۳ء / ۱۳۳۲ھ میں جبکہ شریف حسین سلطنت عثمانیہ کے خلاف انقلاب کے پروگرام کو بروئے کار لانے والا تھا۔ اس وقت بھی مولانا کا قیام حجاز ہی میں تھا۔

ان انقلابات نے فکری میلانات کے لیے یکسوئی پیدا کر دی پہلے سے علم صحیح حاصل تھا۔ دنیا کی خاک چھاننا کوئی مستقل مقصد نہ تھا بلکہ ربانی مطمحِ نظر کے لیے جدوجہد کرنا اور دین کے لیے دنیا کے ہر عیش کو قربان کرنا عمر بھر کی جلاوطنی کا مقصد و منشا تھا، جو ان میلانات سے حاصل ہو گیا۔

ان تمام واقعات کے دوران میں آپ کی فطرت صحیح مطمحِ نظر سے قریب تر ہوتی گئی۔ اسلامی نصب العین قطعیت کے ساتھ دل و دماغ میں راسخ ہو گیا۔ ضمیر نے فیصلہ کیا کہ دنیائے اسلام کی یہ تمام ناکامی اجتماعیات سے علیحدگی، اسلامی قانون سے بے خبری اور اسلام کے صحیح نظامِ حکومت کی عدم موجودگی سے رونما ہے اور اب اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت مرتب کیا جائے۔ علمائے اسلام کو اس طرف دعوت دی جائے اور دنیا کے لیے اجتماعی تحقیقات کا ایک قدیم باب جدید عنوان سے پیش کیا جائے۔ اگر پہلے درجہ میں یہ کام اپنی اصلی صورت میں مکمل نہ ہو تو جو صورت ممکن ہو اس پر عمل کیا جائے۔ تکمیل

کے لیے دعوتِ عام پر اعتماد کیا جائے، اور اُس وقت کا انتظار کیا جائے جب فضلائے اُمت ماحول سے مجبور ہو کر اس آواز کو سُننے کے لیے تیار ہو جائیں۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب وہ کسی اہم نصب العین سے قریب ہو جاتا ہے۔ اس نصب العین کو اپنے لیے خاص کر لیتا ہے۔ پھر وہ سب سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور سب سے جُدا ہو کر اپنی راہ الگ بناتا ہے۔ جب مولانا کی زندگی میں وہ وقت آگیا تو اُنھوں نے حکومت کے دائرہ سے الگ ہو کر گھر کے گوشہ کو پسند کیا فطری حکومت کے طرز کی تحقیق کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ اور عملی زندگی کی جگہ تبلیغی زندگی کے حق میں فیصلہ دیا۔ اسی فیصلہ نے اسلام کے نظامِ حکومت کی ترتیب کے کام کو اصولی اہمیت دی اور اجتماعی فطرت کی بند راہ کو کھول دیا۔

اس تمام تفصیل سے میرے لیے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے۔ مجھے سب سے پہلے افغانستان کے زمانہ قیام میں "اسلامی حکومت" کا ایک ہلکا سا پرتو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ زندگی کے پانچ سال میری خوش قسمتی کے بہترین سال تھے۔ دنیائے اسلام کے اچھے اچھے دماغوں سے تعارف کا حاصل ہونا میرے لیے اہم بات تھی۔ اسلامی اجتماعیات کے غلط اور صحیح تصورات، ملے جلے مدرکات و میلانات، سُلجھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے خیالات اکثر گفتگو کا موضوع بن جاتے۔ پھر دل آزاد، دماغ آزاد، زبان آزاد، بڑی بات یہ کہ ماحول آزاد۔ بارہا علمی دائرہ میں علمی نظریے دلوں کی سطح سے زبان پر آئے اور نئے سرے سے دماغ پر اپنا مقام تیار کرتے رہے۔

امامتِ کبریٰ کی حقیقت، اسلامی نظامِ حکومت کا مفہوم۔ خلافتِ عظمیٰ کا مدعا، حکومتِ الٰہی کے معنی۔ اور عرشِ عظیم کی سلطنت کی ماہیت نے پہلے دن ایک لافانی عقیدہ کی شکل اختیار کی۔ اگرچہ یہ عقیدہ اسلامی عقیدہ کی ایک شاخ تھی مگر اُس نے پہلے ہی دن سے دل کی

گہرائی میں اپنی جڑ قائم کرلی۔

"امامت عظمیٰ" کے نظریۂ حکومت کی تحقیق اور دستورِ حکومت کی ترتیب یہی وہ اصول تھا جو کابل ہی میں میرے سینہ کی امانت بنا۔ اور یہی وہ اصول ہے جو اس کتاب کے قالب میں انسانی بصیرت کے سامنے ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت کا پہلا خاکہ

مولانا ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) میں حکومتِ الٰہی کے متعلق اسلام کے اساسی نظریات کو قلمبند کرچکے تھے۔ ابتدائی خاکہ چند صفحات پر منتشر تھا، یہ کل ذخیرہ چند اصولوں کی شکل میں تھا۔

(ا) حکومت ہر حیثیت سے آسمان و زمین کے باجبروت فرمانروا کا حق ہے۔

(ب) حکومت الٰہی کا تصور ایک ایسا قانونی تشخص رکھتا ہے جس میں انسان کی دستبرد کو کوئی دخل نہیں۔

(ج) حکومت قانون کی متحرک قوت کا نام ہے۔ قانونسازی (Legislation) حکومت کی مجرد خصوصیت ہے۔ اجرائے احکام کے کام کو غلطی سے حکومت سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ حکومت کا کام نہیں، حکومت کے ماتحت دفتر (سکرٹریٹ) کا کام ہے۔

(د) اسلام کا طرز حکومت آج کل کے ہر طرز حکومت سے جداگانہ اور ایک مستقل طرز ہے اپنی مخصوص مفہوم کے اعتبار سے نہ شاہی ہے نہ پارلیمانی نہ جمہوری ہے، نہ دکتاتوری (ڈکیٹٹرشپ) نہ اشتراکی ہے نہ وفاقی۔ تمام نظریوں کے عمدہ اور پسندیدہ اصول جن سے انسانیت عامہ کے تخلیقی اور عالمگیر مطمح نظر کو قوت حاصل ہو اس طرزِ حکومت کی اصل ہیں اور تمام خرابیاں جو موجودہ نظامہائے حکومت کے فساد کو ظاہر کرتی ہیں اس کے دائرہ سے خارج ہیں۔ وہ دنیا میں نیا ہی طرزِ حکومت ہے۔ جو ربانی مطمح نظر کی حیثیت سے تمام بلند پایہ نظریوں کا اعتدال ہے۔ صرف ذہنی اعتدال

نہیں بلکہ وہ اعتدال جو نصف صدی تک اپنے علمی آثار سے دنیا کو حیرت میں ڈال چکا ہے۔ اور جس میں امامت اور سیاسی رہنمائی کے اوصاف بھی بر وقت پیدا ہو جاتے ہیں۔

زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اسلام کے نظام حکومت کا جامع اور مختصر خاکہ فارسی زبان میں مرتب ہو گیا۔ یہ خاکہ ابتدا میں ایک تصور تھا۔ دوسرے درجہ میں مضمون کی صورت میں آیا تیسرے مرحلہ پر اس نے علماء کی رائے عامہ حاصل کرنے کے لیے ایک قانونی استفتاء کی شکل اختیار کی اور آخر میں ایک کتاب کی شکل میں آیا۔

حکومتِ الٰہی کا پہلا دستورِ اساسی

اسلام کے نظام حکومت کی ترتیب اور تیاری کی وہ تحریک جو ۱۹۲۳ء میں شروع کی گئی تھی، بنیادی طور پر یکم شعبان ۱۳۵۰ھ (۱۹ء) کو پوری ہو گئی۔ مجلس دستور اُمت بجنور کی طرف سے حکومت الٰہی کا پہلا[2] دستور حامل دفعات شائع کر دیا گیا۔ جس کے اجزا، حسب ذیل تھے:۔

(ا) "مقصد اشاعت" اجتماعیات کی راہ میں اصلاحی جہاد۔

(ب) آقائی فیض محمد خاں وزیر خارجہ دولتِ افغانستان کی تقریظ۔

(ج) اسباب تدوین

(د) بابِ تقنین۔ حکومت کے کاموں میں قانون سازی کا حصہ

(ھ) اسلامی سلطنت کے عناصر ترکیبی فرمانروا۔ قانون۔ صدر اعظم۔ حدود سلطنت۔

(و) قوت عاملہ (Execution) حکومت کے دائرہ میں احکام کو نافذ

[1] تصوری حیثیت (۱۹۲۳ء) میں مضمون کی حیثیت (۱۹۲۵ء) میں۔ کتاب استفتاء (۱۹۲۷ء ۱۳۴۶ھ) میں۔ [2] دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب نے سب سے پہلے اس دستور اساسی کی تعلیمی اہمیت کو محسوس کیا۔ مولوی عبد السلام قدوائی زبانی خطبات کی صورت میں اس کے دقیق مطالب کی تعلیم طلبائے ندوہ کو دیتے ہیں۔

کرنے والی قوت کا درجہ۔

(ز) امامتِ اُمت کے عناصر ترکیبی۔ اُمت یا قوم۔ اولوالامر یا ہیئت عاملہ

(ح) امام — یا مجلس حکومت کا لیڈر۔ قائد و رہنما۔

(ط) دارالاسلام — یا قلمروئے مملکت۔

(ی) دارالسلام — دارالسلطنت

(ک) سرکاری زبان

(ل) بیت المال — جمہور کا خزانہ

(م) باب حقوق۔ اسلامی حکومت میں شہریوں کے حقوق۔ حقوق عامہ مسلمانوں کے حقوق۔ غیر مسلموں کے حقوق۔ خارجی سیاست۔ معاہدات۔

اس دستور کی ترتیب میں دو خیال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ امامتِ امت کا یہ دستور اسلام کے مکمل نظام حکومت کی بنیاد ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اقدام اوّل درجہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ اور نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ترقی یافتہ اور متمدن دنیا کے تمام علماء کے لیے اسلامی اجتماعیات کے قلعہ کا جدید دروازہ وا کرتا ہے۔

ترتیب دستور کی دعوت مولانا نے اسلامی نظامِ حکومت کا ابتدائی خاکہ مرتب کرنے کے بعد اس کو مشرق و مغرب کے علماءِ سیاست کی رائے عامہ کے استصواب کے لیے پیش کیا[1]۔ آپ نے کابل۔ اور آزاد قبائلی مرکز ریاست باجوڑ (یاغستان) سے علماء اسلام کو اسلامی نظامِ حکومت کی ترتیب کی دعوت دی، اور پہلا دعوت نامہ ان الفاظ میں شائع کیا:۔

"دیکھنا یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے کیا نمونہ کامل پیش کیا ہے اپنی عمر اور مبارک عہد کو معمولی

---

[1] دستور اساسی امامت اُمت علامہ منصور (لوح ص۱) اسباب تدوین ص۲۔ طبع ۱۳۵۰ھ بجنور۔

باتوں اور انفرادیت پر صرف فرمایا ہے یا اپنے عدیم النظیر جہاد اور روح پرور تعلیم سے ایک معیاری اور کامل اُمت اور فرض شناس امامت (حکومت) کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔

فرائض اور وظائف کا ادا کرنا سب اٹل ہے۔ ان کے انکار سے کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا، پھر جزئیات کو اصل سے زیادہ اہم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے تنزل کا سانحہ اس سے شروع ہوتا ہے کہ اُمت کی ذمہ داری لا نرث ولا نورث کے علی الرغم شخصی وراثت (شہنشاہیت) کا لقمہ بن گئی۔ خدا کے حاکمانہ حق کو غصب کرنے والے شہنشاہوں نے علماء کے افکار کو جزئیات اعمال کی طرف اس طرح بزور دھکیل دیا کہ ان کو اب تک اجتماعی مسائل کی طرف رُخ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسی لیے مسلمانوں کا اجتماعی انحطاط رو بہ ترقی ہے۔ امت کے علماء حق اور بعض طبقے پارٹی بندی کی رو میں بہہ گئے۔ حالانکہ اصل دریافت طلب یہ امر تھا:-

اسلام میں حکومت و امامت کی اصلی تصویر کیا ہے۔ انارکی، یا شہنشاہیت؟ شہنشاہیت ہے تو وہ کون ہیں جنہیں خدا کے آزاد بندوں کا مالک بنایا جائے۔ یا کوئی اور جداگانہ صورت ہے۔

بہر حال اُمت کی موجودہ ذمہ داری یہ ہے کہ علم و تحقیق کے مکمل وسائل جمع کرنے کے بعد امامت امت (اسلامی حکومت) کا دستور اساسی مرتب کر دیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح پارلیمنٹری جمہوری، اشتراکی حکومتوں کے دستور مرتب ہو کر دنیا کے سامنے آچکے ہیں۔

میرے خیال میں اس طرح دستور اساسی کی طرف توجہ کرنے سے اُمت کے فضلاء کو یورپ کی قانونی تقلید سے نجات مل جائیگی۔"[1]

[1] یہ مکتوب اخبار مہاجر دیوبند میں طبع ہوا۔ دیکھو جلد ۲ نمبر ۲۱-۲۲، ۱۸ محرم ۱۳۴۷ھ، ۷ جولائی ۱۹۲۸ء۔ تاریخ نگارش مکتوب ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ۔ ریاست آزاد باجوڑ، علاقہ سرحد۔

اس کے بعد دوسرا دعوت نامہ شائع ہوا جس کے منتخب الفاظ یہ ہیں :-

"خدائی حکومت کا آخری دستور آخری عصر کے پیغمبرؐ کی معرفت انسانیت کے ہاتھ میں پہنچا۔ رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس دستور کو عملی مثال کی صورت میں اس دنیا میں قائم کر کے دکھایا۔ آپ کے بعد اُمت کے بہترین فرد صدیق اکبرؓ اور ان کے نائب اصحاب نے دنیا کے اعلیٰ ترین خطوں میں وسعت دے کر مشرق و مغرب میں اس کے اصولِ امتیاز کو روشن کیا۔ پھر حیرت ہے کہ جلد ہی یہ روشنی تاریکی سے بدل گئی۔ نام نہاد عالم اسلام نے بلکہ تمام دنیا نے کائنات کے پروردگار کی حکومت کے دستور کو عمل کے دائرہ میں تو کیا علم کے حلقۂ درس میں بھی نہیں دیکھا۔

اب اس دورِ ابتلا میں اُمت پر لازم ہے کہ دینِ اجتماعی کے اصول کو عہد بنی اُمیہ کی اجتماعی بدعات سے پاک کر کے قانونِ قرآن، قانونِ نبوت، قانونِ خلافت راشدہ کی روشنی میں مدون کر کے علم و عمل کے لیے کمربستہ ہو جائے، یہ اسلام کی اساسی ضرورت ہے۔ جمعیۃ علماء کے ترجمان اخبار الجمعیۃ نے "ملوکیت اور جمہوریت" کا عنوان قائم کر کے فضلائے اُمت کو دعوت دی مگر یہ سلسلہ بے نتیجہ ختم ہو گیا۔ مضمون نگاروں میں سے کسی صاحب نے حکومت شوریٰ کا اور مولانائے محترم سید سلیمان ندوی نے جمہوریت اسلامیہ کا عنوان قائم کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ حکومت جمہوریت ہے حالانکہ یہ نئی اصطلاح ہے اور جدید اختراع۔ اس کی ایجاد میں ہمارے علمائے اجتماعیات کا کوئی حصہ نہیں۔ میں نے اس نکتہ پر متوجہ بھی کیا مگر اخبار نے میری اصولی غرض پر غور نہیں فرمایا آج ہم اس عصرِ رُشد اور عہد اجتماعی میں اپنی حکومت کے صحیح نام کے استعمال پر بھی قادر نہیں ہیں"۔

مذہب وسیاست کی وحدت کی اساس پر اسلامی نظامِ حکومت کی ترتیب کی یہ دعوت وقت کی سیاسی فضا میں غائب ہوگئی۔ یہ ایک امانت تھی جس کو ۱۳۴۶ھ نے مستقبل کے سپرد کردیا۔ تعجب ہوتا ہے ـــ کہ اس مکتوب[1] کی بار بار کی دعوت پر ہندوستان کے ارباب علم و کمال کو غور کرنے کی فرصتِ قلیل بھی میسر نہ ہوئی۔ اسلام کے نظامِ حکومت کی ترتیب کی جو دعوت (۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء) میں دی گئی تھی اس کو مصروفیتوں کے حصار نے علمی قلعوں میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ بعض مرتبہ حالات کی مجبوریاں پوری قوم کی تقدیر بن جاتی ہیں۔ کیونکہ قوم کا دل بیمار ہوتا ہے اور دماغ مفلوج۔ کبھی کبھی انسانی بصیرت اپنے لیے ایک خاص دائرۂ کار مقرر کرلیتی ہے۔ اور اس کے لیے اس سے باہر آنا مشکل ہوجاتا ہے، وہ کبھی نہ کبھی اصل کی طرف رجوع ضرور کرتی ہے مگر کب؟ جبکہ سفینۂ تقدیر پوری طرح منجدھار میں پہنچ جاتا ہے" اسلام کے نظامِ حکومت" کے باب میں بھی ہماری کوتاہی سے یہی ہوکر رہا۔

اسلامی نظامِ حکومت اور افغانستان

یہ امر وجہ مسرت ہے کہ افغانستان نے ترتیبِ دستور کے مقصد عظیم کی اہمیت کو سمجھ لیا۔ جو ہندوستان کے وقتی جمود کا کسی حد تک کفارہ ثابت ہوا افغانستان کی صحافت کے ممتاز جرائد نیم رسمی اخبار روزنامہ اصلاح کابل اور ہفتہ وار اخبار انیس کابل نے اپنی بلند پایہ آرا، دستور کی موافقت میں شائع کیں۔ قانون مجلس اقوام کے افغان عالم ع۔ج آقائی سردار فیض محمد خاں وزیر امور خارجہ افغانستان نے اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کی[2]

"مولانا منصور انصاری کا مرتبہ دستور علم اجتماعی، قانون، اصول حکومت کے لیے بہترین رہنما ہے۔ جس پر ہماری سلطنت کے علماء نے آج تک توجہ نہیں کی۔ ہماری نگاہوں اور عصرِ حاضر

---

[1] مطبوعہ مکتوب کی مکمل اصل جس میں اسلام کے اجتماعی تصورات کا لطیف نقش موجود ہے محفوظ ہے۔ مصنف

[2] دستور اساسی امامت امت علامہ منصور دعکس تحریر فارسی جلالتمآب وزیر خارجہ افغانستان۔ ص ا

کے علماء کی نظروں سے جو چیز مستور تھی وہ بھی دستور ہے جس سے تازہ اُمیدیں حاصل ہوتی ہیں"

دستخط فیض محمد وزیر امور خارجہ ۲۸ جوزا ۱۳۰۹ سنہ (۲۰ محرم ۱۳۴۹ سنہ ھ) مطابق سنہ ۱۹۳۰ء

وزارتِ عدلیہ کے شارحینِ قانون کی علمی کونسل اور اعلیٰ شاہی عدالتی کونسل نے بھی اس طرف توجہ کی اور مرتبہ دستور کو اپنی دستاویز[1] ۴۹۵ سنہ ۱۳۵۱ھ کے ذریعہ سے منظور کیا اور تصدیقی سند صرف ایک لفظ سے اختلاف ظاہر کر کے دی۔

اس باب میں ہندوستان کی ابتدائی سرد مہری سے دستور کے مرتب پر جو اثر ہوا اُس کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے:-

"اگر میرے خیالات صحیح نہ ہوں تو علماءِ امت اس کی اصلاح فرمائیں اور اگر صحیح ہوں تو اُن کی تصدیق اور اجراء کا انتظام ہونا چاہیے۔ ناموں کے جا و بیجا استعمال سے ہمارا وظیفہ جو بے سے مقدم ہے پورا نہیں ہو سکتا۔ مجھے نہایت قلق ہے اگر اُمت پر کبھی اس کام کی اہمیت واضح ہوئی تو میری طرح اس کو بھی رنج ہوگا"

جائے شکر ہے کہ آج اس آواز نے اثر پیدا کیا۔ ملک کے مختلف حصّوں میں اسلام کے نظامِ حکومت کی ترتیب کے متعلق جو احساس نظر آرہا ہے وہ بہر حال مبارک اور بہر نوع لائق ستائش ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اسلامی ذہن دنیا کے دوسرے خاکوں کو سامنے رکھ کر اپنا خاکہ بنانے میں مصروف تھا مسلمانوں کے افکار ہوا کے رُخ پر ایک سمت جا رہے تھے۔ گذشتہ ربع صدی کا حاصل یہ ہے کہ ہم دوسروں کی مانگی ہوئی راہوں پر چل رہے تھے۔ ہمارے جسموں پر ایک اجنبی حکومت کا قبضہ تھا اور ذہنوں پر اجنبی نظریوں کا۔ عثمانیوں کی ملوکیت، ترقی پسند ترکوں

[1] یہ دستاویز راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

کی انجمن اتحاد و ترقی کی تحریک، جمہوریت کے نعرے، اشتراکیت کی شورشیں۔ آمریت کی مرعوبیت کے تمام دور اس امر کے شاہد ہیں کہ جو قوم اپنی راہ سے علیٰحدہ ہو جاتی ہے وہ ہر اُس راہ پر چل نکلتی ہے جو سامنے آجاتی ہے۔

صورتِ حال کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں حکومت کے میدان میں امامت اقوام کا تصور ناپید ہو چکا تھا۔ امامت سے صرف محراب امامت اور امام سے مسجد کے غریب پیش امام کے علاوہ حکومت کی رہنمائی اور حکومت کا صدر تصور میں آہی نہیں سکتا تھا۔ آج یہ حالت نہیں ہے۔ ہندوستان میں اسلامی نظام حکومت کی ترتیب کے لیے احساس کے بعد اقدام شروع ہو چکا ہے۔ یہ تعمیر اصل بنیاد پیدا کر چکی ہے۔ وقت کے تقاضوں نے اس تحریک کے سلسلہ میں جو ہنگامی رُخ پیدا کر دیا ہے اس میں ترتیب دستور کا خیال کارفرما ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریک کس کس طرح دلوں میں پہنچی، دماغوں میں داخل ہوئی اور جن لوگوں نے مسلمانوں کی قومیت سے اس کا تعلق قائم کیا ان کی زبان و قلم کو کہاں کہاں سے امداد حاصل ہوئی تاہم اگر اصل مقصد کو ہنگامی آوازوں کے جال سے علیٰحدہ کر کے دیکھا جائے تو ہندوستان میں اس سلسلہ کی کوششوں کے دو باب نمایاں ہیں۔

(۱) دارالمصنفین کے سابق فاضل رفیق مولانا سعید انصاری اور مولانا محمد میاں دیوبندی نے اُردو زبان میں اسلامی دستور کو روشناس کرایا۔

(۲) اس سلسلہ کی اولین مستند اور قیمتی کوشش جامعہ عثمانیہ کے اُستاذ سیاسیات پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم اے (آکسن)، بار ایٹ لا کا کتابچہ ہے جس کا نام قرآن کا نظریہ سلطنت ہے یہ مختصر رسالہ اسلاً انگریزی زبان میں ہے۔ مولانا سعید الحق عمادی بی اے نے اس کا اُردو ترجمہ کیا جو ۱۳۵۵ھ میں آج سے پانچ قبل شائع ہوا۔

ندوۃ المصنفین | آخر میں اسلام کے اجتماعی قوانین کی تدوین اور نظامِ حکومت کی ترتیب کے مسئلہ نے ندوۃ المصنفین سے ربط پیدا کیا یہ انسانی کوششوں کے لیے ایک خدا داد موقع تھا۔ اس تصنیفی ادارہ کے قیام میں چند در چند محرکات کا دخل تھا۔ برادرم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے جب اس عظیم کام کا افتتاح کیا تو اُسی وقت یہ امر ایک طے شدہ حقیقت کی صورت میں سامنے آگیا کہ اس ادارہ کا اساسی مقصد اسلام کے قانون و آئین کے مختلف پہلوؤں کو ترقی یافتہ اسلوب اور زمانۂ حال کے طرز پر پیش کرنا ہے۔ اسلام کے آئینی رجحانات کے ہر باب کو علیحدہ علیحدہ مرتب کرنا ایک یقینی فرض قرار دے دیا گیا۔ اور کام کی بنیاد مرحلۂ اول پر رکھ دی گئی۔

اسلامی نظامِ حکومت اور دستورِ اساسی، قانونِ مدنی، قانونِ جزاء و سزا (فوجداری) نظامِ تعلقاتِ خارجہ، قانونِ شریعت عامہ، دستورِ معاملات، ضابطۂ اخلاق و اعمال اور اسلامی فقہ کی قانونی جزئیات کی ترتیب و تدوین علیحدہ علیحدہ مستقل اور طے شدہ مقاصد تھے جن میں اسلام کے نظامِ حکومت کی ترتیب کا کام اُسی دن شروع کر دیا گیا جس دن ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ یہ کام کئی سال سے شخصی طور پر بے ضابطہ ہو رہا تھا، اب اس نے ایک باضابطہ شکل اختیار کر لی۔ خوش قسمتی سے ادارہ کے رفیق اعلیٰ مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمٰن نے اسلام کے اقتصادی عنوان کو علم و نظر کے لیے منتخب کیا۔ اس طرح "اسلام کا اقتصادی نظام" ایک فہمی اور بنیادی نقش کی صورت میں پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے آیا جس نے ندوۃ المصنفین کے تصنیفی رجحان کی غایت کو حکمتِ عملی کی صورت میں پیش کیا۔ اس کتاب نے ملک کے بلند پایہ علمی حلقوں اور بلند نظر علماء کو جس تیزی سے اپنی طرف متوجہ کیا اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ خداوند برتر کی مبارک مرضی ہمارے صادق عزائم کے سر پر سایہ فگن ہے اور مسلمان اسلام کے نظامِ حکومت کا مکمل خاکہ اپنے ہاتھوں میں لینے اور اس کو اپنے دل و دماغ کا سرمایہ بنانے کے لیے تیار ہیں۔

یہ خدائے تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے اپنی اصل رہنمائی سے اسلامی اجتماعیات کے بند دروازے اپنے ایک بندے کے دل پر کھولے۔ ابتداء میں انفرادی تحقیق نے نظریات کی صورت اختیار کی عمیق توجہ سے ان نظریات کے لیے قرآن وسنت اور آثار سے تائید حاصل ہوئی اس مرحلہ پر میں اُس توجہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کا اظہار کتاب کی ترتیب کے دوران میں رفیق محترم ابوالقاسم مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری اور برادر معظم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین کی طرف سے برابر ہوتا رہا ہے۔ کسی علمی کام کے لیے علمی دائرہ میں علمی طرز پر ذی علم رفقا کا التفات ایک ایسی شئے ہے جس پر خدا کی عطا کردہ توفیق کے بعد سب سے زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کو ذمہ داریوں کا جو احساس قدرت کی طرف سے ملا ہے اس نے اس کتاب کی تیاری میں مجھ سے پورا تعاون کیا۔ انہوں نے اس خدمت کی عظمت کو پوری طرح محسوس کیا اور مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں اس امانت سے عہدہ برآ ہوسکوں جس کو میرے قلب نے سالہا سال قبل قبول کیا تھا۔

تدوین دستور کے لیے موزوں وقت

مندرجۂ بالا تفصیلات کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کا ایک نتیجہ؟ اور ایک قطعی نتیجہ! یہ کتاب ہے۔ اس حیرت انگیز تاریخی دور میں، اجتماعیات کے اس عقلی زمانہ میں جب کہ حقائق کے عشق پر عقل کے مادی قوی کا مکمل غلبہ ہوچکا ہے۔ اسلام کے نظام حکومت کی ترتیب کا ذمہ لینا غیر معمولی جرأت کے ساتھ زمانہ کے ناموافق ہاتھ سے ہاتھ ملانا ہے بصارت کے اس دور میں بصیرت کا پیغام دینا بڑی جسارت کا کام ہے۔ آن دیکھے خدا کو ماننا انسانیت کے ایمان کی اصل تھی اب یہ حال ہے کہ نگاہیں چشموں کی امداد کے بغیر ایک فٹ کے فاصلہ کے حروف نہیں دیکھ سکتیں مگر دعویٰ یہ کہ آنکھ سے دیکھے بغیر مافوق الادراک خدا کو کیسے مان لیا جائے

کبھی کبھی عقل کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ہر انسان عقل کے کانٹے میں ربانی معتقدات کو تولنا چاہتا ہے اور اپنی عقل کو نوشیرواں کی میزانِ عدل سمجھتا ہے۔ اگر عقل کے عکس ریز کی امداد کے باوجود نفس انسانی کی قطعی کیفیات کا علم کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک عقل ایک ایجاد کو وجود میں لے آتی ہے تو دو ارب سے زائد انسانوں کا وجدان تعقلی اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ذہنی نارکی اور فکری اشتراکیت کا یہ لاجواب اور بے دلیل دور مشکل ہی سے ایسی تصانیف کا تحمل کر سکتا ہے۔ البتہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کے اصول پر اس پیچیدگی کے ساتھ ایک سہولت بھی ہے۔ نئے تمدن کی نمائش کے جو دن مقرر تھے پورے ہو چکے ہیں۔ اب یہ نمائش ختم ہو رہی ہے اور اس کی زرق برق دوکانیں اُٹھ رہی ہیں۔ اس نمائش کے پس منظر پر جو تماشے جلوہ دکھا رہے تھے وہ بھی صبح ہونے سے پہلے اپنے ہر نقش کو مٹا رہے ہیں۔ نیا نظام قائم ہو یا نہ ہو، پُرانا نظام بیلی مٹی کے برتن کی طرح نئی برسات کی پہلی بوند پڑتے ہی مشتِ خاک ہو کر ہوا کے طوفان میں اُڑ گیا۔ ترقی کی رفتار تیز تھی تو تنزل کی رفتار تیز تر نکلی۔

بالڈون نے انگلستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کہا تھا "آئندہ جنگ یورپین قوموں ہی کو نہیں یورپین تمدن کو ختم کر کے رہیگی" یہ تمدن ستمبر ۱۹۳۹ء میں اُسی روز ختم ہو گیا تھا جس روز لندن کا پہلا گولہ برلن پر اور برلن کا پہلا گولہ لندن پر اتنی تیزی سے گرا کہ موت کو عورتوں، بچوں اور بوڑھوں میں بھی تمیز کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ یورپ کے مغرور نظامِ حکومت کی گردن ٹوٹ رہی ہے۔ اس کی روح کمزور، قالب مضمحل اور دل و دماغ خراب ہو چکا ہے۔ اس کے جسم پر مردنی کے جو آثار ہیں اُن کو کوئی نو ایجاد لباس بھی نہیں چھپا سکتا۔ اجتماعی غلامی، سیاسی چھوت چھات مالی دستبرد، اقوام و ممالک کی تفریق، جارحانہ وطنیت، طبقاتی اونچ نیچ، اخلاقی نفاق، جھوٹ کی اشاعت اس ساری عمارت کے ستون تھے۔ اسلام نے ان ستونوں کو تیرہ سو سال پہلے

توڑ کر انسانیت عامہ کے لیے نیا ایوان بنایا تھا۔ یورپ نے تعصب سے کام لے کر اس کو ڈھا دیا اور علم و عقل کی قوت سے جاہلیت کے دورِ حکومت کے تمام اوصاف کو جمع کر کے حکومت شروع کی تین سو سال کی قلیل مدت میں اس حکومت کا قصرِ بلند زمیں بوس ہو رہا ہے، اب اب پھر وقت آیا ہے کہ انسانیت کے تباہ حال رہنماؤں کو انسانیت عامہ کے اسلامی مطمحِ نظر کی طرف دعوت دی جائے۔

اسلام کا نظامِ حکومت انسان کے اجتماعی نظم پر مبنی ہے۔ اس کے اعلان و اظہار کے لیے اس زمانہ سے بہتر دوسرا زمانہ نہیں آئیگا۔ ایشیا نے یورپ کو مذہب عطا کیا تھا اب اس کو حکومت کا طرز اور سلیقہ بھی عطا کرنا چاہیے۔ اگر یورپ کے علم، صناعی، سائنس، اور عقلی عروج کو اسلام کے ربانی نصب العین کے ماتحت کر دیا گیا تو یہ عالمگیر امن عالمگیر مساوات، عالمگیر آزادی اور عالمگیر حکومت کا پہلا دن ہوگا جس پر انسانی تاریخ ناز کریگی۔

مناسب طریق کار اس اہم مقصد کے لیے حکومت کا دستور مرتب کرنا ایک انسان کا کام نہیں جماعت کا کام ہے، جماعت بھی وہ جو اسی فرض سے بالکل وابستہ ہو جائے۔ اس ذمہ داری کو نصب العین قرار دے کر دائرہ کار میں داخل ہو۔ اس کے ارکان مدتوں یکجا رہیں۔ ایک کتب خانہ کو اپنے لیے مرکز فکر تصور کریں۔ اسلامی آثار اور اسلام کے مستند علما اجتماعیات کی کتابوں کا مطالعہ خاص اسی نقطۂ نگاہ سے کریں۔ ہر مطالعہ کے بعد اپنے افکار کو سمیٹیں۔ باہم ملیں، مل کر مسلسل بحث کر کے علم و تحقیق کی قوت سے ایک قطعی راہ پیدا کریں۔ جو نظریہ ثابت ہو جائے اُس کو لکھ لیا جائے جب تمام نظریات گہرائی کے موتی کی طرح سطح پر آجائیں تو اُن کو اس سلیقہ سے جمع کر دیا جائے کہ اگر اس مجموعہ کو دنیا کی ترقی یافتہ غیر مسلم اقوام کے دل پر اُتار دیا جائے تو اُن میں سے ہر ایک اس کو اپنے دل کی امانت تصور کر سکے۔ اس کام کے لیے عظیم سرمایہ، زبردست محنت، محکم عزم، مسلسل

مصروفیت، سازگار ماحول اور مکمل وقت کی ضرورت ہے۔ میری روح ۱۹۲۳ء سے اس وقت کی منتظر ہے۔ جب تک ہماری ان ضرورتوں کا شیرازہ پریشان ہے۔ ہمیں اس وقت سے پہلے ان تمام کوششوں سے واسطہ رکھنا پڑیگا جو اسلام کے عظیم الشان اجتماعی سرمایہ کے مدفون خزانہ کو بے خبری کی تہ سے علم وتحقیق کی سطح پر لا رہی ہیں۔

پیش نظر کتاب اسی سلسلہ کی مضبوط کڑی ہے، اس کی ترتیب میں خدا کی زبردست تائید کا حقیقی حصہ ہے۔ اس کے بعد سالہا سال کے مضبوط عقیدے، مدتوں کے سیاسی اور اجتماعی ذوق۔ ابتدا کی صحیح رہنمائی اور انتہا کی بیحد وبہایت مصروفیت کا بڑا دخل ہے کتنے دن تھے کہ راتوں سے جا ملے اور کتنی راتیں تھیں کہ صبح کی سرحد میں داخل ہو کر ختم ہوئیں۔ جاگتے ہوئے کتابوں کے ذخیرہ نے فرصت نہ دی اور سوتے ہوئے دل ودماغ کی بیداری سے مہلتِ خواب میسر نہ ہوئی۔ ضرورت تھی کہ یہ عظیم مقصد روح کی پوری توجہ کو جذب کرلے۔ اس ضرورت کے لیے ان تمام میلانات کو چھوڑا جن کا تعلق سیاسیات سے تھا۔ اس سے زیادہ شخصی زندگی کا جو عنصر مانع آیا خواہ وہ کتنا ہی عزیز تھا مگر اس سے بھی کنارہ کشی کو حق ترجیح حاصل ہوا۔ اس تمام تفصیل کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب میں بہت کچھ ہے مگر ابھی اس میں اور بہت کچھ شامل ہو سکتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اس موضوع پر اس قسم کی کوئی کتاب آج تک اس طرز پر نہیں لکھی گئی۔

چونکہ اس کتاب میں اسلامی نظامِ حکومت کے تمام عناصر اور آئین مملکت کا مکمل خاکہ موجود ہے اس لیے اگر اس کو ایک مکمل عمارت قرار دیا جائے تب بھی یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تعمیر کی وضع وساخت میں ترقی کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ اس کتاب میں مستند معلومات کا جو ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے اور اس سے جو نتائج پیدا کیے گئے ہیں وہ آنے والے دور کے مصنفین اور علماء قانون کے تصنیفی کام کے لیے ماخذ قرار پاسکینگے۔

حکومت کا مفہوم

دنیا میں سب سے بڑی قوت مذہب ہے، اور اس کے بعد حکومت، حکومت کا لفظ زبان پر آتا ہے تو سب سے پہلے اپنی عظمت کی حکایت بیان کرتا ہے۔ کانوں پر اس کا سنگین اثر پڑتا ہے، دل اس کے رعب کو محسوس کرتا ہے۔ دماغ پر اس کا دباؤ پڑتا ہے اور مغرور عقل بھی تھوڑی دیر کے لیے اس کی قیدی نظر آتی ہے۔ حکومت اپنے دائرۂ عمل میں کتنی عظیم الشان اور حیرت انگیز چیز ہے؟ اس کو ظاہر کرنے کے لیے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کی نظر میں جس قوم کے پاس حکومت ہے اُس کے پاس سب کچھ ہے اور جس کے پاس حکومت نہیں اُس کے پاس اول تو کچھ ہے ہی نہیں، اگر کچھ ہے بھی تو برائے نام!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی بنیادی تعریف اور اُس کا مفہوم کیا ہے؟ جہاں تک انسانی نظریہ کا تعلق ہے پانچویں صدی (سنہ ۵۰۰) قبل مسیح کے یونانی مقننین اور چوتھی صدی قبل مسیح (سنہ ۲۰۰ ق م)[1] کے رومی علماء قانون کے زمانہ سے لے کر آج تک تمام فلاسفہ (فلاسفر) حکومت کے طور طریقوں کے متعلق ہم آہنگ نہیں ہیں۔ البتہ حکومت کے اس نام نہاد اصل مفہوم پر سب کا اتفاق ہے کہ "وہ ایک ایسی ہیئت حاکمہ کی شکل میں رونما

---

[1] سنہ ۳۰۰ ق م - ابن کثیر ج ۶ ص ۱۶۷ -

ہوتی ہے جس کی تنظیم انسانی افراد کی اجتماعی تصویر اور تدبیر سے ہوتی ہے یعنی جہانبانی اور جہانداری کا وہ عزم جو زمین کے کسی مخصوص حصہ میں ایک ہیئت حاکمہ اختیار کر لیتا ہے اور اس ہیئت میں اس کا اختیار و اقتدار پورا پورا کام کرتا ہے[1]"

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر سیاسی اور اجتماعی ہیئت کی ایک غرض ہوتی ہے جو اس کے کاموں اور کارناموں کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ یہ غایت ماحول کے تقاضوں، نیک ارادوں اور سچی اُمیدوں کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتی ہے۔ خواہ اس غایت کا ظہور کتنی ہی سادہ صورت میں کیوں نہ ہو اس کے ادراک اور متعین صورت میں محسوس کرنے کے لیے ایسے مسلسل کاموں اور پیہم کوششوں کا وجود میں آنا ضروری ہے جو بلند فراست اور صحیح تدبر کا نتیجہ ہوں۔ سیاستدان اور سیاست کار اصحاب کی وہ جماعت جو انسانی ہیئت کی غرض و غایت کا صحیح ادراک کر سکتی ہے، تمام کاموں کو ایک دائرہ پر حرکت دے سکتی ہے۔ اور جو اپنے تدبر کو اس طرح بروئے کار لا سکتی ہے کہ اس کی کاوش سے اجتماعی ہیئت بن جائے۔ ہماری سیاست کی اصطلاح میں اسی کوشش و کاوش کو جس کا مصدر ارادہ ہے حکومت کہتے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے حکومت کا سرچشمہ حکم ہے۔ جو جماعت حکم کے منبع سے سیراب ہوتی ہے وہ حکومت ہے[2]۔ یا وہ طاقت جس کے ارادہ اور کلام سے انسانی سیاست کی اجتماعی مشین چلتی ہے۔

دنیاوی حکومت کی تعبیر اور تشریح کے متعلق علمار قانون کی رائے ایک نہیں ہے۔

(۱) **افلاطون** کہتا ہے "حکومت کی اصل خوبی یہ ہے کہ اُس کے دائرہ میں قوم کے ہر فرد کو وہ درجہ حاصل ہو جس کا وہ مستحق ہے اور جس کے ماتحت اس کی استعداد منظر عام پر آسکے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۱ ص ۹ دیکھو "گورنمنٹ"۔ نظریہ سلطنت۔ جے کے بلنچلی۔ باب اوّل ص ۱۳۔۱۴۔
دائرۃ المعارف (فرید وجدی) ج ۳ ص ۴۷۳۔ "الحکومۃ"

[2] دائرۃ المعارف۔ پطرس بستانی (لفظ حکومۃ) ج ۷ ص ۱۳۲۔

قوم کا ہر فرد ایک احتیاج رکھتا ہے۔ حکومت کی ذمہ داری یہ ہے وہ اُس کو پورا کرے[1]۔

احمد امین افلاطون کی اس رائے کی پیشبندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حکومت قانون اور نظم کی وہ اعلیٰ ہیئت ہے جو قوم کے ہر ہر فرد کی ذاتی ترقی کے لیے مرکز اور منشا بنتی ہے اور ایک آسان وسیلہ کی حیثیت اختیار کر کے قوم کے تمام طبقوں کی طبعی استعداد کے سدھار کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے جس حکومت میں قوم کے ہر شخص کو اس کا حق ملجاتا ہے تو وہ ایک متوازن سوسائٹی کے قیام کا موجب بن جاتی ہے[2]"

(۲) ارسطو نے حکومت اور متعلقات حکومت کو ایک خاص حکیمانہ ترتیب سے بیان کیا ہے: "دنیا ایک باغ ہے، حکومت اُس کا باغبان۔ حکومت ایک طاقت ہے اور قانون اس کے بل پر زندہ رہتا ہے۔ قانون ایک سیاست ہے حکمراں اس کو چلاتا ہے۔ حکمراں ایک نظام ہے، فوج اُس کی قوت بنتی ہے فوج مددگار ہے اور مال فوج کی امداد کرتا ہے۔ مال ایک سرمایہ ہے جس کو عام رعایا جمع کرتی ہے۔ رعیت زبردست غلام ہے جو انصاف کے سایہ میں رہتی ہے۔ انصاف ایک جوہر ہے جس سے دنیا کا نظام قائم ہے[3]۔ ارسطو کی نظر میں عقل کی بہترین ایجاد بہترین حکومت ہے[4]۔

(۳) ابن خلدون کی نظر میں ملک زندگی کا طبعی مرکز ہے۔ جہاں انسانی ضرورتوں نے قدرتی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ انسان عادۃً اقتدار پسند ہے۔ حکومت انسان کی اُس حیوانی قوت کا اثر ہے جس کا رجحان غلبہ کی طرف رہتا ہے اور جو انسان کے نفس کے اندر بجائے خود موجود ہے[5]

---

[1] کتاب الاخلاق احمد امین مصری ص ۲۸۴ [2] ایضاً ص ۲۸۳۔

[3] کتاب السیاستہ ارسطو۔ (بحوالہ) دائرۃ المعارف پطرس بستانی لفظ السیاستہ ج ۱۰ ص ۲۷۴ (مطبوعہ مصر ۱۸۹۸ء)

[4] حوالہ بالا ج ۳ ص ۱۸۰ (ارسطو)

[5] کتاب العبر ابن خلدون (۱۳۲۴ھ) ف امامۃ وخلافۃ ص ۱۳۳

تاریخ میں حکمائے اسلام کی ایک مستقل جماعت ایسی پائی جاتی ہے جو حکومت کی حقیقت اور اصل مفہوم پر قانونی انداز میں روشنی ڈالتی ہے، ان کے نظریوں کا ذکر اسلام کے حکومتی رجحان کے ماتحت آئیگا۔ یہاں صرف ایک رائے کا پیش کر دینا کافی ہے، یہ رائے ایک مستقل اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ موجودہ دور کے تمام ترقی یافتہ نظریوں سے بہت پہلے فلسفۂ قانون کے ایک مسلمان عالم نے اس کو پیش کیا ہے۔

علامہ ابو البقا، جو گیارہویں صدی ہجری میں امام ابو حنیفہ کے قانونی طبقہ کے ایک ممتاز رکن اور قانونی اصطلاحات کے مانے ہوئے شارح قرار دیے گئے ہیں حکومت کی بنیادی تعریف لغت کی امداد سے ان الفاظ میں کرتے ہیں[1]

"حکم اور امتناعِ حکم کی صورت میں ایک ایسا تصرف جس کا مقصد و منشا اصلاح ہو"

اس تعریف کی رو سے حکومت اور حکومت کے فعل کا فرق صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ ایک تنظیمی ہیئت یا ایک مرکز قوم کو کہتا ہے۔ ایسا کرنا چاہیے اور ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اس مرکز کا وہ اصلاحی ارادہ یا حکمتِ ارادی جس کا تصرف امر و نہی کی صورت میں صادر ہو رہا ہے حکومت ہی یا حکومت کی اصل اور جو باتیں اس تصرف کے نتیجہ میں بروئے کار آ رہی ہیں وہ حکومت کا فعل ہے یا اس کی حکمت عملی۔

عصرِ جدید کے سرکردہ علمائے قانون اور فلاسفہ میں ژان ژاک روسو اپنی فکر کے اعتبار سے ابن خلدون اور ابی البقاء کی تصریح سے قریب ہے اور پستالوزی ابن خلدون کے نظریہ کا مقلد نظر آتا ہے۔

[1] کلیات ابی البقاء ص ۲۸۰ مطبوعہ علمی ۱۲۸۶ھ یہ کتاب اسلامی قانون کے اصطلاحی الفاظ کی مستند کتاب ہے۔ اس کا نام کلیات العلوم بھی ہے۔ موجودہ دور میں انسائیکلوپیڈیا کا لفظ جس مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اسلامی عہد میں اس کے لیے کلیات العلوم کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ ابو البقاء الحسینی الکفوی (م ۱۰۹۵ھ)

روسو[1] کا نظریہ۔ روسو کے نزدیک سلطنت کی بنا معاشرہ پر ہے۔ ایک مجتمعہ گروہ یا شہریوں کی تعداد کثیر جو ایک سلطنت کے قیام کے لیے باہم متفق ہو گئے ہوں، مملکت کی اعلیٰ طاقت کا مظہر ہے۔ اور حکومت کی بنیاد[2]۔ روسو یہ بھی کہتا ہے کہ ہر آزاد فعل کی طرح حکومت کا صدور دو اسباب سے ہوتا ہے۔ ارادہ سے اور قوت سے

(۱) وہ ارادہ جو حکومت کا تعین کرتا ہے۔

(۲) وہ قوت جو حکومت کے وجود کو عمل میں لاتی ہے۔

ارادہ کیا ہے ——— قانونسازی کا اختیار۔ قوت کیا ہے ——— عاملانہ اختیار۔ حکومت ان دونوں چیزوں کی باہمی ترکیب سے بنتی ہے۔ اگر سوال کیا جائے حکومت کا اصل مفہوم کیا ہے تو کہا جائیگا ——— ملکی قوت کے لیے ایک موزوں عامل۔ ایک کارفرما ہیئت جو قوت کو ایک مرکز پر لا کر ارادۂ اجتماعی کے مطابق استعمال کرے سلطنت اور فرمانروا کے درمیان واسطہ کا کام دے۔ سیاسی ہیئت میں وہ بات پیدا کر دے جو انسان میں روح اور جسم کے اتحاد سے پیدا ہوتی ہے۔ مملکت کے اندر حکومت کا اصلی کام یہی ہوتا ہے جسے غلطی سے فرمانروا کا کام سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ حکومت فرمانروا نہیں ہے، بلکہ فرمانروا کا عامل اور کارندہ ہے[3]"

پستالوزی کا نظریہ پستالوزی حکومت کے کاروبار سے کچھ مایوس ہے۔ اس کا خیال ہے کہ[4]

حکومت اور فرد کا تعلق بالکل ایک حیوانی تعلق ہے۔ فرد اپنے آپ کو حکومت کے تحت اس لیے نہیں لاتا کہ وہ ایک اخلاقی فریضہ ہے یا خدا کے احکام انجام دینا چاہتا ہے بلکہ حکومت کی اطاعت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرے۔ اور اپنے دن چین سے گذارے

---

[1] ژان ژاک روسو (Rousseau) (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) علامہ ابن خلدون اور روسو کے نظریہ کی یکسانیت کے لیے دیکھو مقدمہ کتاب العبر ص ۲۵ فصل ۲ ص ۱۵۸ مطبوعہ مصر۔ نظریہ سلطنت مغلی۔ مقالہ دوم باب چہارم ص ۱۰۱۔
[2] معاہدۂ عمرانی روسو (جامعہ) ص ۱۲۰ تا ۱۹۹۔ [4] پستالوزی مصنفہ ڈاکٹر عبدالحمید ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (جامعہ) باب ۲ ص ۱۰۶

مواقع پر قرون وسطیٰ اور موجودہ عہد کے درمیان اسلام کے سیاسی دور کے جو نقوش موجود ہیں۔ اُن کو درمیان سے نکال دیا جائے۔ اور دوسری کوشش یہ کی گئی کہ انسانی نظریۂ حکومت کو بحث کا اصل موضوع قرار دے کر علم و تحقیق کے لیے چھانٹ لیا گیا اور مذہبی تصورِ حکومت کو ضمنی حیثیت دے کر اعتراضات کی فرودگاہ بنایا گیا۔ اور معمولی انداز میں ذکر کرنے کے بعد نظر انداز کر دیا گیا۔

علامہ ابن خلدون[1] ہمارے علماء اجتماعیات میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے دونوں نظریوں کا جائزہ لے کر آج سے پانچ سو سال قبل ربانی نظریہ کے سر اقتدار کو اونچا کیا ہے۔

علامۂ محترم اپنی مشہور تاریخ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

" انسانوں[2] کی لازمی اجتماعی ہیئت حکومت کی حقیقت ہے۔ اس کا مطمحِ نظر غلبہ اور قہر جبر اور تشدد ہے۔ یہ دونوں رُخ انسان کی غضبناک فطرت اور حیوانی سرشت سے تعلق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان صفات کی موجودگی میں ایک حکمراں اکثر و بیشتر حق سے دور ہو جاتا ہے فرمانروا کا ماتحتوں کے معاملات، مطالبات، اُمیدوں اور خواہشوں میں دخیل کار ہونا، مقاصد میں اختلافی صورتوں کا ظہور میں آنا۔ رعایا کا وفاداری کے قانون کی اطاعت سے انکار کر دینا، پارٹیوں کا پیدا ہونا، جماعتی خود غرضی کا ظاہر ہونا، اور خونی انقلاب کے لیے آمادہ ہو جانا یہ سب ایسے امکانات ہیں جو حکومت کی سرگرمیوں سے زیادہ دور نہیں رہتے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں سے قانونِ حکومت کا عمل شروع ہوتا ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو حکومت اپنے استحکام کو قائم نہیں رکھ سکیگی۔ حکومت کی قانون سازی کا یہ کام اگر عقل انسانی انجام دیتی ہے تو حکومت عقلی سیاست کے ماتحت قائم ہوتی ہے اور اگر اللہ کی جانب سے کسی ایسے شخص کی معرفت فرض کی شکل میں

---

[1] ابن خلدون ۷۳۲ھ، ۸۰۸ھ (۱۳۳۲ء، ۱۴۰۲ء) [2] مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون فصل ۲۵ (خلافت و امامت) ص ۱۵۸

حکومت کی پہلی تقسیم

دینی حکومت ـــــ دنیاوی حکومت

حکومت کی اولین تقسیم دو مستقل نظریوں پر مبنی ہے۔ نظریۂ دینی اور نظریۂ دنیاوی۔ ان دونوں نظریوں کا نام نظریۂ ربانی ـــ اور ـــ نظریہ انسانی بھی ہو سکتا ہے۔

نظریۂ دینی وہ مثالی حکومت جو قانون سازی اجرائے قوانین اور نفاذ احکام کے دائرہ میں انسانیت عامہ کے فطری عقلی اور اخلاقی رجحانات کے عین مطابق ہو۔ مذہب کے قانون اور خالق و مخلوق کے ضوابط اجتماعی۔ سے متاثر ہو ایک بلند اور برتر وجود کے ما فوق الادراک آئینی اقتدار، قانونی بالا دستی اور حق قانون سازی کا زندگی کے ہر ہر شعبہ میں اعتراف کرتی ہو۔ اپنے تمام سیاسی افکار و اعمال میں مذہب کی حاکمیت کو ایمان و یقین کا معیار قرار دیتی ہو نظریۂ نبوت آخرت پر ایمان رکھتی ہو ـــ مادی عناصر کے لیے روحانی عوامل کو بشریت کی اصلاح اور ترقی کا واحد ذریعہ تصور کرتی ہو، اور سب سے پہلے اور سب سے آخر۔ اللہ کو کارخانۂ عالم اور کائنات کے اجتماعی نظام کا موجد اور اُس کے طاقتور ارادہ کو متصرف سمجھتی ہو ـــ ایسی حکومت کا ظہور جہاں کہیں ہو اور جب کبھی ہو اس کو نظریۂ دینی اور نظریۂ ربانی کی حکومت قرار دیا جائیگا۔ ایسی حکومت تاریخ ماضی کے صفحات پر نظر آئے۔ حال کی سطح پر پیدا ہو، مستقبل کی دوربین میں نظر آئے اس کو دینی اور ربانی حکومت کے نام سے پکارا جائیگا۔

نظریہ دنیاوی وہ حکومت جو اپنی وضع و ساخت میں خدائی پیغام کی برکت سے محروم ہو جس کے قوانین، ضوابط اور احکام کے بنانے اور بگاڑنے میں تنہا اور تنہا انسان کے دماغی پندار اور عقلی غرور کا دخل ہو، جو دنیا میں ہوا کے رُخ پر بگڑی ہوئی گھڑی کے پنڈولم کی طرح کبھی اِدھر، کبھی اُدھر

حرکت کرے کبھی آہستہ کبھی تیز، کبھی متحرک اور کبھی ساکن ہو۔ جو دنیا داری کے خالص مادی حوائج پر مبنی ہو۔ جس کا مدار نفس کی آزاد خواہشیں ہوں۔ ظلوم وجہول انسان کے بے مہار ارادے، بے فیض اعمال اور بے قید علوم وفنون ہوں ایسی حکومت دنیاوی طرز کی حکومت ہوگی جس کو انسانی حکومت کا خطاب دینا بھی صحیح ہے۔

مختصر یہ کہ حکومت، اگر دین کی ازلی اور ابدی صداقتوں کے ماتحت ہو تو دینی ہے اور اگر صرف دنیا داری کے سبب ہو تو دنیاوی ہے۔ حکومت کا سب سے بڑا کام انسانیت عامہ کی اصلاح ہے۔ اگر یہ کام مذہب کی اصلاحی حکمت عملی کے ماتحت ہو تو حکومت دینی ہوگی اور اگر اس کا دعویٰ دنیاداری کے آزاد طریقوں کے ماتحت کیا جائے اور مقصد دنیا داری کے علاوہ اور کچھ نہ ہو تو حکومت دنیاوی ہوگی۔

اگر دریافت کیا جائے کہ دونوں نظریوں کا سرمایۂ امتیاز کیا ہے تو کہا جائے کہ جو باتیں مذہبی حکومت کے آئینہ میں جوہر کی طرح جھلکتی ہیں دنیاوی حکومت میں ان کا نظر آنا دشوار ہے اور جو نمائشی طور طریقے دنیاوی حکومت کے دلآویز جسم کو آراستہ کر کے اہل دنیا کی ظاہر بیں نگاہوں کو وقتی طور پر مسحور کرتے ہیں مذہبی حکومت کا دامن ان سے پاک صاف رہتا ہے۔

ہمارے علمائے اجتماع اور یورپ کے علمائے سیاست[1] دونوں اس تقسیم کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے علماء نے اسلام کے نظامِ حکومت کو تفصیلی موشگافیوں سے اسی طرح دور رکھا ہے جس طرح اسلام ہر قسم کی پیچیدگیوں سے دور رہا ہے تاہم اوّل اوّل دوسری تیسری صدی ہجری میں ان کا قاعدہ یہ رہا ہے کہ وہ امارت وامامت کے اصولی تصورات اور متعلقات کو احادیث کی امداد سے جمع کر دیتے تھے۔ اس دور کی نمایاں مثال امام ابو عبید کی تصنیف ہے جس میں امارت کی

---

[1] نظریۂ سلطنت شبلی۔ م ۴ ب ۴ ص ۳۵۶۔

احادیث کے بعد اسلام کی مالیات عامہ کے مختلف پہلوؤں کو تیسری صدی میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے دور میں حکومت اور اخلاق کے قوانین اور جزئیات کو جمع کر دیا جاتا تھا اور کبھی کبھی تاریخ کے واقعات بھی اس کے ساتھ شامل کر دیے جاتے تھے۔ علامہ ابوالحسن ماوردی کے اجتماعی اور سیاسی آثار۔ امام ابوالحسن راغب اصفہانی کے نظریات اور علامہ ابن خلدون کی تمدنی تحقیقات اسی سلسلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

ہمارے علماء کا قاعدہ یہ رہا ہے کہ وہ اصولاً دینی تصور حکومت سے بحث کرتے ہیں اور ضمنی طور پر دنیاوی حکومت کا نام لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبی حکومت اصلی اور حقیقی شئے ہے اور دنیاوی حکومت اس کی بگڑی ہوئی تصویر۔ ربانی حکومت ایک اصلاح ہے اور انسانی حکومت اس کی خرابی۔ ربانی حکومت ہمیشہ فرد کی اصلاح اور جماعت (سوسائٹی) کی ترقی پر متوجہ رہتی ہے۔ انسانی حکومت اس نیک کام کو برباد کرکے اپنی غلط کاریوں کا تخت بچھاتی ہے۔ جب زمانہ کا انقلاب قدرت کی اجازت سے انسانی اختراع کا خاتمہ کر دیتا ہے اور اس کی خرابیاں اپنے اندرونی اور بیرونی دباؤ سے حکومت کی اجتماعی ہیئت کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ تو مذہبی حکومت، انسانیت، اخلاق، تمدن اور ابدی قوانین کی قوت سے بگڑے ہوئے نظام کو بدلنے کے کام پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتی ہے۔

ہمارے علماء کی کتابوں سے یورپ نے جو استفادہ کیا ہے۔ اس کا اعتراف وہ علمی ذخیرے ہیں جو یورپ کی الماریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ جدید یورپ نے کمال دلیری سے ہمارے تاریخی اجتماعی۔ سیاسی اور قانونی ذخیرہ سے استفادہ کیا لیکن جب سیاسی نظریوں کی جدید تنظیم کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے اُستادوں کے جواب میں جو راہ اختیار کی اس کو محتاط اور نامعلوم جوابی حملہ قرار دینا بجا ہوگا۔ اس سلسلہ کی پہلی کوشش تو یہ نظر آتی ہے کہ کارآمد

حکومت کیا ہے؟ اخلاق کی روح نہیں قوت جس کا تعلق حیوانی خواہشات سے ہے۔[۱]

لارڈ برائس کی رائے | مشہور انگریزی قانون داں والئی کاؤنٹ جیمس برائس (Jams Bryce) نے اپنی کتاب موڈرن ڈیماکریسی میں مغربی جمہوریت کی تاریخ پیش کرتے ہوئے جو کچھ سپرد قلم کیا ہے اُس سے بھی حکومت کے لفظ کا مفہوم متعین کرنے میں امداد ملتی ہے؛

ایک سیاسی طاقت جو شخص یا جماعت اس سیاسی طاقت کو استعمال کرتی ہو وہ حکمراں ہے۔ اگر ایک شخص اس سیاسی طاقت کا سربراہ کار ہے تو حکومت شخصی ہوگی اگر یہ سیاسی طاقت عوام کے ہاتھ میں ہے تو حکومت جمہوری ہوگی۔

علامہ وجدی کی تصریح | عربی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) کے مصنف فرید وجدی حکومت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"وہ ہیئت یا جماعت جو قوم پر حکومت کرتی ہے اور قوم ہی کے افراد سے منتخب ہے"[۲]

شروانی کی تصریح | پروفیسر ہارون خاں شروانی اردو زبان کے مستند سیاسی مصنف کی حیثیت سے حکومت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے عصر حاضر کا "تازہ ترین اور عام فہم نظریہ" پیش کرتے ہیں:۔

"مملکت؛ انسانوں کی منظم سیاسی ہیئت کا نام ہے اور حکومت اُس کل کا نام ہے جس کے ذریعہ سے مملکت کے کاروبار انجام کو پہنچتے ہیں، گویا مملکت ایک ادارہ ہے اور حکومت اس ادارہ کا آلۂ کار ہے"[۳]

---

۱ موڈرن ڈیماکریسی (Jams Bryce) باب ۳

۲ دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۳ ص ۳، ۴ لفظ الحکومۃ۔

۳ مبادی سیاسیات۔ ب ص ۲۱ (دوسرا اڈیشن) از پروفیسر ہارون خاں شروانی صدر شعبہ سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔

عاید ہوتی ہے جو قانونسازی کا مظہر اور شارع ہے تو حکومت کے لیے دینی سیاست کی داغ بیل پڑجاتی ہے۔ جو حیاتِ دنیا اور ثباتِ آخرت میں مفید اور کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ دینی سیاست کی اہمیت کا نقطہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیقی زندگی کا مقصد صرف دنیا نہیں ہے۔ دنیا میں اس وقت بظاہر حیات موثر ہے مگر یہ حیات موت کی حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس زندگی کا مقصود عارضی زندگی سے بلند ہے۔ زندگی کا اصل مقصد و منشا دین ہے۔ نام کا دین نہیں بلکہ وہ دین جو ہم کو ارتقائی راہ سے انجام کے مرکز کمال (آخرت) پر پہنچا سکے"

شریعتیں اور سلسلہ انبیاء

جب مذہب کے ساتھ شریعت کا نام لیا جاتا ہے تو اُس سے قوانین کا وہ مجموعہ احکام مُراد ہوتا ہے جس کا منبع الہام ہوتا ہے اور جس کو دین کی قوت نافذ کرتی ہے۔ جو ہستیاں ان قوانین کے نمود و ظہور اور نزول تنزیل کا ذریعہ بنتی ہیں ان کو پیغمبر، رسول اور نبی کا لقب دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن خلدون اسی پہلو کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"شرائع (شرعی قوانین) اسی لیے اپنے مرکز سے آتے ہیں تاکہ ابدی سعادت کی طرف رہنمائی کریں۔ شریعتوں کا مقصد، عبادت بھی ہے اور معاملات کی تنظیم بھی۔ انتہا یہ کہ مذہب کے اصولی معیار پر انسان کا اجتماعی ہیئت کے ساتھ حکومت و سلطنت قائم کرنا بھی خدائی شریعتوں کے دائرہ عمل میں داخل ہے"

یہی بات دینی اور دنیاوی حکومت کے درمیان امتیاز کو نمایاں کر دیتی ہے۔ دینی حکومت میں ہر عمل کا محور واضع شریعت ہوتا ہے۔ ایک دینی حکومت اپنے اصل شرعی قوانین کے لحاظ سے جبر و استبداد، قاہرانہ تسلط اور تغلب۔ ظلم و زیادتی، زد۔ زبردستی، بُری خواہشوں اور بُرائیوں سے

کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ جو بات عام سیاسی نقطۂ نگاہ سے متعلق ہو کر برائی سے خوبی کا جامہ پہن لیتی ہے وہ مذہبی دائرۂ اثر میں ہر وقت، ہر طرح اور ہر صورت میں بری رہتی ہے عام سیاسی حکومتیں اللہ کی روشنی کو نہیں قبول کرتیں ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور اور خدا کا قانون یہ ہے کہ جو اللہ کی روشنی کا اکتساب نہیں کرسکتا ہے وہ کوئی روشنی حاصل نہیں کرسکتا۔ ایک مافوق العادہ قانونی طاقت ہی یہ جانتی ہے کہ انسانیت عامہ کا عام مفاد جو سب کے لیے یکساں ہے کیا ہے۔ اس بارے میں رسول خدا کا بھی ایک قانونی اثر موجود ہے۔ یہ تمہارے کام ہیں اور تم پر ہی عائد کر دیے گئے ہیں۔ اللہ جو قانون نافذ کرتا ہے وہ انسانوں کے مصالح عامہ ہی سے وابستہ ہوتا ہیں۔ اور انہی کے فائدہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

واحکام السیاسۃ انما تطلع	رہے سیاسی حکومتوں کے احکام وہ دنیاوی مصلحتوں
علی مصالح الدنیا فقط یعلمون	کے اثر سے باہر نہیں آتے صرف دنیاوی زندگی کے
ظاھراً من الحیاۃ الدنیا۔[1]	ناشتی دائرہ میں نظر آتے ہیں۔

دینی قانون کا مطمع نظر یہ ہے کہ تمام انسانی ذمہ داریوں کو خواہ وہ دنیا کے ماحول سے متعلق ہوں یا صلاح آخرت سے مذہب اور شریعت کے قوانین کی دفعات کے ماتحت کر دیا جائے۔

انبیاء: ان ذمہ داریوں کی رو سے جو حکومت صورت پذیر ہوتی ہے اس کا کام شریعت کے علمبرداروں کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے یعنی وہ شخصیتیں جن کو ہم انبیاء کا خطاب دیتے ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک کو نبی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

خلفاء: وہ انسانی افراد جو دین اور دنیا کی ذمہ داریوں، فرائض، اور امور حکومت اور مصالح عامہ کے معاملات میں نائب السلطنت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں ہماری اجتماعیات میں ان کو

---

[1] مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون ۲۵ ص ۱۵۹۔

خلفاء کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ابن خلدون اس وضاحت کے بعد لکھتے ہیں۔

فقد تبین لك من ذٰلك معنی الخلافة — یہ بیان خلافت کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔

دینی اور دنیاوی نظریوں کی تنقیح کے لیے علّامہ ابن خلدون نے اپنے نظریہ کی توضیح کرتے ہوئے آخر میں ایک قطعی اور اصطلاحی عنوان اختیار کیا ہے۔ سیاسی مملکت اور خلافت یہ دو اصطلاحی لفظ ہیں اور دنیاوی حکومت اور دینی حکومت کے ہم معنی ہیں۔ ان دونوں کی اصطلاحی تعریف مستقل پیرایہ بیان اختیار کر کے ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔

ملک سیاسی	سیاسی حکومت وہ ہے جو سوسائٹی کو عقلی مطمح نظر کے ماتحت دنیاوی دستبرد اور دفاع کے لیے تیار کرے۔
خلافت	وہ حکومت جو شرعی نصب العین کے ماتحت آخرت اور عافیت کی صلاح و فلاح کو اصل تصور کرے اور اس عظیم مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کو مصالح عامہ کے لیے تیار کرے۔ کیونکہ دنیا کے تمام معاملات، کوائف و احوال، ذمہ داریاں اور فرائض آخرت کے تصور اور عاقبت کے مفاد کے ماتحت ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ تمام فرائض اور واجبات درحقیقت نیابتی واجبات ہیں۔ خلیفہ درحقیقت نبی کے ایوان سیاست میں نیابتی واجبات کو پورا کرتا ہے۔ وہ نبی اور رسول کا نائب، جانشین اور حکمبردار کارندہ ہوتا ہے۔ اور دین کے دفاع اور دنیا کی سیاست میں پیغمبر کی نمائندگی کرتا ہے (ص ۱۵۹)

امام شاہ ولی اللہؒ کی تصریحات

جس طرح علامہ ابن خلدون حکومت کو دینی اور دنیاوی قرار دینے میں اسلام کے مذہبی

نظریۂ اجتماع کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طرح امام شاہ ولی اللہ دہلوی جن کو ہمارے آخری دور کے علماءِ اجتماعیات میں اوّل درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔ حکومت کی اس تقسیم کو اس کی مخصوص شکل میں تسلیم کرتے ہیں[1]۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ "انسانی زندگی کے دائرہ میں انسان کے ہاتھوں سے جو سیاسی نظام بنتا ہے وہ شہری اور شاہی اوصاف رکھنے والی حکومت کی بنیاد قائم کر دیتا ہے اس نظامِ حکومت کے ماتحت فرمانروا (حکومت کا ذمہ دار اعلیٰ) اپنے شہری مرکز میں قیام کرتا ہے یہاں سے حکومت کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ اِدھر اُدھر سے سرمایہ سمٹ کر آنا شروع ہوتا ہے جنگجو سپاہی اور لڑنے مرنے والے افراد اُس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے مزاج مختلف ہوتے ہیں، صلاحیتیں جُدا جُدا ہوتی ہیں اور وہ خود جبر و استبداد کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک ارجمند حکومت کو جس مثالی قانون (سنت راشدہ) کا پابند ہونا چاہیے، یہ لوگ اُس سے اپنے تعلق کو توڑ لیتے ہیں۔ ان میں دنیا داری کی حقیر طمع پیدا ہو جاتی ہے۔ دشمنی اور حسد بڑھ جاتا ہے سرمایہ داری اور زمینداری یہ دو ایسے مفاد ہیں جو معرکۂ جنگ کا باعث بن جاتے ہیں"۔

یہ وہ خرابیاں ہیں جو اکثر دنیاوی شہنشاہیتوں کا ساتھ دیتی ہیں اس لیے نسل انسانی کے افراد بےچین ہو کر شہنشاہ کی جگہ خلیفہ کا انتخاب کرتے ہیں یعنی اس ہستی کا جو دنیا کے امن و نظم میں انبیاء کی قانونی نیابت کا حق ادا کرتی ہے ایسا شخص بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ اس کے لیے زبردست امتحان، عظیم جدوجہد۔ بڑے اجتماعات غیر معمولی سرمایہ کے خرچ۔ جانوں کی قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب خلیفہ اپنا عہدہ سنبھال لیتا ہے اور عوام یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ ان کی بہتری کے لیے ایک ہستی مل گئی ہے، تو انسانیت کی بہتری کا وقت آ جاتا ہے۔ روئے زمین کا کردار

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب الانفاق الرابع (سیاستہ الاعوان) ص ۴۷۔

(کیریکٹر درست ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے ظالم اور جابر لوگ (جن سے بندگانِ خدا تنگ ہوتے ہیں) ذلیل کر دیے جاتے ہیں۔ شہنشاہتیں خلیفہ کی اطاعت کر لیتی ہیں اور انسانیت عامہ کے معیاری نظامِ حکومت کے سامنے گردن جھکا لیتی ہیں خدا کی نعمت مکمل ہو جاتی ہے۔ قرآن کے نظریہ اتمامِ نعمت کے ماتحت مثالی حکومت کا مکمل ظہور ہو جاتا ہے۔ سلطنت میں امن قائم ہو جاتا ہے، عوام کو امان اور پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس مثالی حکومت کا سردار (خلیفہ) جنگ کی ضرورت دیکھتا ہے تو وہ میدان جنگ میں بھی نکلتا ہے۔ اس کا مقصد دفاع ہوتا ہے۔ جب نفس انسانی درندگی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اُس سے نقصانات اور خطرات پہنچنے کا امکان ہوتا ہے تو خلیفہ کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جوابی حد تک مقابلہ کرے اور میدانِ جنگ میں پہنچ کر ہر خطرہ کو دور کرے"۔

ہمارے علماء نے دینی حکومت کو روشناس کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے مذکورہ بالا تشریحات سے اس کی گراں قدر کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں علماءِ مغرب کا طور و طریقہ دوسرا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ہمارے علماء کے نزدیک جب دنیاوی حکومت دنیا داری کی سرحد سے فساد کے منتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ اپنی اندرونی اور بیرونی خرابیوں کو بروئے کار لے آتی ہے۔ شخصی استبداد عمومیت اختیار کر لیتا ہے اور انسانیت کے قوانین کے انکار کے ساتھ ظلم کو بھی جمع کر دیا جاتا ہے۔ انسان اپنی مصیبتوں کو کھلے طور پر محسوس کر لیتا ہے۔ جبر عام ہو جاتا ہے۔ انصاف گم ہو جاتا ہے، انسان انسان کو ذبح کرتا ہے اور انسان کا خون کھُلے شہروں کی نالیوں میں پانی کے بھاؤ بہتا ہے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں پناہ چاہنے کے باوجود پناہ گاہ سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ جارحانہ انفرادیت وحشیانہ شہریت۔ اور شیطانی عسکریت، اجتماعی اوصاف کی فرشتگی کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اُس وقت دینی حکومت اپنا کام

شروع کرتی ہے۔ اب وہ اپنے کارخانہ کی بڑی مشین کا پہیہ گھماتی ہے اور زندگی کی جولانگاہ میں اپنا کاروبار پھیلاتی ہے۔ خاص کر اسلام کی دینی حکومت جو انسانیت کے ترقی یافتہ رجحان کے لیے سایۂ رحمت تمام انسانوں کے لیے موجب صلاح و فلاح اور ایک اعلیٰ نصب العین کی حیثیت سے مکمل ہے۔

علماءِ مغرب کہتے ہیں کہ دینی حکومت ماضی کے ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ دور کی پیداوار ہے اور موجودہ زمانہ کا علم سیاست اس سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تصانیف میں دینی تصور حکومت کو زیادہ جگہ نہیں دی جاتی۔ اگر کسی مرحلہ پر اس قسم کی حکومت کا نام لینا ضروری ہوتا ہے تو اس کی بنا اعتراف پر نہیں اعتراضات پر ہوتی ہے۔

جے کے بلنچلی نے یونان و روما اور عہد جدید کے جو نظریات ترتیب دیے ہیں ان میں اس طرز عمل کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ بلنچلی اپنی رائے بھی ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"مذہبی حکومت، سلطنت کی وہ شکل ہے جس کا تعلق نوع انسان کے عہد طفولیت سے ہے[1]۔ مذہبی حکومت میں قوائے انسانی جو قانون و حکومت کے فیصلے کے لیے لازمی ہیں بہت ہی ناممکل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی سلطنت میں لامحالہ مردانہ قوتیں زنانہ قوتوں کے تابع ہوجاتی ہیں۔ خود اعتمادی اور آزادی کو کبھی پوری طرح نشوونما نہیں ہوتا ہے[2]۔"

اہل مغرب ان خیالات میں زیادہ تر اس لیے معذور ہیں کہ انھوں نے اسلام کے دور اوّل کے طرز حکومت سیاسی حکمت عملی اور قانونی محرکات کی تحقیق میں وقت صرف نہیں کیا۔ بعض مصنفین

---

[1] نظریہ سلطنت جے کے بلنچلی عثمانیہ۔ باب ۶ تصوری یا مذہبی حکومت ص ۳۶۳۔ [2] نظریہ سلطنت ص ۳۷۳

نے اپنے آزاد خیالات کے ماتحت اس طرف توجہ کی ہے لیکن سلطنت کی عام تاریخ
اسلام کے نظریۂ سلطنت سے خالی ہے۔ اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ جو بات ان کے
تصنیفی موضوع سے خارج ہے۔ اس میں اُن سے آسانی سے غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔ اس
کی بڑی ذمہ داری آخری دور کے علماء اسلام پر بھی ہے جن کو زمانہ نے قانونی جزئیات کی سطح سے
بلند ہوکر اجتماعی میدان میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اگر ہماری آبادی میں راہ کے چراغ روشن
نہیں ہیں اور ایک اجنبی مسافر راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے تو یہ اس کا نہیں خود ہمارا قصور ہے

البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اہل مغرب کو قرون وسطیٰ کی جو عصبیت بطور میراث
پہنچی ہے اس نے ان کی راہ کو سنگلاخ چٹانوں سے بھر دیا ہے۔ تاریخی تحقیق سے یہ بات ثابت
کی جاسکتی ہے کہ نپولین کے حوصلوں، لوتھر کی تحریک اصلاح۔ فرانس کے جمہوری انقلاب، یورپ
کے اجتماعی عوامل اور اشتراکیت کے نظریہ مساوات میں اسلام کے تیرہ[۱۳] سو سالہ اجتماعی دور
اور مسلمانوں کی جاری کی ہوئی تحریکِ انسانیت کا زبردست دخل ہے۔ اگر نظریۂ ارتقاء اصلاً
صحیح ہے تو خلفاء اربعہ کے مذہبی دور کے معیاری اور مثالی طرز حکومت سے ربط ظاہر کیے بغیر یورپ
کی موجودہ ترقی کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیاوی طرز کی موجودہ حکومتیں اپنے پسندیدہ
اوصاف کا سلسلہ روما اور یونان سے ملا رہی ہیں تو اس کا سبب سیاسی تعصب کے علاوہ اور
کسی شئے کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ارتقا کا سارا عمل مسلسل ہے۔ جب یورپ اسلام کے اجتماعی
دور کی برکات سے انکار کرتا ہے تو وہ اس کو بھول جاتا ہے کہ اس کے انکار سے درمیان کی سنہری
کڑی ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتی ہے اور بلند نظر محققین کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ علم کا دامن آج بھی جہل کے
ہاتھ میں ہے۔ علماء کے لیے لاعلمی کسی وقت بھی علمی دلیل کا مرتبہ حاصل نہیں کرسکتی، اور جب لاعلمی
خود اختیاری ہو تو اس کا نام جہل مرکب ہو جاتا ہے۔ علماء یورپ کچھ تو اسلام سے بےخبر ہیں اور کچھ بےخبر

رہنا چاہتے ہیں اور اس کو مفید مقصد سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اسلام کی حقیقتوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے جو مجازی راہیں اختیار کی ہیں اور جس جس طرح اسلامی دور کے حقائق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کی ساری داستان انسانی علم کی نظر میں قابل سرزنش ہے

مشہور امریکن مستشرق ڈاکٹر ایس پی اسکاٹ اس روش پر ذیل کے الفاظ میں ماتم کرتے ہیں:۔

"مسلمانوں نے جو مفید کارنامے دکھلائے ہیں خاص کر وہ فوائد جن کا تعلق قرون وسطیٰ سے ہے ان سے ہمارے دور کے مورخین گذشتہ صدی تک دانستہ چشم پوشی کرتے رہے ہیں یا اُن کو کم کر کے دکھاتے رہے ہیں اس کی عام وجہ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس کا علم بھی نہیں تھا۔ مگر اکثر و بیشتر یہ ہے کہ اسلام کی عجیب و غریب سریع ترقی کا اگر دوسرے مذاہب کی سست رفتار سے مقابلہ کیا جائے تو ایک قسم کی رقابت و تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں ہر شخص تشنہ علم ہے یہ ممکن نہیں کہ کلیسا کے پیرووں کی بے توجہی اسلامی سائنس کے نور کو مکدر کر سکے۔"[1]

جہاں تک مذہبی حکومت کی مزعومہ خرابیوں کا تعلق ہے جواب میں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ علم و تحقیق کی روشنی میں موجودہ ترقی یافتہ حکومتوں کے طور طریقوں کو خلفاء اربعہ کے بے داغ عہد حکومت کے مقابلہ میں رکھ کر مفاد عامہ کے لحاظ سے وزن کر لیا جائے۔ آج ظلم و جبر۔ عہد شکنی، مالی دستبرد کشت و خون، بربادی و ہلاکت۔ انسانی جماعتوں کی باہمی دشمنی۔ افراد کی عدم مساوات، جمہور کے حقوق کی پامالی کی جو مثالیں دوربین سے دیکھے بغیر نظر آرہی ہیں خلفاء کے ترقی یافتہ عہد میں اس کا ادنیٰ سا نقشہ بھی نہ ملیگا۔ بیان کردہ خرابیاں مذہبی طرز حکومت کی

[1] اخبار الاندلس اسکاٹ۔ دیباچہ مصنف صفحہ ۶۰ مطبوعہ لاہور۔

خرابیاں نہیں ہیں بلکہ ان انسانی گمراہیوں سے اخذ کی گئی ہیں جنہوں نے دنیاوی طرز حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ خرابی اصل میں نہیں بلکہ انسانی تجربہ کی غلط کاری میں ہے جو عقل کی رہنمائی میں اپنی مذہبی اصل سے جدا ہو کر اکثر پستی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔

دینی طرز حکومت کو سراسر انسان کے عہد طفلی سے وابستہ کرنا بھی غلط ہے۔ یہ عقل کی ٹھوکر ہے جو تاریخی واقعیت کی جگہ غصب کرنے کے لیے ناجائز طور پر نوکِ قلم پر کھائی گئی ہے درحقیقت دنیاوی حکومت کی طرح دینی حکومت کا زمانہ بھی منقسم ہے۔ اجتماعی ہیئت بھی زندہ افراد کی طرح ہوتی ہے۔ حکومت بھی ایک انسان کی طرح زندگی بسر کرتی ہے، اس کا جسم ہوتا ہے اور روح ہوتی ہے، اس کا بچپن ہوتا ہے، جوانی ہوتی ہے، بڑھاپا ہوتا ہے۔ دینی حکومت کا ایک زمانہ عہد طفلی تھا، پھر ایک زمانہ زمانۂ جوانی آیا۔ انسانیت کا بچپن، مذہبی حکومت کا بھی بچپن تھا۔ جب انسانیت کا عہد شباب آیا اور اسلام نے انسان کے عقلی اور اجتماعی قویٰ کو مکمل کر دیا تو دینی حکومت نے بھی اپنے کمال اور شباب کو ظاہر کر دیا۔

اسلام سے پہلے عیسائیت کا حقیقی ظہور درجہ کمال سے ربط پیدا کرنے کے لیے اپنی تڑپ ظاہر کر چکا تھا، نام کی یہ عیسائیت اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام کے علاوہ کوئی دوسری قابل رد شئے نہ تھی۔ ہر مسلمان کو تسلیم کرنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت برحق کا ظہور اسلام کے مطلوبہ نصب العین کے ابتدائی آثار میں سے ایک قابل اعتراف اثر تھا۔ الہامی انجیل اور خدا کے قرآن کا وہی ربط تھا جیسا نوجوانی اور جوانی کے درمیان ہوتا ہے۔ جس طرح نوجوانی ایک قابل فخر شئے ہے مگر اس کی کمی کو پاکیزہ جوانی کا آخری پیغام ہی مکمل کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام نے آکر حضرت عیسیٰ روح اللہ کے پیغام کو مکمل کر کے انسانیت کی عظیم خدمت انجام دی۔

اب یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ دینی حکومت کی عام غایت سیاسی مبادیات نہیں بلکہ اجتماعیت کی تکمیل اور تنظیم ہے جو آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، درجہ بدرجہ ترقی کر کے تیرہ سو سال قبل اپنی معراج کو ظاہر کر چکی ہے۔

حکومت کی ابتداء اور اُس کی ترقی

انسانی جماعت، معاشرہ اور سوسائٹی منظم سیاسی صورت اختیار کرنے سے پہلے کس حال میں تھا۔ اس کے اولین سرے کو ہاتھ میں لانا دشوار ترین امر ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت اور مملکت کی تنظیم کبھی نہ کبھی اسی طرح عمل میں آئی ہوگی جس طرح انسان تخلیق کی دنیا میں آیا۔

آج سے پانچ سو برس پہلے علامہ ابن خلدون نے سلطنت کو دنیا کی صلاح و فلاح کا مرتع اور نفس انسانی کی خوش آئند امیدوں اور تمناؤں کی سب سے بڑی غایت قرار دیا ہے۔[1]

اس سے دو سو برس پہلے امام غزالی نے سلطنت کے ارتقائی مدارج کا ذکر کیا ہے[2] اور اس کو انسانی اجتماع کا آخری معیار قرار دیا ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابوالحسن ماوردی نے دنیا کی اصلاح کو ایک مطمح نظر قرار دے کر اس کے لیے دو واجبات تجویز کیے ہیں۔

(۱) تمام دنیا کا ایک مکمل، منظم اجتماعی نظام ہونا ضروری ہے۔ اور یہی سلطنت کی غایت ہے۔

(۲) جامعہ انسانی کے ہر ہر فرد کی بہتری کا انتظام ہونا چاہیے۔

یہ سمجھنا چاہیے کہ مملکت کے نظم کی بنیاد دو چیزیں ہیں۔ بہترین اجتماعی نظام اور بہترین فرد جو سیاسی سوسائٹی کا رکن بن سکے۔ کیونکہ فرد کی خرابی ایک متعدی شے ہے۔ اس سے دوسرے

---

[1] مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون حصہ دوم فصل اول [2] احیاء العلوم امام غزالی ج ۳ ص ۵-۶

افراد کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ اگر فرد صلاحیت اور حقوق کے اعتبار سے بہتر حالت میں نہیں ہے تو مملکت کا نظم خراب ہو جائیگا اور انسانیت کے سارے نظام میں ابتری پھیل جائیگی[1]۔

جرمن مقنن ہجے کے بلنچلی نے اس نظریہ سیاسی کی نقش بندی ان الفاظ میں کی ہے۔

"ایک اکیلا انسان فرد کی حیثیت سے اور انسانی نوع اپنی اجتماعی حیثیت میں تخلیق عالم کی دو ایسی ضدیں ہیں جو ابتداء سے چلی آتی ہیں اور برابر قائم رہنے والی حقیقتیں ہیں شخصی (انفرادی قانون) اور عام اجتماعی قانون کا فرق بھی انہی دونوں پر مبنی ہے[2]۔

قرآن کے قانونِ اجتماعی کے یگانہ عالم امام ابوالقاسم حسین بن محمد راغب اصفہانی ربانی مملکت کے نظریہ کی تشریح کرتے ہوئے سلطنت کو اعلیٰ سے اعلیٰ شرف قرار دیتے ہیں[3]۔ سلطنت ایک زینہ ہے جس کے ذریعہ انسان بلند سے بلند درجہ حاصل کرتا ہے، اور درجہ بدرجہ ترقی کے بعد عزت، عظمت کی معراج پر پہنچتا ہے۔

سسرو[4] سلطنت کو انسانی طاقت کی اعلیٰ پیداوار قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کسی کام میں خدا کی مرضی سے اتنا قریب نہیں جتنا سلطنت کی بنیاد ڈالنے میں۔

افلاطون[5] اپنی کتاب ریپلک (Republic) میں سلطنت اور حکومت کو انسان کی نیکی اور روحانی طاقتوں کے متوازن اور ہم آہنگ جلوہ سے تعبیر کرتا ہے۔

ارسطو[6] حکومت و سلطنت کو قوموں اور ملکوں کی مکمل اور خود کفیل زندگی کا مجموعہ ظاہر کرتا ہے[7]۔

---

[1] ادب الدین والدنیا۔ علامہ ابوالحسن الماوردی (۳۶۴ - ۴۵۰ھ) ص ۷۹ طبع ۱۳۲۶ھ مصر۔
[2] نظریہ سلطنت بلنچلی م۔ ا۔ ب ص ۲۶ [3] الذریعہ الی مکارم الشریعہ۔ دیباچہ ص ۳
[4] قدیم روما کا مشہور ماہر قانون۔ [5] و [6] یونان قدیم کے دو مشہور فلسفی اور سیاستداں۔
[7] نظریہ سلطنت بلنچلی م ا۔ باب ۳ دنیائے قدیم ص ۳۶ و ۴۰۔

مندرجۂ بالا نظریات سے معلوم ہوا کہ ہر خیال اور ہر فکر کے علماء حکومت و سلطنت کو ایک اعلیٰ درجہ کا مطمح نظر قرار دیتے ہیں۔ یہ مطمح نظر مدتوں سے غلط صحیح۔ مناسب و نامناسب شکلوں سے دنیا کے سامنے آتا رہا ہے لیکن تاریخی ایقان کے ساتھ ہر شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حکومت کا ظہور کب ہوا اور دنیا میں اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ایک ایسی شاندار تنظیم اور ادارتی ہیئت جس کی عظمت پر تمام دنیا کا اتفاق ہے اس کے متعلق ساری دنیا کی یہ بےخبری تعجب پیدا کرنیوالی ضرور ہے مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ منصور انصاری[1] کی رائے میں مذہب کی طرح سیاست و سلطنت کی ذمہ داری کا وجود ایسے زمانہ سے ہے جس کے آغاز کی تاریخ کا دریافت کرنا انسان کے لیے مشکل ثابت ہوتا رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سلسلہ کے نہایت ہی دقیق اسرار میں سے صرف اتنا معلوم ہے کہ انسانیت عامہ نے ایک سیاسی معاشرہ یا اُمت کی حیثیت سے مملکت کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں اُٹھانے کی قوت میں آہستہ آہستہ ترقی پائی۔ جامعہ انسانی میں اس ترقی کی مثال فرد کی ترقی سے قطعاً ملتی جلتی ہے۔ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے اور عالم موجودات میں بچپن کے خط سے روانہ ہو کر بلوغ کی حد تک پہنچتا ہے بالکل اسی طرح سیاسی نظم (مملکت پیدا ہوا پھر اُس میں بچپن اور بلوغ کا ظہور ہوتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ کا ابتدائی دور فرد کی ذمہ داری اور انفرادی وظیفہ سے شروع ہوا ہوگا۔ ابتدا میں یہ ذمہ داری ہلکی ہوگی اور پھر اس نے سنگین ذمہ داری کی حیثیت اختیار کر کے کامل قوتیں پیدا کیں اور آخرالامر اجتماعی معاشرہ میں درجۂ کمال ظاہر ہوا۔ اس طرح مملکت یک بیک نہیں بنی بلکہ اس کو فرد کی ذمہ داریوں کے عمل رانہ کا نتیجہ کہنا چاہیے[2]

---

[1] محمد بن عبداللہ انصاری کابل میں مندرجہ بالا عرف سے مشہور ہیں۔ قیام کابل کی ابتداء (۱۹۱۴ء ۱۳۳۴ھ)

[2] الدین والسیاسہ (مذہب اور سیاست) مہاجر دیوبند۔ سلطان العلوم نمبر ج ۲ شمارہ ۲۵۔ ۳۶ مورخہ ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء (قلمی ۵ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ علاقہ آزاد باجوڑ)

بلنچلی کی رائے یہ ہے کہ ـــــــ ہمارا تاریخی علم جس زمانہ تک پہنچتا ہے اس سے بہت پہلے ابتدائی سلطنتوں کا قیام ہو چکا تھا تاریخ کا احساس اس وقت تک زندہ نہیں ہوا تھا جب تک کہ زمین پر بہت سی سلطنتیں قائم نہیں ہو چکیں[1]۔

اب ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت کی تنظیم کبھی نہ کبھی ضرور عمل میں آئی ہوگی اور معاشرۂ انسانی پر ضرور ایسا زمانہ گذرا ہوگا جب اس میں سیاسی کیفیات پیدا نہیں ہوئی تھیں[2]۔ یہ زمانۂ حال کی رائے ہے جس کو نظریہ دینی کے ماتحت صرف اُس حد تک قبول کیا جا سکتا ہے جس حد تک حکومت کے عناصر اور حاکم و محکوم کے دنیاوی نظریہ کا تعلق ہے نظریہ دینی کی رو سے حکومت ازلی اور ابدی چیز ہے۔ اور اس کا تعلق ایک برتر ذات کے بالادست اقتدار سے ہے۔ البتہ انسان دنیا میں اس کی نیابتی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے اور دنیا کے ماحول میں زبردست اقتدار کا مالک بن جاتا ہے۔ حکومت کی روح حکم ہے اور حکم کی روح قانون، اس اعتبار سے حکومت ہمیشہ سے قدرت کے ازلی اقتدار کی نمائندہ ہے۔ ہاں دنیاوی واجبات کے لحاظ سے حکومت کے نیابتی فرائض نے ایک ارتقائی حکمت علمی کے ماتحت اپنا مکمل نمونہ مدت کے بعد پیش کیا اور اس طرح انسان کو انسانیت عامہ کے اجتماعی عقیدہ اور عمل سے تعارف پیدا ہونے کا موقعہ ملا[3]۔

اہم اور تاریخی نظریے

سلطنت کے آغاز کے متعلق تاریخی قیاسات نے متعدد رائیں پیدا کر دی ہیں دور جدید کی دستوری موشگافیوں نے حکومت کے نظریوں کو ایک مرکب شے کے لا تعداد ترکیبی

---

[1] نظریہ سلطنت مقالہ ۴ باب ص ۲۶۹ [2] مبادی سیاسیات شروانی۔ اشاعت دوم۔ ارتقائی مملکت باب ۳ ص ۲۹-۳۰۔ [3] تفسیر حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی ج ۳ ص ۳۰۰ (آیت استخلاف) مفردات القرآن امام راغب اصفہانی (خلف)، ج ۱ ص ۱۴۱ طبع خیریہ قاہرہ۔ کلیات العلوم علامہ ابوالبقاء حنفی ص ۳۱۶ طبع استنبول۔

عناصر کی طرح بہت زیادہ پھیلا دیا ہے تاہم تمام نظریوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) حکومت کے وجود پانے سے قبل انسان کی اجتماعی کیفیات کس حالت میں تھیں

(ب) اور بعد میں نظریہ حکومت نے کتنی اندرونی تقسیموں، تصورات اور خاکوں کو قبول کیا۔

نظریۂ ربانی پہلے نظریہ کی رو سے سب سے پہلا تصور ربانی تصور ہے "خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور خدا ہی نے حکومت کو پیدا کیا ہے۔" یہ ہے اس تصور کی غایت! گویا سلطنت خدا کی پیدا کردہ تنظیم ہے جو الہام کے سرچشمہ سے آبحیات حاصل کرتی ہے۔ دنیا میں تمام مذہبی حکومتیں اسی نظریہ کی روشنی میں اپنا چہرہ دنیا کو دکھاتی ہیں۔ ان میں اسلام کی سلطنتیں فطری اساس اور صحیح طریقہ پر قائم رہی ہیں[1]۔ بودھ سلطنتیں اور بنی اسرائیل کی سلطنتیں بھی اس تصور سے وابستہ تھیں۔

نظریۂ ربانی میں ابتدا ہی سے دو خیال کارفرما رہے ہیں:۔

سلطنت خداوند تعالیٰ کا بلاواسطہ فعل ہے، خدا نے سلطنت کو پیدا کیا ہے۔ اور وہی اس کو بلاواسطہ برقرار رکھتا ہے اور اس پر حکمرانی کرتا ہے۔

سلطنت کو خدا نے بالواسطہ قائم کیا ہے اور بالواسطہ ہی اس پر حکومت کرتا ہے۔

یہ دوسرا خیال نظریہ خلافت سے قریب تر[2] ہے۔ اس نظریہ کی تشریح آئندہ صفحات میں کی جائیگی۔

نظریہ ربانی کی رو سے اگرچہ حکومت کا مکمل اور معیاری نمونہ ابتدا میں دنیا کے سامنے

---

[1] دیکھو نظریہ ربانی کی ابتدائی حکومتیں اور اُن کے سیاسی آثار۔ تاریخ الکامل ابن اثیر الجزری۔ ج ۱ ص ۶ و ۲۷

[2] نظریہ سلطنت بنچلی مقالہ ۲ باب ۷ ص ۲۹۷۔ زمانۂ انقلاب کی تاریخ نی بورج ۱ ص ۲۱۴۔
مبادی سیاسیات شروانی باب ۳ ص ۴۲۔
الذریعہ الی مکارم الشریعہ۔ ص ۱۹۔

نہ آیا تھا لیکن کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں انسان سیاسی کیفیات سے آشنا نہ رہا ہو[1] پروفیسر ہارون خاں شروانی نے مشرق و مغرب کے جدید میلانات میں اس امر کو بعنوانِ ذیل تسلیم کیا ہے

شاید تاریخ میں کسی ایسی انسانی معاشرہ کا ذکر نہیں جس میں سیاسی تخیل کا کلیۃً نقدان ہو[2]"

مہاتما بدھ کا نظریہ | ملے جلے تاریخی تصورات میں مہاتما گوتم بدھ[3] کا نظریہ پہلا مانا جاتا ہے۔ اُنہوں نے کسی کے سوال کے جواب میں یہ کہا ہے۔

"ابتدا میں انسان کی حالت بالکل مکمل تھی، رنج و فکر کا پتہ نہ تھا، رفتہ رفتہ خاندان قائم ہو گئے ذاتی ملک کا رواج ہوا۔ قوم چار طبقوں میں تقسیم ہو گئی، لوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ ایسی وقت میں ضرورت پیش آئی کہ ظلم و جبر کا انسداد کیا جائے۔ تمام لوگ یکجا جمع ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے مفاد باہمی کے لیے ایک حکمراں کو انتخاب کر کے مملکت کی بنیاد قائم کی"۔

ہندوستان کے سیاسی میدان میں دوسرا نظریہ کوٹلیا کا ہے جس کی رُو سے راج سے پہلے نراج کی کیفیت تھی، ہر شخص خود غرض تھا۔ اور انسان کی وہی کیفیت تھی جو سمندر کی مچھلیوں کی ہوتی ہے، یعنی ہر طاقتور کمزور کو کھانے کے درپے تھا۔ کوٹلیا اس صورتِ حال کو متسیا نائے یعنی "منطق ماہی" سے تعبیر کرتا ہے۔ قریب قریب اسی عصر میں چینی فلسفی موہ تی نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ مملکت کے قیام سے پہلے ہر شخص کے نزدیک حق اور ناحق کا تخیل جداگانہ تھا۔

مغربی علمار سیاست میں اس موضوع پر سب سے پہلے انگلستان کے فلسفی ہوبز نے کھلا ہوا میدان پیش کیا ہے وہ منطق ماہی کے نظریہ کا قائل ہے اور یہ رائے رکھتا ہے مملکت سے پہلے انسان کی فطری حالت میں قانون کا کلی طور پر فقدان تھا۔ جب خود غرضیوں کے تصادم میں

---

[1] دیکھو تاریخ ابن اثیر ج ۱۔ ص ۱۵۔ [2] مبادی سیاسیات باب ۳ ص ۳۰

[3] گوتم بدھ ۵۶۳ قبل مسیح ریاست کپل وستو (نیپال) کے راجہ سدھودھن شاکیہ کا بیٹا۔

انسان اپنی زندگی سے عاری ہوگئے تو اُنھوں نے آپس میں معاہدہ کرکے اپنی قوتوں کو ایک اقتدار اعلیٰ کے ہاتھ میں دے دیا۔ مشہور انگریز فلسفی جان لوک کی رائے میں یہ صحیح نہیں ہے کہ مملکت کے قیام سے پہلے کوئی قانون نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی قانونِ قدرت رائج تھا۔ ہر انسان عقل و شعور رکھتا تھا۔ حق و باطل میں تمیز کرسکتا تھا، ہر شخص ضروریاتِ زندگی پر اختیار رکھتا تھا بشرطیکہ دوسروں کے لیے سنگِ راہ نہ بنے۔

یورپ کا شہرہ آفاق سیاستداں۔ انقلاب فرانس کا روحانی باپ ژان ژاک روسو (Rouseou) کہتا ہے کہ انسان اپنی فطری حالت میں بہت آرام سے تھا۔ انصاف اور اخلاق کا تخیل تو بالکل مفقود تھا لیکن ہر شخص پوری طرح آزاد ہونے کی وجہ سے فطرتہً دوسروں کے احساسات اور جذبات کا پاس کرتا تھا۔ کوئی شے کسی کی ملک نہ تھی بلکہ غیر مقبوضہ شے پر ہر شخص کو قبضہ کا اختیار تھا۔ اس عہد زریں کا خاتمہ افراد کی حرص کی وجہ سے ہمیشہ کے واسطے ہوگیا۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ انسان ابتدا میں معیارِ احسن پر تھا بعد میں اسفل سافلین کے گہرے گڑھے میں اُتر گیا۔

حکومت کا قیام

دنیا کی ہر عمارت اپنی سطح کی تہ میں ایک بنیاد ضرور رکھتی ہے۔ جب ہماری زمین کی سطح پر حکومت اور سلطنت کا ایوان تیار ہونے لگا تو اُس کی بنیاد انسانی فکر و عمل کے مسلمات پر رکھی گئی۔ دنیاداری کی نظر سے دیکھا جائے تو ہم ان مسلمات کی نظری تاریخ سے یقین کے ساتھ آگاہ نہیں ہیں۔ ایسا ہونا ایک قدرتی امر ہے انسان آج کے واقعات آج ہی بھول جاتا ہے۔ حال کو یاد رکھنا اور اس کی لاتعداد تحریکوں کو دماغ کی فرودگاہ میں علیحدہ خیموں میں رکھنا بڑے بڑے دماغوں کے لیے مشکل امر ہے، ہزاروں برس پہلے کی تاریخ جس میں جاہلیت کے

ان گنت دور بھی شامل ہیں، اپنی بعینہٖ شکل ہی کس طرح ہمارے علم میں رہ سکتے تھے۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ہماری دنیا، ہمارا دین مملکت اور اس کے دائرۂ کار میں ہماری ذمہ داریاں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ کون ہے جو تخلیق کے راز کی صداقتوں سے آگاہ ہو۔ یہ فخر مذہب ہی کو حاصل ہے کہ خدا کی منشار کے ہر مفہوم کو ہر موضوع کے ماتحت سچائی یقین اور قطعیت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے اور صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس کے مقصد و منشا میں ادنیٰ فرق نہیں پیدا ہوتا۔

دنیا کو یہ دعویٰ ہے کہ مملکت کا قیام چند بنیادی نظریات پر عمل میں آیا ہے لیکن انسانی فکر ونظر کا اختلاف ان بنیادی نظریات میں بھی معلوم ہوتا ہے۔ ہم یہاں ان نظریات کو چند الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

نظریۂ ابتدائی | نہایت قدیم اور ابتدائی نظریہ جس کی دریافت اسٹریلیا کے وحشی قبائل کے قدیم معاشی اطوار سے ہوئی ہے۔ پروفیسر ایڈورڈ جنکس کہتے ہیں کہ یہ نظریہ ابھی اس درجہ پر ہے کہ اگر اس کو آسان سے آسان الفاظ میں بھی لکھا جائے تب بھی اس کا تصور مشکل سے قائم ہو سکے گا۔ کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ قدیم انسانی معاشرہ کا نمونہ موجود ہے۔ اس سے وہ نقشِ قدم نمایاں ہوتا ہے جس پر چل کر انسان نے اگلا اور ارفع قدم رکھا[1]۔ اس نظریہ کا دوسرا نام نظریہ طوطمی ہے۔ زمانۂ حال کی تحقیق کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ انسانی سوسائٹی ابتدائی یا طوطمی نظریہ کی معاشی تنظیم میں پہلی پہل بروئے کار آئی۔

[1] پروفیسر ایڈورڈ جنکس لکھتے ہیں کہ اسٹریلیا والوں کی معاشرتی وحدت فی الحقیقت قبیلہ نہیں بلکہ طوطم گروہ ہے، یعنی آوارہ جماعت جو کسی قدرتی نشان سے پہچانی جاتی ہے اور جس کے افراد ایک دوسرے کے ہاں شادی نہیں کرتے۔ ان کے یہاں قانون محض ممنوعات کا نام ہے۔ ان کے عقائد اور تصورات میں ارتقائے انسانی کے دو قوی ترین عناصر قانون اور مذہب کی مبادیات کی دلفریب جھلک نظر آتی ہے۔ (تاریخ سیاسیات (عثمانیہ)، باب ۱ ص ۱۵)

نظریہ حکومت آبائی[1] انسان نے بنیادی تصور کے ماتحت اپنے ابتدائی دور وحشت سے ترقی کر کے "آبائی معاشرہ" کی صورت اختیار کی۔ پہلے درجہ میں انسانی دور وحشت کا دور تھا۔ زندگی موجود تھی۔ آوارہ معاشرت کا نمونہ بھی پایا جاتا تھا۔ معاشرت کی کوئی نہ کوئی قانونی صورت بھی تھی لیکن ہر صورت میں وحشت نمایاں تھی۔

جب ارتقائے معاشرت نے دوسرا قدم اُٹھایا تو آبائی معاشرہ کی صورت پیدا ہوگئی جس کے تین عناصر تھے

رشتہ داری کا احساس مستقل ازدواج۔ گھر کی سوسائٹی کا قیام اور اُس پر باپ کی حکومت۔

گھر کا فرمانروا (جد اعلیٰ) مذہب کا محافظ۔ اخلاق و کردار کا نگراں۔ گھر والے کی ذمہ داریوں کا ضامن اور گھر کی جماعت اور سوسائٹی کی تمام باتوں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ قدیم رومۃ الکبریٰ میں اقتدار آبائی (Patria Potestas) زندہ مورث کی تمام اولاد پر شامل ہوتا تھا

آبائی معاشرہ کنبہ اور قبیلہ دونوں پر حاوی رہا ہے۔ کنبہ اس معاشرہ کی چھوٹی حکومت ہے اور قبیلہ بڑی سنہری دور میں حضرت آدم بنی ابراہیم اور بنی اسرائیل کی حکومتوں میں آبائی معاشرہ کا رنگ صاف نمایاں ہے۔ ارسطو کے زمانہ سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک مشکل سے ایسا دور گذرا ہوگا جس میں علمائے سیاست کی ایک نہ ایک جماعت نے نظریہ آبائی پر اس کی تائید میں قلم نہ اٹھایا ہو[2][3]

نظریہ جبر[4] حکومت ظلم و جبر کا نتیجہ ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ جس کی طاقت اُس کی حکومت۔

---

[1] علامہ غزالی نظریہ آبائی کو مملکت کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ دیکھو احیاء العلوم ج ۳

[2] تاریخ سیاسیات ایڈورڈ جنکس باب ۳ ص ۱۶

[3] مبادی سیاسیات شروانی باب ۳ ص ۴۲ دیکھو ارتقائے مملکت۔

[4] نظریہ سلطنت ببلی عثمانیہ مقالہ [illegible] باب ۸ ص ۳۰۵۔ مبادی سیاسیات باب ۳ ص ۴۶۔

جو قہر اور غلبہ سے تسلط حاصل کرے وہی سلطنت کا مالک ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت قوت ہی حق کی دلیل ہے۔ پلوٹارک نے (سوانح کمیلوس باب ۱۷) میں برینوس شاہ گال کی زبان سے یہ نظریہ ادا کیا ہے "تمام قوانین ہیں سب سے قدیم تر قانون وہ ہے جو قوی کو کمزور پر حکمران بناتا ہے"۔ اکثر فلسفی بھی ہم کو یہی بتاتے ہیں اور ان سے زیادہ مطلق العنان جابر بادشاہ ہیں یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ حکومت نظریۂ جبر پر قائم ہے۔

نظریۂ معاہدہ عمرانی حکومت، حکمراں اور عوام کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ گویا جب عوام بدنظمی سے گھبرا گئے تو انھوں نے اپنی خوشی سے اپنے اختیارات حکمراں کو سپرد کر دیے۔ اس نظریہ کے ماتحت رائے عامہ کا اختیار باقی رہتا ہے جس کا قدرتی نتیجہ جمہوری انقلاب ہے یہ تصور اپنی حقیقت کے اعتبار سے نظریۂ جبر کے برعکس ہے۔

زمانۂ تاریخ کی حکومتیں

زمانۂ تاریخ کی حکومتوں کے متعلق انسانی علم اب تک کوئی یقین حاصل نہیں کر سکا ہم قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کی کونسی قوم نے سب سے پہلے حکومت قائم کی اور سلطنت کی تنظیم کا فرض انجام دیا۔

انسانی علم الہامی قانون کی امداد سے صرف ایک دعویٰ کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے سلطنت کا ظہور "ربانی تنظیم" کی صورت میں ہوا۔ خدا کی ہستی سب سے پہلی اور سب سے بلند ہے۔ انسانی عقیدے نے صدیوں تک اس اصول کو مانا ہے کہ انسان کی

۱؎ نظریہ سلطنت بلنچلی مقالہ ۲ باب ۹ ص ۳۰۸۔ لیوی تھن ہابس باب ۱۷۔ رسائل حکومت لاک کتاب ۲ دفعہ ۶ معاہدۂ عمرانی روسو

سیاسی تنظیم کا آغاز خداوند معظم کے نمایندوں کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ اس اصول سے تاریخی زمانوں سے قبل تاریخی سلطنتیں ربانی سلطنتوں کی صورت میں قائم ہو چکی تھیں۔

جرمنی کا ماہر سیاست و قانون جے۔ کے بلنچلی بھی اس خیال کی صداقت کو مانتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ہمارا تاریخی علم جس زمانہ تک پہنچتا ہے اُس سے بہت پہلے ابتدائی سلطنتوں کا قیام ہو چکا تھا تاریخ کا احساس اُس وقت تک نہیں پیدا ہوا تھا جب تک زمین پر بہت سی سلطنتیں قائم نہ ہو چکیں۔[1]"

ہندستانی سلطنتیں قیاسی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصریوں اور یہودیوں سے پہلے ہندوستانی سلطنتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہندوستان میں حضرت آدم کی پیدایش کے مسئلہ سے ربانی نظریہ بھی اس قیاس کی تائید کر سکتا ہے۔

مصری سلطنتیں بنی اسرائیل کی سیاسی سلطنتوں سے پہلے مصر میں سلطنت کا قیام عمل میں آچکا تھا حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کی اجتماعی زندگی کی تخلیق سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

بنی اسرائیلی سلطنتیں یہود کی قدیم مقدس کتابوں اور قرآن حکیم سے ان سلطنتوں کا حال معلوم ہوتا ہے ان سلطنتوں کے بعد تاریخی اور انسانی سلطنتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

یونانی سلطنت یونانیوں کی سیاسی تنظیمات نے ایشائے کوچک، اٹلی، سسلی، بحر متوسط (بحر روم) کے ساحلوں اور یونانی جزیروں کو سلطنتوں کی شکل میں پیش کیا۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ فی الحقیقت نئی سلطنتوں کی پہلی تخلیق تھی۔ یونانیوں نے کوئی بڑی شہنشاہی نہیں قائم کی بلکہ منتشر سیاسی اداروں کی حیثیت سے اپنا کام کیا۔ (یونانی حکومت کی ابتدا ۱۶۴۳ سنہ ق م)[2]

---

[1] نظریہ سلطنت بلنچلی م ۴ باب اول ص ۲۶۹۔ [2] دائرۃ المعارف بستانی ج ۲ ص ۵۰۹

روما کی سلطنت تاریخ کا دعویٰ ہے کہ رومیوں کی سلطنت ابتدا ہی سے ایک عام قانونی تنظیم تھی۔ وہ بنی بنائی حکومتوں کی توسیع تھی جس کا مقصد عالمگیر سلطنت کا نظام قائم کرنا تھا۔

کلیسائی حکومتیں کلیسا نے شہنشاہ سے علٰحدہ ہو کر پوپ کے نام سے روما کو پایۂ تخت قرار دے کر رومی تخیل کی پیروی کی۔ یہ انسانی سلطنت کو مذہبی سلطنت بنانے کی غرضمندانہ کوشش تھی جو عرصہ تک یورپ میں چمک دمک دکھاتی رہی۔

جرمن ٹیوٹن سلطنت روما کی عالمگیر شہنشاہی کو جرمن ٹیوٹن نسل نے شکست دے کر شاہی اقتدار حاصل کیا۔ اس طرح ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ پر ہر جگہ ٹیوٹن حکمراں تھے۔ کلیسا کا مذہبی تصور اور رومی تہذیب دونوں ان میں جمع تھے۔ اس کے بعد جدید دور شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے شروع ہوتا ہے۔ نکولاس پنجم (۱۴۴۷ء-۱۴۵۵ء) جولیس دوم (۱۵۰۳ء-۱۵۱۳ء) اس عہد کے سرگروہ سمجھے جاتے ہیں[1]۔

حکومت بحیثیت تنظیم انسانی

انسانی حکومتیں اور اُن کی قسمیں دو ہزار برس پہلے ارسطو نے دنیاوی حکومت اور سلطنت کی تین قسمیں[2] بیان کی تھیں۔ اگرچہ ہمارے زمانہ میں ان کی تنقید[3] اور تنقیح میں کافی کوشش صرف کی گئی ہے۔ پھر بھی ان کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا[4] ہے ارسطو نے اس تقسیم کی تصویر بنانے میں فرمانروائی اور حکومت کے اقتدار کی تصوری قوت کو بنیاد قرار دیا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہر انسانی سلطنت میں ایک بڑی ہستی طاقت کا مرکز ہوتی ہے۔ اور تمام دوسرے افراد اس

---

[1] نظریۂ سلطنت بلنچلی مقالہ چہارم باب س ۲۶۹۔ باب ۴ ص ۲۸۷ و م (۱) ب ۳ ص ۳۶ و ۴۰

[2] علم الاخلاق۔ الی نیقوماخوس۔ تالیف ارسطو ترجمہ عربی احمد لطفی سید ک ۸ ب ۱۰ ف ۳ الجزء الثانی ص ۲۵۴

[3] تاریخ سیاسیات پروفیسر ایڈورڈ جنکس ایم اے۔ طبع عثمانیہ باب ۱۴ ص ۱۵۷۔ مبادی سیاسیات پروفیسر شروانی باب ۱ ص ۲۳ ۲۴

[4] نظریہ سلطنت جے کے بلنچلی (المانی) عثمانیہ مقالہ ۶ باب ۱ صفحہ ۳۴۶

کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ ہستی سلطنت کے سب سے بڑے رکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعلیٰ رکن کی ہیئت سلطنت کے دل پر اپنا خاص نقش قائم کرتی ہے اس لیے قدرتی طور پر وہی حکومت کی تقسیم کا مرجع اور مرکز بنتی ہے۔

تین اچھی حکومتیں | حکومت کی تین قسمیں معیاری، پسندیدہ، جائز اور قابل قبول ہیں۔ ان تین اچھی حکومتوں سے تین بری حکومتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تین اچھی حکومتیں یہ ہیں

(۱) "شاہی" فرد واحد کی حکومت جس کو آج کل شہنشاہیت (Monarchy) کا نام دیا جاتا ہے۔

(۲) "اعیانی" چند ممتاز امرا کی حکومت جو تمام افراد ملک پر حاوی ہو۔

(۳) "عوامی" عوام کی حکومت جس کو ارسطو حکومت عامہ (پالیٹی (Politay)) کہتا ہے۔ یہ اکثریت کی حکومت ہے جو اغراض عامہ کو مدنظر رکھ کر اپنی سرگرمیوں کے دائرہ میں حرکت کرتی ہے۔ یہی تین حکومتیں بدترین ہو جاتی ہیں اگر عوام کی بہتری کا مقصد پورا نہ ہو۔ حکومت کی تین صورتیں حسب ذیل ہیں:-

"طاغی" وہ شہنشاہیت جس کا مقصد شہنشاہ کے نفس و شیطان کے علاوہ کچھ نہ ہو۔

"عدیدی" (امرائیت) چند قابو یافتہ خود غرض امرا کی جابر حکومت

"ازدحامی" معمولی طبقہ کے غیر تعلیم یافتہ عوام الناس کی بے قید حکومت۔ ایک ایسا ازدحام جو حکومت کے منشا نظم کو پورا نہ کر سکے۔

ان میں سے طاغی حکومت پستی کے آخری درجہ پر ہے[1]۔

زمانۂ حال کی حکومتیں | زمانۂ حال میں حکومت کے طریقوں، حکمراں طبقہ کے اختیارات اور مفاد عامہ کے

[1] علم الاخلاق ارسطو ج ۲ ص ۲۵۴۔

جمہوری رجحان نے جو صورت اختیار کی ہے اُس نے حکومت کی تقسیم کی نئی صورتیں پیدا کر دی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت کسی نہ کسی شکل سے زمانہ حال میں رائج رہی ہے۔ یہ صورتیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

شاہی حکومت | جس میں ایک شخص بادشاہ ہو اور اس کے شاہی اختیار اس کی اولاد کی طرف منتقل ہوتے رہے ہیں۔ یونان و روما کی حکومتیں ابتدا میں اسی قسم کی شاہی حکومتیں تھیں۔ زمانۂ حال کی شاہی حکومتیں اپنی شخصی تصویر میں انہی حکومتوں کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

جاگیری شاہی | وہ طرزِ حکومت جس میں بادشاہ کی وفاداری ان جاگیروں کے زیر اثر ہوتی ہیں جو بادشاہ کی طرف سے اپنے وفادار کارکنوں کو دی جاتی ہیں۔

دستوری شاہی | پارلیمنٹری طرز کی حکومت جس میں بادشاہ کے اختیارات آئین کے پابند ہوتی ہیں اور آئین سازی پر قوم کے منتخب نمایندوں کا اختیار رہتا ہے[۱]۔

شہنشاہی | وہ حکومت جس کا ایک شہنشاہ ہوتا ہے جو اپنے خاص دائرۂ عمل سے باہر نکل کر بہت سی قوموں اور ملکوں پر اپنا اقتدار قائم کرلیتا ہے۔ بادشاہ قوم پر حکومت کرتا ہے اور شہنشاہ اقوام پر

اعیانی | اس حکومت کا بہترین اصول یہ ہے کہ قوم کے زیادہ معزز، ممتاز شرفا اور اعیان کمتر درجے کے عوام پر حکمراں ہوں یونانیوں میں اسپارٹا کی سلطنت اعیانی طرز کا نمونہ تھی۔ روما کی جمہوریت میں بھی اعیانی تصور کارفرما تھا۔

عمومی حکومت | عوام کی حکومت۔ آزاد عوام اور ایسے شہریوں کی حکومت جن کے حقوق مساوی ہوں۔ عمومیت کا قدیم تصور فرد پر حکومت کے اجتماعی اقتدار کو ترجیح دیتا ہے، انفرادی آزادی تسلیم تو کی جاتی ہے مگر اس کا صدور حکومت کے منبع سے ہونا چاہیے۔

---

[۱] آئینی شاہی نئے زمانہ کا ثمرہ ہے۔ مونٹیسکو کے قول کے مطابق اس کا تخم قدیم جرمنی میں بویا گیا تھا۔ بلنچلی

جمہوریت | جدید تصور کے ماتحت جمہور کی نیابتی حکومت! عوام خود حکومت نہیں کرتے بلکہ اپنی رائے سے ایسے نمایندے منتخب کر کے جمہوری ایوان میں بھیجتے ہیں جو حکومت کے کاموں میں قوم کی نمایندگی کرتے ہیں

مرکزی جمہوریت | عوام کے منتخب نمایندوں اور جمہوری پارلیمنٹ کے ارکان کی حکومت جو ایک طاقتور مرکز سے ان تمام صوبوں کی مجموعی ہیئت پر حکومت کرے، جو پوری طرح مرکزی اقتدار کے ماتحت ہوں۔

لامرکزی جمہوریت | یہ طرز حکومت آزاد حکومتوں کی تنظیم سے ایک خاص قسم کی حکومت کو وجود میں لاتا ہے۔ اس کے آزاد عناصر عجیب وغریب قانونی مسلمات کے ماتحت ایک عجیب وغریب مرکز کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ جو درحقیقت عام مفہوم میں مرکزی اقتدار اور طاقت کا مالک نہیں ہوتا۔ آزاد عناصر یا آزاد حکومتیں محض اپنے مفاد کے لیے ایک تنظیم کی صورت اختیار کرتی ہیں وہ خاص خاص نمایشی اختیارات مرکز کو دے دیتی ہیں اور باقی تمام اختیارات اپنے مضبوط ہاتھ میں رکھتی ہیں۔ امریکن جمہوریت اس طرز حکومت کی حیرت انگیز مثال ہے۔

فیڈرل (وفاقی) حکومتیں

پروفیسر ایڈورڈ جنکس تاریخ سیاسیات میں لکھتے ہیں کہ سیاسیات کی گذشتہ صدی کا اصلی قابل توجہ پہلو وفاقیتوں کا قیام ہے۔ وفاقی حکومتیں مرکب مملکتوں کا نمونہ ہیں۔ مذکورۂ بالا شاہی، اعیانی، جمہوری مملکتیں زیادہ تر مفرد (وحدانی) قسم کی حکومتیں ہیں۔ مفرد (وحدانی) حکومت سے مراد ایک ایسی حکومت ہے جو بجائے خود ایک ہو۔ اور اپنا ایک مرکز رکھتی ہو۔ مرکب حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ کئی حکومتیں خاص مصالح کے ماتحت

متحد ہو کر ایک حکومت بن جائیں۔

ان کا زیادہ واضح اور عام نام اور مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔

وحدانی حکومت	تن تنہا۔ واحد حکومت جو ایک مرکز سے تمام کاموں کو انجام دے۔
وفاقی حکومت	چند آزاد حکومتوں کے وفاق سے ایک متحدہ حکومت کی تشکیل جو خارجی یا اندرونی

اثر قبول کر کے باہمی وفاق کو اپنی آزادی کے تحفظ اور علم و تمدن کی ترقی کے لیے قبول کر لیں۔

وفاقی عہدیت	کنفڈریشن	جب دو یا دو سے زیادہ حکومتیں اپنے معاہدے

کر کے بعض ذاتی اختیارات مستقل طور پر یا ایک خاص مقررہ وقت کے لیے ایک مرکزی قوت کو سپرد کر دیتی ہیں۔ مگر اس صورت سے کہ ان کی آزاد اور مستقل حیثیت پر کوئی مخالف اثر نہ عائد ہو اور اپنی آزاد رائے سے اس اتحاد سے علیحدہ ہونے کا حق رکھتی ہیں اور علیحدہ ہو سکتی ہیں۔ زمانۂ حال کے سیاسی نظریات، اشتراکیت، قومی اشتراکیت، نازی ڈکٹیٹرشپ (آمریت) فاسطی ڈکٹیٹرشپ (آمریت) مندرجۂ بالا نظریات ہی کے ترقی یافتہ آثار ہیں۔

وہ کتابیں جن سے اس حصّہ کی ترتیب میں امداد لی گئی

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۱ ص ۹

(۲) دائرۃ المعارف (عربی انسائیکلوپیڈیا) پطرس بستانی۔ لفظ حکومت ج ۷، ص ۱۳۲

(۳) انواع الدول و حریت الملل علامہ منصور انصاری (کابل) ص ۱۲۔ ۳۸

(۴) نظریہ سلطنت جے کے بنچلی۔ عثمانیہ مقالہ ۲ ص ۵، ۲ تا ص ۵۰۰

(۵) تاریخ سیاسیات پروفیسر ایڈورڈ جنکس آکسفورڈ باب ۱۴، ص ۱۵۷

(۶) تاریخ عمومی۔ علامہ ہاشم شائق صدر مجلس مؤلفین وزارت تعلیم افغانستان ص ۲۰۹۔ مطبوعہ کابل ۱۳۰۳ھ

(۷) تھیوری اینڈ پریکٹس برٹش گورنمنٹ

(گورنمنٹ انگریزی کے اصول) طریق حکومت باب ۱ ص ۲ طبع پنجاب رلیجس سوسائٹی لاہور ۱۹۰۴ء

فطری حکومت[1]

انسانی سلطنت کے تمام عقلی اور نمائشی نظریوں کے مقابلہ میں مذہب کا فوق العادہ نظریہ جو صحیح، سچی، اصولی اور مثالی حکومت دنیا میں قائم کرتا ہے۔ اسلام کے ضابطہ اجتماعی میں اس کے کئی نام ہیں جن کا تعین ان کی مختلف حیثیتوں سے ہوتا ہے۔ اس کا نام دینی حکومت[2] ہے۔ اس لیے کہ ہم اس کا ذکر دنیاوی حکومت کے مقابلہ میں کرتے ہیں۔ اس کا بہت ہی روشن اور مقبول نام حکومتِ الٰہی ہے۔ روئے زمین پر خدائے واحد کی حکومت! یہ اس لیے کہ اس حکومت کا سرچشمہ خداوند عرش عظیم کا اقتدار اعلیٰ ہے اور ہم اس کو انسانی حکومت کے مقابلہ میں انسانیت عامہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس حکومت کو فطری حکومت سے موسوم کرنا اس زمانہ کے عقلی رجحانات کے مطابق ہے۔ مذہب ایک فطری حقیقت ہے خدا نے انسان کو فطرت پر پیدا کیا ہے[3]۔ اس کی فطرت احسن تقویم (معیارِ احسن) پر مبنی ہے فطری حکومت ایک فطری قانون کے تابع ہے۔ اور یہ قانون انسانیت عامہ کے فطری واجبات کے مطابق قدرت کی حاکمیت سے دنیا کے دل پر نازل ہوتا ہے۔

قرآنِ عظیم نے چھٹی صدی عیسوی میں انسانی فطرت کی بڑائی کے اصول کی تجدید

---

[1] انسانی حکومت کے مقابلہ میں مذہب کی حاکمیت کے ماتحت جو مخصوص حکومت قائم ہوتی ہے اُس کو مختلف نام دیے گئے ہیں۔ حکومت الٰہی ایک ایسا نام ہے جس کو انجیل اور زبور خدا کی بادشاہت کے نام سے تسلیم کرتے ہیں۔ اس کو تصوری حکومت اور اصولی حکومت بھی قرار دیا گیا ہے۔ میں اس کو معیاری اور مثالی حکومت کہتا ہوں۔ علامہ منصور انصاری اس کو فطری حکومت کا نام دیتے ہیں اس لیے یہاں اسی نام کو ترجیح دی گئی ہے۔ فطری حکومت حکومتِ الٰہی کا دوسرا اور اہم نام ہے۔ (غازی)

[2] نظریہ سلطنت (دلبنچلی)، عثمانیہ م ۶، باب ۶، ص ۲۶۲-۲۷۱ دیکھو مذہبی حکومت

[3] الدر النثیر علامہ جلال الدین سیوطی ج ۳ باب الفاء ص ۲۳۱۔ کلیات ابو البقاء باب الفاء ص ۵۰۴ طبع آستانہ

کی اور اُس کو خُدا کی طرف نسبت دے کر انسان کے لیے پیش کیا اس طرح نظرت کا اصول اسلام کے نظام اجتماعی میں داخل ہو گیا[۱]۔ ژان ژاک روسو (Rousseau) نے اٹھارویں صدی میں انسانی نقطۂ نگاہ سے اُس کو تسلیم کیا[۲]۔ اور فطری رہناؤں کی تقلید میں آزادی، مساوات، اخوت اور انسانیت کے وہ نعرے بلند کیے جن کو خدا کے پیغمبر نامعلوم زمانوں سے اور پیغمبر اعظم ایک ہزار سال پہلے بلند کر کے قدرت کے اولین منشا کو پورا کر چکے تھے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ روسو اسلام اور قرآن کی قانونی حکمتوں کا مطالعہ کر چکا تھا[۳] اور قرآن اس سے صدیوں پہلے انسانی فطرت کو تسلیم کر چکا تھا۔

"انسان کی فطرت اچھی ہے، انسانی فطرت کو ہر چیز کی طرح خدا نے پیدا کیا ہے انسانیت عامہ کا نظام اجتماعی (دین قیم) فطرت پر مبنی ہے۔ یہ وہ نظریات ہیں جن کی بنا پر علامہ منصور انصاری دینی حکومت کو فطری حکومت کہتے ہیں[۴]۔ وہ فرماتے ہیں۔

"وقت آچکا ہے کہ انسانی بہتری کے لیے سچی اور صحیح اجتماعی فطرت کے اصول کو پھر قائم کیا جائے اور اُس کو عصر حاضر کے سیاسی رہنماؤں اور ترقی یافتہ اقوام یورپ، امریکہ، جاپان، چین، ہندوستان، عرب اور افریقہ کی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے۔ فطری حکومت کیا ہے۔ خلافت راشدہ — بہتر سے بہتر نیابتی حکومت — جو بنی اُمیہ، بنی عباس اور آل عثمان کی اجتماعی بدعتوں سے پاک ہو"

فطری حکومت کے دو رُخ دینی حکومت کی تاریخی سرگزشت وقت کے صادق تقاضوں کی مکمل

---

[۱] نظرت کا تعلق قانون انبیاء سے۔ دیکھو النہایہ ابن اثیر ج ۳ باب الفاء ص ۲۳۲

[۲] مبادیِ سیاسیات پروفیسر شروانی ایم۔ اے۔ باب ۳ ص ۳۷

[۳] الاسلام والحضارۃ العربیہ کرد علی ج ۱ ص ۶۹

[۴] حکومت الٰہی (فارسی متن) ص ۱۲ طبع اول ۱۳۵۰ھ بجنور۔

داستان ہے۔ جب ہم خدا اور انسان کے اُس قریبی ربط پر غور کرتے ہیں جس کا تعلق دین و دنیا کے معاملات اور دنیا کے سیاسی نظم اور قدرتی تنظیم سے ہے تو ہم کو فطری حکومت کے دو رُخ صاف صورت میں نظر آجاتے ہیں۔

(۱) ایک فوق العادہ اور بالادست طاقت کا اقتدارِ اعلیٰ

جو حکومت کا منبع اور عزت کا سرچشمہ ہے جو حکومت کا خالق بھی ہے اور مالک بھی[۱]۔

(۲) انسانی دائرہ میں کچھ ایسے کامل و مکمل انسانوں کی موجودگی جو دنیا میں مندرجۂ بالا اقتدار کی نمایندگی کے فرائض بیمثال فرض شناسی کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور دنیا کے جسم و روح اور ظاہر و باطن پر حکومت کرتے ہیں[۲]۔ یہ دونوں رُخ اپنی اصطلاحی شکل میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

حکومتِ الٰہی۔ روئے زمین پر تن تنہا ایک خدا کی حکومت اپنے تمام قانونی اقتدار و اختیار کے ساتھ[۳]۔

خلافتِ عظمیٰ[۱]۔ ان باکمال معتمد اور نمایندہ افراد کی نیابتی حاکمانہ ذمہ داری جو نمایندگی کی قانونی دستاویز لے کر[۴] اور الہام کی قوت پا کر دنیا اور اہلِ دنیا کے دائرۂ حیات میں داخل ہوتے ہیں اور امامتِ اقوام (Leadership of the Nations) کے عظیم الشان کام کو اول درجہ کی رہنما کی حیثیت سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں یا وہ نیابتی امارت (Sulsidiory Govrt.) جو مندرجۂ بالا افراد کے منتخب جانشینوں اور ارجمند نمایندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور **امامتِ کبریٰ** (Universal leudership) کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

---

[۱] تقریر دلپذیر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب طبع قاسمی باضافہ عنوانات۔ دیکھو مسئلہ توحید ص ۲۳-۲۴ ایضاح الادلہ سیدنا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی (قسنا، قاضی) [۲] بحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ ص ۱۴۰۔

[۳] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۱۷-۲۱

[۴] کلیات العلوم ابو البقاء حنفی باب (ا-م)، ص ۱۳۳۔

فطری حکومت کے عناصر ترکیبی
خداوند عالم اور اُس کا اقتدار اعلیٰ
نبوت اور انبیاء کا قانونی سلسلہ

خداوند عالم کو دنیا کے نظام اجتماعی پر ہمیشہ سے آج تک جو اقتدار حاصل رہا ہے تاریخ عالم کے ہر دور میں عقلائے زمانہ نے اس کو دلی عقیدت کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ یہی اقتدار حکومت الٰہی کی اصل ہے لیکن دنیا کے عام مطمح نظر کے اعتبار سے اس اقتدار کو تسلیم کرنے کے بعد جو بات اہم تر ہے وہ یہ ہے کہ فطری حکومت کا تمام کام خدا کے اُن پیغمبروں کے ہاتھوں میں آکر مکمل تنظیم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جن کی صداقت پر لامذہب انسان بھی حرف نہیں لا سکتے[1]۔ اسی بنا پر یہ کہنا آئینی قیمت رکھتا ہے کہ حکومت الٰہی اور خلافت انبیاء دونوں ایک ہی تصور حکومت کے دو رُخ ہیں حکومتِ الٰہی کے نظریہ کا رجحان ہمیشہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف ہوتا ہے اور خلافتِ انبیاء کا میلان ہر زمانہ میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف رہا ہے۔

اسلام کے نظریۂ سیاسی کا پہلا کلیہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام حقیقتیں ایک حقیقتِ کبریٰ میں گم ہو جاتی ہیں۔ ہماری بوڑھی دنیا اپنے بچپن سے آج تک قدرتِ خداوندی کے ناقابل تردید طاقتور اور ہمہ گیر منشا کے ماتحت مستقبل کے نامعلوم خطوط کی طرف آگے بڑھ رہی ہے۔ اللہ نے دنیا کو پیدا کیا ہے اس کا ارادہ بلندی کے منتہا سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے، اس کی مرضی کچھ ایسے لوگوں کو چھانٹ لیتی ہے جو دنیا میں اس کے اقتدار اعلیٰ کی نمایندگی کرتے ہیں[2]، اور دینی اساس پر دنیا کی تنظیم و ترقی میں خدا کے نائب کی حیثیت سے حصہ لیتے ہیں۔

یہ اسلامی نظریہ کا دوسرا کلیہ ہے کہ ہر پیغمبر اپنے زمانہ میں خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے امامۃ اُمت کے منصب عظمیٰ پر فائز رہا ہے۔ حکومتِ الٰہی اور خلافت عظمیٰ کا تمام و کمال دار و مدار پیغمبروں کی شخصی عظمت اور قانونی اہمیت پر ہے یہی وجہ ہے کہ خدا کے بعد نبی کی ہستی انسانی فہم کے لیے سب سے

---

[1] طبیعیات العلوم ابوالبقا حنفی (باب را۔م) ص ۱۳۳ [2] ایضاً فصل الراد "الرسالہ" ص ۳۵۱-۳۵۲

بڑی شے ہے۔

نبوت کا منصب عظیم اور انبیار کی آئینی حیثیت

"نبوت" ایک منصب عظیم ہے جس کے ماتحت فطری حکومت کا نظام انسانی تصور میں اپنا مقام پیدا کرتا ہے۔ اپنی حکمت عملی کو اقتدار و اختیار کی جولانگاہ میں لاتا ہے۔ اپنی سلطنت کا قالب تیار کرتا ہے اور اس سلطنت کی حدود قائم کرتا ہے اور حکومت کی شیرازہ بندی میں حصہ لیتا ہے نبوت کی امداد سے ہماری سیاست، اجتماعی ہیئت کی روحِ عمل کو حرکت دیتی ہے اور حکومتِ الٰہی کے مطمحِ نظر کو منظرِ عام پر لے آتی ہے۔

اسلام کے اجتماعی قانون میں انبیار کو جو آئینی اہمیت حاصل ہے وہ نبوت کے منصبِ عظیم کا ہی نتیجہ ہے۔

انبیار انسانیت عامہ کے روحانی ہیرو ہیں جنہوں نے اکثر حالات میں تنِ تنہا اصلاح و ترقی کی راہ میں وہ دلیرانہ کارنامے انجام دیے جو کارناموں کی دنیا میں بے مثال تھے۔ وہ اپنے ہر سیاسی قول اور اجتماعی فعل میں خدا کی طرف سے مجاز ہوتے ہیں اور ان کے قوائے عقلی روحانی معراج حاصل ہوتی ہے۔

انبیار کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کے اقتدارِ اعلیٰ اور بنی آدم کی عظمت اجتماعی کے درمیان صحیح ربط پیدا کریں۔ یہی ذمہ داری ہے جس کی بنا پر یہ کہنا بجا ہے کہ ہر نبی اور پیغمبر انسانیت کے تاریک دور میں مالک الملک کی نورانی دنیا کا سفیر ہوتا ہے۔ زمین و آسمان کا نور اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک روشن اور لکھا ہوا قانون کتاب کی صورت میں اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور اُس کی توجہ تمام تر انسان کی اصلاح حال اور روشن مستقبل کی طرف ہوتی ہے۔

مورخ طبری نے ابی ہریرہؓ سے جو روایت بیان کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیار

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی ج ۱ ص ۸۳ ۔ باب حقیقۃ النبوۃ و خواصہا)

اپنی مستقل جماعتی حیثیت میں "روشنی اور نور کی قوم ہیں۔ جن کو خداوند عالم نے اپنے بندوں کی دنیا میں اپنے نمائندہ اور سفیر کی حیثیت سے روشن مقاصد کے لیے بھیجا ہے

انسانی معاشرہ کے قدیم آثار کی تحقیق یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہماری دنیا کی سنہری تاریخ انبیا ہی کی تاریخ ہے۔ انبیار کرام خدائی فرمان سے عزت پاتے ہیں۔ غیبی استعداد کے ماتحت خدا کے پیغام کو قبول کرتے ہیں۔ خدا کے حکم سے اپنی اجتماعی مہم کو سچائی اور انصاف کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ اپنی فطرت کو خدا کے اعلیٰ قوانین کے مطابق بنا لیتے ہیں اور انسانِ کامل بن کر انسانیتِ عامہ کے محسن اور مصلح بن جاتے ہیں۔

یہ برگزیدہ اصحاب اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سلسلہ تنظیم کی زرین کڑی ہیں خدا اور بندگان خدا کے ربط و تعلق کو قائم رکھنا اور اُس رشتۂ محکم کی حفاظت کرنا جس کا تعلق ایک طرف فطری حکومت سے ہے اور دوسری طرف انسانوں کے مفاد عامہ سے انہی پاک نفس نمابندگان خدا کی مذہبی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا قانون منصبِ نبوت سے ہم آہنگ ہوکر بلندی سے زمین پر اُترتا ہے اور انسانی عقل کے نشیبی مدرکات کو متاثر کرکے فطرت کے بلند مطمح نظر کی طرف لیجاتا ہے۔ انبیار اس قانون کو قبول کرکے اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں معقول دلائل سے اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے نفاذ اور اجرار کے لیے لازوال طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ ایک امانت ہوتی ہے جس کو تمام موانع، مصائب اور مشکلات کے باوجود انسانوں تک پہنچایا جاتا ہے

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ انسان اور انسانی فطرت کا صادق ترین میلان ہمیشہ

ل تاریخ الامم والملوک ابن جریر طبری مطبوعہ مصر (ذکر وفات آدم) اذا قومٌ علیھم نورٌ — یکایک ایک نورانی قوم نظر آئی — ھٰؤلاء الانبیار والرسل الذین ارسل الی عبادی۔ یہ انبیار اور رسول تھے جو بندگان خدا کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

(جلد اوّل ص ۷۷)

سے خدا کے پیغمبروں کو اپنے عقائد کے مضبوط قلعہ میں جگہ دیتا رہا ہے ہو سکتا ہے کہ مادیت میں اُلجھی ہوئی عقلیں جو اپنے اندر انبیاء کے منصب عظیم کو تسلیم کرنے کی استعداد نہیں پاتیں۔ انکار کر بیٹھیں مگر انسانی بصیرت نئے نظریوں کی ناکام نمائش سے مرعوب ہونے کے باوجود اُس ساری حیرت انگیز تاریخ کو نظر انداز نہیں کر سکتی جس کا تعلق ان اولوالعزم پیغمبروں سے ہے جنہوں نے ہماری دنیا کو بنانے سنوارنے اور صحیح طور پر ترقی دینے میں زبردست کام کیا ہے۔ انبیاء کا سیاسی نصب العین ایک ایسے قدیم اور صحیح طرز خیال سے متعلق ہے جس کی واقعیت نئے دور کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ دنیا میں ہمیشہ سے اقرار اور انکار کی دو قوتیں کام کر رہی ہیں لیکن انبیاء کے ظہور کے بعد انسان سے انکار کے حق کو سلب کر لیا گیا ہے۔ رسولوں کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ازلی قوانین کے مطالبات سے آگاہ ہو جائے غفلت میں پڑ کر گمراہ نہ ہو گمراہ ہو تو خدا کی قدرت اور اپنی فطرت حسنہ کو الزام نہ دے۔ قرآنِ عظیم اسی حقیقت کو الہامی الفاظ میں پیش کرتا ہے:

رسلاً مُّبَشِّرِین و منذرین لئلا	(ہم نے) رسول بھیجے خوش آیند حقائق کی خبر دینے
یکون للناس علی اللہ حجۃ	والے اور ڈرانے والے تاکہ نسل انسانی کے افراد کو اللہ
بعد الرُّسل و کان اللہ عزیزا	پر الزام کا حق باقی نہ رہے (ان) رسولوں کی
حکیما[1] (نساء)	آمد کے بعد اللہ زبردست ہے اور حکمت کا مالک ہے

اسلام کے علماء اجتماعیات کی آراء

اسلام کے علماء اجتماعیات نے نبوت کو مہتم بالشان منصب قرار دیا ہے اُنھوں نے تشریح و تعبیر کے جو طریقے اختیار کیے ہیں اُن میں یہ بتایا ہے کہ نبوت ایک قانونی قوت ہے، نبوت ایک ربانی مہم ہے، ایک خاص طرز کی نمایندگی ہے۔ ایک خاص قسم کی نورانی قیادت ہے۔ ان آراء کا علحدہ علحدہ تجزیہ کرنے سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ نبوت کا منصب

---

[1] قرآن عظیم پ ۶، نساء، ص ۱۳۴ طبع بجنور

حاصل کرنے والی ہستیاں خدائی ہیں یا تو طاقتور حکومت کی نمائندہ رہی ہیں یا اس حکومت کے تمام کاموں کی ذمہ دار قرار دی گئی ہیں[۱]۔

ایک نبی کو خلیفۃ اللہ (اللہ کے آئینی نائب) کی حیثیت سے جو کام کرنا پڑتا ہے اس کے لیے قوت ضروری عنصر ہے[۲]۔ نئے زمانہ کے علمار قانون کہتے ہیں کہ حکومت کی اصل قوت ہے۔ بلکہ قوت ہی حکومت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رائے اسی قدیم ربانی نظریہ سے ماخوذ ہو۔ نبی کی عظمت اور قوت خدا کی عظمت اور قوت کا نمونہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قرآنِ عظیم کے ضابطۂ اجتماعی میں یہ دو اصولی دفعات پاتے ہیں۔

(ا) "عزت اللہ کا حق ہے" اور حکومت اللہ کی ملک وہ جس کو چاہتا ہے عزت اور حکومت دیتا ہے

(ب) تمام قوتوں کا مالک اللہ ہے اور یہ ناقابلِ شک قانون ہے۔

قانونی قوت | نبوت پہلے درجہ میں ایک قانونی قوت ہے اور نبی اس قوت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ قوت کامل تواتر کے ساتھ ایک منتخب ہستی سے دوسری ہستی کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے جب نبوت کی یہ قوت خدا کے پیغام کو قبول کرلیتی ہے اور نبی خدا کے قانون کا حامل ہو جاتا ہے تو اُس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پوری طاقت کے ساتھ اس کو اپنے ہاتھ میں لیگا، اور اس کے اجرا کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو ایک مامور اور خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ یہی وہ نظریہ قوت ہے جس کی بنا پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انبیار اپنی مستقل ذمہ دارانہ حیثیت میں زبردست اور امتیازی قوت کے مالک ہوتے ہیں[۳]۔

---

[۱] دیکھو تفصیل کے لیے البدایہ والنہایہ ج ۱-۲، تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ (صفحات متعلقہ تاریخ انبیار)
[۲] حکومت اور قوت کے باہمی تعلق کی تائید کے لیے دیکھو السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ امام ابن تیمیہ ف ۲ ص ۷، طبع اول خیریہ مصر ۱۳۲۲ھ [۳] مفردات امام راغب اصفہانی (ملک) ص ۱۲۶ طبع خیریہ مصر

امام ابن ہشام اپنی سیرت میں لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ قانونِ الٰہی نازل ہوا تو زمانۂ جاہلیت کے مشہور عرب موحد ورقہ بن نوفل نے اپنے وجدان صحیح کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آپ اس اُمت کے نبی ہیں اور آپ کے پاس وہی ناموس اکبر آیا ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا" یعنی وہ بڑی سے بڑی عزت جو منصب نبوت کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ آپ کو عطا کی گئی ہے[1]۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

وللنبوة اثقالٌ ومؤونةٌ لايحملها	نبوت ان ذمہ داریوں کے بارگراں کا نام ہے جن کو
ولا يستطيع بها الا اهل القوة	عہدہ برا ہونا اولوالعزم اور ارباب قوت پیغمبروں
والعزم من الرسل[2]	کے علاوہ کسی دوسرے کا کام نہیں[3]۔

ربانی مہم | امام ابو محمد بن حزم کی تصریح کے مطابق نبوت ایک ربانی مہم ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک جماعت کو منتخب کرتا ہے جس کے افراد درجۂ کمال پر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ وہ کسی یونیورسٹی میں کسی معلم اور پروفیسر سے تعلیم حاصل نہیں کرتے مگر علم کی خداداد دولت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور یہ دولت بے طلب اُن کو دی جاتی ہے۔

انسانی زندگی کے دائرہ میں ہر مقصد کی کامیابی کے لیے تعلیم اور رہنمائی دو ضروری چیزیں ہیں۔ نبی کی ہستی ان دونوں ضرورتوں کو خدا کے پیغام اور قانون وحی کے ذریعہ پورا کرتی ہے[4]۔

ربانی سفارت | امام راغب اصفہانی قرآن کے ترجمان کی حیثیت سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ نبوت ربانی سفارت ہے۔ یہ منصب ایک قسم کی نمایندگی ہے جس کا تعلق تین اُمور سے ہے۔ اللہ سے، اللہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۲۸ [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۲۹

[3] نبی کی قوت کا سرچشمہ خداوند عالم کی قوت ہے کیونکہ وہی اصل ہے۔ دیکھو الملل والنحل ابن حزم جلد ۱ ص ۱۳۱ طبع محمد علی بمصر۔ [4] الملل والنحل علامہ ابن حزم ج ۱ ص ۹۴۔ دائرۃ المعارف فرید وجدی۔ لفظ نبا، ج ۹ ص ۲۷، ۲۹۔

کے بندوں کے مصالح آخرت سے اور دنیا کے معاشی مفاد سے اور خود اُن لوگوں سے جو قوائے عقلی کے اعتبار سے برگزیدہ ہوتے ہیں اور نبوت کا منصب حاصل کرتے ہیں۔

انبیاء کو دربارِ خداوندی سے زبردست اور مفید ہدایات اور اطلاعات ملتی ہیں۔ جو اُن کی باخبری کے لیے ایک مستقل وجہ بن جاتی ہیں[1]۔

علامہ راغب اصفہانی اپنی قابل قدر سیاسی تصنیف الذریعہ الی مکارم الشریعہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بنی نوع انسان کے دائرۂ حیات میں انبیاء کی ہم ( ) کا آنا انسانی زندگی کی لازمی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔ انسان کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حقیقی اور دائمی منافع اور نقصانات سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے اصولی فوائد اور جزئی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ قدرتاً یہ ضروری تھا کہ پیغمبروں کا ظہور ہو۔ جو بنی نوع انسان کو اللہ کے احکام پڑھ کر سنائیں۔ انسان کو پاک نفس بنائیں۔ علم و فن کی طرف متوجہ کریں، خداوندی قانون کی تعلیم دیں، ربانی سیاست اور حکمت کے نکات سمجھائیں تاکہ انسان کے لیے اپنے بہترین مفاد اور معاش سے وابستہ رہنے اور اپنی صلاح و فلاح کو سمجھنے کے مواقع پیدا ہو سکیں[2]۔"

علامہ ابن خلدون نے انبیاء کے متعلق جو تصریحات پیش کی ہیں ان سے وہ تمام اوصاف سامنے آجاتے ہیں جن کا تعلق خدا اور بندگانِ خدا سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

نبوت خدا کے پیغام کو قبول کرنے کی غیبی استعداد ہے جو محنت سے حاصل ہونے کی بجائے فطرت کی ذاتی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے۔ انبیاء خدا کے انتخاب کردہ برگزیدہ انسان ہیں۔

---

[1] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی مطبوعہ خیرہ مصر سنہ ۱۳۲۲ھ ج ۴ ص ۱۴۴۔

[2] الذریعہ الی مکارم الشریعہ ب ۹ ص ۶۸، ۶۹ طبع اول الوطن سنہ ۱۲۹۹ھ

اللہ نے چند اشخاص کو شرافت اور فضل و کمال کے بلند درجہ پر پہنچایا۔ ان سے ہم کلام ہو کر اپنی معرفت کو ان کی فطرت میں داخل کیا۔ انہیں اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا۔ ان کو بصیرت عطا کی اور اپنی عابد قوم کے مفاد عامہ کے تمام رازوں سے باخبر کیا۔[1]

انبیاء کی ذمہ داری یہ ہے کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے مستعد رہیں۔ ان کو آگ میں گرنے سے بچائیں، تمام بُری راہوں اور نقصان پہنچانے والی باتوں سے بچا کر سچی آزادی اور نجات کی راہ کی طرف مشعل دکھائیں۔ اور علوم و فنون کو انسانی دسترس میں دیدیں۔

انبیاء ایسی پیشین گوئی کرتے ہیں جو اپنی صداقت کے اعتبار سے دوسری زبان پر نہیں آسکتی۔ اللہ کے دربار سے ان نامعلوم احکام کا علم حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے علاوہ کسی انسان کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔[2]

انبیاء کی دو نمایاں علامتیں ہیں۔ (۱) سچائی (۲) قانونِ الٰہی کے نزول کے وقت دنیا و ما فیہا سے بے تعلقی۔ وہ بے تعلقی جو روحانی بادشاہ سے ہمکلام ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔[2]

نبوت کے لیے صدقِ مقال[3] اساسی شئے ہے۔ خلافت الٰہی کے نظامِ اجتماعی کی بنیاد ہمیشہ اسی صداقت پر قائم رہی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ختم نبوت تک انبیاء آتے رہے ہیں۔ اس پر دوستوں اور دشمنوں کا اتفاق ہے کہ ہر نبی اپنی کردار کے اعتبار سے انسانیت عامہ کا محسن اور رہبات میں صادق تھا۔ انبیاء کی صداقت تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔ مذہبی انسانوں کی طرح لامذہب انسان بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ انبیاء نے اپنے بچپن اور اپنی جوانی میں کبھی صداقت کا دامن نہیں چھوڑا۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون فصل ۱ مقدمہ ۶ ص ۷۷ [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۸۸

[3] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی ج ۴ ص ۱۴۳ مطبوعہ خیریہ قاہرہ ۔ کلیات ابوالبقاء فصل نون ص ۶۵۲ مطبوعہ استانہ

علامہ ابی البقا حنفی نے اپنی کلیات العلوم میں نبوت اور حکومت کے ربط کو بھی پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"نبوت میں بلندی (مطمحِ نظر کی بلندی) کا لحاظ پایا جاتا ہے۔ نبی آزاد انسان ہوتا ہے۔ اس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے اُس سے عظیم فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ وہ معصوم اور بُرائیوں سے پاک صاف ہوتا ہے (دنیا کے اچھے سے اچھے قائد و رہنما کے متعلق جو دعویٰ نہیں کیا جاسکتا وہ ہر نبی کے کردار کے متعلق کیا جاسکتا ہے) وہ اپنے عصر میں اخلاقی کمالات اور ارتقا کے اعلیٰ درجہ پر ہوتا ہے۔ خداوند برتر اس کے مرتبہ کو بلند کردیتا ہے اور اس کو اپنے مقصد و منشا اور اپنی مرضی کے لیے چھانٹ لیتا ہے۔ اس پر اپنا قانون (شرع) نازل کرتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ قانونی احکام کی اشاعت کی جائے اور خدا کی عظمت کے ساتھ اس کی حکومت کے احکام کو نافذ کیا جائے[1]۔"

امام شاہ ولی اللہ دہلوی یہ تصریح کرتے ہیں۔

"نبی ربانی سیاست کے ماتحت عوام الناس کے دائرۂ حیات میں بھیجا جاتا ہے۔ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔ اس کی خوشی میں خدا کی خوشی ہوتی ہے اور اس سے بغاوت کرنے میں خدا سے بغاوت اور دوری لازم آتی ہے" خلیفہ کی حیثیت سے نبی کی ذمہ داریوں کا لحاظ کیا جائے تو کہا جائیگا: "وہ ہستی جو سیاسیات کے اصولی قوانین کو بنی نوع انسان کے ماحول میں انصاف کے ساتھ جاری کرے[2]۔"

قرآن حکیم میں انبیاء کی فطری حکومتوں کا ذکر

قرآن حکیم کے سلسلہ ذکر میں انبیاء کرام تسبیح کے پاکیزہ دانوں کی طرح صفحہ بہ صفحہ نظر آتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے ابتدائی عصر سے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ عروج

[1] کلیات العلوم ص ۵۲ ۶ مطبوعہ استانہ ۱۲۸۶ھ [2] حجۃ اللہ البالغہ۔ باب حقیقۃ النبوۃ ص ۸۴ مطبوعہ منیریہ ۱۳۵۲ھ

وکمال تک پیغمبروں کی آمد کا مفید سلسلہ جاری رہا ہے۔ انبیاء کے جو اوصاف قرآن کے ضابطہ سیاست و سلطنت میں ذکر کیے گئے ہیں ان میں نبوت کے بعد کوئی وصف اتنا نمایاں نہیں جس قدر ان کا وہ کردار جس کا تعلق حکومت سے ہے۔ اور اقوام و ملل کی سرداری اور رہنمائی سے۔

قرآن کے بیان اور فرمان کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام پہلے اور سردار دو عالم آخری پیغمبر ہیں جن کو خدا کی طرف سے نائب حکومت اور جانشین سلطنت (خلیفۃ اللہ) کا منصب[1] حاصل ہوا ہے۔

درمیانی سلسلہ کے تمام انبیاء کو شامل کرنے کے بعد ہم اس سلسلہ کو کئی زمانوں پر تقسیم کر سکتے ہیں ان میں سے ہر دور کے پیغمبر حکومت و سلطنت کے سیاسی واجبات کے ذمہ دار رہے ہیں۔

ابتدائی دور | دینی اور فطری حکومت کا وہ ابتدائی دور جس کو ہم تخلیقی اور تکوینی اور تصوری دور کہتے ہیں اس لیے کہ یہ دور حکومت سے زیادہ حکومت کے تصورات کی تخلیق و تکوین اور ابتداء کا زمانہ تھا یہ دور سیدنا آدم علیہ السلام سے سیدنا نوح علیہ السلام کے عصر ظہور پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت ادریس مشہور پیغمبر ہوئے ہیں۔

تنظیمی دور | فطری حکومت کے سیاسی معاشرہ اور سوسائٹی کا اصلاحی دور جس میں انسانی تنظیم کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس دور میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ نے تاریخی شہرت حاصل کی۔

اجتماعی دور | یہ دور حضرت ابراہیم (۲۰۰۰ ق م) سے شرف آغاز حاصل کرتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۶۰۰ء) پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دور دو بڑے اجتماعی سلسلوں میں تقسیم ہو جاتا ہے دونوں سلسلوں کے وہ سردار اور رہنما جن کا قرآن حکیم میں ذکر ہے حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] انبیاء کی سیاسی حکومتوں کے تاریخی احوال کے لیے دیکھو قرآن عظیم مترجمہ سیدنا شیخ الہند، فوائد علامہ شبیر احمد عثمانی طبع بجنور تاریخ طبری ج ۱۔ تاریخ ابن اثیر ج ۱۔ تاریخ ابن کثیر ج ۱-۲۔ قصص الانبیاء، عبدالوہاب النجار (ازہری) ارض القرآن مولانا سید سلیمان ندوی ج ۱-۲۔

بنی اسحٰق: حضرت اسحٰقؑ حضرت یعقوب۔ (اسرائیل) حضرت یوسفؑ۔ (بنی اسرائیل) حضرت شعیب، حضرت موسیٰؑ، حضرت الیاس، حضرت الیسع، حضرت ذوالکفل حضرت داؤد۔ حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) بنی اسمٰعیل: حضرت ابراہیم اور حضرت لوط ایک زمانہ میں خلافت الٰہی کے حاکمانہ اور حکیمانہ خیالات کی ترجمانی کرتے رہے ہیں ان کے بعد عرب کی سیاسی سیادت بنی اسمٰعیل کے حصہ میں آئی۔ حجاز تک اس سلسلہ کے آثار ملتے ہیں۔

نبطی حکومت جو بحر احمر سے نہر فرات تک وادی القریٰ، مدین اور قلمروے رقیم (پیٹرا) پر حکمراں تھی۔ غسانی حکومت جو ظہور اسلام تک شام پر حاکم رہی۔ بنی قیدار کی حکومتیں۔ قصی ابن کلاب کی عربی امارت۔ اور پیغمبر اعظم، سردار دو عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابتی حکومت اسمٰعیلی سلسلہ کی حکومتیں تسلیم کی گئی ہیں۔ آخری اسلامی دور کو بھی تمام و کمال سیدنا اسمٰعیل سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔

انبیاء کے دو طبقے ہمارے نظریۂ اجتماعی کی رو سے انبیاء کے دو طبقے ہیں۔ پہلے طبقہ میں وہ پیغمبر شامل ہیں جنہوں نے فطری معاشرہ کی اصلاح و ترقی میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے حکومت تو نہیں قائم کی لیکن دنیا کی جعلی حکومتوں کے مقابلہ میں دینی اور فطری حکومت کے نظریات کو نمایاں کیا۔ حکومت سے پہلے حکومت کا تصور پیدا کرنا ان کی عاملانہ سیاسی ذمہ داریوں میں سے ایک عظیم ذمہ داری تھی حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت عیسیٰؑ اسی طبقہ اولیٰ کے ممتاز رکن ہیں

دوسرے طبقہ میں وہ پیغمبر داخل ہیں جنہوں نے مذہب فطرت کے اصولی قوانین کے

لے سلسلہ براہیمی کے پیغمبروں کی تفصیل کے لیے قرآن عظیم کی حسب ذیل سورتیں ملاحظہ فرمائیے۔ آل عمران، النساء، الانعام، الانبیاء، الاحزاب، صٓ۔ اردو داں اصحاب تفسیر حقانی اور قرآن عظیم مترجمہ شیخ الہند سے مفید مقصد استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطابق انسانی معاشرہ کو منظم اور نیابتی طرز پر حکومت قائم کر کے ایک اہم خدائی فرض کی تکمیل کی حضرت شیث، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ حضرت یوشعؑ، حضرت سلیمان، اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس طبقہ کی مقدس، برگزیدہ اور قابل ذکر شخصیتیں ہیں۔

اسلامی عقیدہ اُن پیغمبروں کی عظمت کو بھی تسلیم کرتا ہے جن کا نام قرآن کے سلسلۂ ذکر میں نہیں ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے سیدنا آدم پہلے انسان اور پہلے پیغمبر ہیں جن کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے موسس اوّل ہیں۔

قرآن کے ابتدائی تین پاروں میں جلیل القدر انبیار کی تاریخ حیات درج ہے۔ اس مختصر خاکہ میں اُس تصورِ حکومت کا نقش بھی سامنے آجاتا ہے جو حکومت الٰہی اور خلافت انبیاء کا مقصد ہے[۲]۔ قرآن کا پہلا اعلان یہ ہے کہ سیدنا آدم کو نیابتی حکومت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ ابلاغ ہے کہ ابراہیم دنیا میں ایک اُمت عظمیٰ کی تنظیم کے لیے امام بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ان کو حکومت و رہنمائی کا وہ اعلیٰ سے اعلیٰ سلیقہ دیا گیا ہے جس کو ہماری اصطلاح میں رُشد کا نام دیا جاتا ہے۔ دنیا کی رہنمائی کے لیے جو اوصاف ضروری ہیں ابراہیمؑ کی پاکیزہ فطرت ان سے عیناً ربط رکھتی ہے۔ کیونکہ مزاج کا تحمل، دل کی نرمی اور مقصد پر توجہ سیدنا ابراہیم کے خاص[۵] اوصاف تھے۔

قرآن کی پاکیزہ سیاسی زبان میں ہمیں اس کے علاوہ دوسرے انبیاء کی سلطنتوں اور سرداری کا حال بھی ملتا ہے[۶]۔ جب ایک انسان خلافت آدم اور امانت ابراہیمؑ کی حکایت سُننے کے بعد

---

[۱] بروایت تورات۔ تفصیل کے لیے دیکھو نظریہ سلطنت (زنجلی) م (۱) ب ۱-۳ ص ۱۴-۱۵۔
[۲] قرآن عظیم۔ دیکھو قانون الٰہی، حکومت الٰہی، منصب نبوت کا تعلق، ربانی تنظیم اور انبیاء کرام سے۔ پ۳ آل عمران (ما کان لبشر تا کونوا ربانیین)۔ (دیکھو انبیاء کے نام اور اُن کے سلسلے۔ قل امنا باللہ ـــــ ونحن لہ مسلمون مزید تفصیل پ۶ النساء میں دیکھو[۳] قرآن عظیم پ۱۲ ہود[۴] [۵] قرآن حکیم میں اس حال کی شیرازہ بندی سورہ انبیاء سے زیادہ کسی دوسری جگہ نہیں کی گئی۔ یہاں سیدنا ابراہیم کی معیاری حکومت حضرت لوط کی آزادی اور پیغمبروں کی امامت کا ذکر درج ہے۔

دوسرے انبیاء کی عظمت کا حال معلوم کرنے کے لیے متوجہ ہوتا ہے تو اُس کو قرآن حکیم سے اولین مرحلہ پر یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ "حکومت اللہ کی چیز ہے اور وہی اس کا مختار ہے" اس اجتماعی عقیدہ سے فیضیاب ہونے کے بعد اُس کی نظر آدمؑ و نوحؑ کے علاوہ ابراہیمؑ و عمران کے تاریخی سلسلہ کے اُن سرداروں پر پڑتی ہے جو دنیا جہاں سے پسند کیے گئے ہیں[1]۔ پھر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ابراہیم کی نسل کو تحریری قانون، حکمت سیاسی اور سلطنت عظمیٰ سے بھی بہرہ مند کیا گیا ہے[2]۔

حضرت موسیٰ کے متعلق فرمانِ مُبین ہے کہ ہم نے ان کو اپنے احکام اور سلطان مبین (ناقابل انکار غلبہ) کے ساتھ بھیجا ہے۔

سیدنا عیسیٰؑ کے باب میں تصریح ہے کہ وہ سید و سردار ہیں۔ حصور یعنی پاکدامن ہیں۔ آخرت کی طرح دنیا میں وجاہت مند ہستی ہیں[3]۔ آخر میں رہنمائے عالم اور سردار دو عالم کے متعلق یہ منشور ہے کہ تم مسلمانوں کی تمدنی تنظیم سے جو اجتماعی ہیئت بناؤ گے اس کو روئے زمین کی نیابتی حکومت اور عالمگیر غلبہ[4] حاصل ہوگا۔

---

[1] قرآن عظیم پ ۳ آل عمران　[2] و اتینٰهم ملكًا عظيمًا پ ۵ سورة النساء ۴

[3] پ ۳ - آل عمران

[4] پ ۲۶، محمدؐ ۴۷ الفتح ۴۸ -

فطری حکومت کی سیاسی تاریخ

فطری حکومت (خلافت) کا نظریہ ہماری الہامی تاریخ کے معرکۃ الآرا مسلمات میں سے ہے اور اس کا تعلق انسانی معاشرہ کے آغاز، وسطی دور اور انجام سے یکساں ہے۔ عقلائے مذاہب تاریخ کے ہر تمدنی دور میں اس امر کو تسلیم کرتے رہے ہیں کہ اس کائنات میں ہر شئے کا ایک آغاز ہے۔ آغاز سے ترقی کا جو سلسلہ جاری ہوتا ہے برابر منشائے تخلیق کو پورا کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب ہماری کائنات کی ہر چیز قدرت کے آخری انقلاب کے عمل کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیگی اور ہم مکمل ارتقاء کے بعد ایک مستقل نئی دنیا میں نئی زندگی سے ہمکنار ہونگے۔ جس کا نام ہماری اجتماعیات میں "آخرت" ہے۔

اسلامی معاشرہ کی تخلیق اسلامی سوسائٹی اور فطری معاشرہ کی تخلیق کیونکر عمل میں آئی؟ اس بنیادی سوال کے جواب میں یہ امر واضح ہے کہ اسلام نظریۂ تخلیق کو جزو ایمان قرار دیتا ہے اور اس نظریہ کو تسلیم کرنے کی ساری دنیا سے پُر زور اپیل کرتا ہے۔

اسلامی حکومت کی بنیاد کھلے طور پر اسلامی معاشرہ پر ہے۔ اور اسلامی معاشرہ انسان کی تخلیق و تکوین کے ماتحت دنیا میں ظاہر ہوا ہے۔ انسان، انسانی سوسائٹی، انسانی مذہب اور انسانیت کی دنیا میں حکومت و مملکت کے تصور کی پیدائش ایک وقت اور ایک ساتھ ہوئی ہے۔

اس سلسلہ کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کی حد تک ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ جب نہ انسان تھا نہ انسان کا ذکرِ مذکور تھا اور نہ انسانی معاشرہ[1]۔ اسی سلسلہ کا دوسرا نظریہ تخلیق ہے۔ جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں پہلے نہ انسان تھا نہ انسان کی دنیا نہ انسانوں کی منظم جماعت تھی اور نہ وہ تصورِ حکومت جس کا تعلق انسان سے ہے۔ پھر وہ زمانہ آیا جب انسان پیدا ہوا اور انسان کے ساتھ وہ تمام چیزیں جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ قدرت نے انسانی عظمت کے جس قانون[2] کو سرکاری فرمان کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہر اعتبار سے صحیح ہے۔

انسانی معاشرہ کے تکوینی درجات

فطری حکومت کے ابتدائی معاشرہ کی بنیاد عرصۂ ازل میں ایک ایسے تخلیقی ماحول میں قائم ہوئی ہے جو منشائے الٰہی کے عین مطابق تھا۔ اگرچہ ہم مادی حجابات کی وجہ سے اپنی محدود عقل سے اس غیر محدود اور فوق الطبیعۃ ماحول کا پورا ادراک نہیں کر سکتے لیکن اس کو اپنے عقیدہ کا جز تسلیم کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ جن پیغمبروں نے ہم کو اس حقیقت سے آشنا کیا ہے اُن کے قول کی صداقت تاریخی مسلمات کے مقابلہ میں زیادہ واقعیت رکھتی ہے۔ انسان کے وہ اجتماعی مصالح جن کا تعلق انسانیت عامہ کی تمدنی تنظیم سے ہے۔ ان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہم اس طرزِ فکر کو سچی عقیدت کے ساتھ تسلیم کر لیں اور اس طرح عبادتگذار قوم ہونے کا ثبوت دیں۔

اسلام کی الہامی تاریخ، واقعات کی ترتیب میں جس حد تک امداد دیتی ہے اُس کی رو سے یہ قیاس کرنا حق بجانب ہے کہ انسانی معاشرہ کی تخلیق کا اولین ربط خداوند تعالیٰ کے ارادہ سے ہے یہ کہنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ پہلے پہل تخلیقی ارادہ میں ظاہر ہوا۔ اس کے بعد

---

[1] قرآن عظیم۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ کیا نہیں گذرا انسان پر ایسا زمانہ جب وہ کچھ بھی نہ تھا۔

[2] قرآن عظیم وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ ہم نے آدم کو عظمت دی

اس معاشرہ نے ربانی معاہدہ کے اثر کو قبول کرلیا، اب اس معاشرہ میں تخلیق کے ربانی عمل کو دخل ہوا، جب یہ عمل مکمل ہوگیا تو اُس کی حیثیت تخلیقی معاشرہ کی ہوگئی تخلیق کے وقت اس کی انسانیت نے اپنے وجود کے خدوخال کو پوری طرح ظاہر کردیا۔ اس کے خانگی اوصاف بھی ظاہر ہوگئے، اور اس نے نسلی ارتقاء کے قانون کو بھی قبول کرلیا۔ اس مرحلہ پر آبائی معاشرہ ظہور میں آگیا۔ آدم علیہ السلام اس فطری خاندانی اور اسلامی معاشرہ کے سردار تھے اور ان کے بیٹے ہابیل، قابیل اور شیث اس معاشرہ کے اولین ارکان۔

"ربانی معاہدہ" انسانی تکوین سے پہلے

ربانی میثاق اس صورت میں ہوا کہ ایک طرف عرش حکومت تھا اور دوسری طرف بنی نوع انسان کی اجتماعی اور تخلیقی اہمیت جس کی سرداری کا تاج آدم کے سر پر تھا۔ انسانی تصویر زندگی کا آب و رنگ حاصل کرنے کے بعد گویائی کی دولت سے مالامال ہوئی عرش حکومت سے معاہدۂ ربانی کا مطالبہ ہوا، اجتماعی ہیئت نے صمیم قلب سے عہد کیا اور زبان دے کر عہد کو مکمل کردیا۔ اس ماحول کی نورانی مخلوق نے (جو اسی طرح ہم کو نظر نہیں آتی جس طرح فروغ نظر میں نقصان عارض ہونے کے بعد ایک عام انسان کو آسمان کے لاکھوں نورانی عناصر نظر نہیں آتے) انسان کے سامنے حکومت الٰہی کا تمثالی نمونہ پیش کیا۔ (امتثلوا کلھم الامر الالٰھی)[1] یہ پہلا دن تھا جب حکومت الٰہی کے طاقتور تصور نے انسانی معاشرہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ کمال کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے ظہور کے لیے خود راہ پیدا کرلیتا ہے۔ یہ کام بھی قدرت کے منشائے کمال کا پہلا مظاہرہ ثابت ہوا۔

آدمؑ کو سب سے پہلے جو عطیہ ملا وہ علم اشیاء[2] تھا۔ علم کے بعد معاشرہ کی تنظیم کے لیے جو بنیادی

---

[1] تاریخ طبری ج ۱ ص ۴۰ و ۶۲ طبع حسینیہ مصر۔ تاریخ الکامل ج ۱ ص ۱۵

[2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر الدمشقی (۷۷۴ھ) جلد اول ص ۹۰-۹۱۔

بات ظہور میں آئی۔ وہ ربانی طاقت اور انسان کی اجتماعی ہیئت کے درمیان "معاہدۂ اطاعت"[۵۱] تھا۔ فرمانروا اور انسانیت عامہ کے افراد کے درمیان یہ پہلا ربط تھا جس کی وجہ سے انسانی ذمہ داریوں کے دنیاوی پہلو میں اجتماعی معاشرہ کی پوری تصویر نظر آنے لگی۔

مورخ ابن اثیر نے ایک حدیث کو اس نظریہ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم پہلے متمدن انسان تھے۔ آدم پہلے پیغمبر اور رہنمائے مذہب تھے۔ آدم پہلے شخص تھے جنہوں نے معاشرتی قوانین کو معاشی دائرہ[۵۲] میں قبول کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ آدم کی تخلیق کے ربانی عوامل میں حکومت (انسان کی امامت اور خلافت) کا قطعی تصور ابتدا ہی سے شامل تھا۔ ولقد کرمنا بنی آدم کے قانونی اعلان نے انسان کی سیاسی شرافت کو شرعی اہمیت دی جب سیاسی اختیارات کی دستاویز ملی تو اس کے لیے پہلا فرمان ان الفاظ میں صادر ہوا انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ (ہم روئے زمین کے لیے اپنا نائب السلطنت مقرر کرنے والے ہیں۔

فطری سیاست کا ابتدائی ظہور

اس تفصیل سے اسلامی حکومت کے قدیم تاریخی اور سیاسی تصور کا امتیاز صاف[۵۳] طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ کے نظریہ میں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں انسان کی حالت مکمل تھی۔ حضرت آدم کا وجود اس معیار کمال کو پوری طرح ظاہر کر دیتا ہے یہ بھی صحیح ہے کہ بے اعتدالی کا بازار گرم ہوا تو حکومت منظر عام پر آئی لیکن حکومت کا وجدان اس امر کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے کہ قتل و قتال اور لوٹ مار سے پریشان ہو کر لوگ ایک جگہ جمع ہوئے اور حکمراں کو منتخب کیا گیا۔ ہمارا تاریخی رجحان یہ ہے کہ حکومت اول ہی دن سے

---

۵۱ تاریخ الامم والملوک ابن جریر طبری۔ ذکر آدمؑ ج ۱ ص ۸۷ مطبوعہ حسینیہ مصر

۵۲ تاریخ الکامل۔ ذکر آدمؑ ص ۱۷۔ تاریخ طبری ص ۷۵ روایت ابوذر غفاریؓ

۵۳ مبادی سیاسیات شروانی۔ ارتقائے مملکت باب ۳ ص ۳۲۔

موجود تھی۔ حکومت الٰہی کا اولین نمائندہ اور نائب السلطنت بجائے خود اختیارات کے ساتھ موجود تھا اور وہ پسندیدہ، معیاری اور منتخب انسان تھا اور انسانیت کا کامل نمونہ۔ جب انسانی سرشت کا شریف رجحان بدی کے حملہ سے ہلاک ہوگیا اور پہلا قتل وقوع پذیر ہوا تو خلیفۃ اللہ نے اپنے تمدنی ماحول میں اپنے فرائض کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ یہ درست ہے کہ ان فرائض کی تکمیل میں سیاسی سے زیادہ تمدنی رُخ نمایاں تھا لیکن اس تمدنی اقدام کی بنا ابتدائی حکومت کے واجبات میں سے ایک واجبی ذمہ داری کو پورا کرنا تھا اس سے علامہ منصور انصاری کی اُس رائے کی صحت بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ انسانیت عامہ نے ایک اُمت (سیاسی معاشرہ) کی حیثیت سے مملکت کی ذمہ داریوں کے بارگراں کا تحمل کرنے کی قوت میں آہستہ آہستہ ترقی کی ہے مقصود یہ ہے کہ اصل قوت موجود تھی مگر اس میں ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق ترقی ہوتی رہی اور یہ ارتقائی عمل عہد محمدی میں پورا ہو کر دنیا کے سامنے آگیا۔

آدم کی خاندانی ہیئت میں سب سے پہلے ربانی حکومت کا قانون اس وقت میدان عمل میں آیا جب انسانی فطرت کو "احسن تقویم" (معیار احسن) سے "اسفل السافلین" پستی کے انتہائی قعر میں گرنے کا موقع ملا۔ اس موقع کی نمائش قتل سے ہوئی۔ یہ پہلا قتل تھا جس نے اُس ضرورت کو ظاہر کیا جس کی بنا پر پیغمبروں کے ظہور کا قانون نافذ ہوا تھا۔

انسانی معاشرہ کی تقسیم عصر آدم اور عہد شیث کے درمیانی دور میں یہ ابتدائی معاشرہ دو شاخوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک شاخ قابیل ابن آدم کی اولاد تھی تو دوسری شیث ابن آدم کی۔ قابیل انسانی معاشرہ میں قتل و تشدد کا پہلا موجد ہے۔ اسی لیے اس کو خلافت کے منصب سے محرومی نصیب ہوئی۔ بعد کے ارتقائی دور میں یہ دونوں شاخیں صاف نمایاں ہیں۔ انسانی معاشرہ کی اسی تقسیم

---

[1] تاریخ طبری روایت محمد بن اسحق ص ۷۔ [2] تاریخ الکامل ابن اثیر الجزری ص ۱۵، ۱۶ و ۱۷

سے پہلے پہل حکومت کی ابتدائی تقسیم بروئے کار آئی ربانی نظریہ کے مقابلہ میں انسانی نظریہ میدان میں آیا اور خلافت عظمیٰ کے مقابلہ میں دنیاوی تصورِ حکومت پیدا ہوا۔[۱]

انبیاء کی سلطنتیں

خلافت آدم

فطری سلطنت کی تاریخ میں پہلی سلطنت سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانہ میں قائم ہوئی علم، اطاعت[۲] اور امانت، یہ تین مفہوم ابتداء سے اس سلطنت میں موجود تھے۔ جہاں تک عملی سیاسیات کا تعلق ہے اس حکومت کی ذمہ داری اول درجہ پر امانت[۳] کی حیثیت رکھتی تھی جس کی سربراہی کا فخر علم کو حاصل تھا۔ انسان نے اس امانت کو قبول کر کے جس حوصلہ اور بے جگری کا ثبوت دیا تھا اس کو خدا کے دربار میں درجہ قبول حاصل ہونا تھا ہو کر رہا۔ اس حوصلے نے انسان کو تمام کائنات پر فائق کر دیا اور یہی وہ حوصلہ تھا جس کی بنا پر انسان کو فطری حکومت کے دائرہ سیاست میں حکومت الٰہی کی نیابت کا منصب عظیم حاصل ہوا، اور آدم علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء یکے بعد دیگرے اس منصب پر فائز ہوتے رہے۔

علامہ قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتی اپنی عالمانہ تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت آدم روئے زمین پر خلیفۃ اللہ کے منصب پر متمکن تھے۔ خلافت الٰہی کے قانون کا قیام، احکام کا نفاذ مقدمات کی اپیلوں کی سماعت ان کی مقررہ ذمہ داریاں تھیں اور بندگانِ خدا کی رہنمائی اور اللہ سے ان کا عمیق تعلق قائم کر دینا ان کا کام تھا۔[۴]

---

[۱] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۲۰ تا ۴۱۔ [۲] تاریخ طبری ذکر اخنوخ ج ۱ ص ۸۷۔ تفسیر کبیر امام رازی ج ۱ ص ۳۰۲۔ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۱ ص ۹۱

[۳] تاریخ الکامل ابن اثیر عہد آدم فی الدنیا ج ۱ ص ۱۵۔

[۴] تفسیر مظہری پ سورہ ۲ ص ۴۹ جلد اول۔

آدم علیہ السلام کی دو حیثیتیں زیادہ نمایاں ہیں۔ پہلی حیثیت تو یہ ہے کہ وہ خلافۃ اللہ کے منصب عظیم پر فائز ہونے والوں میں پہلے انسان ہیں دوسری حیثیت یہ ہے کہ ان کی خلافت جس سیاسی تنظیم پر مبنی ہے اس کا تعلق آبائی معاشرہ سے ہے۔ اور یہ تعلق ایسا ہے جس کے ماتحت تمام انبیاء خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے آجاتے ہیں۔

علامہ ابوحیان اندلسی نے آدم علیہ السلام کے سیاسی منصب پر اپنی رائے جس خوبی سے ظاہر کی ہے اُس سے خلافت الٰہی کا سیاسی، تمدنی اور عمرانی رجحان بخوبی سامنے آجاتا ہے اور ہمیں یہ معلوم کرنے میں سہولت پیدا ہوجاتی ہے کہ انبیاء کی مقدس روحانی ذمہ داریوں میں ترک دنیا کی جگہ دنیا سے تعلق رکھنا ایک مستقل ذمہ داری تھی جس کا تعلق سیاسی درجہ میں ربانی مطمح نظر سے تھا۔ دنیا میں خدا کی حکومت کے نیابتی واجبات کو پورا کرنا۔ سچائی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا، دنیا کو بنانا سنوارنا، دنیا کی سرسبزی اور شادابی کو سدابہار بنانے میں حصہ لینا انبیاء کے دائرۂ فرائض میں اسی طرح داخل تھا جس طرح دنیا سے یکسو ہوکر خاص اوقات میں خدا سے ہمکلام ہونا۔

ابوحیان خلیفہ کے لفظ کی معنوی قوت اور سیاسی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"والخلیفۃ قیل ھو آدم لانہ خلیفۃ اللہ تعالیٰ، والانبیاء ھم خلائف اللہ فی ارضہ واقتصر آدم لانہ ابوالخلائف (آدم خلیفۃ اللہ ہیں اور تمام انبیاء روئے زمین خلافت الٰہی کے نیابتی منصب پر فائز ہیں۔ قرآن میں آدم کے نام کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ تمام خلفاء کے باپ ہیں)

اس کے بعد خلیفہ کی اصطلاحی تعریف بیان کردی گئی ہے۔ خلیفہ وہ ہستی ہے جس کی طرف روئے زمین کے انسانوں کی ذمہ داری اور ان کے کاموں کی تدبیر و تنظیم منتقل ہو۔ اور وہ وجود جو باشندگان ارض

---

۱ کشاف زمخشری ج ۱ ص ۶۱ ۲ کشاف زمخشری ج ۱ ص ۶۱ ۳ البحر المحیط ج ۱ ص ۱۴۰۔ لفظ ابوالخلائف

۴ الذریعہ الی مکارم الشریعہ ب ۳۔ ص ۵۵

۵ دیکھو روایت ابن مسعود اور ابن عباس (بحرالمحیط)

کے مصالح عامہ کا نگراں ہو جس طرح قیصر روم کی حکومت کا، کسریٰ فارس کی حکومت کا اور تبع یمن کی حکومت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔[1] خلیفہ کے عملی واجبات کیا ہیں؟ اس کے متعلق یہ الفاظ موجود ہیں۔

(۱) حق اور عدل کی حکومت کو قائم رکھنا

(۲) روئے زمین کی عمرانیت کو زندہ کرنا۔ زراعت کو ترقی دینا۔ بستیاں بسانا۔ نہریں جاری کرنا۔[1]

علامہ زمخشری بھی خلافت انبیاء کے تسلسل کو تسلیم کرتے ہیں اور حضرت آدم کی طرح جملہ پیغمبروں کو نیابتی طرز حکومت کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس تفصیل سے آدم علیہ السلام کے منصب نبوت اور عہدہ حکومت کے ہر دو پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فطری حکومت کے نائب السلطنت ہونے کے اعتبار سے ان کی ایک حیثیت تو یہ تھی کہ وہ سلطنت ارضی کے امام (رہنمائے حکومت) (Leader of the State) تھے۔ دوسری حیثیت یہ تھی کہ رسول تھے اور خدا کے قوانین کے حامل تھے ربانی قانون کے اکیس الہامی صحیفے ان کے ہاتھ میں تھے[3] اور انہی پر ابتدائی معاشرہ کی بنیاد قائم ہوئی[4] خلیفۃ اللہ کے عام خطاب کے علاوہ ان کا خاص خطاب "صفی اللہ"[4] تھا

بنی آدم کے آبائی معاشرہ نے دوسرے دور میں داخل ہو کر اجتماعی ارتقار کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔ حضرت شیث فطری حکومت کے سلسلہ تنظیم کی دوسری کڑی تھے۔

ابن الاثیر نے اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات پیش کرتے ہوئے فطری حکومت کے اولین معاشرہ کے حقیقی وجود کو ثابت کر دیا ہے۔ ان واقعات میں چند باتیں نمایاں[5] ہیں۔

---

[1] البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۱ ص ۱۴۰   [2] أئمة يهدون بأمرنا (قرآن حکیم)

[3] تاریخ طبری ج ۱ ص ۷۵ - تاریخ ابن الاثیر ج ۱ ص ۱۷   [4] تاریخ طبری ج ۱ ص ۸۰

[5] دیکھو تاریخ الکامل ابن اثیر (المتوفی سنہ ۶۳۰ھ) جلد اول ص ۸۰

(۱) حضرت آدم اولین متمدن انسان کی حیثیت سے ابتدائی انسانی ہیئت پر منجانب اللہ اقتدار رکھتے تھے۔ (ص ۱۰)

(۲) حضرت آدم کو فطری حکومت کی جو ذمہ داری حاصل تھی انہوں نے اس کو سیاسی وصیت کے ذریعے سے شیث کی طرف منتقل کیا۔ یہ ذمہ داری سرتاسر حکومت کی ذمہ داری تھی۔ (ص ۱۷، ۱۸، ۱۹)

(۳) "شیثؑ" ہبت اللہ کے خطاب سے سرفراز کیے گئے (ص ۱۷)

(۴) شیثؑ کی تنفیذی حکومت اور عاملانہ قوت جس ربانی قانون پر مبنی تھی وہ پچاس[۵] صحیفوں پر مشتمل تھا۔ (ص ۱۷)

پیغمبر اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول سے ہم یہ رائے اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بنی نوع انسان کی تنظیم کا وہ کام جو آخرت کے زندہ تصور کے ماتحت سیاست ومعیشت پر اثر انداز رہا ہے۔ اپنے اندر ایک تسلسل رکھتا ہے۔ اس تسلسل کے عناصر ترکیبی کا اظہار ان انبیاء سے ہوتا ہے جن کی معلوم شدہ تعداد ایک لاکھ چوبیس[۱] ہزار ہے۔ قرآن کی رو سے اجتماعی ہیئت کے یہ برگزیدہ اور ذمہ دار افراد دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کا علم ہم کو حاصل ہے اور کچھ وہ جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں[۲]۔ ہم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ دنیا کی عمر کتنی ہے اور فطری حکومت کا سیاسی دور کتنی صدیوں پر مشتمل ہے لیکن انبیاء کی تعداد سے دنیا کی قدامت اور انسانی معاشرہ کی تاریخی قدر و قیمت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

خلافت شیث دنیا کی اس طویل عمر کے طویل دور میں حضرت شیث کی زندگی میں سیاسی کیفیات زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ حضرت آدم نے اپنی سیاسی سیادت کو ایک ایسے رسمی وثیقہ کے ذریعہ سے حضرت شیث کو سپرد کیا جس کو قانونی مصالح کے لحاظ سے پوشیدہ رکھنا ضرور سمجھا گیا

---

[۱] تاریخ الکامل ابن الاثیر ج ۱ ص ۱۷۔ [۲] قرآن عظیم۔ ورسلا قد قصصنٰھم علیک من قبل ورسلا لم نقصص علیک (پ ۶۔ النساء)

تھا۔ اس طرح مملکت اور ریاست (State) کا نیابتی منصب حضرت شیثؑ کو حاصل ہوا۔ مورخ ابن الاثیر صاف الفاظ میں اس سیاسی واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔

لما حضرت اٰدم الوفاۃ	جب آدم کا انتقال ہوگیا تو شیث کو حکومت ملی اور
عہد الی شیث	آدم کے بعد ریاست (اسٹیٹ State) کا نظم
وصارت الریاست بعد اٰدم الیہ	اُن کے ہاتھ میں آگیا۔

حرم امن کی تعمیر

حضرت شیث نے اپنے عہد میں جو عمرانی آثار چھوڑے اُن میں کعبۃ اللہ کی عمارت کو عظیم اہمیت حاصل تھی۔ اس عمارت کو پتھروں اور مٹی کے امتزاج سے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ خدا کا پہلا گھر تھا جو دنیا میں امن عامہ کے مطمع نظر کو پیش کرنے کے لیے منشاءِ خداوندی کے مطابق وصی آدم، ہبۃ اللہ، حضرت شیث نے تعمیر کیا۔ دنیا کے دار السلطنت میں یہ اولین ایوان تھا جس کو ہم فطری حکومت کا حرم امن تسلیم کرتے ہیں[1]۔

حضرت شیثؑ کے زمانۂ خلافت میں ایک مرکزی تعمیر حکومت کے اجتماعی تصور کے لیے کوئی معمولی تائید نہ تھی لیکن اس کے فوراً ہی بعد حضرت شیثؑ کی عاملانہ ذمہ داریوں کا انوش ابن شیث کی طرف منتقل ہو جانا بنی آدم کے ابتدائی دور میں حکومت کے وجود کا ایک اور ثبوت تھا۔ انوش نے اپنے محترم باپ کی طرف سے انسانی معاشرہ کی ذمہ داری کو قبول کیا۔ ذمہ داری کا یہ انتقال بھی دستاویزی وصیت کے مطابق رونما ہوا۔ اس سلسلہ میں شیثؑ نے اپنے محترم باپ آدم کی قانونی نظیر کی پوری پوری پیروی کی۔

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:۔

قام انوش بن شیث بعد موت	انوش میدانِ کار میں آئے اور اُنھوں نے اپنے

---

[1] تاریخ الکامل ذکر شیث ج ۱ ص ۱۷ [2] ایضاً ص ۱۹

ابیہ بسیاست الملک[۱] باپ شیث کے بعد مملکہ کی سیاست کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مورخ طبری کا بیان ہے کہ انوش نے اپنے باپ کے طرز حکومت اور منہاج سیاست میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ حضرت شیث کے طرز پر کام جاری رہا۔

خلافت ادریس

آدم علیہ السلام کی خلافت عظمیٰ تمام دنیاوی حکومتوں سے علیحدہ ترقی کے منازل طے کرتے کرتے حنوخ کے دور میں داخل ہوتی ہے۔ حنوخ[۲] حضرت ادریسؑ کا نام ہے۔ انوش کے بعد حضرت ادریس خدائی سلطنت کے نائب السلطنت قرار پاتے ہیں اور خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں

حضرت ادریس بنی آدم میں پہلے باضابطہ پیغمبر قرار دیے گئے ہیں۔ تاریخ کے صفحات واقعات کی جزئیات کا اعتراف کرنے میں زیادہ فیاض ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم کے سلسلہ حکومت کی تفصیل تاریخ میں موجود ہے۔ لیکن قرآن کا ضابطۂ اجتماعی آدمؑ کے بعد صرف ادریس علیہ السلام کی خلافت اور سیاسی نظام کا ذکر کرتا ہے۔ ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ آدم کی ریاست ایک ذمہ داری کی حیثیت سے دستاویزات وصیت کے مطابق سلسلہ بہ سلسلہ حضرت ادریس تک پہنچی۔ آدم نے پہلے ہابیل کو وصیت کی۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کردیا تو یہ وصیت شیث کی طرف منتقل ہوگئی۔ شیث نے انوش کو، انوش نے قینان کو، قینان نے مہلائیل کو، مہلائیل نے یارد کو اور یارد نے اپنے لڑکے خنوخ (ادریس) کو وصیت کر کے حکومت کا نظام سپرد کیا۔ قرآن اس تاریخی سلسلہ کی تردید نہیں کرتا لیکن یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے بعد بنی آدم میں ادریس کو باضابطہ خلافت اور پیغمبری حاصل ہوئی۔

---

[۱] تاریخ الکامل ج ۱ ص ۱۹۔ تاریخ طبری ج ۱ ص ۸۱۔ [۲] حنوخ۔ دیکھو تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۲۰-۲۱ تاریخ طبری ج ۱ ص ۸۵-۸۶۔ قصص الانبیا استاذ عبدالوہاب النجار طبع ثانی (۱۳۵۵ھ) امیر فاروق مصر۔ استاذ عبدالوہاب لکھتے ہیں کہ توریت کے عبرانی نسخہ میں حضرت ادریس کا نام خنوع درج ہے اور عربی ترجمہ میں اخنوع۔

اس زمانہ کی تاریخ سے دو باتوں کا خاص طور پر سراغ ملتا ہے۔

(۱) ملک سے مملکت قائم ہوئی۔ پہلے انسان کو اشیاء کا علم حاصل ہوا۔ علم اشیاء کے بعد انسان نے اشیاء کو اپنی ملک بنایا۔ بہت سی املاک نے نظم اختیار کر کے انسانی سطح نظر میں اجتماعیات کی صورت پیدا کی۔ اور اجتماعی تصور نے مملکت کو وجود عطا کیا۔

(۲) سیاسی معاشرہ عسکری رجحان سے آشنا ہوا اور عسکری فتوحات سے سلطنت کے قیام میں مدد حاصل ہوئی۔

حضرت آدم کے زمانہ میں حکمت عملی کا رجحان ملک اور مملکت کے نظریہ سے وابستہ رہا لیکن حضرت ادریس کے دور کو اس اعتبار سے خصوصیت حاصل ہے کہ سیاسی معاشرہ نے ان کے عہد میں اسلامی تصور کے ماتحت اپنے عسکری رجحان کو پہلی مرتبہ ظاہر کیا۔ یہ کہنا چاہیے کہ دنیا کو خدائے واحد کی اطاعت کے لیے فتح کرنے کی پہلی مہم کو اسی دور میں شرف آغاز حاصل ہوا۔

ھو اول من جاھد فی	ادریس علیہ السلام پہلے انسان ہیں جنہوں نے اللہ کے رستے
سبیل اللہ وقطع الثیاب	میں جہاد کیا اور فوجوں کو حرکت دی اور کپڑے کی قطع اور
ـــــ دعا ادریس	خیاطی کو ایجاد کیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو حکومت الٰہی کے
قومہ ووعظھم و	اعتراف کی دعوت دی، ان میں تبلیغ کا کام کیا اور
امرھم بطاعۃ اللہ	حکومت کے اس رجحان کو ظاہر کیا جس کا تعلق اللہ
(تاریخ ابن اثیر)	کی اطاعت سے ہے۔

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ ابوذر! چار پیغمبر ہیں جن میں تین سریانی ہیں آدم، شیث اور حنوخ۔ حنوخ پہلے انسان ہیں جنہوں نے قلم کو تحریر کے

لیے استعمال کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر تیس صحیفے نازل فرمائے تھے

خلافت نوحؑ اور حکومتِ الٰہی

نوح علیہ السلام ۱۲۶ سنہ (وفات آدم) میں پیدا ہوئے۔ ان کے دور میں سلطنت کاربانی نظریہ زیادہ منظم صورت میں اور زیادہ قطعیت کے ساتھ دنیا کے سامنے آیا۔ اسلام اس سے پہلے ہی حکومت کے میدان میں آنے کے لیے اپنے ضروری اوصاف کو ظاہر کر چکا تھا۔ بدقسمتی سے انسانی معاشرہ میں وجدان کی خرابی سے فساد کی جو صورت نمایاں ہو چکی تھی وہ عصر نوحؑ میں منظم سرکشی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ قوم نوحؑ نے اللہ کے فطری قوانین اور لازوال احکام کی صداقتوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پیغمبر نے زبردست عزیمت کے ساتھ اپنے تقرر کی دستاویز پیش کی۔ فساد کے خلاف صلاح و فلاح کی حکمت عملی کو پیش کیا لیکن اکثریت کی گمراہی شکل ہی سے راہ راست پر آتی ہے۔ قوم نوح کی بڑی تعداد آمادۂ فساد تھی اور مائل بہ فساد رہی

اسلامی معاشرہ میں سیاسی تنظیم کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کی حکومت کے دائرہ میں ہر اچھا کام کیا جائے اور ہر بُرے کام سے اجتناب کیا جائے۔ قوم نوحؑ نے اس بنیاد ہی کو کھود کر پھینک دیا اور بدکاریوں کو آزادی دے دی گئی۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ ربانی حکومت سے بغاوت اور عرش عظیم کے احکام سے سرتابی اس قوم کا مستقل فیصلہ تھا۔ ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ صورت حال کے اس نازک پہلو ہی نے نوح علیہ السلام کو اصلاح احوال کے دائرہ میں لا کھڑا کیا۔ وہ قوم کے مقابلہ پر محاذ قائم کر کے نکلے اُنھوں نے اپنی قوم کو نتائج سے آگاہ کیا۔ بڑے دن کی سزا سے ڈرایا

---

[۱] تاریخ الکامل ابن الاثیر ذکر نوح ج ۱ ص ۲۴-۲۵ - البدایۃ والنہایہ ابن کثیر دمشقی قصہ نوح علیہ السلام ج ۱ ص ۱۰۰ و ۱۱۸ تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۹۰ [۲] ابلغکم رسٰلٰت ربی وانصح لکم (قرآن عظیم)

[۳] الذین کذبوا باٰیٰتنا انھم کانوا قوم سوء فاغرقنھم اجمعین (قرآن عظیم)

ممکن حد تک سرزنش کی اور حکومتِ الٰہی کے احکام کی اطاعت کی طرف بُلایا حضرت نوحؑ نے ان کے سامنے چار باتیں پیش کیں۔

(۱) یٰقوم لیس بی ضلالۃ ولکنی رسول رب العٰلمین۔ اے قوم میں گمراہی نہیں لایا ہوں البتہ میں دنیا جہان کے پروردگار فرمانروائے مطلق کا سفیر ہوں (۲) ابلغکم رسٰلٰت ربی وانصح لکم واعلم من اللہ ما لا تعلمون۔ میں تم کو فرمانروائے عالم کے فرمان پہنچا رہا ہوں تمہاری خیرخواہی کی بنا پر تم کو نصیحت کر رہا ہوں اور میں اللہ کی ان باتوں سے باخبر اور آگاہ ہوں جن سے تم خبردار نہیں ہو۔ (۳) ان اعبدوا اللہ واتقوہ۔ اللہ کی عبادت کرو اور خدا ترسی کے قانون کو قبول کرو۔ واطیعون اور اللہ کی حکمبرداری اور اطاعت کرو یہی معافی اور نجات کی راہ ہے

معاہدۂ[2] ربانی کے ماتحت حضرت نوحؑ نے اپنی ذمہ داری کو پورا کر دیا۔ معاہدہ جس قدر مضبوط اور سخت تھا خلیفۃ اللہ نے بغاوت کے مقابلہ میں اسی قدر شدید مقاومت کی لیکن گمراہ قوم کی گمراہ اکثریت نے نوحؑ کی پیغمبرانہ ذمہ داری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ خدا کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ یہ لوگ سوسائٹی کا فاسد تلچھٹ ہیں ان کو زمین سے زیادہ زمین کی تہ میں رہنے کا حق ہے۔ پیغمبر نے دعا کی پروردگار ان منکر اور کافر اشخاص کو بغاوت کی سزا مے[3]۔ خدا کی حکومت کا تیور طوفان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں نے جو سوسائٹی کا فرمانبردار عنصر تھے سفینۂ نوحؑ میں پناہ لی۔ قدرت نے اعلان کر دیا کہ آج خدا کی حکومت سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ سرکش انسان غرق کر دیے گئے اور فرمانبردار نسل خدا کی منشاء کے مطابق حضرت نوحؑ کی پیغمبرانہ تدبیر سے زندہ رہی۔ امواج کے بے پناہ مد و جزر نے منکروں کو اپنی قید میں لے لیا۔ سرکش ہستیاں غرق ہو کر خدا جانے

---

[1] تاریخ طبری ج ۱ ص ۹۰ طبع حسینیہ [2] واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح۔ الخ ـــــ واخذنا منھم میثاقا غلیظا۔

[3] قرآن عظیم۔ سورۂ نوح۔ دعائے نوح۔

کہاں سے کہاں غائب ہوگئیں۔ کوئی نہ تھا جو خدا کی مرضی کے اُس رُخ کو بدل دیتا جو تاریخ کے ایک عظیم حادثہ کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اگر نجات پا سکے اور غرق ہونے سے آزادی حاصل کر سکے تو صرف وہی انسان جن پر خدا نے رحم کیا (لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم)

حضرت نوحؑ کو نیابتی حکومت کی جو ذمہ داریاں حاصل تھیں۔ رفقائے سفینہ بھی ان میں حصہ دار تھے۔ جو لوگ طوفان سے بچ کر زندہ رہے وہی خلافت کے مستقبل کے امین قرار پائے۔

قرآنِ عظیم کا بیان ہے کہ نوح اور ان کے رفقا کو نجات دی گئی۔ ان کو دنیا کے لیے ایک علامت[1] قرار دیا گیا۔ اور خلافت[2] وحکومت کی ذمہ داریاں سپرد کر دی گئیں۔ نوح کی اچھی نسل کو بچا لیا گیا اور وہی آج تک اس دنیا کے پھلنے پھولنے کا ذریعہ بنی[3]۔

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے جماعت انسانی کو ذمہ داریوں کے اعتبار سے چند طبقوں میں تقسیم کر دیا[4] تھا۔ یہ اس لیے تاکہ حکومت کے کاموں کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق انجام تک پہنچایا جا سکے۔

خدا کی مرضی یہی تھی کہ انسان اپنے ابتدائی دور میں تقسیم کار کا اصول ایجاد کرے اور کام کرنے کی نئی صلاحیتیں پیدا کرنے کے بعد نئے طریق سے روشناس ہو۔ اسلامی عہد کے مستند علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے عصر سے نوح علیہ السلام کے ظہور تک دس صدی کے عرصہ میں اجتماعی دائرہ میں کوئی خرابی رونما نہیں ہوئی، اگر قابیل کے اقدامِ قتل کو نظر انداز کر دیا

---

[1] وجعلنٰھا اٰیۃً للعٰلمین۔ [2] وجعلنٰھم خلائف

[3] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر الدمشقی (۷۷۴ھ) ج ۱ ص ۱۱۳ و ۱۱۵۔

[4] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۲۵۔

جائے تو یہ کہا جائیگا کہ اس تمام دور میں سیاسی معاشرہ قومی توحید کے اصول پر زندگی بسر کرنے میں مصروف تھا۔ روئے زمین پر ایک ہی قوم تھی اور یہ تھی "خدا کی قوم" جو خدا کے نام پر زندہ تھی اور خدا کے نام پر مرنے کے لیے تیار تھی عصر نوح میں پہلی مرتبہ انسانوں نے اجتماعی شکل میں حق سے سرتابی کی اور حق و باطل کا پہلا معرکہ حضرت نوح کی امامت میں بپا ہوا۔ حق کو کامیابی اور باطل کو قانونِ قدرت کے مطابق ناکامی ہوئی۔

اگر اس عہد کے سیاسی اور تمدنی میلان کو دیکھا جائے تو اس میں معاشی کیفیات زیادہ نمایاں نظر آئینگی۔ نوح علیہ السلام کا زمانہ درحقیقت معاشیات کا زمانہ تھا۔ انسان کی مجلسی زندگی کے اطراف و جوانب ضرورتوں کے سانچوں میں ڈھل رہے تھے۔ حکومت کی غایت یہ تھی کہ انسان خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر اپنی زندگی کی نو پیدا مشین کو حرکت دے اور اگر اس ابتدائی زمانہ میں سیاست کا کوئی مقصد تھا تو وہ صرف یہ تھا کہ انسانی نسل اپنی قدر و قیمت کو محسوس کرے اور ان تدبیروں کو دل میں جگہ دے جن سے عام انسانی مفاد وابستہ ہے۔

حضرت نوح نے اپنی قوم کے سامنے دو نعرے لگائے تھے "خدا سے ڈرو" "خدا کے اقتدار کی اطاعت کرو"۔ ان نعروں سے یقیناً خدا کی کوئی غرض وابستہ نہ تھی۔ نہ خدا کے نائب السلطنت کا مفاد ان سے وابستہ تھا۔ قرآن میں نوح کے نام سے جو سورت نازل ہوئی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ پیغمبر خدا کی عام تاریخی کوششوں کا مآل انسان کے مفاد کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ خدا کے نائب نے انسانوں سے خطاب کرکے جو کچھ کہا اس کا مستند خلاصہ جو اس خیال کے لیے قطعی سند ہو سکتا ہے یہاں درج کرنا مناسب ہے۔

"میری قوم کے انسانو! خدا کی اطاعت کرو غلطیوں پر ندامت کا اظہار کرو۔ خدا تم پر آسمان

لے ۵ تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۲۳ ذکر حضرت نوح۔

کی دھاریں چھوڑ دیگا، تمہارے مال و دولت کو کئی گنا کر دیگا تمہاری نسل کو بڑھا دیگا، تمہارے واسطے باغ لگا دیگا، نہریں جاری کر دیگا، تم آسمانوں کو دیکھو، نورانی چاند کی طرف نظر بلند کرو، روشن چراغ سورج پر غور کرو۔ اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بساط بنا دیا ہے۔ صرف اس لیے کہ تم اس کی کشادہ راہوں پر چلو۔[1]

ان الفاظ پر نظر ڈالنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے اجتماعی کاموں کی غایت انسانی سوسائٹی کی تنظیم اور انسان کا عام مفاد نہیں تھا۔

اس سلسلہ میں ایک آخری سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ معاشی زندگی کے اس عمرانی رجحان میں حکومت کا تصور کس حد تک موجود تھا۔ ابتدائی تفصیلات میں اس سوال کا کافی جواب موجود ہے۔ لیکن جواب کا ایک قطعی رُخ پیدا کرنے کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ نوح علیہ السلام ایک منتخب انسان تھے۔ ان کا ذکر آدم، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کے ساتھ آتا ہے۔ خدا کے منتخب، بلند درجہ اور پسندیدہ پیغمبروں کی صف میں نوح علیہ السلام کی شخصیت صاف طور پر اُس مقام پر آتی ہے جہاں حکومت و اقتدار کا تخت بچھا ہوا ہے۔ طوفان کے وقت حضرت نوح نے "انت احکم الحاکمین" کا نعرہ بلند کیا۔ اور اپنے پروردگار کو "حکمرانوں کا حکمراں" کہہ کر ندا دی۔ یہ تنہا ایک نعرہ اس دور کے تصورِ حکمرانی کا رُخ متعین کر دیتا ہے اور ہم اس نعرہ کو سُن کر صدیاں گذرنے کے بعد یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں۔ نوح علیہ السلام کے عصرِ خلافت میں حکومتِ الٰہی کا آفتاب انسانی دائرہ میں روشنی پھیلا رہا تھا۔

خلافت ہود علیہ السلام

عصرِ نوح میں نیابتی حکومت کے جو تصورات درجہ کمال پر پہنچ چکے تھے وہ ہود علیہ السلام کے

[1] قرآن عظیم سورۂ ہود طبع بجنور ص ۲۹۳۔

عصر خلافت[1] میں بھی نمایاں طور پر موجود تھے۔ طوفان نوح کے بعد نوح کی نسل میں نیابتی حکومت کا باقی رہنا، پھلنا پھولنا، اور مستقل صورت میں نظر آنا قدرتی امر تھا۔ نوح علیہ السلام کی وصیت[2] ان کی اولاد تک پہنچ چکی تھی اور ان میں سے صالح افراد جانتے تھے کہ امر الٰہی اور حکومت توحید کا بارِ عظیم اُن کی گردن پر آچکا ہے۔

ہود علیہ السلام قوم عاد کے ایک برگزیدہ فرد تھے۔ اور قوم عاد نوح علیہ السلام کے پوتے ارم کی اولاد تھی اور ارم ہی کی طرف منسوب تھی۔ انکا وطن احقاف (قلمروئے یمن) تھا۔ حافظ ابن کثیر ان کی تاریخی حیثیت کے متعلق کہتے ہیں کہ عاد عرب عاربہ[3] ہیں۔ ہود علیہ السلام کے سلسلہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ دور اوّل کے عاد ہیں۔ سام بن نوح کے بیٹے ارم کی اولاد میں ہیں۔ ساحلِ بحر کے قریب ریگستانی پہاڑوں کے علاقوں میں ان کی بود و باش تھی مضبوط ستونوں والے (خیموں میں) رہتے تھے۔ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تن من کے اعتبار سے زبردست اور طاقت کے اعتبار سے جیوٹ انسان تھے۔ قرآن میں ان کے متعلق یہ لفظ آتے ہیں "عادِ ارم؟ عظیم ستونوں والی قوم۔ تمام شہروں میں ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی۔ تن و توش کے اعتبار سے پرشکوہ[4]"

خلافت انبیاء کی تاریخ میں قوم ہود کی حیثیت کتنی اہم ہے اور حضرت ہود سے نیابتی حکومت کی کس قدر عظیم ذمہ داری وابستہ تھی اس کا اندازہ خلیفۃ اللہ فی الارض پیغمبر خدا حضرت ہود کے ان الفاظ سے کیجیے جو قوم ہود کے لیے عام تذکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عاد کے لوگو خدا کے اُس انعام کو یاد کرو کہ اُس نے قوم نوح کے بعد تم کو خلافت دی[5]۔
(قرآن عظیم۔ ۱۶۱ف)

---

[1] قصص الانبیاء۔ عبدالوہاب النجار ص ۶۷۔

[2] البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر (وصیت نوح) حدیث نبوی بروایت عبداللہ بن عمرو ج ۱ ص ۱۱۹۔

[3] البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر دمشقی ج ۱ ص ۱۲۰۔ مع کردستان العلمیہ ۱۳۴۸ھ (مصر)

[4] قرآن عظیم پ ۸ الاعراف ۔ پ ۳۰ الفجر ۸۹۔

علامہ سید سلیمان ندوی اپنی تحقیق کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں "قوم نوح کی بربادی کے بعد جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمراں جماعت وجود میں آئی قرآن کی زبان میں اسی کا نام عاد ہے۔"

عاد اُن سامی قبائل کا بڑا قبیلہ ہیں جنہوں نے جدید تحقیقات کے مطابق بابل مصر و شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں[1]۔

انسانی فطرت جس قدر اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اسی قدر انسانی تعقل میں پستی کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے، فطرت انسانی شرافت کی مشعل کو روشن رکھنا چاہتی ہے لیکن عقلی اقتدار جب صحیح رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے تو خالص طاغی حکومت کی شکل اختیار کر لیتا ہے قوم عاد بھی خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کر سکی۔ وجہ یہی تھی کہ اس نے ہود علیہ السلام کے بابِ خلافت اور ان کی قیادت سے علیحدگی اختیار کر لی[2]۔

پیغمبر نے کہا "میں فرمانروائے عالم کا رسول ہوں، سفیر ہوں، نمائندہ ہوں" قوم عاد کے افراد جو خلافت کو سرمایہ داری میں تبدیل کر چکے تھے اور عقل کی ترازو میں تل رہے تھے انہوں نے کہا۔ "ہود! تم پست درجے کے کم عقل انسان ہو۔ ہمارا گمان یہ ہے کہ تم جھوٹے بھی ہو۔ پیغمبر نے کہا (یٰقوم لیس بی سفاھۃ لکنی رسول رب العٰلمین الخ) اے قوم میں پست درجہ کی کم عقلی سے کر ظاہر نہیں ہوا، میں کائنات کے مالک اور پروردگار کا رسول ہوں، میں تم کو احکام ربانی پہنچا رہا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور امین ہوں"۔

پیغمبر نے خلافت کے واجبات کو حکیمانہ تحمل کے ساتھ یاد دلایا۔ اور کہا خدا نے تم کو حصہ بقدر جثہ دیا ہے تم کو نعمتوں کا سزاوار بنایا ہے۔ ان نعمتوں کو یاد رکھو ان کا حق ادا کرو۔ یہی

---

[2] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۳۰ [1] ارض القرآن علامہ سید سلیمان ندوی ج ۱ ص ۸ – ۱۲۷

کامیابی کی صورت[1] ہے۔

قوم عاد خلافت کو دنیاوی سلطنت کا رنگ دے چکی تھی اور انسانیت کے مذہبی میلانات سے کنارہ کش ہو کر غرور کی ترازو میں اپنا وزن کر رہی تھی۔ اسی خودسری اور تکبر کی حالت میں وہ یہ نعرہ بھی لگا بیٹھی ۔مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً قوت و زور میں ہم سے کون زیادہ ہے پیغمبر نے اصلاح حال کے لیے بادشاہوں کے تاج سے بھی زیادہ قیمتی بات کہی اگر تم حکومت الٰہی کے احکام اور خدا ترسی کے قوانین کا احترام کرو گے تو (یزدکم قوۃً الیٰ قوتکم) خدا تمہاری قوت سے زیادہ اور قوت دیگا۔ پیغمبر کو کہنا پڑا (اراکم قوم تجھلون) اب میں جان گیا کہ تم جاہل اور نادان سوسائٹی کے مانند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جاہل اتنی بات نہ سمجھ سکے کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے جس نے ان کو خلافت کی ذمہ داریوں کا اہل سمجھا وہ ان سے بھی زیادہ قوی ہے۔ تاریخ کی تحقیقات قرآن عظیم کے اس بیان کی پیروی کرتی ہیں کہ سلطنت عاد کو خدا کی طاقت نے ختم کر دیا اور ہوا کے طوفان نے اس کو ہلاک کر کے دنیا سے ناپید کر دیا[2]۔

اس عظیم تاریخی قوم کے زمانہ میں حکومت و سلطنت کا نیابتی تصور کتنا روشن تھا اس کا اندازہ پیغمبر کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:۔

> "میرا اعتماد اللہ پر ہے جو میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار اور فرمانروا ہے۔ کوئی بھی ایسا چلنے والا نہیں جس کی پیشانی اُس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ میرا پروردگار شاہراہ مستقیم پر ہے۔ اگر اس پر بھی تم انکار کرو تو میں جو احکام لے کر آیا ہوں وہ تم کو پہنچا چکا ہوں (ویستخلف ربی قوماً غیرکم ولا تضرونہ شیئاً) فرمانروائے عالم تمہارے علاوہ کسی اور کو خلافت (نیابتی حکومت) عطا کریگا

---

[1] قرآن عظیم سپ الاعراف ۔ [2] قرآن عظیم۔ حم سجدہ، احقاف، الحاقہ، البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۲۲، ۱۲۶ و ارض القرآن علامہ ندوی ج ۱ ص ۱۶۲۔

اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے[1]

ان الفاظ کے بعد حضرت ہود کے زمانۂ حکومت کے ربانی رجحانات بخوبی سامنے آجاتے ہیں۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام انبیاء کی طرح ہود علیہ السلام بھی خلافت عظمیٰ کے ربانی منصب پر فائز تھے۔

خلافت[2] صالح علیہ السلام

صالح علیہ السلام، حضرت ہودؑ کے بعد خلافتِ عظمیٰ کے منصب جلیل پر نمایاں ہوئے اور نیابتی حکومت کی ذمہ داریوں کے تسلسل کی ایک کڑی اُن کے ہاتھوں میں پہنچ کر مکمل ہوئی۔ حضرت صالح قوم ثمود میں مسند خلافت پر متمکن تھے۔ خداوند معظم اس تاریخی حقیقت کو صالح علیہ السلام کی زبان سے ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد (قرآن عظیم)	یاد کرو۔ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو (نیابتی حکومت) دی۔

ثمود نسلاً عاد کے ہم جد اور حکومت کے معاملہ میں اپنے پیشروؤں کے وارث تھے۔ ثمود کی زندگی میں نظریۂ خلافت کا عمل برابر کارفرما رہا، قرآن عظیم کے الہامی بیان سے اس قوم کے اجتماعی اوصاف کا جو حال معلوم ہوتا ہے اُس میں چند باتیں سیاسی اصول کے طور پر سمجھ میں آتی ہیں

قوم ثمود خلافت اور حکومت کے مطمح نظر کی حامل تھی۔ اس قوم کا تمدن ترقی کرکے کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا، اس دور کے انسان اپنے قلمروئے حکومت میں عمرانی کاموں کی بنیاد رکھ

---

[1] قرآن عظیم سورۂ ہود

[2] قرآن عظیم۔ الاعراف، سورۂ ہود، سورۂ شعراء، سورہ الحجر۔ تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۱۱۵۔ تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۲۸۔ البدایۃ والنہایۃ ابن اثیر ج ۱ ص ۱۳۰، ۱۳۸۔ قصص الانبیاءؑ (نجار) ص ۷۸ و ۹۳۔ ارض القرآن علامہ سلیمان ندوی ص ۱۸۷ و ۱۸۹۔

چکے تھے۔ ان کے پاس انجینئرنگ کا فن بھی تھا۔ انہوں نے شہری عمرانیت کے دو دائرے بنائے شاداب میدانی علاقے جہاں ان کے ہاتھوں سے بڑے بڑے محلات کی بنیاد پڑی۔ پہاڑی مقامات جہاں انہوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنائے۔

خلافت کی حکمت عملی کے ماتحت دو باتیں خاص طور پر آئینی حیثیت میں ممتاز نظر آتی ہیں۔ قیامِ امن اور فساد کا خاتمہ۔ اس سلسلہ میں خلیفۂ وقت نے اپنی قوم کو ایک بات تو یہ یاد دلائی کہ تمہاری حکومت انسانی عقل و حکمت کی غلام نہیں بلکہ اس کا تعلق آزاد ربانی نظریہ سے ہے اور دوسری بات مطالبہ کی صورت میں پیش کی کہ روئے زمین کو فساد کی جولانگاہ نہ بناتے پھرو۔

ثمود کے انسانی معاشرہ میں وحدت پیدا کرنا پیغمبر کی حکمت عملی کا جز تھا لیکن اس کا امکان اس وقت ختم ہوگیا جب یہ قوم دو حصوں میں تقسیم ہوگئی متکبر سرمایہ دار اونچے طبقہ کے فرد لوگ اور وہ غریب کمزور عوام جنہوں نے پیغمبر کی تحریک میں حصّہ لیا۔

حق سے بغاوت کا نتیجہ ہر حال میں ہلاک ہونا ہے۔ قوم ثمود نے خلیفۃ اللہ سے بغاوت کی، خلافت کی ذمہ داریوں کو اس کی صحیح صورت میں ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ سرمایہ داری کا غرور ان کو کھا گیا، غریبوں سے نفرت ان کے دل میں جگہ پا گئی۔ قدرتِ الٰہی ان کی بغاوت کو کیسے برداشت کرتی دنیا کا ہر واقعہ خدا کی مرضی یا اُس کے فیصلہ کو ظاہر کرتا ہے۔ علاقہ حجر جہاں اس قوم کا وطن تھا زلزلہ سے تباہ ہوا۔ اور ثمود کی اجتماعی زندگی اسی میدان ترقی میں ختم ہوگئی جہاں اُس نے سر اُٹھایا تھا۔

خلافت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ اپنے شرف و مجد کے اعتبار سے تاریخ کی جلیل القدر اور جمیل الشان ہستی ہیں۔ دنیا کے کروڑوں انسان جن میں یہود، عیسائی اور مسلمان شامل ہیں عقیدت اور محبت کے پاکیزہ جذبات کے ساتھ حضرت ابراہیم کا نام لیتے ہیں۔ زبور، توریت، انجیل میں ابراہیم کی تاریخ حیات کا ذکر موجود ہے۔ قرآن کو نظر تحقیق سے دیکھیے تو حضرت ابراہیم کے نام کی ذہن و فکر کے آزاد گوشوں پر مسلط ہو جاتی ہے اور دل کی رگوں کا خون بائیں سمت سے دائیں سمت حرکت کرنے لگتا ہے۔ نگاہیں تمام مسافت کو طے کر کے منزل کو پا لیتی ہیں۔ دل کو دلپسند گوہر مقصود مل جاتا ہے اور دماغ اجتماعی زندگی کی سطح بلند پر حکومت و سلطنت کے نصب العین سے ربط پیدا کر لیتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے کاموں میں رشد و ہدایت کے ساتھ حکومت کی جبلی خواہش پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطنت ان کا پیدائشی حق تھا جو قدرتِ خداوندی کے یادگار زمانہ عطیہ کی حیثیت سے انہیں ملنا چاہیے تھا اور جو ان کے سلسلہ کے بلند پایہ انبیاء کو بالآخر مل کر رہا۔ انھوں نے خداوند کائنات سے اپنی موثر دعاؤں میں جو چیز مانگی وہ ایک امت، ایک سیاسی تنظیم ایک سچا مذہبی نظام۔ ایک اجتماعی ہیئت، با اقتدار اور خود مختار ریاست! کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔

حضرت ابراہیم کے تاریخی سفر جس تکوینی ارادہ کے ماتحت امیدوں اور امنگوں کے ساتھ جاری رہے اُن سے جو نتائج پیدا ہوئے اور اُن نتائج میں خدا کی مرضی جس درجہ موثر رہی اُس کا مطلب صاف شکل میں یہی ہے کہ حال کے کارخانہ میں حکومت الٰہی کا مستقبل بن رہا تھا۔ یہ وہ بات ہے جس کا اظہار ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ حیات کے ہر ایک باب سے

ہوتا ہے[1]۔

اگرچہ عصر ابراہیمؑ میں "ربانی سلطنت" قائم نہیں ہو سکی لیکن روئے زمین کے جابر حکمران نمرود کی آتشیں طاقت کا مقابلہ اس سلطنت کے بنیادی تصور ہی کا باضابطہ مظاہرہ تھا۔

خدا کے فیصلہ کے مطابق حکومت آلِ ابراہیمؑ کی قسمت سے تاج کا موتی بن چکی تھی۔ خداوند برتر آدم و نوح کی طرح آلِ ابراہیم اور آلِ عمران (ابراہیم اور عمران کی نسلوں کو اپنے انتخاب سے عظمت دے چکا تھا۔ ناممکن تھا کہ اس انتخاب کو حکومت کی تاریخ میں درجہ قبول حاصل نہ ہوتا۔

ابراہیمی زندگی کے پُر اثر پس منظر پر غور کیجیے دیکھیے کہ اس سے جن باتوں کا یقین پیدا ہوتا ہے وہ دنیا کے اجتماعی مطمح نظر کے مطابق ماضی و حال سے کتنا عمیق ربط رکھتی ہیں۔ اس مرحلہ پر ہمیں چند باتیں مخصوص شکل میں محسوس ہوتی ہیں۔

آبائی معاشرہ (۱) عصر آدم سے عصر نوح تک انسانی تنظیم کا میدان آبائی معاشرہ تھا۔ سوسائٹی دنیا جہان کی طرح تھی۔ جس کو خدا نے اپنے غیر مسئول ارادہ کے ماتحت پیدا کیا تھا۔ خدا نے اپنے اختیار اعلیٰ سے مجلسی عوامل۔ آبائی تصورات (جو آغاز تخلیق کا منطقی نتیجہ ہے) اور نیابتی حکومت کے کاموں کو یکجا کر دیا تھا۔ یہ تینوں امور عصر آدمؑ سے عصر نوح اور عصر ابراہیمؑ تک یکسانیت کے ساتھ پائے جاتے ہیں خلافت انبیا، حکومت در حکومت" کے اصول پر اپنا چہرہ دنیا کو دکھاتی ہے۔ اس لیے حکومت کے مسند عالی پر وہی ہستیاں جلوہ گر ہوئیں جو نسل انسانی کے لیے باپ کے مرتبہ تک بلند تھیں اور جن کو مالک کائنات خداوند عالم نے دنیا جہان سے پسند کیا تھا۔

یہ خیال بطور اصول قرآن حکیم کی جن آیات سے پیدا ہوتا ہے اُن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

---

[1] زبور داؤد ۱۰۵-۱۰۶ تورات تکوین ۱۲/۱ ، تاریخ طبری ج ا ص ۱۲۸ و ۱۲۹ و ۱۴۱ ۔ تاریخ ابن کثیر (دیکھو ابراہیم کے مختلف ابواب) ج ا ص ۳۳ و ۳۴ ۔ قصص الانبیاء (نجار الازہری) ص ۱۰۸ ۔

[2] تفسیر کبیر رازی ۔ ج ۲ ص ۳۲۳ طبع حسینیہ مصر۔

"اللہ کا حکم مانو، اور پیغمبر کا۔ اگر کچھ لوگ، اعراض کریں تو اللہ کا اعلان ہے، کہ وہ کافروں کو ناپسند کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے سارے جہان سے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو پسند کیا ہے جو ایک دوسرے کی اولاد تھے[1]"

اس جگہ ابراہیم کے خاندان اور عمران کے خاندان کے ساتھ "ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ" ایک دوسرے کی اولاد ہونے کا ذکر کرنا اور ابتدا میں آدم کے مرتبۂ عالی کو پسندیدگی کی سند عطا ہونا اس امر کی بین شہادت ہے کہ خلافت و امامت کی حاکمیت میں اور سیاسی تشکیل میں (آبائی معاشرہ) باپ، کی سرداری کا جو اصول ابتدا سے مستبر تھا وہ (ابراہیمی) دور تک بھی موجود رہا[2]۔

طاغی حکومت کا مقابلہ (۳) ابراہیم علیہ السلام کا ظہور وقت کے سیاسی تقاضا کا اثر تھا۔ دنیا کے بڑے حصہ پر نمرود کی جابر شہنشاہی کا اقتدار تھا۔ معمولی وہم پر جبر و تشدد اور بیرحمانہ قتل کی اجازت تھی[3]۔ حکومت کی طاغوتی طاقت خدائی اقتدار پر غالب آنے کے لیے میدان جنگ میں خدائی اوصاف کا مظاہرہ کر کے آخری جرم کا ارتکاب کرا رہی تھی۔

یہ عام آئینی اصول ہے کہ خلیفۃ اللہ کی پیغمبرانہ ہستی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب انسانیت عامہ کے فائدے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم عینًا اس وقت دنیا میں بھیجے گئے جب دنیا کو ان کی ضرورت تھی۔

حکومت الٰہی اور خلافت انبیاء کے دائرہ حکومت میں حکومت و سلطنت کا نائب (خلیفہ) اجتماعی ہیئت کا رہنما ہوتا ہے لیکن نمرود کی دنیاوی حکومت میں سلطنت کا سارا نظام شخص واحد کی اغراض کا آلۂ کار تھا، یہ ایسی خرابی تھی جس کو قدرت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام

---

[1] قرآن عظیم پارہ ۳ آل عمران ص ۶۸ ترجمہ شیخ الہند [2] کشاف زمخشری ج ۱ ص ۱۸۵ قرآن عظیم دیکھو تائیدی آیات نعبد الٰهك وإلٰه آبائك ابراهيم واسمٰعيل واسحٰق ونحن له مسلمون (سورۂ بقر) ملة أبيكم ابراهيم۔ پ ۱، الخ [3] طبری ج ۱ ص ۱۲۰ - ابن الاثیر ج ۱ ص ۴۳

کا نمرود کی حکومت کے مقابلہ میں آنا اور خداداد قوت مقابلہ سے نمرود کو شکست[1] دینا انسانی سلطنت کی خرابیوں کو دور کرنے ہی کے لیے تھا آنے والے دور میں حکومت کی نئی تعمیر سے پہلے نا اہل بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ضروری تھا۔ ابراہیمؑ اور نمرود کے تاریخی مقابلہ میں جو اہم نمایاں ہیں وہ اسی ضرورت کی تکمیل ہے یعنی اچھی حکومت کے قیام سے پہلے بُری حکومت کے اقتدار کا خاتمہ۔

حضرت ابراہیمؑ کا تمام اجتماعی کام اس اصول پر مبنی تھا کہ تمام دنیا کی توجہ ایک بلند و برتر ذات کی وحدت پر مرکوز ہو جائے[2]۔ انہوں نے اس مقصد کو مدنظر رکھ کر فلسفہ و حکمت کی پیغمبرانہ قوت سے قوم کے اعتقادی انتشار کو دور کرنے کے لیے مقبول دلیلوں سے کام لیا۔ آسمان کے نورانی عناصر کے سامنے انسان کی پیشانی جھکی ہوئی تھی اس کو اٹھایا اور آسمان و زمین کے ازلی و ابدی نور کے سامنے تمام پیشانیوں کو جمع کرنے کے لیے خدائے واحد کا نعرہ بلند کیا اور دنیا میں کامیابی حاصل کی۔

ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد اس وقت تک زندہ رہے جب تک وہ تمام آثار نمایاں نہ ہوگئے جنہوں نے نسل ابراہیم کو پیغمبری، قانونِ قدرت کی فہم، خلافت و حکومت کے دائرہ میں نمایاں کیا[3]۔

(۳) عام اجتماعی ذمہ داریاں | حضرت ابراہیمؑ کی ذمہ داریاں دینی تھیں، اس لیے اجتماعی بھی تھیں سیاسی بھی، اخلاقی بھی تھیں تمدنی بھی۔ معاشی بھی تھیں، عمرانی بھی، قانونی بھی تھیں اور روحانی بھی یہ ذمہ داریاں دعائے ابراہیمؑ میں اسی طرح نمایاں ہیں جس طرح آسمان پر متعدد روشن ستارے

۱؎ طبری ج ۱ ص ۱۲۲

۲؎ قرآن حکیم اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

۳؎ تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۲۲۔

خدا کا صادق و مخلص پیغمبر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہے "اے مالک و مختار پروردگار اس شہر کو شہر امن (بلد آمن) بنا دے، اس کے شہریوں کو کھانے کے لیے پھل عطا فرما۔ پروردگار ہم کو اپنی حکومت کا حکمبردار (مسلمان) بنا اور ہماری اولاد میں سے فرمانبردار امت کو تشکیل عطا کر ہمیں حج کے اجتماع عام کے قاعدوں کی تعلیم دے۔ ان میں رسول نازل فرما جو اُن پر تیرے احکام کی تلاوت کرے جو ان کو کتاب یعنی مجموعۂ قانون کی تعلیم دے حکمت سکھائے اور اُن کو پاکیزہ بنائے۔"

اس قیمتی دعا کے جواب میں خدا کا فرمان بھی قیمتی الفاظ میں صادر ہوا۔

"ہم نے بیت کعبہ (ابراہیم کے بنائے ہوئے گھر) کو انسانوں کے لیے مرکز اجتماع بنایا۔ اور امن کا دارالسلطنت الخ ملت ابراہیم سے وہی روگرداں ہو سکتا ہے جو بذات خود رجعت پسند ہو ہم نے اس امت کے ارکان کو دنیا میں پسندیدہ درجہ عطا کیا ہے اور ابراہیم آخرت میں نکوکاروں میں سے ہے۔[1]"

حضرت ابراہیم کی سچی دعا میں آبرومندی کا وہ پاک جذبہ بخوبی نمایاں ہے جس کی بنا پر دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی تنظیم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور حکومت کا نظم عالم وجود میں آجاتا ہے۔ ایک دارالسلطنت جو مرکز فساد نہ ہو، دارالامان ہو۔ شاداب معاشی زندگی جس کی بہار پھل پھول ہوں، اطمینان اور اقتدار اعلیٰ کی مکمل اطاعت: وفاداری، اور حکمبرداری جو اسلامیت کی روح اور اسلام کی حقیقت ہے سالانہ روحانی اجتماع، جس کے مراسم عام اجتماعی بہتری کا موجب ہوں۔ مقصد کی تکمیل کے لیے ایک پیغمبر کا ظہور جو کتاب اور احکام کتاب کا معلم ہو اور حکمت اجتماعی کا ماہر جو فرد کو اتنا پاکیزہ بنا دے جس کی بنا پر اس کو سوسائٹی کا شریف رکن قرار دیا جا سکے۔"

---

[1] قرآن عظیم پ ۱ بقرہ ۲ رکوع ۱۴-۱۵۔

دعا کے ان عام مطالبوں میں ذمہ داریوں کا رجحان اسی طرح جھلک رہا ہے جس طرح شفاف اور منور آئینہ میں ماحول کی اشیاء یہی وہ رجحان ہے جو سالہا سال کے بعد انسانی معاشرہ میں رونما ہوا اور جس سے انسانی فکر کو فطری حکومت سے جدید ربط پیدا کرنے میں سہولت میسر ہوئی۔

جدید ملی تصور | حضرت آدمؑ سے حضرت صالحؑ تک ہر پیغمبر اسلام کا علمبردار تھا لیکن حضرت ابراہیمؑ نے خلیل اللہ کا خطاب حاصل کر کے جس کام کا علم بلند کیا وہ اپنی اصولی حیثیت میں نئے طرز کا کام تھا۔ اسلام انسان کے عزیز ساتھی کی طرح ابتدا ہی سے ساتھ تھا لیکن اس نے اپنی انقلاب انگیز تصویر کے لیے ابراہیمی عہد کا انتخاب کیا۔ یہ سمجھیے کہ انسان کو طویل سفر کے لیے راہ سے شاہراہ مستقیم یعنی ایک سیدھی لائن تیار مل گئی۔ انسان کے لیے مذہب وجود پذیر ہوا۔ مذہب نے مذہب توحید بن کر اسلام کا نام پایا، اسلام نے اجتماعی میدان میں آکر امت کی تشکیل کا اعلان کیا، در اس تشکیل نے اپنی ترقی کے لیے ابراہیمؑ کا دامن رشد تھام لیا۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا[۱]۔ (جو بھی اچھے خوش آئند کام کرے، پسندیدہ کارنامے دکھائے، مرد ہو یا عورت اس کا خطاب مومن ہے۔ ایسے انسان باغ و بہار جنت میں داخل ہونگے اور ان کا حق تل کے برابر بھی ضائع نہ ہوگا۔ اور اس شخص سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی (اسلام لاکر) جو اچھے کاموں میں مصروف ہے اور ملت ابراہیمؑ کا پیرو کار ہے۔ اس ابراہیمؑ کے ملی تصور کا جس کو اللہ نے خالص دوست بنا لیا ہے)۔

یہ آیت قرآن کی حیرت انگیز آیات میں سے ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ فرد کے لیے

---

[۱] قرآن عظیم پ۵، النساء ۴۔

ایمان ضروری ہے۔ ایمان اول درجہ کے اچھے کاموں سے پیدا ہوتا ہے۔ مومن ناقابل ردحق رکھتا ہے۔ سوسائٹی کا اچھا رکن وہ ہے جو اسلام قبول کر کے نیک کاموں میں مصروف رہے اور ابراہیم کی قائم کردہ قومیت کے دائرہ میں جمع ہو جائے کیونکہ یہ قومیت خدا کے دوست کی طرف منسوب ہے۔ اس جگہ صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت ابراہیم پہلے شخص ہیں جنہوں نے قومیت کے محدود مفہوم کو عملی سیاسیات کے میدان میں لاکر امت و ملت کے وسیع تصور سے آگاہ کیا جس سے دنیا کو یہ سبق حاصل کرنے کا موقعہ ملا کہ ایک عالمگیر حکومت کے لیے عالمگیر امت کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کے تاریخی فیصلوں نے ہمیں یہ بتایا کہ ابراہیم خدا کے پہلے نائب ہیں جنہوں نے قوم کی اجتماعی قدر و قیمت کو متعین کیا۔ اور قومیت کے دھندلے مقصود کو امتِ عظمٰی کے عام اور واضح مقصد میں تبدیل کر کے ایک نئے اجتماعی اصول کی بنیاد ڈالی۔[ل]

(۵) حکومت کا تصور | حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ زندگی پر جس قدر غور کیا جاتا ہے وہ تمام و کمال ایک عظیم سیاسی واقعہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ حکومت ایک عام سیاسی کاروبار ہے اور خلافت کا تعلق شرعی سیاست سے ہے۔ اس اصول سے براہیمی عہد ابتدا ہی سے حکومت و سلطنت کے تصور کا گہوارہ معلوم ہوتا ہے۔

خداوند کائنات نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمائش میں ڈالا۔ امتحان میں مبتلا کیا صبر و

ل قرآن عظیم۔ (۱) ان ابرٰھیم کان امۃ قانتا للہ۔ ابراہیم پیشوائے امت تھا خاص اللہ کا فرمانبردار (سورۂ نحل)
(۲) فاتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفا (آل عمران) موحد ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو۔
(۳) دینا قیما ملۃ ابراھیم حنیفا۔ خالص و مخلص ابراہیم کی امت ایک محکم مذہب ہے۔
(۴) دیکھو۔ ملت ابراہیم سورہ نحل سورہ بقرہ (۵) ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمٰکم المسلمین۔ اللہ نے تم کو درجہ پسندیدگی عطا کیا ہے۔ اس نے تمہارے لیے دین کے بارے میں کوئی مشکل بات نہیں رکھی۔ یہ دین تمہارے باپ ابراہیم کی ملت ہے اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے (پ ۱۷، الحج ۲۲)

برداشت کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا۔ حکومت کی اہم ذمہ داری سے پہلے ایسا ہونا ضروری تھا۔ جب آغازِ کار کی دشواریاں سہل ہوگئیں تو وقت سے کے پیغمبرِ اعظم کو حکومت کی ذمہ داری سے آشنا کیا گیا جب وقت آیا تو روئے زمین کے مختارِ مطلق فرمانروا نے ان الفاظ میں ابراہیم کی حکومت کا اعلان کیا کہ میں تجھ کو حکومت کا قائدِ اعلیٰ (امام) مقرر کرونگا (اِنّی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَاماً۔ قرآن عظیم بقرہ رکوع ۱۴) امام قائدِ سلطنت کو کہتے ہیں۔ امامت وہ منصب ہے جس میں حکومت کے ساتھ رہنمائی کا تصور موجود ہو۔ حضرت ابراہیم کو امامتِ عظمیٰ کے اعزاز سے دنیا کو نیا تاج نصیب ہوا۔ فرمانروائے عالم نے ایک نئے طرزِ حکومت کی بنا ڈالی جس سے حکومت کے جسم میں جبر و تشدد کی جگہ رہنمائی کا خوش آیند تصور پیدا ہوا۔ صداقت، نرمی، نیکی، اعلیٰ درجہ کی خوبی (رُشد)[1] یہ وہ جواہر تھے جن سے پیغمبری کا تاج مزین تھا۔ جب حکومت کو پیغمبری کے ساتھ جمع کیا گیا تو حکومت کی روح میں بھی اس کو پیوست کر دیا گیا۔

عصرِ ابراہیم میں حکومت کے تصورات کو جس طرح ابتدا ہی سے عروج حاصل ہوا اس کو مقدس الہامی کتابوں کے بیانات سے تقویت پہنچتی ہے۔

زبور میں وارد ہے کہ "خداوند ہمارا خدا ہے اُس نے ابراہیم سے عہد کیا۔ (نسل ابراہیم میں) اسحاق و یعقوب سے اس عہد کی قسم کھائی۔ یعقوب کے لیے شریعت اور اسرائیل کے لیے سرزمینِ کنعان کو میراث قرار دیا اور اسے عہد کو ابدی ٹھہرایا وہ تعداد میں قلیل، وطن سے بے وطن تھے وہ قوم بقوم مملکت بمملکت چلتے پھرتے تھے"[2]

"خداوند نے اپنے بندے ابراہیم کو یاد کیا۔ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو خوشی اور شادیانوں کے ساتھ نکال لایا۔ انہیں قوموں کی سرزمینیں دیں۔ اُنہوں نے قوموں کا حاصل میراث (ارضی

---

[1] سورۂ مریم (صدیقاً نبیاً) سورۂ انبیاء۔ ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہٗ

[2] زبور داؤد (۱۰۵) ۸، ۱۳-۱۴۔

وراثت) پائی[1]

زبور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم امت اور اجتماعی ہیئت کے رہنما تھے[2]

توریت (کتاب موسیٰ) میں بھی اس تصور حکومت کی تصدیق موجود ہے۔ خداوند نے ابراہیم کو کہا تو اپنے ملک اور اقربا کے درمیان سے اس ملک کو نکل چل جو میں تجھ کو دکھاؤنگا۔ میں تجھ کو بڑی قوم بناؤنگا (تکوین ب۱۲ ۲-۳) تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کی مانند بڑھاؤنگا اور تیری نسل سے روئے زمین کی قومیں برکت پائینگی (تکوین باب۱۳ ۱۴،۱۵)

خداوند نے ابراہیم کو جلوہ دے کر کہا میں بھی ملک (مصر) تیری نسل کو دونگا (تکوین ب۱۲ ۷)

قرآن عظیم بھی اصولی حیثیت سے ابراہیم کے رجحان سلطنت کو پیش کرتا ہے جو درحقیقت ربانی تصور ہی کا روشن عکس ہے ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو حکومت کی امامت اعلیٰ سے اعلیٰ معیاری اور مکمل حکومت عطا کی گئی حکمت، سیاسی فہم دی گئی اور باطل قوتوں کا اقتدار توڑنے کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی[3] کا اقتدار اعلیٰ دکھایا گیا۔ ابراہیم کے درجات کو بلند کیا گیا۔ آل ابراہیم کو سند پسندیدگی عطا کی گئی نسل ابراہیم کو اعلیٰ کارناموں کے برروئے کار لانے کا حکم کیا گیا۔ اور امامت عظمیٰ کے طرز پر حکومت کی ذمہ داریاں دی گئیں[4]

ابراہیمی حکومتیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں دنیا کی اجتماعی خرابیوں کا مقابلہ کرکے

---

[1] زبور داؤد (۱۰۵) ۴۲-۴۵ [2] زبور داؤد (۱۰۶) -۱۷

[3] وکذلک نری ابراہیم ملکوت السمٰوٰت والارض ولیکون من الموقنین (انعام)

[4] وجعلنٰھم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات۔ ان کو بنایا ہم نے امام جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے ان کو یہ حکم کیا کہ نیک کاموں کو انجام دیں۔ پ ۱۷، انبیاء ۲۱۔

جس عزیمت کے ساتھ کامیابی حاصل کی اُس نے ابراہیمؑ کے گھرانے میں پیغمبری کے اوصاف پیدا کر دیے۔ اس طرح خدا کی لازوال مرضی سے نیابتی حکومت کی پاکیزہ ذمہ داریاں بھی اولادِ ابراہیم کے حصّہ میں آ گئیں۔

زبورِ مقدس، توراتِ مقدس اور قرآنِ عظیم تینوں نے ہم آہنگ ہو کر اُس ربانی احسان کا ذکر کیا ہے جس کے ماتحت ابراہیمی نسل کو حکومت کے میدان میں دنیا کی عام بھلائی کے لیے کام کرنے کا موقعہ ملا۔

قرآن کا بیان ہے کہ مملکت کے اقتدارِ اعلیٰ کو حق ہے کہ وہ سلطنت کے مالک کی حیثیت سے جس کو اہل تصور کرے اس کے ہاتھ میں دنیا کی قسمت دے۔ فرمانروائے سلطنت نے اپنے اس اختیارِ مطلق کے ماتحت ابراہیم کے گھرانے کو تین قسم کی عظیم الشان ذمہ داریاں سپرد کیں[1]۔

(۱) کتاب، الہامی قانون، تحریر شدہ دستور اور مجموعۂ احکام جس کی رو سے مذہب کی حاکمیت کے ماتحت دینی حکومت قائم ہوتی ہے اور جس کی رو سے حکومت کو اخلاق کے حقیقی حصار میں پابندی کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔

(۲) حکمت۔ سیاسی بصیرت اور فہم جو شریعت الٰہی کے عرفان سے حاصل ہوتی ہے اور دین و دنیا کے کاموں کو معراجِ کمال پر پہنچاتی ہے۔ وہ علم جس سے معاملات کی گہرائی تک پہنچنے میں امداد ملتی ہے۔ حکمت قانون کی روح ہے۔ اس لیے قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ چونکہ قانون حکومت کی روح ہے اس لیے حکمت کے مفہوم میں حکومت بھی داخل ہے جس طرح قانون قول اور عمل کی مطابقت پر زور دیتا ہے۔ اسی طرح حکمت علم اور عمل کی ہم آہنگی پیدا کرتی ہے حکمت

---

[1] کلیات العلوم علامہ ابی البقاء حنفی (الکتاب) ص ۵۰۵ [2] کلیات العلوم علامہ ابو البقاء حنفی (الحکمۃ) ص ۲۸۲

نہی سیاست کا نام ہے۔ اس میں فہم انسانی کو قانونِ شریعت، عدل اور پیغمبرانہ احکام کی صداقتوں کے ماتحت کام کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ آل ابراہیم کو یہی حکمت عطا کی گئی جو مفوضہ حکومت کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے لابدی شئے تھی۔

ملک عظیم | مملکت عظمیٰ اور سلطنت کبریٰ ایک ایسی عظیم و جلیل حکومت جو حکومت کے بالا دست مالک کے اقتدار اعلیٰ کی نائب اور نمائندہ ہو اور پیغمبری کے آئینی استحقاق کی بنا پر حاصل ہو۔

بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل نے دنیا کی تاریخ کے قیام کے دوران میں جس اختیار و اقتدار کے ساتھ دنیا کے اجتماعی رُخ کو درست کرنے میں حصّہ لیا ہے وہ قرآن کی صداقت کا کافی ثبوت ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی تین بیگمات تھیں۔ سارہ، ہاجرہ، قطورا۔ حضرت سارہ کے بیٹے حضرت اسحٰق تھے۔ حضرت اسحٰق سے حضرت یعقوب، عیسو دو بیٹے تھے۔ عیسو کا لقب ادوم تھا۔

حضرت ہاجرہ سے صرف حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ قطورا سے جو اولاد ہوئی ان میں سے مدین اور اہل ودان (اصحاب الایکہ) کے علاوہ دوسروں کے تاریخی حالات کا علم نہیں ہے اگرچہ ان کے نام توریت میں مذکور ہیں۔

حضرت سارہ کی اولاد میں بنی اسحاق اور بنی ادوم حکومت کے وارث ہوئے قطورا کی اولاد میں۔ اہل مدین اور اہل ودان (اصحاب الایکہ) نے مدتوں حکومت و سلطنت کے نظام کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔

حضرت ہاجرہ کی اولاد میں انباط (اصحاب الحجر نبطیون) قیدار اور قریش سلطنت کے وارث ہوئے۔

---

۱ تفسیر کبیر امام رازی ج ۲ ص ۴۴۴ طبع حسینیہ۔

مدین بن ابراہیم | بنو مدین کا زمانۂ آغاز دو ہزار سال قبل مسیح فرض کیا جاتا ہے تورات میں ان کا ذکر عہد یعقوب (۱۷۰۰ ق م) میں ملتا ہے۔

مدین حضرت موسیٰ کے عہد (۱۶۰۰ یا ۱۴۰۰ قبل مسیح) میں پانچ سرداران حکومت کے ماتحت تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مدین کا مرکز حکومت پٹرا (رقیم) ملک شام کے قریب بحر میت (Dead Sea) اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے اس لیے اس کی شمالی حدود بھی اسی جگہ تک سمجھنی چاہئیں۔

تاریخی روایات سے بنو مدین کی حکومت کے آثار کی تصدیق ہوتی ہے۔ قرآنِ عظیم اصولاً ان روایات کی تائید کرتا ہے

قرآنِ عظیم کا بیان ہے کہ "مدین قوم کے پاس ان کے بھائی، ان کے گھرانے کے رکن شعیب کو ذمہ دار نمایندہ بنا کر بھیجا گیا"[1] شعیب نے ان کی رہنمائی کے لیے جو اصولی احکام ان کے گوش زد کیے وہ یہ تھے (۱) خدائے واحد کی اطاعت و پرستش، تجارت میں برابر تولنا، انسانوں کے حق میں کمی نہ کرنا۔ قیام امن کے بعد فساد نہ پھیلانا۔ اچھے شہروں کو نہ ڈھانا، سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کی سعی نہ کرنا۔

قرآن مدین کو کہتا ہے تم قلیل تعداد میں تھے خدا نے تم کو کثیر تعداد میں پھیلا یا۔ اقلیت کا اکثریت میں تبدیل ہو جانا حکومت کے عام اثرات میں سے ہے۔ قرآن بنو مدین کے خداداد اقتدار کا ذکر کر کے پہلے ان کو اصلاح حال کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے فاصبروا حتی یحکم اللہ بیننا وھو خیر الحاکمین (اگر تم حکومت کی غایت (اصلاح) کے پیغام اور ایمان کو قبول نہیں کرتے تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا کی حکومت کے تصرفات ظاہر ہو جائیں

[1] والیٰ مدین اخاھم شعیبا۔ (قرآن)

کیونکہ خدا ہی بہترین حکمران ہے۔

مدین کے گمراہ حلقوں نے اس پیغام کو قبول نہ کیا۔ خدا کی مرضی نے ان کو ختم کر دیا اور زمانہ کے احوال نے ان پر ناکامی کی چادر ڈال دی۔ قوم مدین کی تباہی کے بعد اسمٰعیلی عرب اس علاقہ کے مالک ہو گئے۔

دوان | قطورا کی ابراہیمی نسل کی دوسری شاخ اہل دوان ہیں جن کو قرآن میں اصحاب الایکہ کا خطاب ہے۔ ان کے متعلق بھی تاریخ یہ بیان کرتی ہے کہ وہ دوان کے نام سے ایک رقبۂ ملک کے مالک تھے۔ دوان کو تاریخی اندازہ کے مطابق شمالی عرب حجاز سے شام کی راہ پر تیمار کے قریب واقع ہونا چاہیے۔

حضرت شعیب نے دوان (اصحاب الایکہ) کو بھی امن عام کے سیاسی قانون اور میزانِ عدل کے معاشی اصول کی طرف دعوت دی تھی۔ لیکن انہوں نے قانونی حدود کو توڑا اور خدائی انتقام کی آماجگاہ قرار دیے گئے۔ وان کان اصحاب الایکۃ لظلمین فانتقمنا منھم[2] (یقیناً جنگل والے حد سے گزر جانے والے ظالم تھے۔ پس ہم نے ان سے انتقام لیا)

بنی ادوم | بحر المیت (بحر الملح) اور خلیج عقبہ (عیلانہ) کے درمیان سارے دوسرے بیٹے عیسو کی نسل آباد ہوئی۔ یونانی اس کو اب تک ایڈومیا (Idumia) کہتے ہیں عیسو (ادوم) اسحٰق کے بڑے بھائی تھے چھوٹے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے محترم چچا حضرت اسمٰعیل کے پاس چلے گئے۔ اور اُن کی صاحبزادی یاسمہ یا محلات سے شادی کی۔ اور بھی کئی شادیاں کیں جن سے نسل کو ترقی ہوئی۔ ان میں عمالیق اور عوص کو شہرت بھی حاصل ہوئی عیسو ادوم اپنی تمام اولاد کو لے کر کوہ سعیر (سراۃ) پہنچے۔ یہ ملک جو شام سے انتہائے یمن تک پھیلا ہوا ہے

[1] تاریخ الکامل ابن الاثیر ج ا ص ۴۰ قصۂ شعیب [2] قرآن عظیم۔ حجر، شعراء، ص، ق۔

ان کا مسکن بنا۔ اسی لیے اس کا نام ادوم پڑگیا۔ چند صدیوں کے بعد عیسو کی نسل ایک بڑی قوم بن گئی جس نے سنہ ق م سے پہلے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی جب بنی اسرائیل مصر سے آئے تو یہ حکومت سعیر میں قائم تھی۔ بصریٰ اسی حکومت کا شہر تھا جس کو آنحضرت صلعم کے وقائع اور مقدس پیشین گوئی کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

حضرت ایوب | سلسلہ ابراہیمی کے مشہور پیغمبر حضرت ایوب نے اسی قوم میں خلافت الٰہی کے فرائض انجام دیئے۔

بنی اسمٰعیل کی حکومتیں

حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ہاجرہ کے صاحبزادے ہیں، اور عرب کے جد اعلیٰ ہیں وہ زبردست تاریخی حالات جنہوں نے اقتدار کی بساط پر نسل ابراہیمؑ کا سر بلند کیا۔ حضرت اسمٰعیل کی زندگی میں اول دن سے رونما تھے۔ براہیمی آرزوؤں کے خالی پیمانہ کو زندگی کے شیریں رس سے بھرنے والی پہلی ہستی کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے کم ہے۔

حضرت ابراہیم سارہ کے سدا بہار زمانہ سے اُمید منقطع کر چکے تھے۔ سارہ خلیلؑ کے چچا کی بیٹی تھیں مگر اولادسے برومند نہ ہو سکتی تھیں۔

حالات و واقعات کے اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم کو بابل سے ہجرت کرنی پڑی وہ اپنے وطن سے سارہ اور لوط (بیوی اور بھتیجے) کو لے کر اور فرات کے کنارے کلدان کے شہر اور میں پہنچے اور یہاں سے مغربی فلسطین (نابلس) اور نابلس سے مصر پہنچے۔

شاہان رعاۃ (عمالیق) کا زمانہ ہے۔ جن کو رومی ہکس   کہتے ہیں۔ فرعون وقت حکمران مصر سارہ کو ملاقات کے لیے طلب کرتا ہے۔ اس ملاقات کے وقت حضرت سارہ اپنے

بلند کیریکٹر کا اظہار کرتی ہیں جس کی مثال مشکل ہی سے تاریخ میں ملیگی۔ ایک بادشاہ کے مقابلہ میں ایک کمزور عورت کا کردار فولاد سے زیادہ مضبوط ثابت ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کو ایک سبق آموز حادثہ پیش آتا ہے۔ بادشاہ کے تصور میں نیکی کے احساس کے ساتھ ایک خوشگوار انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ فرعون مہاجروں کے قافلہ کو انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کرتا ہے اور اپنی ایک لڑکی جس کا نام ہاجرہ ہے ساتھ کر دیتا ہے[۱]۔

حضرت ابراہیم سارہ سے نا امید ہیں۔ ہاجرہ سے اُمید وابستہ کرتے ہیں جو پوری ہوتی ہے۔ حضرت اسمٰعیل پیدا ہوتے ہیں۔ ابراہیمؑ کے گھر میں لڑکے کو شرف ولادت حاصل ہوا۔ اس کے بعد نوّے سال کی عمر میں حضرت سارہ سے حضرت اسحٰق پیدا ہوئے[۲] اور حضرت ابراہیم کو حمد ربانی کے لیے ہاتھ اُٹھانے کا موقع ملا۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق — شکر و ستایش اس خدا کے لیے جس نے مجھ کو بڑی عمر میں اسمٰعیل و اسحٰق عطا فرمائے۔

حضرت ابراہیم کے گھریلو معاملات۔ نے نیا رُخ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاجرہ، اسمٰعیل کو لے کر مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں آئے اور ماں بیٹے کو چھوڑ کر چلے گئے یہ خدا کا حکم تھا پورا ہوا اور ہاجرہ کی عزیمت نے اس کو یہ کہہ کر گوارا کیا "ہمارا خدا ہم کو ضائع نہیں کریگا" شیرخوار اسمٰعیل اسی وادی میں بڑھا۔ پھولا، پھلا۔ آخر وہ زمانہ بھی آیا جب اسمٰعیل کی نسل نے دنیا میں سربلند ہو کر کام کیا۔ اسمٰعیل کی ہی نسل سے آسمان و زمین کا نور ظاہر ہوا۔ عرب کے رہنے والے خانہ بدوش قبائل نے خلافتِ الٰہی کے مکمل تصرفات دیکھے۔ ایک مثالی حکومت بہترین مملکت، اعلیٰ ترین

---

[۱] توراۃ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱ دیکھو مشہور معتبر مفسر توراۃ ربی شلوم کی تشریح (بحوالہ ارض القرآن ج ۲ ص ۳)

[۲] قصص الانبیاء عبدالوہاب النجار مصری ص ۱۰۸، ۱۱۶۔

[۳] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۷۵۔

اور بے مثال سلطنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

زبور اور توریت کی بشارت پوری ہوگئی۔ تورات کی بشارت تھی۔ "اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سُنی، دیکھ میں اس کو برکت دونگا اسے برومند کرونگا، اس کو بہت بڑھاؤنگا اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے۔ اور میں اُس کو بڑی قوم بناؤنگا" حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے[1] پیدا ہوئے جو اپنے اپنے قبیلہ میں آبائی معاشرہ کے بارہ امام اور قائد تھے۔

قرآن سے حضرت اسمٰعیل کے جن اوصاف کا علم حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہیں۔ نوجوان حلیم، حکم الٰہی کے حکمبردار، وعدہ کے سچے، رسول، نبی، آمرِ صلوٰۃ و زکوٰۃ۔ فرمانروائے عالم کے نزدیک پسندیدہ۔ اسمٰعیلؑ نے ایک سو ستر سال کی عمر میں انتقال کیا حجر میں والدہ کے قریب دفن کیے گئے ان کے ارتحال کے بعد عرب کی قسمت نابت اور قیدار کے ہاتھ میں آئی، یہ دونوں اسمٰعیل اور ہاجرہ[2] کی نسل کے روشن چراغ تھے۔ عرب کے تمام قبائل انہی دونوں کی اولاد ہیں۔ تاریخی تحقیق کے مطابق پیغمبر اعظم محمد مصطفےٰ[3] کا سلسلہ بھی انہی کے واسطہ سے ابراہیم و اسمٰعیل تک پہنچتا ہے[4]۔

نبطی حکومت | اسماعیلی نبطیوں کی تاریخ انسانی علم کے مطابق (۸۰۰ ق م) سے شروع ہوتی ہے علامہ ندوی یوسیفوس یہودی پہلی صدی مسیحی کے جغرافیہ داں کے حوالہ سے لکھتے ہیں

"بحر احمر سے نہر فرات تک اسماعیل کے بارہ بیٹوں کا قبضہ ہے۔ اس سبب سے اس کا نام نباطیہ پڑ گیا ہے[5]۔"

نبطیوں کا ملک درحقیقت حجر، مدین، رقیم کی قدیم ریاستوں کا مجموعہ تھا چونکہ انہوں نے آخر

---

[1] اسمٰعیل کے بارہ بیٹے۔ نبایوت، قیدار، اد، بئیل، مبسام، مشماع، دومہ، مسا، حدار، یطور، نافیش، قدمہ پیدائش ۲۵۔ ۳۔ تورات قصص الانبیاء (النجار) ص ۱۴۳۔ [2] ارشاد نبوی بروایت ابی ہریرہ۔ اے شریف النسب اہل عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ جو تم سب کی ماں ہیں بخاری ج ۲ ص ۲۰۱ [3] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۲-۱۹۳۔ [4] ارض القرآن ج ۲ ص ۶۱ و ۶۲۔ [5] گولڈ مائنس آف مدین ص ۲۲۵

میں حجر کو اپنا مرکز بنا لیا تھا اس لیے قرآنِ مجید نے ان کو اصحاب الحجر کا خطاب دیا ہے۔

قرآن عظیم کا بیان ہے کہ یہ لوگ ایک تمدن رکھتے تھے، پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے تھے جن میں امن و آرام کے ساتھ رہتے تھے۔

آلِ غسان انباط کے مٹنے کے بعد آلِ غسان (غساسنہ، آلِ جفنہ) نمودار ہوئے۔ یہ لوگ اسماعیلی تھے۔ عرب و شام کے درمیانی علاقہ میں ان کی حکومت تھی۔ ایران و روم کی جنگوں میں جانبین ان کے تعاون کے طالب تھے۔ چونکہ غسانیوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اس لیے ہمیشہ رومیوں کا ساتھ دیتے رہے۔ جبلہ اور حارث ابن جبلہ دونوں رومیوں کی نظر میں اس تعاون کی وجہ سے اہمیت رکھتے تھے۔ آفتاب اسلام کے طلوع تک غسان اہل روما کی امداد سے حکومت کرتے رہے۔ اسلام نے آکر روم کے ساتھ اہل غسان کے تخت اقتدار پر بھی قبضہ کر دیا[1]۔

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ بنو قیدار کا اقتدار حکومت حضرت اسمٰعیل کے دوسرے بیٹے قیدار یا قیدار نبی اسرائیل کے بارہ سرداروں میں ایک با اقتدار شخص تھا۔ زبور داؤد میں قیدار کا نام مذکور ہے[2]۔ اشعیاء نبی قیدار اور اس کے ملک (عرب) کا ذکر کرتے ہیں۔ اسیریا کے کتبات اور یونان کے علماء جغرافیہ اس نام کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان نے بھی اپنے ترانہ میں قیدار کے خیموں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ۱۰۰۰ ق م میں بنی قیدار ایک قومی حیثیت رکھتے تھے آٹھویں صدی قبل مسیح میں اشعیا نبی عرب کی بابت الہامی کلام کے اثنا میں یہ مانتے ہیں کہ قیدار کے لوگ صاحب حشمت اور بہادر تھے[3]۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ۸۰۰ ق م تک بنی اسمٰعیل کے اس سلسلہ میں وہ اوصاف موجود تھے جن کی وجہ سے حکومت کا کام چلتا ہے۔ توریت کی بعض آیات سے معلوم

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۸۰ [2] زبور داؤد ۱۲۰-۵ (میں مسک میں سکونت کرتا اور قیدار کے خیموں کے پاس رہتا ہوں۔ طبع بائبل سوسائٹی لاہور۔

[3] کتاب مقدس پرانا عہد نامہ (تورات)، یسعیاہ باب ۲۱ ص ۶۲۰

---

[1] زبور داؤد ۱۲۰-۵ (میں مسک میں سکونت کرتا اور قیدار کے خیموں کے پاس رہتے ہیں)، طبع بائبل سوسائٹی لاہور۔

ہوتا ہے کہ قیدار کی نسل میں جاہ و جلال کی حکومت تھی[1]۔

قیدار سرداروں کی قوم تھی۔ اسی طرح نبایوط بھی اسمٰعیل کے بارہ سرداروں میں سے تھا۔ دونوں بھائیوں کی نسل حکومت کے کاموں سے آشنا تھی۔ اسی نسل میں عرب کا مشہور سردار اور جدِ اعلیٰ عدنانؑ پیدا ہوا۔ جو ان فاتحوں کا جدِ اعلیٰ بھی ہے۔ جنہوں نے عرب کے سنگلاخ ریگ زار میدانوں سے نکل کر دنیا کے نخلستانوں میں خدا کی سلطنت قائم کی اور اس سلطنت کو ان فطری اصولوں پر چلایا جن کی مثال آج تک کسی زمانہ کی سیاسی حکمتِ عملی کے دائرہ میں نہیں ملتی۔

قریش عدنان کے مضر قبیلہ کی ایک ضمنی شاخ قریش ہے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جس کے ماحول کے گوشوں سے پیغمبرِ اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیقؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ منظرِ موجود پر ظاہر ہوئے۔ قریش اپنی نسبت ما بعد کے اعتبار سے دس قبیلوں کا مجموعہ تھا۔ بنی ہاشم بنی اُمیہ، بنی نوفل، بنی عبدالدار، بنی اسد، بنی تمیم، بنی مخزوم، بنی عدی، بنی جمع، بنی سلیم یہی وہ قبائل ہیں جو ظہورِ اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت کے سیاسی ہیرو تھے اور جن میں سے بعض حکومت کے عامیانہ طرز کے پاسبان تھے اور تمام قبائل میں سردار تصور کیے جاتے تھے۔

ایوب علیہ السلام ایوب علیہ السلام سلسلۂ قرآن کے مستند پیغمبروں میں ہیں[2] اور ان کا تعلق ابراہیم علیہ السلام کی جماعت سے ہے۔ انہوں نے دنیا میں صبر و برداشت کا معیار قائم کیا ہے[3]۔ ان کی زندگی عقلائے عالم کے لیے تذکار ہے اور عباد تگذار امت (عابدین کے لیے) ایک نصیحت خیز تجربہ[4]۔

---

[1] اشعیا نبی باب ۲۱-۱۶-۱۷۔ یرمیاہ باب ۴۹-۲۸۔ تفصیل کے لیے دیکھو ارض القرآن علامہ ندوی ج ۲ ص ۹۲۔

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۱۹۳۔ نظم امام الناشی ص ۱۹۷۔

[3] تاریخ الکامل ابن الاثیر ج ۱ ص ۴۴۔ قصص الانبیاء (نجار) ص ۱۴۵۔ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۰۔ دیکھو قرآن عظیم، سورۂ انبیاء، سورہ النساء، سورہ الانعام، سورہ ص وجدنٰہ صابراً نعم العبدُ الخ

[4] قرآن عظیم سورۂ انبیاء ذکریٰ للعابدین سورۂ ص ذکریٰ لاولی الالباب۔

ان کے دینی نصب العین کے دو رُخ تھے۔

(۱) خدا کی توحید کے اصول پر لوگوں کی وحدت کا قیام۔

(۲) انسانی زندگی کے دائرہ میں مفادِ عامہ کی بہتری کے لیے کام کرنا۔
(ابن اثیر ج ۱ ص ۴۴)

بنی اسحٰق کی حکومتیں

سارہ کی براہیمی نسل سے بنی اسحٰق پیدا ہوئے اُنھوں نے دنیا کی تاریخی صداقتوں کے اظہار میں جس درجہ حصّہ لیا۔ اس کو ربانی سیاست کا ایک روشن دور کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے آخری دور میں اپنی تفویض شدہ ذمہ داریوں کے خلاف کام کیے، لیکن ان کاموں سے اُن عظیم اقدامات کی قدر و قیمت کم نہیں ہوسکتی جن کا تعلق بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے ہے۔

یعقوب علیہ السلام اور بنی اسرائیل — بنی اسرائیل اپنے پیغمبر اور سردار حضرت یعقوب کی طرف منسوب ہیں۔ یعقوبؑ اسحٰق کے بیٹے، ابراہیم کے پوتے اور خطاب کے اعتبار سے اسرائیل ہیں۔

اسرائیل اپنے مفہوم کے اعتبار سے عبداللہ کے برابر ہے۔

حضرت ابراہیم کی امامت سلسلہ بسلسلہ یعقوب کی معرفت نسلِ یعقوب میں بھی پہنچی۔ اسحٰق کی پیدائش میں خوشخبری کا عنصر موجود تھا۔ قدرت کا وعدہ تھا، اسحٰق کی نسل میں اچھے درجہ کے افراد بھی ہونگے۔ جو پیغمبر ہونگے اور سچی زبانیں ان کا نشانِ امتیاز ہونگی۔ دنیا اور دین کی ذمہ داریوں میں صداقت کے جوہر کو داخل کرنا ان کا کام ہوگا[1]

حضرتِ یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں اسرائیلی سلسلہ کے پیغمبر ہیں ان کے کاموں

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۱۹۸۔ دیکھو بنی اسرائیل میں حضرت یوسف کی حیثیت۔

اور کارناموں کا منتہا حضرت یعقوب ہی کی ذات ہے۔ قرآن حکیم کے عام انداز بیان میں ابراہیم اور یعقوب دونوں نام عام طور پر ایک ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ قرآن کا بیان ہے کہ ابراہیم اور یعقوب دونوں نے اپنی اولاد کو یہ وصیت کی۔[1] میرے بچو! تم خدا کے حکمبردار رہنا اور انہوں نے اس کو قبول کر کے کہا کہ "ہم اس کے حکمبردار رہینگے"[2]

حضرتِ یعقوب کی اس وصیت میں حضرت ابراہیم کے آئین پیشین کا اثر پوری طرح جھلکتا ہے۔ بنی اسرائیل کی حکمبرداری جس قانونی روایت کے تابع ہے اس میں حضرت ابراہیم نے خدا کی حکمبرداری کا اعلان کیا ہے۔ اور وہ اس سے کچھ ہی پہلے قرآن میں درج ہے[3]۔

قرآن ہی کا یہ حکم ہے کہ یعقوب پر جو قانون نازل ہوا ہے اس پر ایمان لانا۔ اسی طرح ضروری ہے جس طرح قانون قرآن[4] پر عمل کرنا۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب[5] جب مصر پہنچے تو اُن کی عمر ایک سو تیس[6] سال تھی اُنہوں نے سترہ سال مصر میں قیام فرمایا۔ یہ اندازہ کرنا آسان ہے کہ حضرت یوسف کی حکومت میں حضرتِ یعقوب کے سترہ سال کے قیام کا کس قدر زبردست اثر ہوگا

مملکت یوسف علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے حسن وجمال کی تمام دلکش اور دلربا داستانیں ایک طرف اور اُن کی حیرت انگیز شاندار زندگی کے وہ واقعات دوسری طرف جن سے حکومتِ الٰہی کے روشن فانوس کو انسانیت عامہ کے جلوہ زاروں میں اور زیادہ نور اور روشنی حاصل ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جن کی طرف اسباط یعقوب (نسلی اولاد) منسوب ہیں۔ ابن کثیر کے بیان کے

---

[1] قرآن عظیم۔ پ البقرہ ووصیٰ بھا ۔تا۔ نحن لہ مسلمون۔

[2] قرآن عظیم ترجمہ شیخ الہند (متوسط بجنور) البقرہ ص ۲۵ کشاف زمخشری ج ۱ ص ۹۵، ۹۷۔

[3] قرآن عظیم پ بقرہ تلک امۃ ۔تا۔ اسحٰق ویعقوب الخ

[4] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۰۰ ۲۲ حیات اسرائیل [5] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۹۸۔

مطابق ان تمام میں یوسفؑ سب سے زیادہ باعظمت جلیل القدر اور شریف الطبع تھے۔ علماء کے ایک طبقہ کی رائے یہاں تک ہے کہ ان بارہ جوانوں میں صرف یوسفؑ ہی ایک مستقل پیغمبر تھے اگر یہ رائے ترجیح نہ حاصل کر سکے تو اتنا ضرور تسلیم کیا جائیگا کہ یوسف علیہ السلام کو پیغمبرانہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے درجۂ اختصاص اور مرتبۂ کرامت حاصل تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو کریم ابن کریم۔ معزز انسان اور معزز انسان کے بیٹے قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں عزت کرامت کے ساتھ نبوت کی تصدیق کی گئی ہے۔ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا۔ بہت زیادہ معزز و مکرم کون ہے۔ جواب میں فرمایا گیا۔ اللہ کے نبی یوسف۔ نبی اللہ (یعقوب) کے بیٹے۔ نبی اللہ اسحٰق کے پوتے۔ خلیل اللہ ابراہیم کے پڑپوتے[۱]۔

رجحان حکومت | یوسف علیہ السلام کی زندگی اسلامی حکومت کے رجحان کی روشن سے زیادہ روشن شرح ہے۔ قرآن میں سورۂ یوسف کا جگہ پانا وہ اعزاز ہے جو بنی اسرائیل کے سرداروں میں کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا۔ یہ ایک عام حقیقت ہے کہ دنیا کے برگزیدہ افراد حالتِ خواب سے قطع نظر بیداری میں خواب دیکھتے ہیں اور مردانہ وار جدوجہد کے ذریعہ ان کی تعبیروں سے اپنی زندگی کی بلند و بالا عمارت بناتے ہیں۔ حضرت یوسف نے اسی قسم کا خواب دیکھا۔ بزرگوار باپ نے تعبیر میں اس خداداد اقتدار کا سادہ نقشہ کھینچ دیا جو کچھ ہی دن بعد دنیا کی نگاہوں پر آراستہ ہونے والا تھا[۲]

(۱) تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کریگا۔

(۲) تجھ کو معاملات اور سیاسی باتوں کی فہم عطا کریگا۔

---

[۱] قال یوسف نبی اللہ، ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفسیر میں اور ابو یعلیٰ اور بزار نے اپنی اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹

[۲] قرآن عظیم پ۱۲ (سورۂ یوسف) وکذٰلک یجتبیک الخ

(۳) تجھ کو حکومت کی ذمہ داریاں دے کر اپنی نعمت تجھ پر پوری کردیگا

(۴) تیرے واسطے نعمت کی تکمیل اسی طرح ہوگی جس طرح تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق پر اس سے پہلے نعمت کو مکمل کیا گیا۔

قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کردیا "مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ (ہم نے یوسف کو زمین میں حکومت کا تمکن عطا کیا)۔ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (اور جب (یوسف) اپنی قوت کو پہنچ گیا تو ہم نے اس کو حکومت دی اور علم اور ہم نیک کردار اور حکمبردار لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں)۔

یوسف علیہ السلام خود بھی اعتراف کرتے ہیں "رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ (پروردگار فرمانروا! بیشک تو نے مجھ کو کچھ حکومت دی ہے) اس اعتراف کے بعد کچھ اور اعترافات ہیں۔

(۱) پروردگار نے مجھے گفتگو کے اُس رُخ کی تعلیم دی جو فہم و فراست سے متعلق ہے۔ یعنی جس سے حکیمانہ اور سچے سیاسی پہلو پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) اللہ آسمان و زمین کو فطرت پر پیدا کرنے والا ہے۔ دنیا میں اور دنیا کے بعد کی زندگی میں میرا کارساز ہے۔

(۳) (دعاء) پروردگار مجھے ایک (حکمبردار) مسلمان کی موت دے اور مجھے صالح اور صلاحیت پسند انسانوں کے ساتھ شامل کر۔

یوسف علیہ السلام کی حکومت کے رجحان میں چند اور بھی نمایاں، لائق توجہ اور روشن پہلو ہیں۔ یہ امر ہر طرح قابل لحاظ ہے کہ یوسفؑ ابراہیمؑ کے ابائی معاشرہ کے رکن اور پیغمبرانہ مطمع نظر کے داعی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہیں۔

---

[۱] قرآن عظیم سورۂ یوسف ۱۲ [۲] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۰۳

ہیں اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی اجتماعی ہیئت (ملت) کا پیرو ہوں۔ وَ اتبعت مِلَّۃَ اٰبَآئِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ (قرآن عظیم سورۂ یوسف)

کسی قوم کا بنانا اور ایک قوم کی بنا رکھنا دونوں کام یکساں عزیمت اور قوی توجہ کے طالب ہیں۔ حضرت ابراہیم کی تنظیمات ملی کے بعد حضرت یوسف پہلی ہستی ہیں جنہوں نے عمل کے میدان میں آکر بنی اسرائیل کا قومی نظام بنایا۔ عرش کی بادشاہت اور خدا کی قوم کے درمیانی ربط کو مضبوط اور روشن فرمانوں سے محکم و منور کیا، علم اور حکومت کا آفتاب عالمتاب یوسف مصر کے جیلخانہ میں بند ہے مگر سطح نظر ذہن سے غائب نہیں۔ قیدیوں سے خطاب ہے اور اعلان نصب العین کا۔

قیدخانہ کے رفیقو! ایک معبود اچھا یا کئی معبود۔ ایک حکمراں اچھا ہے یا کئی حکمراں۔ حکومت کس کی ہے؟ عبادت کس کی واجب ہے؟ محکم دین کا وہ مفہوم کیا ہے جسے دنیائے انسانیت کی اکثریت نہیں جانتی؟ حکومت اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں۔ یہ اللہ کا حق ہے جس پر کوئی دست درازی نہیں کرسکتا۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت (اطاعت) نہ کرو۔ یہی دین محکم ہے جس سے انسانی اکثریت لاعلم ہے۔ ان الحکمُ الا للہ ۔ امر الا نعبدُ الّا ایاہ ۔ ذٰلِک الدین القیم ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون (یوسف[1])

حضرت یوسف کے دور میں اللہ کی حکومت کا یہ عنوان جس رنگ سے مرکز نمود پر آیا اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ یوسف علیہ السلام زندگی کی پیچ و خم دیدہ راہوں سے مصر پہنچے اور عزیز مصر کی حیثیت سے مملکت کے قائد و امام مقرر ہوئے۔ اس طرح حکومت کی ذمہ داری منشائے الٰہی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ یہی وہ ارضی اقتدار و استقرار تھا جس کا ذکر قرآن میں اظہار واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے[1]۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۰۲۔

علامہ ابن کثیر کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت امامت اور ولایت کے نظریات کے مطابق تھی۔ عزیز مصر ولید بن ریان کو فرمانروا کی حیثیت سے یہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ یوسف عقل کے اعتبار سے کامل، رائے کے اعتبار سے مضبوط اور فہم کے اعتبار سے پختہ کار اور کردار کے اعتبار سے شرافت کا معیار ہیں۔ اس یقین کے نتیجہ میں حضرت یوسف کو اختیارات ملے اور ارض مصر پر حکومت و اقتدار حاصل ہوا۔[1]

حکومت موسیٰ علیہ السلام | دنیا کے الہامی صحیفے اور تاریخی نوشتے سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبرانہ عزائم اور سیاسی عواطف ایک مستقل قانون شریعت اور حکمت عملی کے تابع تھے۔

قرآن عظیم کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کی اجتماعی غلامی، فرمانروائے وقت کے گھر میں موسیٰ کا نشوونما، دور شعور میں سیاسی قوت کا ذہنی عروج، حکومت کا خدا داد میلان۔ بنی اسرائیل کی غلامی کا احساس، دنیا کی ایک تاریخی قوم کی نجات کے لیے غیر سازگار ماحول سے نکلنا۔ ارض مدین کے حوالی میں قدرت کا تابع فرمان بن کر چند سال معاشرتی زندگی بسر کرنا، وادی مقدس (سینا) میں ربانی قوت سے فیضیاب ہونا، فیضیاب ہو کر اپنے بھائی ہارون کی معیت میں بنی اسرائیل کے شیرازہ کو منظم کرنا اور آخر الامر وقت کے جابر ہستی کے متکبرانہ ادعا کے مقابلہ میں آنا اور فائز المرام ہو کر بنی اسرائیل کو فرعونی شہنشاہیت سے نجات دے کر فطری حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت لانا ایسے واقعات ہیں[2] جن سے عصر موسیٰ کے سیاسی ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

قوم موسیٰ | قرآن عظیم میں قوم فرعون کے مقابلہ میں قوم موسیٰ کا ذکر موجود ہے۔ اور ایک ایسے مقام پر جہاں انسانیت عامہ کو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ سارے عالم اور اہل عالم کے لیے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۲۰۵، ۲۱۰۔ تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۵۱

[2] قرآن عظیم سورہ الشعراء ۲۶۔ تفسیر ترجمہ شیخ الہند ص ۴۶۳

[3] دیکھو قرآن عظیم سورۃ الشعراء، طٰہٰ، الفرقان، القصص، سورہ یونس، سورہ الاعراف، سورہ غافر

اُس بالا دست ذات کے پیغمبر ہیں جس کی سلطنت آسمان و زمین کے دائرہ پر حاوی ہے وہاں قوم موسیٰ کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا گیا ہے اُمَّۃٌ یہدون بالحق و بہ یعدلون ایک اُمت جس کے افراد راہ حق کے رہنما ہیں اور قانون حق کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔[1]

یاد رکھنا چاہیے کہ بنی اسرائیل کے ارکان میثاق ربانی کے پابند تھے جس کی خاص دفعات یہ تھیں بنی اسرائیل خدائے واحد کی عبادت اور اطاعت کرینگے، نماز اور زکوٰۃ ادا کرینگے، آپس میں خونی جنگ نہ لڑینگے، اور ہموطنوں کو جلا وطن نہیں کرینگے۔ یہ ربانی معاہدہ ایک ایسے ربانی مطالبہ پر مبنی تھا جس کا تعلق قانون مدنی کی ایک عام دفعہ سے ہو سکتا ہے۔ مطالبہ یہ تھا۔ "لا تلبسوا الحق بالباطل" (حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا) دنیا کا ہر حکم کسی اصل پر مبنی ہوتا ہے۔ اس حکم کی اصل خدا کے الفاظ میں وہ یادگار امتیاز تھا جس کی بنا پر خدا نے تمام عالم سے بنی اسرائیل کو فضیلت کے لیے چھانٹا تھا (انی فضلتکم علی العلمین بقرہ)

سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی اول درجہ کی پیغمبرانہ ذمہ داریوں کے ساتھ کس طرح ایک اجتماعی ہیئت کی تنظیم کی اور کس طرح ایک غلام قوم کو آزادی دلائی اور اپنے کارناموں سے حکومت و سلطنت کے لیے راہ پیدا کی اس کا اظہار قرآن عظیم کے ناقابل تردید بیان سے ہوتا ہے۔

"القصص[2]" جب موسیٰ اپنی طاقت پر پہنچ گیا اور سنبھل گیا تو ہم نے اس کو حکم دیا اور حکومت کا علم (قرآن عظیم)

سورۂ الاعراف کے الہامی بیانات سے اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے موسیٰ علیہ السلام کو جو منصب عظیم عطا کیا تھا اس کے متعدد ترکیبی عناصر تھے۔

"رسالت ربانی" "پیغمبرانہ ذمہ داری" "کلام[3]" "ربانی فرمان" "الواح[4]" "لکھے ہوئے قوانین۔"

---

[1] قرآن عظیم پ۹ الاعراف، [2] پ۱، البقرہ ۲

"رُشد" طاغی طرزِ حکومت کے خلاف حکومت راشدہ کا اعلیٰ طریقہ اور سلیقہ، ان عناصر کے ساتھ قرآن نے یہ بھی بیان کر دیا کہ ان سب کا مقصد قوت کا حصول تھا، اور اپنی قوم پر اچھے عنوان سے حکومت کرنا۔ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا (موسیٰ! الواح کو قوت سے اپنے ہاتھ میں لے اور اپنی قوم کو حکم کر کہ اس کی اچھی دفعات پر عمل کر رہے۔ (ترجمہ شیخ الہند[۲۱۶])

دنیا کا عام اصول ہے کہ پہلے ایک قوم غلامی کے سلسلۂ محکم کو توڑتی ہے اس کے بعد حکومت قائم کرتی ہے۔ عہد موسوی میں یہ اصول حالات و واقعات کے روشن آئینہ میں اچھی طرح اپنی جھلک دکھا چکا ہے۔ اسی حکومت کا احساس تھا جس نے حضرت موسیٰ کو یہ اعتراف کرنے پر آمادہ کیا۔ مجھ کو میرے خدا نے حکومت دی اور مجھے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر قرار دیا (فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ (الشعراء)

جنگ آزادی | بنی اسرائیل کی نجات اور آزادی کی جنگ دو چیزوں سے شروع ہوئی جن میں سے ایک دعویٰ تھا اور دوسرا مطالبہ، دعویٰ یہ تھا کہ اس دنیا کی حکومت کا مالک خداوند عالم ہے اور ہم اس کے عطا کردہ اختیارات کے نمائندے ہیں اور مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر مجبور کر دیا گیا ہے۔ ان کو آزاد کر کے ہمارے ساتھ روانہ کرو۔ فرعون نے آزادی کے مطالبہ کو باتوں باتوں میں گم کر دیا اور دعوے کے متعلق جواب دیا "مَا رَبُّ الْعٰلَمِينَ" خداوند عالم (حکمران کائنات) کون ہے[۱]؟ یہ سوال ایک پرجوش مقابلہ کا چیلنج تھا جس کا جواب حضرت موسیٰ نے ان الفاظ میں دیا "رب العالمین کون ہے؟ آسمان و زمین اور کل کائنات کا پروردگار (فرمانروا)

فرعون کی سمجھ کا پیمانہ حکومت کے جنون آزما ہاتھوں سے الٹ چکا تھا اس لیے اس نے اصلاحِ حال کی جگہ مقابلہ کا نعرہ لگا دیا۔ "انا ربکم الاعلیٰ" (میں ہوں، میں تمہارا فرمانروائے اعلیٰ) اس نعرہ کا بلند ہونا جنگ کا بگل ہونا تھا۔ ایک طرف خدا کی مرضی موسیٰ، ہارون اور بنی اسرائیل

---

[۱] قرآن عظیم پ ۱۹، الشعراء، اِنَّا رَسُوْلُ ربّ العلمین سے ان کنتم تعقلون تک [۲] سورۂ النازعات

کے ساتھ بھی حضرت موسیٰ نعرہ بلند کر رہے تھے کہ میں غالب طاقتوں کے ساتھ مقابلہ کرونگا۔

دوسری طرف فرعون تھا، فرعون نے اپنی عزت کے جھوٹے غرور (پرسٹیج) سے مجبور ہو گیا (وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ) اس نے تکبر ظاہر کیا۔ اور اس کی فوج ناحق بڑائی کے محاذ پر نکل آئی۔[1]

مقابلہ روحانی قوتوں سے شروع ہو کر مادی طرز پر ختم ہوا۔ فرعون ناکامی کے حقیقی سمندر میں غرق ہو گیا۔ اور اس طرح غرق ہوا کہ حکومت کی بربادی کا غم اس کے منہ میں سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ (الزخرف)

یہ جنگ حکومت کے معاملات سے کس حد تک متعلق تھی اس کی تصدیق حضرت موسےٰ[2] کے ان الفاظ سے ہو سکتی ہے۔

(۱) موسیٰ نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا۔ اللہ سے کمک مانگو، برداشت سے کام لو۔ کوئی شک نہیں اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے زمین کا وارث بناتا ہے۔ انجام خدا ترس نکوکار انسانوں کے لیے ہے (سورۂ اعراف)

(۲) وقت قریب ہے کہ اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیگا اور تم کو روئے زمین کی خلافت و حکومت عطا کریگا۔

اس سے بھی زیادہ واضح وہ "قومی اعلان" ہے جو حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے اس وقت جاری کیا جب ارضِ مقدس میں داخلہ کا حکم دیا اور ایک خطرناک انقلاب سے آگاہ کیا۔

"اے قوم اللہ کے انعام کو یاد رکھ اس نے تم میں نبوت کا منصب دیا اور حکومت کے علمبردار پیدا کیے۔ تم کو وہ اقتدار دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا۔ اے قوم ارضِ مقدس میں

---

[1] قرآنِ عظیم، الدخان وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ سے بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ تک [2] القصص

داخلہ کا شرف حاصل کر۔ یہ اللہ کی قانونی ہدایت ہے۔ اور رجعت سے تعلق نہ پیدا کرو اور نہ تم لوگ ایک ایسے انقلاب کی لپیٹ میں آجاؤ گے جو نقصان پہنچائیگا۔ (المائدہ)

افسوس بنی اسرائیل حق و باطل کی جنگ کے بعد فطری حکومت کی بنیاد پر اپنی سیاسی تنظیم کا کام مکمل نہ کر سکے۔ یہود آج تک جہانگرد قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا نہ دنیا کی سیاسی نظم میں کوئی حصہ ہے، نہ حکومت ہے، نہ اقتدار۔

یہ خدا کا فیصلہ ہے اور قرآن کا اعلان، دنیا کی تاریخی قوموں کی کوششیں آج تک یہود کی قسمت کے سادہ نقشہ میں نہ رنگ بھر سکی ہیں اور نہ بھر سکتی ہیں۔ یہ خدائی فیصلہ ہے اور خدائی فیصلے کبھی نہیں بدلتے۔

خلافت یوشع ؑ طبری اور ابن کثیر کا متفقہ بیان ہے کہ سیدنا موسیٰ کے آخری دور حیات میں حکومت الٰہی کی ذمہ داری حضرت یوشع کے ہاتھ میں پہنچی۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو شدید ابتلا سے نجات دلائی، بیت المقدس پر قبضہ کیا اور سرکش حکومتوں سے جنگ کر کے ان کو زیر کیا اور خدائی بادشاہت قائم کی۔[1]

بیت المقدس کی فتح کے متعلق تاریخ کے کئی بیان ہیں۔ ہمارے مورخین کی رائے عام جس کو ابی ہریرہؓ کی بیان کردہ حدیث کی تائید حاصل ہے یہ ہے کہ ہارون ؑ اور سیدنا موسیٰ ؑ کے انتقال کے بعد حضرت یوشع ؑ نے بیت المقدس کو فتح کر کے بنی اسرائیل کے لیے حکومت قائم کی۔[2]

زمانۂ حال کا سیاسی مورخ جے کے بلنچلی (جرمن مقنن) بھی اپنے الفاظ میں مسلمان مورخین کی رائے کی تائید کرتا ہے اور اپنی کتاب[3] میں لکھتا ہے "بنی اسرائیل نے سیاسی نمو بیت

---

[1] البدایۃ والنھایۃ ابن کثیر ج ۱ ص ۳۱۹ نبوۃ یوشع [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۲۳ تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۶۹، ۷۰۔

[3] نظریہ سلطنت طبع عثمانیہ۔ مقالہ ۱ ص ۱۵۔

حضرت موسیٰ سے حاصل کرلی تھی مگر وہ سلطنت کی حیثیت میں اُس وقت تک نہ آسکے جب تک یوشع نے ان کو فلسطین میں متمکن نہ کر دیا"۔

اہل تورات کا بیان ہے کہ حضرت یوشع نے شام کے اکتیس والیان ملک سے جنگ کی اور ان کو شکست دے کر فتح حاصل کی درحقیقت یہ فتح و فوز حکومت الٰہی کے واجبات کو پورا کرنے کے لیے تھی قدس کی فتح اور دنیاوی نظریہ حکومت کی شکست نے یہ ظاہر کر دیا کہ پیغمبر علیہ السلام اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر چکے ہیں۔

خلافت حزقیلؑ حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سیدنا یوشع علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا نظام اور نیابتی حکومت (خلافت) کا منصب حزقیل بن بوذی کے ہاتھ میں آیا۔[۱] محمد ابن اسحاق کی ایک تاریخی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حزقیل علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں پھر ایک بار خرابی رونما ہوئی اس لیے سیدنا الیاس بن یاسین اجتماعی اصلاح کے لیے انسانوں کے درمیان تشریف لائے اور خدا کے احکام کے مطابق کام کرتے رہے۔[۲]

خلافت الیاسؑ قرآن عظیم میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے بعد سیدنا الیاس کا ذکر کیا گیا ہے قرآن ان کو تابع فرمان مردِ مومن اور بندگانِ خدا میں مخلص کا خطاب دیتا ہے۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ تاریخ میں بنی اسرائیل کے خاندان نبوت کے رکن کی حیثیت سے دمشق کے مغرب میں بعلبک کے باشندوں کی بہتری کا نعرہ بلند کیا[۳] ایک جابر شہنشاہ کے مقابلہ میں خدا کی بادشاہت کے پاکیزہ اصولوں کو پیش کیا اور ایک جابر فرمانروا کے مرنے کے بعد دوسرے فرمانروا کو مسلمان کیا۔ جس کے بعد عوام کی بڑی اکثریت اسلام کے مرکز قیم پر آئی اور اپنے فائدہ

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۳۰۲ [۲] قرآن عظیم میں سیدنا حزقیل کے زمانہ کا ذکر بالواسطہ موجود ہے دیکھو الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت۔ (الخ) تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۲۳۰۔
[۳] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۲۳۹ [۴] قرآن عظیم سورہ الصافات

اپنے فائدہ کے لیے مسلمان ہوگئی۔[1]

خلافت یسع علیہ السلام | حضرت الیاسؑ کے بعد سیدنا یسعؑ منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ قرآن میں دو جگہ ان کے دو نمایاں وصف موجود ہیں سورۂ انعام میں اعلان ہے کہ وہ دنیا میں اقتدار کے مالک بنائے گئے۔ سورۂ "صٓ" میں ہے کہ وہ انسانی نظام کے بہترین فرد ہیں۔ اسحاق ابن بشر نے سعید اور قتادہ کے واسطے سے حضرت حسن سے جو روایت بیان کی ہے۔ اس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سیدنا یسع، حضرت الیاس کے بعد انسانوں کی بہتری کے لیے مقرر ہوئے۔ اس بیان میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک محکم بنیاد پر انسانوں کی شیرازہ بندی میں حصہ لیا، انھوں نے طرز سیاست اور قانون وہی باقی رکھا جس کو ان کے پیشرو نے جاری کیا تھا تاریخی طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت یسع کے بعد انسانی نظام میں سالہا سال تک خرابی کی صورتیں رونما رہی ہیں یکے بعد دیگرے خلفا ہوتے رہے مگر زمانہ کے ماحول میں عام خرابی پیدا ہو چکی تھی اور ایک سرکش بادشاہ دنیاوی طرز پر تشدد کے ساتھ حکومت کے تخت[2] پر قابض تھا۔

امامت شموئیل علیہ السلام | شموئیلؑ کی پیدائش، زندگی اور زندگی کا جہاد پیغمبروں کی تاریخ کے مسلمات میں سے ہیں۔ ان کے زمانہ میں مذہبی حکومت نے اپنے فطری اوصاف کو اس طرح ظاہر کیا جس سے سلطنت کے مزاج میں چند نئے اصولوں کو دخل حاصل ہو گیا۔

قرآن عظیم کی مستقل تصریحات اور مورخ طبری، ابو حیان اندلسی اور حافظ عماد الدین ابن کثیر کی تاریخی روایات سے سیدنا شموئیل کے زمانہ کے سیاسی بحران کا پتہ چلتا ہے۔

سیدنا موسیٰ کے بعد بحر روم کے کناروں پر مصر اور فلسطین کے درمیان عمالقہ آباد تھے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۲ ص ۴ [2] ایضاً ج ۲ ص ۴۔

اور ایک دنیا دار اور دنیا ساز جابر شہنشاہ جالوت ان کا مختار مطلق فرمانروا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے بنائے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو شہروں سے نکال دیا۔ اسرائیلی حکومت کے اکثر علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد ظلم کو عام کر دیا۔ ان کے سرداروں کو قید کر دیا شہریوں کو غلام بنا لیا۔ زبردست ٹیکس (محصول) عائد کر کے مالی دستبرد کا سلسلہ شروع کیا، اور تبرکات کا تابوت جو حکومت و اقتدار اور ایمان و اعتقاد کا سہارا تھا چھین[1] لیا۔

اس صورتِ حال نے ستم رسیدہ انسانوں کو شدید مقاومت پر آمادہ کر دیا[2]۔ اور انہوں نے متحدہ محاذ کے ماتحت سیدنا شموئیل کی خداداد رہنمائی کو قبول کر کے کامیابی کے لیے نئی طرح ڈالنے اور اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ لکھتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں خرابی کی صورت پیدا ہوئی تو ان پر جابر بادشاہ جالوت مسلط ہو گیا۔ جالوت نے ان کو جلا وطن کیا۔ غارتگری کر کے لوٹا اور اپنا غلام بنا لیا۔ اس وقت حضرت شموئیل پیغمبر تھے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ ہم پر کسی شخص کو بادشاہ مقرر کر دیجیے۔ تاکہ ہم اس کی کمان میں خدائے واحد کے لیے میدان جنگ و جہاد میں سرفروشی کے جوہر کھائیں۔

جنگ طالوت و جالوت

پیغمبر خدا نے بنی اسرائیل کی رائے عامہ کے رجحان کو قبول کر لیا اور طالوت کو اجتماعی نظام کا سرسالار مقرر کر دیا۔ شیخ الہند کا بیان ہے کہ طالوت کی قوم میں پہلے سے سلطنت نہ تھی۔ غریب محنت کش قوم تھی[3]۔ بنی اسرائیل کا مزاج خاندانی سرداری، سرمایہ داری اور سلطنت سے متاثر تھا، اس لیے غریب طبقہ کے سردار طالوت کا سلطنت کی مسند پر آنا پسند خاطر نہ ہوا۔

---

[1] بحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۲ ص ۲۵۴ (ذکر طالوت)۔ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۲ ص ۵

[2] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۲۴۲ (خبر شموئیل)

[3] فوائد القرآن شیخ الہندؒ پ ۲ البقرہ متوسط بجنور ص ۵۱ فائدہ ۱۰۳۱۔

قرآنِ حکیم بنی اسرائیل کے احتجاج کو ان الفاظ میں نقل کرتا ہے۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طالوت کی حکومت ہم پر ہو ہم اُس سے زیادہ سلطنت کے مستحق ہیں، اس لیے کہ طالوت سرمایۂ دولت کی کشائش سے محروم بے زر غریب انسان ہے" پیغمبر نے اس سرمایہ دارانہ رجحان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بحث کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

"مانا اس کے پاس سرمایۂ دولت کے وافر خزانے نہیں ہیں مگر اللہ نے اس کو تمہارے مقابلہ میں ترجیح دی ہے۔ اس کو بہت زیادہ علم اور ظاہری جسمانی طاقت اور اعتبار عطا کیا ہے۔ حکومت اللہ کی چیز ہے۔ یہ اُس کا حق ہے، جس کو وہ انتخاب کرے۔" اس جواب کے بعد اب پیغمبر کے نامزد کیے ہوئے نو مالدار حکومت کے ہاتھ میں سلطنت کی ایک ایسی سند آگئی جسے ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑا۔ اب جنگ کے لیے تیاری شروع ہوئی۔ حضرت شموئیل اس تمام محاذِ عمل پر اصل رہنما تھے اور طالوت صرف سیاسی نظام کا تاجدار اور عسکری دستوں کا سپہ سالار تھا۔ بنی اسرائیل عرصہ دراز سے لازمی فوجی خدمت سے سبکدوش تھے ان کو لام بندی کے لیے کہا گیا اور امتحان لیا گیا تو اکثر ناکام ہوگئے۔ ہزاروں میں سے چند سو سپاہی محاذ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہوئے۔ طالوت کی مختصر فوج نے خدا سے عزیمت اور قوت برداشت کی دعا کی کمک کی درخواست کی اور جالوت کی عظیم فوج کے مقابلہ میں نکل پڑی، جنگ ہوئی طالوت کی فوج نے جالوت کی فوج پر فتح حاصل کر کے دنیاوی نظریۂ حکومت کو دینی نظریۂ حکومت سے کھلے میدان میں شکست دی۔ قرآن عظیم نے اسی فتح پر دنیا کے لیے ایک نئے اصول کا اعلان کیا۔

اللہ کے حکم سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اقلیت، اکثریت پر غالب آجاتی ہے۔

۱؎ دیکھو قرآن عظیم ترجمہ و فوائد القرآن شیخ الہند پارۂ دوم کے آخری تین صفحات۔ سورۂ بقرہ
۲؎ بحر المحیط ابو حیان ج ۲ ص ۲۵۵   ۳؎ قرآن عظیم پ ۲، بقرہ

سلطنت داؤد و سلیمانؑ | سیدنا داؤدؑ اور ان کے نامدار صاحبزادے سلیمان (علیہ السلام) دونوں سلطنت خداداد کے مالک تھے۔ حکومت، علم حکومت، عادلانہ قوت فیصلہ حکمت و سیاست یہ امور ہیں جو پیغمبری کے ازلی و ابدلی قانون کے متعلق دونوں بزرگوں کی زندگی میں بے واسطہ موجود تھے ان کے دور حیات میں ربانی سیاست نے جو تنظیمی صورت اختیار کی اس سے اس نظریہ کو فیصلہ کن تقویت حاصل ہوتی ہے کہ دنیا میں خدا کے پیغمبروں کی اصلاحی ذمہ داریوں میں حکومت کرنا[1] اور طاغی حکومتوں کی اصلاح کرنا بھی داخل ہے

علامہ زمخشری کی تشریح سے ہمارا علم اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سلیمانؑ اور داؤدؑ کی حکومت میں دو پہلو زیادہ نمایاں تھے۔ "دونوں قانون کے شارح بھی تھے قوم کی بڑی عدالت کے حاکم اعلیٰ بھی" آج کل کے زمانہ میں دنیاوی حکومت کی مجلس قانون ساز کے رکن اور پریوی کونسل (اعلیٰ عدالتی کونسل) کے جج کو جو کام کرنا پڑتا ہے اس کو یہ دونوں اصحاب کبھی الہامی تائید سے کبھی اجتہاد سے انجام دیتے تھے۔

سلیمانؑ اپنے باپ کی حکومت کے لیے علم و حکمت کا ستون تھے۔ بچپن ہی سے ہونہار اور صلاحیتمند نظر آتے تھے۔ ایک مرتبہ کسانوں اور گلہ بانوں کے درمیان نزاع ہوا۔ یہ اہم مقدمہ دونوں کی مشترکہ عدالت میں پہنچا۔ دونوں نے علیحدہ علیحدہ فیصلہ تجویز کیا لیکن سلیمان علیہ السلام کی خداداد سیاسی فہم اور حکومت کے سلیقہ نے ترجیح[2] حاصل کی۔ آخر میں سیدنا داؤد نے بھی اس فیصلہ کے حق ترجیحی کی تصدیق کر دی۔ یہ تصدیق درحقیقت آنے والے دور حکومت کی ایک علامت

[1] دیکھو الکشاف امام محمود زمخشری ج ۳ ص ۱۷۔ قرآن مجید ترجمہ شیخ الہند طبع بجنور پ، الانبیاء۔ فوائد علامہ عثمانی ہمارے علماء اجتماعیات نے اپنی مستند تصانیف میں جو تفصیلات پیش کی ہیں۔ علامہ عثمانی دیوبندی نے ان کو اردو داں طبقہ کے لیے مختصر اور روشن الفاظ میں جمع کر دیا ہے) دیکھو ص ۴۲۵۔

[2] دیکھو کشاف الانبیاء۔ لفظ "ففہمناھا" (حکومت دفتری) ج ۳ ص ۱۷

تھی جو عصر سلیمان میں روشن مثال کی طرح دنیا کے سامنے آئی۔[1]

قرآن عظیم داؤد و سلیمانؑ کی حکومت کے تنفیذی اثر و اقتدار کو تسلیم کرتا ہے اور ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔ وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا (ہم نے ان دونوں کو حکومت اور علم (حکومت) عطا کیا ہے۔

عصر داؤد

تاریخ کا بیان ہے کہ طالوت حضرت شموئیلؑ کی بالادست ہدایت پر مدین پر حملہ آور ہوا داؤد جنگی قیدی کی حیثیت سے فاتح طالوت کے ہاتھ آئے۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں معلوم ہو گیا کہ یہ جنگی قیدی خدا اور بندگان خدا کی نظر میں کتنا محبوب ہے۔ داؤد کا جنگی قیدی ہونا ایک نئے سیاسی اصول اور انقلاب حکومت کا پیش خیمہ ہوا۔

طالوت نے جنگ مدین میں جس طرز پر کام کیا، وہ ایسا نہ تھا کہ آئندہ اس کے ہاتھ میں حکومت کی زمام رہتی۔ اللہ کا حکم آیا اور سیدنا شموئیلؑ نے اس کی تعمیل کی پیغمبر نے کہا "طالوت! اب تمہاری خاندانی حکومت نہیں رہ سکتی، حکومت خدا کی چیز ہے اور خدا کا قانونی فرمان یہ ہے "میں اُس کو اقتدار دیتا ہوں جو میری اطاعت کرتا ہے اور اُس کو گرا دیتا ہوں جو میرے حکم کو معمولی سمجھتا ہے"[2]

طالوت کی حکومت داؤد کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ تھا حکومت کا انقلاب جس کو سیدنا شموئیل نے خدا کی حکومت کے نمائندے کی حیثیت میں رونما کیا۔ اس کے بعد طالوت کے علم میں یہ بات بھی لائی گئی کہ تمہاری شخصی اور خاندانی حکومت ختم ہو گئی۔ اس اعلان سے یہ سیاسی اصول سامنے آگیا کہ حکومت کسی ایک خاندان اور ایک شخص کی میراث نہیں ہے۔ حکومت ایک تنفیذی قوت ہے۔ جو خدائی قانون کی اطاعت کرنے والوں کو ملتی ہے۔[3]

---

[1] اس مقدمہ کا ذکر قرآن عظیم نے سورۂ انبیاء میں کیا ہے۔ تاریخی تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ طبری ج ۱ ص ۲۵۳

[2] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۷۶۔ (ذکر ملک داؤد)

[3] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۲۴۹۔

طالوت کی معزولی کے بعد سیدنا داؤد اسرائیلی حکومت کے علمبردار بن گئے۔ مؤرخ طبری اور ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل داؤد علیہ السلام کے گرد جمع ہو گئے اور اس اجتماع کے نتیجہ میں کچھ امور خاص صورت میں ظاہر ہوئے

(۱) داؤد علیہ السلام نے خدا کے پیغمبر اور نمائندہ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ خدا کی مرضی نے یہ ظاہر کر دیا کہ ان کو نبوت کے ساتھ سلطنت بھی عطا کی گئی ہے۔

(۲) خدا نے اپنا مجموعۂ قانون (کتاب زبور) اور تحریری ضابطہ داؤد پر نازل کیا۔ داؤد خوش الحانی سے اس کو تلاوت کرتے۔ اور اُس سے عجیب اثر پیدا ہوتا۔

(۳) داؤد علیہ السلام نے خداداد علم کی قوت سے صنعتِ فولاد کو شروع کیا۔ وہ دنیا میں پہلے موجد ہیں جنہوں نے فولاد سے جنگی لباس دفاعی مقصد کے لیے ایجاد کیا۔

(۴) حضرت داؤد کو خشکی کی طرح پہاڑوں پر بھی تصرف حاصل تھا۔

(۵) حکومت داؤد عالمانہ تدبیر علمی اجتہاد اور سیاسی حکمت عملی پر قائم تھی۔ حکمت عملی میں اجتہاد کی نمود اس دور حکومت کی خصوصیت تھی۔

(۶) چار ہزار کمربستہ سپاہی باڈی گارڈ کی حیثیت سے رات دن موجود رہتے اور حضرت داؤد کی حفاظت کرتے تھے۔ اس شان کے باوجود سلطنت کے بیت المال سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ ایک باکمال موجد کی حیثیت سے دستکاری سے کچھ رقم پیدا کرتے تھے جو معاشی ضرورت کو پورا کر دیتی تھی۔

(۷) ولی عہد حکومت کے بھائی ایشار نے سرکشی اختیار کی پیغمبر کے حکم سے اس کے خلاف فوج کشی کی گئی۔ حضرت داؤد چاہتے تھے کہ ایشار کو زندہ پکڑ لیا جائے۔ مگر شکست کھانے کے بعد ایک کمانڈر کے ہاتھ سے مارا گیا۔[۵]

[۵] تفصیل کے لیے دیکھو قرآن عظیم سورۂ انبیاء۔ تاریخ الکامل ابن کثیر ج ۱ ص ۷۶-۷۷، تاریخ طبری ج ۱ ص ۲۴۸۔

عصرِ داؤد کا عظیم واقعہ طرزِ حکومت کے متعلق اُس جدید فیصلہ کا اعلان ہے جس نے حکومت کو شخصی اور خاندانی میراث کے دائرہ سے نکال کر یہ قانون مقرر کیا کہ سلطنتِ ارضی کے لیے خاندان نہیں صلاحیت شرط ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ طالوت کی جگہ داؤد کی حکومت اسی اصول کا اظہار تھا۔

زبورِ داؤد اور قرآن عظیم اس وقت نظر کے سامنے ہیں۔ ان سے عصرِ داؤد کے تصورِ حکومت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

زبور کی ریلی آیات قرآن عظیم کے انداز میں خدا کی حکومت کا ترانہ پیش کرتی ہیں۔

خدا تمام زمین کے اوپر بادشاہ عظیم ہے (زبور ۴۷/۲) خدا سارے جہان کا بادشاہ ہے (۷) خدا قوموں پر بادشاہت کرتا ہے۔ خدا اپنے مقدس تخت پر بیٹھا ہے (۸) قوموں کے امام ابراہیم کے خدا کے لوگوں سے مل کر جمع ہوئے ہیں۔ جہاں کی سپریں خدا کی ہیں۔ وہ نہایت بلند ہے (۹)

——— میرے بادشاہ اور میرے خدا مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر (بیت اللہ) میں بستے ہیں (زبور ۸۴/۴) خداوند سلطنت کرتا ہے (زبور ۹۳/۱) خدا بڑا ہی خدا ہے اور بڑا ہی بادشاہ ہے۔ زمین کی بڑی سے بڑی گہرائیاں اس کے قبضہ میں ہیں۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اس کی ہیں، بحر اس کا ہے، بر اس کا ہے (زبور ۹۵/۳-۵)

زبور مقدس نے خدا کی حکومت کے مندرجہ بالا اعلان کے بعد وہ اصولِ وراثت بھی بیان کردیا ہے جس کے ماتحت طالوت کے بعد سیدنا داؤد کو حکومت کی ذمہ داریاں ملیں۔

وہ جو خدا کے منتظر ہیں زمین کو میراث میں لینگے (زبور ۳۷/۹) خدا انصاف کو دوست رکھتا ہے وہ اپنے پاکباز نکوکار لوگوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ راستباز زمین کے وارث ہونگے اور ابد تک اس پر بسینگے (۲۸ تا ۳۰) خداوند کا منتظر رہ اور اس کی راہ کو یاد رکھ کہ وہ تجھ کو زمین کا وارث کرکے

سرفرازی بخشیگا (۳۵)[1]

اِن آیات سے معلوم ہوگیا کہ خدا کی حکومت شخصی اور خاندانی میراث نہیں ہے بلکہ صالح اور راستباز لوگوں کی میراث ہے۔ قرآن عظیم اسی حقیقتِ عظمٰی کو ایک سرکاری اعلان کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔

"ہم[2] نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ تحریری ضابطہ درج کر دیا ہے کہ آخر زمین پر ہمارے صلاحیتمند صالح بندے وارث ہونگے۔ لاریب یہ سرکاری اعلان ہے عبادتگذار قوم کے لیے"۔

قرآن عظیم سیدنا داؤد کی حکومت کو ان الفاظ میں تسلیم کرتا ہے۔

ہم نے داؤد کی سلطنت کو قوت دی حکمت وسیاست عطا کی اور قوت فیصلہ مرحمت کی

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (پ۲۳ ص ۳۸)

حافظ عماد الدین ابن کثیر عصر داؤد کے تاریخی وقائع کے ماتحت یہ لکھتے ہیں کہ داؤد سلسلۂ براہیمی کے پیغمبر تھے۔ بیت المقدس میں خلافت (نیابتی حکومت) کا نظام اُن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے ہیں جن کو پیغمبری اور سلطنت کے عُہدے ایک ساتھ حاصل ہوئے۔ پھر ان کو جو سلطنت دی گئی وہ معمولی نہ تھی بلکہ مملکتِ عظمٰی کے خطاب کی مستحق تھی[3]۔

بیت[4] المقدس فطری حکومت نے اپنے ارتقائی دور میں عمران و مدنیت کے لیے جو مقدس کام کیے ہیں اُن میں بیت المقدس کی تعمیر کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ اس پاک گھر کو حضرت داؤدؑ نے بنانا شروع کیا۔ سنہ جلوس داؤد میں اس گھر کی تعمیر شروع ہوئی اور سلیمان بن داؤد کے زمانہ میں عمارت

---

[1] ان آیات کے علاوہ عہد ابراہیم و اسحٰق کے متعلق وہ آیات دیکھیے جن میں وراثت ارضی کا ذکر ہے۔ (زبور ۱۰۵)

[2] قرآن عظیم پ۱۷ الانبیاء ص ۲۱ طبع بجنور ص ۷، ۲۲ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ۔

[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۱۱-۱۲۔ [4] تاریخ الکامل ابن کثیر ج ۱ ص ۷۷-۷۸۔

مکمل ہو کر انسانی عقیدت کا مرکز اور خدا کی عبادت کی مسجد قرار پائی۔ ہر سیاسی اور اجتماعی تحریک کے لیے مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کی فطری حکومت کے لیے ایک مرکز سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل نے حجاز کی بے آب و گیاہ زمین میں تعمیر کیا اور دوسرا سیدنا داؤد و سلیمانؑ نے انبیار کی سرزمین شام و فلسطین میں تعمیر کیا۔

سلطنت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ چالیس سال حکومت کا نظام چلانے کے بعد سو سال کی عمر میں دنیائے عمل سے رخصت ہو گئے[1]۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے کے متعلق اپنی زندگی میں ایک دعا کی اور ایک پیشین گوئی۔ دعا یہ تھی کہ خداوندا میرے بیٹے کو راستبازی دے وہ تیرے انسانوں میں راستی اور صلاحیت کے ساتھ حکومت کریگا" زبور ۷۲-۲-۳

پیشگوئی یہ تھی:" سمندر سے سمندر اور دریا سے انتہائے زمین تک اس کا حکم جاری ہوگا سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے گذرانینگے اور سبا کا سونا اُس کو دیا جائیگا" (زبور ۷۲-۹-۱۱-۱۵) باپ کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے خود حضرت سلیمان نے بھی خدا کے دربار عظمیٰ میں یہ درخواست دی "پروردگار مجھ کو ایسی سلطنت دے جو میرے علاوہ کسی دوسرے کو نہ ملے۔

باپ کی دُعا او پیشین گوئی بیٹے کے حق اور بیٹے کی دعا اپنے حق میں قبول ہوگئی۔ سیدنا داؤد کے سترہ لڑکے تھے لیکن ذمہ داریوں کی وراثت[2] سیدنا سلیمان کے حصہ میں آئی سلطنت بھی ان کے ہاتھ میں آئی اور نبوت کا منصب بھی ان کو حاصل ہوا[2]۔ وہ سرخ و سفید جسیم انسان تھے۔ بڑے اور گھنے بال رکھتے تھے۔ سفید کپڑے پہنتے تھے۔ علم و سیاست میں اپنے بزرگوار باپ کے مشیر تھے۔ کاریگر مزدور کی طرح کسب کرتے اور معاشی ضرورتوں کو پورا کرتے۔ میدان جنگ میں

---

[1] قرآن عظیم۔ النمل۔ وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ (سلیمان داؤد کا وارث ہوا) ۱۶۔ ۹۵۰ سنہ قبل مسیح تقریباً حضرت سلیمان کا عہد ہے۔ ارض القرآن ج ۱ ص ۲۴۱

[2] تاریخ ابن اثیر ج ۱ ص ۸۷ (ملک سلیمان)

سالارِ اعظم کی طرح زندگی گذارتے تھے[1]

ان کے زمانہ کا مشہور تاریخی واقعہ ملکۂ سبا (یمن) کی سرگزشت ہے۔ کتاب مقدس (توراۃ و انجیل) اور قرآن عظیم میں سبا کی ایک ملکہ کا حال درج ہے۔ قرآن مجید میں ملکۂ سبا کا یہ قصہ مخصوص انداز میں بیان[2] کیا گیا ہے

حضرت سلیمان کے متعلق یہ تصریح کی جاتی ہے کہ قدرت کی خاص طاقتیں حیرت انگیز طریقہ پر ان کی اطاعت کرتی تھیں۔ پرند اُن کی زبان سُنتے تھے، اپنی زبان سُناتے تھے۔ اس زمانہ میں انسانی عقل اپنے محدود دائرہ سے نکل کر اس قسم کی طاقتوں کی تحقیق پر آمادہ ہو چکی ہے جانوروں کی زبان سمجھنے کی کوشش اس یقین کے ساتھ کی جارہی ہے کہ ایک روز بارآور ہوگی۔ یہ روایت بھی ہے کہ ہوا اُن کے تصرف میں تھی۔ ان کے ایک حکم سے ہولکے تختوں پر فوجیں سوار ہو کر بڑی تعداد میں محاذ جنگ پر پہنچ جاتی تھیں۔ اس روحانی شان کی تصویر آج سائنس کے مادی ماحول میں نظر آرہی ہے۔ اس لیے تاریخ قدیم کے الہامی مسلمات کو سمجھنا اس وقت اگلے زمانہ کے مقابلہ میں آسان ہے۔

قرآن واقعہ کو اس صورت میں بیان کرتا ہے: "سلیمان علیہ السلام کا ہُدہُد چندے غائب رہا، حاضر ہوا تو خبر لایا۔ ایک خاتون کو دیکھ کر آیا ہوں جو سبا پر حکومت کرتی ہے۔ ہر چیز سے مالا مال ہے اور اُس کا ایک عظیم الشان تخت ہے۔ سلیمان نے قاصد کی صداقت کی آزمائش کے لیے اس کو حکم دیا۔ یہ ہمارا خط ہے اس کو ملکہ کے پاس پہنچا اور دیکھ کہ کیا جواب ملتا ہے۔ ملکہ نے خط پا کر درباریوں کے مجمع میں کہا کہ میرے پاس ایک مقدس مکتوب آیا ہے۔ یہ سلیمان کا خط ہے اور خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع ہوتا ہے مضمون یہ ہے۔" غرور و تکبر پر گھمنڈ

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۱ ص ۸۰ (ملک سلیمان)
[2] قرآن عظیم پ ۱۹ النمل ع ۱۷۔

نہ کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس آجاؤ" سردربار مکتوب پر مشاورتی بحث شروع ہوئی۔

ملکہ: سردارو! اس بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔

سردار: ہم زبردست اور طاقتور ہیں فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے دیکھنا یہ ہے کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں۔

ملکہ: بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو اُجاڑ دیتے ہیں، ویران کر ڈالتے ہیں۔ وہاں کے معزز اعیان کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں۔ یہ اُن کا دستور ہے۔ میں ان کے پاس تحفے ہدیے زر و جواہر دے کر قاصد کو بھیجتی ہوں پھر دیکھونگی کیا جواب آتا ہے"۔

ملکہ نے سلیمان کو دنیاوی طرز کا بادشاہ سمجھا اور یہ غلط خیال قائم کر لیا کہ فطری حکومت کا قائد و امام زر و جواہر سے مسحور ہو جائیگا۔ قاصد جب سلیمان کے پاس پہنچا اُنہوں نے کہا۔ "کیا تم اس حقیر سرمایۂ دولت سے مجھے فتح کرنا چاہتے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ خدا نے جو دولت مجھے دی ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اُس نے تم کو دی ہے۔ تم اپنے اس تحفہ پر سرشار و خوشوقت ہو۔ سبا کو واپس جاؤ۔ اب ہم اپنی فوجیں لے کر آئیں گے کہ جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکینگے ہم ان کو ذلیل کر کے سبا سے نکالینگے"۔

آخر الامر سیدنا سلیمان نے اپنے اختیارات سے کام لے کر ملکۂ سبا کا تخت منگا لیا ملکہ کو بھی آنا پڑا۔ یہاں پہنچ کر صورت ذات ملکہ کو حقیقتِ حال کا علم ہوا اُس نے خود اپنی رائے، اپنے روحانی عقیدے اور اپنے سرمایۂ و دولت کے درمیان خط کھینچ دیا چشم حقیقت کھلتے ہی اس نے جو نعرہ لگایا وہ یہ تھا۔ عرش عظیم کے پروردگار! میں اپنے نفس پر ظلم کرتی رہی۔ اب سلیمان کے ساتھ میں بھی خداوند کائنات اور فرمانروائے عالم کی حکمبردار ہوں ـــ یعنی مسلمان۔

یہ ایک واقعہ صدہا واقعات کے مقابلہ میں سیدنا سلیمان کی سلطنت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں تصریح کرتے ہیں کہ سلیمان منصبِ سلطنت اور منصبِ نبوت کے

مالک تھے۔ ان کو ہر شے پر اقتدار حاصل تھا، سلطنت اپنے دائرہ میں مکمل تھی اور حکومت کی ذمہ داری زبردست! ان کی فوج کا نظم اور طرز رفتار ایسا ہی تھا جیسا اس زمانہ کی مملکتوں[1] کا ہوتا ہے۔ ایک تاریخی بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہوئی ہے جس میں بیس سال تک انہوں نے سلطنت کا کام کیا۔ ۲ سنہ جلوس میں اُنہوں نے بیت المقدس کی تعمیر شروع کی[2] جو آج تک اُن کے عمرانی حوصلہ اور خدا پرستی کی یادگار ہے۔

انقلابی دور[3] سیدنا سلیمانؑ کے بعد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک انقلاب انگیز واقعات ظہور میں آئے۔ شعیا بن اموصا امامت کے میدان میں آئے۔ ان کے زمانۂ حکومت کا والی حزقیا تھا۔ مگر حکومت کا تمام کام خدا کے پیغمبر اور نمائندہ حکومت کی ہدایت کے مطابق ہوتا تھا۔ بابل کے بادشاہ سنحاریب نے اسی زمانہ میں حزقیا کے خلاف فوج کشی کی مگر خدا کی قدرت کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ تمام لشکر ناگہانی آفت سے ہلاک ہوگیا۔ لشکر کے تمام دستوں میں سے صرف پانچ آدمی بچے، سنحاریب اور اس کے یہ رفقا بیت المقدس لائے گئے اور ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسی اثنا میں قیدی بادشاہ نے پیام موت کو لبیک کہا۔ حزقیا بھی تہ خاک پہنچ گیا اور بنی اسرائیل کا نظام اجتماعی خراب ہوگیا۔ شعیا نے اپنے فرائض سے کام لے کر اصلاح و ترقی کی جدوجہد کی۔ خرابی اس درجہ زیادہ ترقی کر چکی تھی کہ مستقل کامیابی کو مستقبل کے سپرد کر دینا پڑا۔

ارمیا اور بخت نصر | وسطی دور کے مقدس مشاہیر میں اُرمیا بن حلقیا کا نام بھی صفحات تاریخ پر ثبت ہے۔ نیک فطرت انسان گناہوں کے حملوں سے پامال ہو رہے تھے۔ انسانی معاشرہ کے افراد کی عجیب حالت تھی۔ عوام حکومت کی ذمہ داری کو بھول چکے تھے وفاداری اور اطاعت

---

[1] تفسیر القرآن العظیم حافظ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۳۶ طبع تجاریۃ الکبریٰ [2] تاریخ طبری ج ۱ ص ۲۶۲

[3] البدایۃ والنہایۃ مورخ ابن کثیر ج ۲ ص ۳۲ - ۵۵ -

کے مفہوم کو فراموش کیا جا چکا تھا۔ ایسے نازک زمانہ میں ارمیاؑ نے خدا کے احکام کی تعمیل کی اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ طاغی عوام اور جمہور کی قوتوں نے اصلاح حال کا ایک پیغام نہ سُنا۔ اسی زمانہ میں سلطنت فارس کا ایک زبردست کمانڈر بخت نصر اپنی فوجیں لے کر میدان میں آیا۔ اس نے سرکش لوگوں کو بے پناہ سزا دی، صدہا انسانوں کو گرفتار کیا اور ارمیا نبی کو جیل سے رہا کر دیا۔

بیت المقدس کی بربادی کے بعد تمام قوم بے در اور بے گھر ہوگئی۔ ایک قوم کئی جماعتوں میں تقسیم ہوگئی۔ کچھ لوگ حجاز چلے گئے، کچھ یثرب (مدینہ) جا آباد ہوئے۔ کچھ وادی القریٰ میں، کچھ مصر میں جا بسے۔

دانیال | بخت نصر نے ارض مغرب، مصر، بیت المقدس، ارض فلسطین اور اردن سے جو قیدی اپنے ساتھ لیے تھے اُن میں دانیال بھی تھے۔ جو بعد میں منصب نبوت پر سرفراز ہوئے ایک تاریخی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو اپنی گورنری کے زمانہ میں ایک انگوٹھی دستیاب ہوئی تھی، انگوٹھی کے متعلق بستی کے باخبر مقامی اصحاب سے دریافت کیا تو اُنھوں نے اس کے نقوش کو دیکھ کر بتایا کہ یہ دانیال کی حکومت کی مہر ہے۔

تعمیر بیت المقدس | زمانہ کا تعین دشوار ہے لیکن اسی زمانہ کے کسی سال میں حکومتِ بابل نے بنی اسرائیل کی رہائی اور معافی کا اعلان کر دیا۔ فلسطین کی سرزمین اُجڑ چکی تھی، انسانوں کی جگہ وحشی جانور بستیوں کے مالک ہو چکے تھے۔ معافی کا اثر شروع ہوا بہت سے آباد کار پھر آ کر بس گئے خاندانِ داؤد کے ایک شخص نے حکومت کا نظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ بیت المقدس کی تعمیر کو دوبارہ بلند کیا گیا۔ ارمیا نبی اس زمانہ میں زندہ تھے اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس پاک تعمیر کو دیکھا اور اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

سیدنا عُزیرؑ | سیدنا عُزیرؑ ایک عالم قانون پیغمبر تھے۔ چالیس سال کی عمر میں ان کی روحانیت کو سیاسی

بصیرت حاصل ہوئی۔ قانونِ تورات کے ہر باب کی ہر دفعہ ان کو حفظ تھی۔ ان سے زیادہ اس قانون کا کوئی عالم نہ تھا۔

زکریا و یحییٰ

سیدنا زکریا اور یحییٰ نے دعا کی تھی کہ پروردگار مجھ کو مددگار عطا کر۔ جو حکومت اور نبوت کی ذمہ داریوں میں میرا وارث ہو۔ دعا کی مقبولیت نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ باپ اور بیٹے کی زندگی میں حکومت کے تصورات کا دخل تھا۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

خدا کی مقدس سرزمین میں عرصہ تک شیطانی سازشوں اور خونی واقعات نے اپنا رنگ دکھایا۔ بندگانِ خدا سرکشی و طغیان کے لشکروں کے مقابلہ میں شکستہ پا ہو چکے تھے۔ قدرت نے ایسے وقت میں آخری پیغمبر کے ظہور سے پہلے آلِ یعقوب کے آخری پیغمبر کو اصلاحِ حال کے لیے بھیجا

سیدنا مسیح اپنی پاکباز ماں سے ملوک طوائف کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ مجوسی روایات کا لحاظ کیا جائے تو میلادِ مسیح کا مبارک واقعہ اسکندر کے حملۂ بابل کے پینسٹھ سال بعد اور اشکانیوں کی سلطنت کے اکیاون سال بعد رونما ہوا۔ عیسائیوں کی روایات کچھ اور کہتی ہیں۔ ان کی رو سے سیدنا عیسیٰ اسکندر کے غلبۂ بابل سے تین سو تریسٹھ سال بعد پیدا ہوئے۔ یہود عرصہ کی سرکشی کے بعد اصل نقطہ سے ہٹ چکے تھے اُنہوں نے خدا کے پیغمبر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی زبانوں نے بدترین حملے کیے۔ مقابلہ کی شدید سازشی تیاریاں کیں۔ قتل کی تجویز کو اتفاق رائے سے پاس کیا لیکن خدا کا نیک نہاد پیغمبر خدا کی بادشاہت کا اعلان کرتا رہا۔

افسوس یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی کوششوں کو انسانی عقیدت نے آخر میں نامناسب رنگ دے دیا۔ یہود کے مقابلہ میں عیسائی پیدا ہوئے مگر اُنہوں نے مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیکر خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو باپ، بیٹا، روح القدس کے نام پر تقسیم کر دیا۔ خدائے واحد کی توحید کا وہ

عقیدہ جو انسانی وحدت کے لیے جزو لاینفک تھا۔ اس کو تثلیث کے مثلث پتھر سے پاش پاش کرنے کی کوشش کی گئی۔

قرآن عظیم اور پیغمبر اعظم کا یہ احسان کتنا گرانقدر ہے اُنہوں نے دنیا کو بتایا کہ حضرت علیٰ کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔

نام مسیح، پاکدامن مریم کے بیٹے، دنیا میں وجاہت مند۔ اللہ کا کلمہ جو مریم کے اندر القا ہوا، روح اللہ کے خطاب سے سربلند، رسول، صالح، صلاحیت مند، سردار، تارکِ دنیا۔ خدا کے احکام کے ساتھ دنیا میں پہنچے، خدا نے روح القدس کو امداد کے لیے مقرر فرما دیا۔

قرآن عظیم سے حضرت مسیح کی زندگی کے اجتماعی رجحانات کے متعلق دو امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اول یہ کہ سیدنا عیسیٰ اختلافی عوامل کو دور کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اعلان کیا خدا کی حکمبرداری کے لیے تیار ہو جاؤ، یقین مانو اللہ میرا اور تمہارا بادشاہ اور پروردگار ہے۔ اسی کی پرستش کرو۔ یہ ہے صراط مستقیم۔[۵]

آپ نے سب کو ایک کلمۂ حق پر جمع کرنا چاہا مگر قوم کا نظم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اگرچہ موجودہ انجیل یہ کہتی ہے کہ آپ کی بادشاہی اس دنیا کے لیے نہیں تھی اور آپ نے کوئی حکومت نہیں قائم کی لیکن قرآن نے دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کیا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اپنے سیاسی ماحول اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے حکومتِ الٰہی کے ایک مشعلِ ہدایت تھے۔ ان کی زندگی سے جو بات صاف ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے آنے والے دور کے لیے ایک فکر اور دنیا کے لیے ایک منشور چھوڑا جس نے آخر الامر کامیابی حاصل کی۔

۵؎ قرآنِ عظیم۔ سورہ الزخرف۔

ایک پیغمبر کی حیثیت سے وہ اپنی اجتماعی صفات پر فخر کرتے ہیں۔ "میں خدا کا مطیع ہوں، میرے پاس قانون آچکا ہے" "مجھ کو مبارک بنایا گیا" "مجھ کو بنانے والے نے جبار ظالم و قاہر اور بدکیش نہیں بنایا ہے" (سورۂ مریم)

"انجیل لوگوں کے لیے رہنمائی کا معیار ہے، یہ خدا کا قانون ہے" قرآن اس مفہوم کے ساتھ تین نعرے اور بلند کرتا ہے جس سے اُس عصر میں حکومت کے قانونی آثار پر نظر پڑتی ہے۔

(۱) جو لوگ خدا کے قانون کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہ بدعمل ہیں۔

(۲) جو لوگ خدا کے قانون پر عمل نہیں کرتے وہ تجاوز کار ظالم ہیں۔

(۳) جو لوگ خدا کے قانون پر عمل نہیں کرتے وہ خدا کی حکومت اور خدائی کے منکر (کافر) ہیں۔ (قرآن حکیم، مائدہ)

عصر مسیح کے مندرجہ بالا بلند آثار آج بھی کروڑوں مسلمانوں کی سچی عقیدت کا مرکز ہیں۔ مسلمان کے جذبۂ ایمان داری کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ خدا کی حکومت کے نیابتی دور کے تمام سرداروں کو تسلیم کرتا ہے۔ یہود مسیح کا انکار کرتے ہیں اور مسیحی محمد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا لیکن مسلمان نہ حضرت موسیٰ کا انکار کرتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ کا۔ بلکہ انسانیتِ عامہ کے ان ان تمام محسنوں کو مانتے ہیں جنہوں نے خدا کے پیغام کے لیے روحانی ماحول پیدا کر کے اپنی اپنی قوموں اور آخر میں ساری دنیا کو امن، اخوت، آزادی، مساوات پر جمع کرنے کی مبارک کوشش کی اور فکر و عمل کی جولانگاہ میں خدا کے اقتدار کو یگانہ سمجھ کر بر روئے کار لانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ خواہ ان میں وہ ہوں جن کا نام ہمیں معلوم ہو یا وہ جن کے کارناموں سے ہم بے خبر ہیں۔

اسلام سے پہلے تاریخی حکومتیں

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے چھ سو سال بعد انسانیتِ عامہ کے سب سے بڑے محسن، پیغمبرِ اعظم محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا۔ آپ کے پیدا ہونے سے پہلے تاریخ کی بہت سی قوموں نے دنیا کے آئینہ میں اپنا چہرہ دکھایا۔ لیکن جب آپ نے اپنا کام شروع کیا اور آپ کے جانثار سپاہیوں نے گردن بلند کر کے دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالی تو ان کے قدموں کے نیچے راستہ صاف تھا۔

ایران نے اسلام سے پہلے چار سلطنتیں[1] دیکھیں۔ (۱) سلطنت پیشدادیاں۔ پیشداد افریدون منوچہر کی سلطنت (۲) سلطنت کیانیاں۔ کیقباد، کیخسرو اور دارا کی سلطنت (۳) سلطنت اشغانیان۔ سکندر کے حملے کے بعد دو سو چھیاسٹھ (۲۶۶) سال تک اشغانی ملوکِ طوائف نے حکومت کی اور انہی اشغانیوں کے زمانہ میں حضرتِ عیسیٰ نے ارضِ فلسطین میں خدا کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ (۴) سلطنت ساسانیاں۔ سکندر کے حملہ سے کئی صدی بعد اردشیر بن بابک بن ساسان نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بہرام، شاپور، ذی الاکتاف، نوشیروان کسریٰ پرویز اسی سلسلہ کے سلاطین تھے۔ نوشیروان کے عہد میں پیغمبرِ اعظم کی ولادت ہوئی اور پرویز کے زمانہ میں اسلام کی حکومت نے اپنے سیاسی آثار کو ظاہر کیا[2]۔

روم نے قرونِ وسطیٰ تک حکومت و سلطنت کے تین دور دیکھے، گیلوس، آگسٹس دونوں پہلے دور کے حکمراں ہیں۔ ان میں سے دوسرے حکمراں نے قیصرِ روم کا لقب اختیار

[1] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۱ ص ۹۸ و ۲۹۳ ج ۲ ص ۲ و ۱۳۔ [2] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۱۳۱ - ۱۶۱

کر کے یونان، شام اور مصر پر کامیاب فوج کشی کی اور ہیروڈوس کو شام کا پہلا وائسرائے بنایا یہی دور ہے جس میں عیسوی مذہب کو فروغ حاصل ہوا، اسی دور میں بلادِ عرب کے بعض حصوں پر رومی اجنبیوں نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ دوسرا دور قسطنطین سے شروع ہوا ہرقلس (ہرکلیس) پر ختم ہوا۔ اس دور میں موجودہ ترکی، شام، مصر، اور عرب کا شمالی علاقہ رومیوں کی ماتحت نوآبادی تھا۔ آنحضرت نے اسی دور کے فرمانروا ہرقلس کو اسلام کے اجتماعی نظام میں داخل ہونے کی دعوت دی تھی تیسرا دور ہجرت نبوی کے بعد شروع ہوا المقتدر اور المستکفی باللہ کے عہد ۹۴۴ء ۳۳۳ھ تک جاری رہا۔

ہندوستان کے متعلق تاریخی طور پر کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ یہاں مذہبی اور سیاسی میلانات کی تاریخ کا بڑا حصہ روایتی اور قیاسی[1] ہے۔ اس ملک میں اسلام سے پہلے مذہبی حکومتیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہاں مغربی ایشیا سے آنے والی آرین نسل نے ویدوں کے مطابق آریہ حکومتیں قائم کیں۔ جنگ آزما حکومتوں کا یہ سلسلہ بہت سے راجگان کے ماتحت تھا۔ پورا ملک کئی ملکوں میں تقسیم تھا۔ اور انسانی معاشرہ میں وحدت مفقود تھی۔ جنگ مہابھارت اور منو کے قوانین کا تعلق اسی عہد سے ہے۔

ہندوؤں کی روایتی کہانیاں یہ کہتی ہیں کہ دو ہزار سال قبل مسیح اجودھیا میں سورج بنسی حکومت کر رہے تھے اور پریاگ (الٰہ آباد) کے قریب برتسٹھان پور (قصبہ جھونسی) اور ہستناپور میں چندر بنسی خاندان نے اپنا تخت بچھا رکھا تھا۔ ۵۰۰ء ق م دیشالی راج تھا اور اس پر مہابیر کا باپ راجہ سدھارتھ حکومت کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ریاست کپل وستو (نیپال) میں راجہ سدھودھن شاکیہ کے محل میں گوتم بدھ پیدا ہوا جس کے بعد ۳۲۲ء (ق م) چندر گپت کی حکومت قائم ہوئی۔

[1] دیکھو مقدمہ مہابھارت ودمن ص ۳ طبع لاہور۔
[2] نظریہ سلطنت شبلی م ۶۔ ب ص ۳۶۶
[3] مہابھارت مکمل ودمن۔ طبع دوم۔

چندرگپت کے پوتے اشوک نے بدھ حکومت کو ٹیکسلا، افغانستان، بلخ، بخارا، بلوچستان تک وسیع کیا۔ یہ حکومت ظہور اسلام تک مختلف علاقوں میں باقی تھی۔ ۲۰۰ ق م میں چین کا خانہ بدوش یوچی قبیلہ براہِ کابل ہندوستان پہنچا اور اُس نے کُشن خاندان کی حکومت قائم کی۔[1]

اسلام سے پہلے تاریخ عالم کی یہ مشہور و معروف حکومتیں سلسلہ بسلسلہ قائم ہوتی رہیں ایک حکومت قائم ہو کر ختم ہو جاتی تو دوسری حکومت منظر عام پر آتی۔ آخر اسلام ظاہر ہوا اور اُس نے ان سب سلطنتوں اور حکومتوں کو فطری حکومت کے نظریہ اور نظام اساسی سے آشنا کیا۔ فارس روم اور ہندوستان کی خراب و خستہ تنظیمات ٹوٹ پھوٹ گئیں اور خدا کی حکومت کے اوصاف کو ظاہر ہونے کے لیے ایک نیا میدان مل گیا

اِسلامی دور

جزیرۃ العرب کے محلِ وقوع پر ایک نظر

عرب کو جغرافیہ کی رو سے جزیرہ نما قرار دیا گیا ہے۔ یہ ملک ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور نقشہ میں دیکھنے سے ایک مستقل اور چھوٹا سا برِ اعظم نظر آتا ہے اس کے تین طرف تین سمندر ہیں جن کو مدت سے تاریخی ملکوں، تاریخی قوموں اور تاریخِ عالم کے فاتح سرداروں سے تعلق رہا ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے اس ملک کا رقبہ اور حدیں قطعی طور پر طے شدہ نہیں ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کی طرح زمانۂ علم میں بھی اس کی شمالی سرحد کا مسئلہ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا ہے، حالانکہ بڑی حد تک اسی مسئلے کے فیصلہ پر ملک کی مجموعی تصویر اور تشکیل منحصر ہے۔

اس سلسلہ میں مورخین کی رایوں میں کافی اختلاف ہے۔ البتہ عام رائے یہ ہے کہ

---

[1] مہابھارت درمن۔ آدی پرب باب ص ۱۱۔

شمال مشرق میں بصرہ سے چل کر بادیۃ الشام سے گذر کر شمال مغرب میں عقبہ تک عرب کی شمالی حد پوری ہو جاتی ہے۔ اس رائے کے مطابق عراق، شام، فلسطین اور شرق اردن کا کچھ علاقہ عرب کے دائرۂ طبعی سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ ایک ایسا عملِ جراحی ہے جس کو آسانی سے گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

جزیرہ نما یا جزیرۂ عرب

پیغمبر اعظم نے اپنے ایک فرمان میں عرب کو جزیرۃ العرب قرار دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عرب کے جسم سے اس کے کسی حصّہ کو علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگلے مورخین سے ابن الاعرابی اور اصمعی نے بھی جزیرۃ العرب کا نام استعمال کیا ہے۔ آنحضرت کے فرمان کی تائید میں حضرت ابن عباس کا بیان بہت صاف ہے۔ ابوالمنذر ہشام بن محمد بن سائب نے اس بیان کو نقل کیا ہے اور یاقوت حموی نے معجم البلدان میں اس کی تحسین کی ہے۔

یاقوت اس بیان کو ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں "عرب کو جزیرۂ عرب کا نام دینے کا سبب یہ ہے کہ تمام علاقہ نہروں اور سمندروں سے گھرا ہوا ہے، چاروں طرف پانی کا جال ہے جس نے تمام ملک کو جزیرہ کی مانند بنا دیا ہے۔ شمال میں بلاد روم ایشیائے کوچک سے نہر فرات اپنے سرچشمہ سے نکلتی ہے چلتے چلتے قنسرین پہنچی، یہاں سے عراق اور جزیرہ کے اطراف میں پہنچتی ہے اور سمندر میں مل جاتی ہے۔ اس کے بعد سمندر شروع ہو جاتا ہے قطیف بحرین، فسطین، عمان، شحر تک پانی ہی پانی ہے، اس کے بعد حضر موت، عدن، دہلک، یمن بلاد فرسان، حکم، اشعر یین اور عک کے گرد سمندر ہے، یہاں سے جدہ تک اور ساحل مکہ، ساحل مدینہ، ساحل طور (وادی سینا) خلیج ایلہ، ساحل رایہ تک سمندر ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اب بحر قلزم مصر سے مل جاتا ہے اور مصر و عرب گلے مل جاتے ہیں۔ یہاں سے دریائے نیل مغربی سمت کو شاداب کرتا ہے۔ اس کے بعد بحر روم آ جاتا ہے۔ ساحل مصر، ساحل فلسطین، ساحلِ

عسقلان، ساحلِ شرقِ اردن، ساحلِ شام، ساحلِ حمص اور ساحلِ قنسرین آجاتا ہے اور یہاں سے پھر اس حصہ سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے جس کا ربط فرات سے ہے۔[1]

معجم البلدان کی مندرجہ تفصیل سے دجلہ و فرات کے سرچشموں کے بعد بہاؤ کی ابتدائی حدیں جزیرۃ العرب کی شمالی حدود ہیں جن کے ماتحت بلادِ عرب میں عراق فلسطین سرحد شام شرق اردن اور جزیرہ نمائے سینا بھی داخل ہیں۔[2]

جزیرۃ العرب کے حق میں چند دلائل

علمائے جغرافیہ نے عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔[3] جبل سراۃ کا کوہستانی سلسلہ جنوب سے شمال تک (یمن سے فلسطین تک) چلا گیا ہے۔ جس نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جنوب میں یمن ہے۔ شمال میں تہامہ کا زیریں علاقہ (حجاز مقدس) واقع ہے۔ مشرق میں خلیج فارس کے ساحل پر یمن نجد اور عراق کے درمیان (بحرین، یمامہ، عمان) کا علاقہ عروض واقع ہے کوہستان سراۃ کے مشرق میں نجد کا بلند و بالا علاقہ ہے۔

اگرچہ اس تقسیم کی رو سے جزیرۃ العرب کی اصل حقیقت پر مخالف اثر پڑتا ہے لیکن اس کے مقابل فرمانِ نبوی کے حق میں اہم دلائل موجود ہیں۔ ان دلائل میں سب سے پہلے اس امر کی تحقیق ہے کہ ایک ملک کے متعلق اتنا عظیم جغرافیائی تسامح کیوں پایا جاتا ہے۔ مسلمان اور یورپ کے علمائے تاریخ و جغرافیہ دونوں اس صرفِ نظر کا شکار کیسے ہوئے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آج تک علم الارض کے ماہرین نے خاص اس نقطۂ نگاہ سے عرب کی باضابطہ فنی پیمائش نہیں کی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کو اس زمانہ کا علمی دماغ بھی تسلیم کرتا ہے۔[4] اس علمی کمی کا یہ اثر ہوا کہ

---

[1] معجم البلدان ج ۳ ص ۱۰۰۔ یاقوت نے بلادِ عرب کے طول کے متعلق پرانے لوگوں میں سے کسی شخص کا قول نقل کیا ہے "من الشحر الی الفرات" (الشحر سے فرات تک)

[2] حجاز، تہامہ، یمن، نجد، عروض۔ دیکھو معجم البلدان (یاقوت حموی) ج ۳ ص ۱۰۰۔

[3] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۲۵ ص ۵۱۲۔

[4] اس موضوع پر دیکھو مسئلہ خلافت مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۲۸ البلاغ پریس

حقیقتِ تاریخی قیاسات میں گم ہوگئی۔ دوسری وجہ سیاسی ہے۔ بسا اوقات بیرونی حملہ آور ایک ملک کو دو ملکوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور کبھی دو ملکوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ایک ملک بنا دیتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو علم تاریخ اقوام، علم الالسنہ، علم الارض اور علم السیاست کی رو سے اِن علاقوں کا تعلق عربوں سے رہا ہے اور عربوں سے رہنا ضروری ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں ایران و روم نے اپنی استعماری سیاست سے حیرہ، انبار، بصریٰ (موجودہ عراق، سرحدِ شام و فلسطین) کو اپنی سیاسی عملداری کے ماتحت کر لیا تھا۔ اس لیے عرب سے ان حصوں کا تعلق مضمحل ہو گیا تھا، جب اسلام نے فارس و روم کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا تو یہ علاقے آزاد ہو گئے، اور پھر اپنے ملک میں آ ملے[1]۔ اس حقیقی رائے کے مطابق جو نقشہ بنتا ہے اُس کی رو سے بصرہ سے بغداد، بغداد سے موصل، موصل سے سرحدِ شام اور وہاں سے ساحلِ بحرِ روم تک بالا بالا خط کھینچا جائے۔ یہ خط شمال میں عرب کی قدرتی سرحد ہوگا۔ اس نقشہ میں عرب کے ہمسایہ ممالک یہ ہونگے۔ مشرق میں ایران، مغرب میں مصر و حبش، شمال میں بالائی شام اور ترکی، جنوب مشرق میں ہندوستان۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ علم الارض کی رو سے آپ کو یمن سے شام تک اور عمان سے بغداد تک اور شحر سے موصل تک یکسانیت ملیگی۔ اس ملک کا سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جبل السراۃ ہے جو عرب کے جنوب (یمن) سے شام تک چلا گیا ہے۔ مغربی کنارہ کی اس حالت میں جو یکسانیت ہے وہ وسطی علاقہ میں ریگستانی حیثیت سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ جنوب ربع خالی کے صحرائے اعظم کو شمال کے صحرائے شام و صحرائے عرب سے کافی تعلق ہے۔ ربع خالی صحرائے

---

[1] خندق کے محاذ پر پیغمبر اعظمؐ نے ان علاقوں کی واپسی کی محیر العقول پیشین گوئی فرمائی تھی، جس کو اسلام کی سیاسی تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔

شام اور صحرائے عراق ایک ہی سلسلہ ارضی کے حصے معلوم ہوتے ہیں۔ ربع خالی کی ایک شاخ نجد کے واسطے سے صحرائے شام میں مل جاتی ہے اور صحرائے جزیرہ کے واسطے سے صحرائے عراق سے ہمدست ہو جاتا ہے۔ مشرق میں اگر دجلہ و فرات کی وادی شادو آباد ہے تو الاحسا، بحرین و عمان کا ساحلی علاقہ بھی اپنی سرسبزی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

علم تاریخ اقوام کی رو سے بھی یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے، عرب بنو اسمٰعیل کا مسکن ہے۔ سیدنا اسمٰعیل، سیدنا ابراہیم کے صاحبزادے ہیں۔ تاریخ کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ باپ کے وطن اور نقل و حرکت کے علاقے (بابل و اطرافِ شام) کو بیٹے کی نسل کے علاقہ سے علیحدہ کر دے۔ علم الانسنہ کی رو سے عربی زبان سامی اقوام کی زبان تھی اور سامی قومیں کسی علاقہ کو کم کیے بغیر تمام عرب میں بود و ماند رکھتی تھیں۔

عرب کا سیاسی ماحول عرب کے چاروں گوشوں پر ایک منظم اور مکمل نظر ڈالی جائے تو خود بخود ایک عجیب و غریب سیاسی ماحول پیدا ہو جائیگا۔ اس کی ہمیشہ کی حیثیت یہ ہے کہ یہ ملک ایشیا میں واقع ہے اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سب سے مرکزِ اتصال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مغربی کنارہ بحرِ احمر کی بڑی شاہراہ پر افریقہ کے مغربی ساحل سے کچھ فرق کے ساتھ ہاتھ ملا رہا ہے۔ اگر ایک انسان خلیج عقبہ سے نکل کر وادیِ سینا کے پہلو سے گذرتا ہوا عرب کے شمالی حصہ فلسطین میں پہنچ جائے اور طاقتور دوربین لے کر کھڑا ہو جائے تو غزہ اور یافہ کی آنکھوں سے یورپ کے ساحلوں کو دیکھ سکتا ہے۔ وادیِ سینا سے مغرب کی طرف راہ پیمائی کی جائے تو کچھ فاصلہ پر فرعونوں کی تاریخی مملکت (مصر) کا علاقہ قدموں کے نیچے ہوگا۔ یعنی وہ ملک جہاں بنی اسرائیل نے آزادی کی جنگ میں کامیابی حاصل کی جہاں رومن اپنی حکومت کے قوانین لے کر پہنچے۔ جہاں نپولین نے بیٹھ کر ایشیا اور افریقہ کی فتح کے خیالات کا وزن کیا اور جہاں آج بھی ملکہ بحر برطانیہ

کی شہ رگ (سویز) کا پانی خون سے زیادہ قیمتی ہو کر بہ رہا ہے۔

مشرق کی جانب کویت کے سامنے خلیج فارس کا ساحل قطر آتا ہے جو ساسانی حکومت اور سکندر کی جہانبانی کی یاد دلاتا ہے۔ جنوب مشرق میں عمان کے شہر مسقط سے قلات کی بندرگاہیں جیونی، پسنی، گوادر دیکھی جاسکتی ہیں۔ قلات وہ جگہ ہے جو عہد قدیم میں ہندوستان ایران اور وسطی ایشیا کے دور دست علاقوں کے لیے وسائلِ نقل وحرکت کا مرکز تھا اور آج بھی درۂ بولان کی وجہ سے ایران، افغانستان اور روس کی سرحدوں کے لیے ہندوستان کا اگلا قلعہ سمجھا جاتا ہے۔ جنوب میں آبنائے باب المندب کے اُس پار حبش ہے۔ جس کے باشندے عہد سلیمان کی تاریخ سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ عرب براعظم ایشیا میں جغرافیائی حدود کے اعتبار سے ایک خاص ماحول رکھتا ہے جس کا اثر تینوں براعظموں کی قوموں اور ملکوں کے سیاسی وجدان پر پڑتا ہے اور جو تمام دنیا کی اجتماعی حالت کو متاثر کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ یہی عرب ہے جو اسلام کے ظہور کا گہوارہ اور اسلامی حکومت کا محور و مرکز بنا۔

علاقوں کی تقسیم | طبیعی اعتبار سے عرب کو پانچ علاقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

تہامہ: وہ گرم سیر علاقہ جو بحرِ احمر کے مشرقی ساحل کے بالمقابل واقع ہے۔ اس کا نام غور بھی ہے۔

حجاز:- جو بلادِ یمن کے شمال سے فلسطین تک تہامہ اور نجد کے درمیان واقع ہے۔

نجد:- جنوب میں یمن اور شمال میں صحرائے السماوہ کے درمیان، عروض و عراق سے متصل۔ یہ علاقہ بلند سرزمین کی وجہ سے نجد کے نام سے پکارا جاتا ہے

یمن: نجد سے بحرِ محیط ہند تک مشرق میں حضرموت، الشحر اور عمان کے درمیان۔

عروض :- یمن، نجد، عراق کے درمیان واقع ہے یمامہ اور بحرین پر مشتمل ہے

عرب اور اس کا اجتماعی نظام

عرب زمانۂ دراز سے بنی نوع انسان کا منبع رہا ہے۔ تاریخی قوموں کا یہ تاریخی ملک اپنے تاریخی محلِ وقوع کے اعتبار سے قوموں، قبیلوں اور حکومتوں کا یادگار زمانہ وطن[1] رہا ہے۔ روم و یونان، ہند و فارس اور مصر و حبش کا یہ پڑوسی زمانۂ اسلام کی طرح زمانۂ جاہلیت میں بھی تاریخی وقائع کا مقصد و منشا، رہا ہے۔ مشہورِ عالم مستشرق ڈاکٹر نولڈیکی اپنی تاریخی انسائیکلوپیڈیا یا تاریخ عالم[2] (Historians History of the world) میں صاف لہجہ میں یہ بیان کرتا ہے کہ یونان قدیم کی کتابوں میں عرب اور عربیا (Arb, Arabia) کے الفاظ ملتے ہیں۔ ہیرڈوٹس اور اس کے ہمعصر علماء جغرافیہ و تاریخ، اسٹرابون بلینیوس، بربلوس، بطلیموس اور سقراط کا شاگرد رشید اکسی نیوفون (Xenofhon) عرب کے نام سے واقف تھا۔ عرب کے بیشتر تاریخی وقائع پردہ میں ہیں تاہم یہ بات تحقیق کی سطح پر آچکی ہے کہ اس ملک نے سامی نسل کے انسانوں کے طوفانی سمندر میں تیز رو موجوں کی طرح آتا جاتا مدوجزر دیکھا ہے۔ یمن سے اقصائے شام تک اور عمان سے بابل تک قحطان و عدنان کے دو بڑے سلسلے نقل و حرکت کرتے ہیں۔ جنوبی اور مشرقی علاقہ کے فاقہ کش بدو کبھی یمن، حجاز، تہامہ، عسیر میں اپنی دنیا تیار کرتے ہیں اور کبھی اپنی فطرت کو سیماب بنا کر رودنیل کے سرسبز و شاداب میدانوں کو بود و ماند کے لیے دریافت کرتے ہیں۔ وہ سب اصل سے سامی ہیں، اس لیے ہم نسل ہیں، وہ سب کے سب عربی ہیں اس لیے ہم وطن ہیں۔ وہ آرامی زبان سے نکلی ہوئی ایک زبان (عربی) بولتے ہیں اس لیے ہمزبان ہیں[3]۔ ان کا جنوب اور شمال جنوب (حجاز

---

[1] معجم البلدان علامہ شہاب الدین یعقوب حموی ج ۶ ص ۱۳۷-۱۳۹- طبع اول ۱۳۲۴ھ السعادہ مصر
[2] تاریخ عالم نولڈیکی جلد ۸ ص ۲-۳- [3] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶ ص ۲۲۶-۲۶۷
[4] التاریخ الاسلام السیاسی ڈاکٹر حسن ابراہیم پروفیسر جامعہ مصریہ ج ۱ ص ۳۵

(تہامہ) سے شمال کی طرف ہجرت کرکے نوآبادیوں کے قیام میں حوصلہ مندی کا اظہار کرنا۔ ایک طرف ان کے خانہ بدوش زندگی کے طبعی آثار میں سے ہے دوسری طرف اس کا تعلق اُس عزیمت سے ہے جس کی وجہ سے بابل میں ۲۲۳۰ ق م حمورابی کی سلطنت قائم ہوئی اور پیٹرا (رقیم۔ الحجر) میں بنو اسمٰعیل کی ناتبی سلطنت عالم وجود میں آئی۔ تاریخ میں ۷۰۰ ق م سے ۱۶۹ ق م تک ان کے آثار کا ذکر موجود ہے۔ اس سلطنت کی حدیں شمال میں فلسطین جنوب میں صحرائے حجاز، مشرق میں صحرائے شام اور مغرب میں خلیج عقبہ ہیں۔

عمالیق جو لاوذ بن سام کی نسل سے ہیں۔ شمالی حجاز (وادی سینا) کے دامن سے نکل کر ایک طرف مصر پر حکمراں ہوئی، دوسری طرف بابل و شام پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

عرب کی قدیم قومیں عرب کی وہ قومیں جو اسلام سے پہلے سطح وجود سے نقشِ آب کی طرح مٹ چکی ہیں (عاد، ثمود، عمالیق طسم، جدیس، امیم، جُرہم) عرب عاربہ عرب کی اصل قحطانی قومیں اور قبائل (قضاعہ، کہلان، ازد) اور اسلام سے پہلے یمن میں تاریخی حکومتیں قائم کرنے والے قبائل اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ عرب مستعربہ سیدنا اسمٰعیل کے سلسلۂ خاندان کے عرب قبائل جن کا مسکن حجاز تھا۔

عدنانی عرب اور قحطانی عرب زمانۂ تاریخ کے عربوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بنی عدنان اور بنی قحطان یہ دونوں قبیلے عرب پر اپنا سیاسی اثر ڈال چکے ہیں اور عرب کے علاوہ اطراف عرب پر حکومت کر چکے ہیں۔ بنو عدنان میں سے قضاعہ نے بحر احمر کے عربی ساحل اور مصری ساحل پر فتوحات حاصل کیں۔ تنوخ نے عراق و شام میں حکومت کی اور حیرہ

---

[1] دیکھو دائرۃ المعارف علامہ فرید وجدی ج ۱۱ ص ۲۲۲ تا ۲۲۳۔

انبار (عراق) کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کیا۔ سلیح نے ارض بلقار (شام) میں حکومت قائم کی۔ جہاں بعد میں غسانی حکومت قائم ہوئی۔ ایاد حجاز سے عراق۔ عراق سے فارس پہنچے اور نوشیرواں سے جنگ کرنے کے بعد کریٹ، موصل اور شام و روم کے علاقوں میں پھیل گئے۔

بنو قحطان نے جو حکومتیں قائم کیں تاریخ میں اُن کے دو طبقے ہیں۔ پہلے طبقہ میں یمن کی معینی سلطنت ہے (جو بحر سفید متوسط (بحر روم) کے کنارہ بحر عرب اور خلیج فارس تک کارفرما تھی) مملکتِ سبا ہے (جو میلادِ مسیح سے پہلے یمن میں قائم تھی) سلطنتِ حمیر (جس نے سبا کے بعد حکومت کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لیا)

دوسرے طبقہ میں وہ حکومتیں ہیں جنہوں نے مشکلات و مصائب کے زمانہ میں جنوب (یمن) سے چل کر عرب کے دوسرے علاقوں میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ ان مہاجرین میں طی، اشعر، جیلہ، جذام، ازد، عاملہ، کندہ، لخم، مذحج، ہمدان، مازن، غسان، عدنان، مزیقیا، ازدشنوبن، اوس، خزرج، خزاعہ کا نام بڑا ہے ان کے ماتحت بے شمار چھوٹے چھوٹے خاندان ہیں ان میں سے لخمیوں (مناذر) نے حیرہ میں۔ کندہ نے حضر موت کے آس پاس اپنی اپنی ریاستیں قائم کیں۔

ریاست غسان مآرب کا بند ٹوٹنے کے بعد بنو غسان نے شام جا کر ڈیرہ آباد کیا۔ وہ شام کے باشندوں (قبیلہ قضاعہ کے افراد) پر جا ٹوٹے۔ لڑے بھڑے اور کامیاب ہوئے۔ ان کی حوصلہ مندی نے ان کو جو تحفہ دیا وہ ایک ریاست تھی جس کا اختیار ان کے ہاتھ میں اور انتداب روم کے ماتحت تھا اُنہوں نے شہر بنائے، تہذیب کی مشعل روشن کی، سر بفلک محل تعمیر کیے، علاقہ حوران میں بصریٰ کو اپنا دارالحکومت بنایا، یہ ریاست عجم کے خلاف روم کا قلعہ تھی۔ تیس بادشاہوں نے اس حکومت کی جن میں پہلا جبلہ بن شمر تھا اور آخری جبلۃ الایہم۔ غسانیوں کی سلطنت شام، تدمر،

فلسطین، لبنان پر حاوی تھی۔ قصر سفید، قصر سیاہ، قصر فضا، قصر ابین اس کے محلات تھے۔

ریاست حیرہ قبیلہ لخم کے خاندان آل نصر نے یہ ریاست عجم کے پہلو میں قائم کرکے تاریخ کا نام روشن کیا۔ عرب مورخ اس کو حکومت حیرہ کا خطاب دیتے ہیں۔ شہر حیرہ موجودہ کوفہ سے تین میل دور اس جگہ واقع تھا جس کو آج کل نجف کا نام دیا جاتا ہے۔ نہر فرات کے غربی کنارہ پر اس کی عالی شان عمارتیں بلند و بالا محلات تھے جن سے اس کی تمدنی عظمت کا نشان ہمپایۂ آسمان نظر آتا تھا۔

اس ریاست کے حکمرانوں کو بعد میں منذر کا خطاب بھی حاصل ہوا اس لیے اس کو آل منذر (مناذر) کی حکومت کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ ۶۰۰ئہ کے آخر میں نعمان بن منذر جو فرمانروائے حکومت تھا عیسائی ہو گیا تھا۔ اس طرح مسیحیت کو شاہی ایوان میں بھی جگہ حاصل ہوگئی۔ لخم کی نسبت سے حیرہ کی حکومت کو لخمیوں کی حکومت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

حیرہ نے تین سو چونسٹھ سال میں بائیس بادشاہوں کا اقتدار دیکھا۔ مگر حیرہ (عراق) کے یہ سلاطین ایران کی بالادست طاقت کے اسی طرح زیردست تھے جس طرح غسانی رومیوں کے۔ حیرہ کا پہلا بادشاہ عمرو بن عدی تھا اور آخری منذر معرور۔

ریاست کندہ بنی کہلان کی نسل اور ایک ضمنی خاندان کندہ نے بحرین سے حضرموت پہنچ کر کندہ کے مقام کو اپنے لیے منتخب قرار دیا لیکن ایک ہمسایہ قبیلہ نے ان کے نظام قیام کو درہم برہم کر دیا۔ اب اُنھوں نے ارض معد میں پہنچ کر مرتع بن معاویہ کی قیادت میں حکومت کا کام شروع کیا اب ریاست حمیر نے ریاست کندہ سے جنگ شروع کر دی۔ امرا القیس (شاعر) کے دورِ حکومت کے بعد کندہ کی حکومت پارہ پارہ ہو گئی۔ دومۃ الجندل، بحرین، نجران، غمر، ذی کندہ میں اس کے اقتدار کا اثر باقی تھا۔ اسلام ظاہر ہوا اور اُس نے ان قبائلی ریاستوں کو اپنے

دامنِ اقتدار میں لے لیا۔

عصرِ جاہلیت کی امارت | عصرِ جاہلیت کے عرب اُس قوتِ جامعہ سے محروم تھے جس کو آج کل حکومت و سلطنت کا نام دیا جاتا ہے ان کے پاس پورے ملک کے لیے نہ کوئی مرکزی نظام تھا نہ انصاف کی اعلیٰ عدالت سپریم کورٹ (Suprem court) نہ پولیس تھی اور نہ محکمۂ امنِ عامہ، نہ مالیات کا دفتر تھا، نہ اقتصادیات کو ضبط میں رکھنے والا محکمہ۔ محاصل کے وصول، ٹیکسوں کے حصول۔ لگان اور مالگذاری کی تحصیل کے لیے نہ پٹواری تھے نہ امین۔

غیر ملکی سیاست سرے سے نہ تھی۔ تجارت کی آزاد راہیں قوت کے بل پر جاری تھیں اس لیے ہمسایہ علاقوں سے سیاسی ربط کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ملکی دستور، مدنی قانون اور فوجداری کے احکام کا ذکر ہی لاحاصل ہے۔ کوئی ضابطہ اور آئین ایسا نہ تھا جو احکام کی طاقت اور نفاذ سے باہمی جھگڑوں کو روک سکے۔ معمولی معمولی باتوں سے غیر معمولی جنگیں شروع ہوتیں۔ سالہا سال تک جاری رہتیں، لیکن ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور مظلوم کو مصائب سے بچانے کے لیے کوئی قوت موجود نہ تھی[1]۔

چھٹی صدی کے قریب عرب میں کسی منظم حکومت کا سُراغ نہیں ملتا۔ یمن جس کی بے آباد زمین کو ۲۰۳۰ ق م میں قحطان نے آباد کیا تھا[2] ایک زمانہ میں آزاد حکومتوں کا مرکز تھا مگر حبش اور ایران کا انتدابِ سیادت ان کو مغلوب کر چکا تھا۔ حضر موت میں قبیلہ کندہ کے آزاد سردار بھی ملوکِ یمن کے انداز پر قبائلی گروہ بندی کے نظام کو چلا رہے تھے۔ اگرچہ ۳۳۳ ق م میں سکندر نے دارا کو شکست دے کر ایران کو چند امارتوں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن اعراب یمن ایران کے بالادست اقتدار سے پھر بھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے تھے[3]۔

---

[1] التاریخ الاسلامی السیاسی ج ۱ ص ۳۹ [2] تاریخ الامم الاسلامیہ خضری محاضرہ ص ۳۶ [3] ایضاً

قلمرو حجاز جہاں اسلام کی اجتماعی سلطنت کا تخت آراستہ ہونے والا تھا اگر معاشی اعتبار سے بلند نہ تھا تو حکومت کے اعتبار سے بھی قبائل کے اختلاف کا مرکز بنا ہوا تھا۔

اگرچہ ابراہیمی عہد میں حجاز کی امارت بنی جرہم کے ہاتھ میں تھی مگر اس کے بعد قبیلہ ازد کے ہاتھ میں آگئی تھی جب آرب میں پشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے سیلاب آیا تو قبیلہ ازد نے مکہ کی طرف رُخ کیا۔ بنی جرہم نے دفاع کیا مگر ناکام رہے اور حکومت قبیلہ ازد کے ہاتھ میں آگئی۔ قبائلی اختلاف کا یہ پہلا نقطہ تھا جو آئندہ سیاسی اختلافات کا سرا بن گیا۔ مکہ میں جو قریش باقی رہے تھے وہ فہر ابن مالک کی اولاد میں سے تھے لیکن ان کو نہ امارتِ حجاز پر دسترس حاصل تھی، اور نہ بیت اللہ کے پُر شرف انتظام میں ان کا کوئی حصہ تھا جب حضرت محمد مصطفٰے کے اجداد میں سے قصی ابن کلاب کا زمانہ آیا تو اُنہوں نے قریش کی پراگندہ جمعیت کو ایک قانونی نظام کے ماتحت لانا چاہا[1] اور اس میں کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر وہ کامیاب ہونے ہی تھے کہ مکہ کے سردار خزاعہ سے جنگ آزما ہوئے اور اس طرح اختلاف کی ایک اور صورت پیدا ہو گئی۔

قصی بن کلاب نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد اختیار کی زمام اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے خسر سے جو مکہ کے خادم تھے انتظامی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ریاست کے نظام میں ایک اور شرف کا اضافہ کر دیا۔ اب امارت مکہ کی بنیاد جن اختیارات[2] پر قائم ہوئی وہ یہ تھی۔

۱۔ امارت مکہ (قبائلی طرز کی بے قید ریاست)

۲۔ دارالندوہ۔ قبائلی مجلس شوریٰ۔

۳۔ حجابت۔ بیت اللہ پر غلاف چڑھانا۔

۴۔ لواء۔ سپہ سالاری۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۱ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹-۷۰، طبع میمنیہ مصر۔

۵۔ سقایہ۔ زائروں کو آب زمزم پلانے کی ذمہ داری۔

۶۔ رفادہ۔ شہر مقدس میں آنے والوں کی مہمانی اور اس کا محصول

یہ نظم اگرچہ معمولی تھا لیکن اس میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ قصی نے اس کو میراث قرار دے کر اپنے خاندان کے لیے مستقل کر دیا۔ اس نے اپنے جانشین کو جو وصیت کی اُس میں یہ صاف درج ہے کہ قریش امارت، ندوہ، لواء، سقایہ، رفادہ، حجابہ کی ذمہ داری میں اس کے جانشین کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت نہیں کرینگے۔[1]

قصی کی ریاست کی یہ تنظیم اپنے وقت کی اچھی تشکیل تھی مگر بہر صورت ایک چھوٹی سی شخصی امارت تھی، اس کے شخصی میراث بن جانے کا نتیجہ یہ ہوا، عبدالدار اور عبدمناف میں سیاسی ہنگامہ بپا ہوگیا۔ عبدالدار قصی کا بڑا لڑکا تھا مگر ناقابل۔ عبدمناف باپ کی حیات میں قوم کے دل کا مالک تھا اور اپنی اعلیٰ قابلیت میں مشہور۔ قصی نے امارتِ مکہ کی ذمہ داری عبدالدار کو دی باپ اور بڑے بھائی کے احترام نے عبدمناف کو صبر و برداشت پر آمادہ کرکے خاموش کر دیا۔ عبدمناف کے چار صاحبزادے تھے۔ ہاشم (پیغمبر اعظم کے بزرگوار دادا) عبدشمس، مُطلب نوفل ــ عبدمناف کے ان شریف زادوں[2] نے عبدالدار کے خاندان کے مقابلہ میں اپنے حق کا اعلان کر دیا۔

یہ لوگ اکثریت میں تھے قابلیت اور حوصلہ کے مالک تھے شریف طبع اور قبیلہ کے درمیاں عزیز و محبوب تھے۔ اس طرح حکومت کا وہ خونی رجحان جو خون کے رشتے سے قصی کے دونوں بیٹوں کی رگوں میں پہنچا تھا۔ دونوں کے انتقال کے بعد عرب کے آسمان پر شفق سُرخ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ عبدالدار کے بیٹے اپنے باپ کی ریاست کو میراث مانتے تھے اور

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲، طبع میمنیہ مصر [2] ایضاً ج ۱ ص ۱،

عبد مناف کے بیٹے خدمت کی اہلیت کو سیادت کی سب سے بڑی دلیل سمجھتے تھے۔ ان میں بڑے ہاشم تھے اور اُن کا فیصلہ یہ تھا کہ خدمت کو اہلیت سے وابستہ ہونا چاہیے ورنہ ناکامی اور بدنامی سے دوچار ہونا پڑیگا۔

ظہورِ اسلام سے کچھ ہی قبل قریش کے شریف زادوں کا یہ اختلاف مخالفت کا قومی سبب بن گیا اور عرب کی تنظیم پر اس کا اثر ہو کر رہا۔ قریش دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ آخر کار شدید اختلاف کے بعد قصی بن کلاب کی وحدانی (Unitary) امارت کے اختیارات بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔[1]

ہاشم نے (جن کا خاندان اپنی شرافت کو عرش بریں تک بلند کرنے والا تھا) امارتِ مکہ میں خارجی تعلق کو بھی ذمہ داری کی حیثیت عطا کی۔ انہوں نے قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ قریش جب روم کے علاقہ میں مال لے کر جائیں تو اُن سے ٹیکس نہیں لیا جائیگا۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ عرب میں راستے غیر محفوظ تھے۔ ہاشم نے قبائل میں دورہ کر کے معاہدہ کیا کہ کاروانِ تجارت کو نقصان نہ پہنچائینگے۔[2]

ذمہ داریوں کی اس تقسیم کے بعد بھی اختلاف کی جھلک واقعات میں نظر آتی رہی جب یہ اختلاف بڑھتا تو قریش کی فراست اس کو کم کرتی۔ اس طرح جو انقلاب بھی ہوتا اس میں خون کی نوبت نہ آتی۔ تقسیم کار کا بنیادی اصول قریش کی سیاست کی بنیاد بنا رہا اور اس طرح قریش اپنی خاندانی شرافت میں ممتاز رہے۔ تاہم اختلاف کی صورتیں کچھ نہ کچھ پیدا ہوتی رہیں حرم عربوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز تھا۔ اس کا اقتدار اسی طرح قوم کی زندگی میں موثر تھا جس طرح شخصی

---

[1] عبد الدار کی ذمہ داری۔ حجابۃ، لواء، ندوہ۔ عبد مناف کی ذمہ داری۔ سقایۃ اور رفادہ۔ تاریخ خضری ج ۱ ص ۵۱۔

[2] امالی ابو علی قالی۔ بحوالہ سیرت النبی علامہ شبلی ج ۱ ص ۱۵۵۔

سلطنت میں ایک مقتدر اور اچھے بادشاہ کا تاج ہوتا ہے۔ عربوں میں اختلاف پیدا ہوا اور اتحاد ختم ہوا تو یہ مرکز وحدت بھی باقی نہ رہا۔ اور وہ تمام فوائد جو اس سے حاصل تھے یکدم ختم ہو گئے قیس و کنانہ کے قبائل کی مشہور لڑائی کو حرب فجار اسی لیے نام دیا گیا کہ عربوں نے حرم کی مرکزی عظمت کو نظر انداز کر کے اس کی حدود میں کشت و خون کو روا رکھا۔

اس دور میں حجاز کے قبائلی طرز حکومت سے جو شخصیت اور جمہوریت کی آمیزش سے ظہور پذیر ہوا تھا عرب کی ترقی کو اور نقصان پہنچا۔ تمام قبائل سرداروں کے ماتحت تھے۔ ہر سردار قبیلہ کا جنگی ہیرو تھا۔ اُن کی قسمت اُس کی ملک ہوتی جب حکم دیتا جنگ شروع ہو جاتی اور جب لفظ صلح زبان سے نکل جاتا جنگ اپنی موت مر کر ختم ہو جاتی، وہ جب چاہتا معاہدہ کرتا اور جب ارادہ کرتا تو معاہدہ توڑ دیتا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ایک زبردست اضطراب رونما تھا۔ عام پستی، خاص تباہی ہمہ گیر بے چینی، عالمگیر معرکہ آرائی کا سلسلہ جاری تھا کہ یکایک کوہستان عرب کے مطلعِ عالی پر اسلام کا آفتاب عالمتاب اُبھر کر اوپر آیا، اور ایک نیا انقلاب رونما ہوا۔ اور نیا نظام انسانوں کی عقل کے روشن پردوں پر ظاہر ہوا

پیغمبر اعظم سے پہلے تاریخی ملکوں اور قوموں کی حالت

پیغمبر اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم منجانب اللہ ایسے دور میں روئے زمین پر جلوہ فرما ہوئے جب دنیا کی تمام قومیں اور سلطنتیں طوائف الملوکی کے عذاب میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل بربادیوں کے منتہا سے رحمتِ عالم کے انتظار میں تھے۔ عیسائی دنیا آپس میں جنگ آزما تھی اور اس خیال پر قائم کہ خدا کی بادشاہت محض ایک تصوری شے ہے، واقعی، وجودی اور حقیقی امر نہیں ہے۔

یہودی قدس سے یثرب تک پراگندہ حال آباد تھے۔ اور عربوں کی مقاومت سے بے حال ہو رہے تھے۔ عیسائی تاجداری کے تخت پر سیدنا مسیح علیہ السلام کے احکام کے خلاف

صف آرا تھے۔ اور اپنے فرائض بھول چلے تھے۔ فارس کی عظیم قوم اسکندر اعظم کے عمل جراحی سے شفا پانے کے بعد قوت حاصل کر چکی تھی مگر شوکت و سطوت کے باوجود تمام قوت کو انسانیت کے اصولوں کو شکست دینے کے لیے صرف کر رہی تھی۔

پیغمبر اعظمؐ نے اجتماعی میدان میں اسلام کا نظام حکومت قائم کرنے میں جن اعلیٰ اور فطری اصولوں کا لحاظ رکھا ہے ان کا اندازہ درحقیقت اس زمانہ کے حالات پر موقوف ہے۔ کیا حالات تھے اور کیا ہو گئے کیسی حکومتیں قائم تھیں اور کیسی حکومت قائم ہوئی۔ کس قسم کے سیاسی محرکات کارفرما تھے اور کس درجہ عظیم انقلاب برپا ہوا۔

اگر اسلام سے پہلے ظاہر ہونے والے واقعات کو میزانِ عدل میں رکھ کر وزن کیا جائے تو ان کے بارے میں یہ ماننا ہوگا کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہولناک مخالفتوں، تباہ کن جنگوں، اور افسوسناک برائیوں کا دور دورہ تھا۔

متمدن فرانس کے فاضل اہل قلم موسیو گال لیبام[1] نے ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں پیغمبر اسلام کو جامعہ اسلامیہ کا قانونی موسس قرار دیتے ہوئے یورپ کے حالات کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے میلاد سے کچھ پہلے اور کچھ بعد چھٹی صدی (۶۰۰ء) کے اطراف میں ساری دنیا کا مطلع فتنہ و فساد کے سیاہ بادلوں سے تیرہ و تار تھا۔ اسپین اور جنوبی فرانس کے باشندے شہنشاہ کلاؤڈیس[2] کے کیتھولک خاندان کے روسا سے پریشان تھے۔ انہوں نے مشرقی روم کے شہنشاہ گسٹینین (Gustinian) کو امداد کے لیے بلایا جب وہ قاہر طاقتوں کے

---

[1] دیکھو مقدمہ موسیو گال لیبام۔ ترجمۂ قرآن بزبان فرانسیسی (بحوالہ دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۹ ص ۱۴۱ ۲ لفظ مسلم، الاسلام فی عصر العلم ج ۵ ص ۲۲۴ طبع مصر۔

[2] کلاؤڈیس (Caludius) جس کو عرب کلوفیس یا کلودیس کہتے ہیں۔ دائرۃ المعارف بستانی ج ۴ ص ۵۵۲ انگلترا

ساتھ مقابلہ کے لیے آیا تو انہی مظلوموں کو جبری لام بندی کے ماتحت مقابلہ کے لیے میدان جنگ میں اپنے محسنوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔

فرانس و اسپین کے مجموعی دائرہ میں کلاؤ دیس کا خاندان اور فرانکی حکومت میں جنگ کا بازار گرم تھا تاریخ میں اس سے زیادہ رنج دہ جنگ کی مثال نہیں ملتی[1]۔

انگلستان میں کیمبرین نسل اور انگلو سیکسن قومیں وحشیانہ معرکہ آرائی اور کشت و خون میں غرق تھیں۔ بربر نسل۔ اسکاٹ لینڈ کی کلٹک (Celtic) نسل اجیوٹ (Jutes) نسل یکے بعد دیگرے دست و گریبان تھے ۵۴۹ء میں کسی قدر حکومت کی سطح پران کا اجتماعی میلان ظاہر ہوتا ہے لیکن ۸۲۸ء تک انگلستان کی شہنشاہیت متحدہ کا خاکہ نہیں بن سکا[2]۔

رومۃ الکبریٰ[3] کی حکومت جس کا نام آج تک دلوں کو مرعوب کرتا ہے سخت قسم کی پاپائی کشمکش میں مبتلا تھی۔ یونان اپنی تاریخی عظمت کو فراموش کر چکا تھا۔ مملکت یونان مشرقی روما کی مملکت میں گم ہو چکی تھی۔

مشرقی یورپ دریائے رائن (Rhine) کے جنوبی کنارے سے دریائے ڈینوب (Danube) کے مشرقی اور مغربی وادی تک اضطراب و اختلاف کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسکنڈنیویا (بحر بالٹک کے ممالک) ناروے اور ڈنمارک کے باشندے گاتھ اور ہون قوموں کے مقابلہ اور مزاحمت میں مصروف تھے۔ موسیو رینان نے رومنوں کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے کہ پہلی صدی کی رومن حکومت اور چھٹی صدی کے رومنوں میں کوئی مشابہت نہیں۔ کیونکہ چھٹی صدی کی رومن سلطنت برائیوں، خرابیوں اور وحشیانہ جنگ و جدال کا نقشہ پیش کرتی ہے[3]۔

---

[1] دائرۃ المعارف ج ۴ ص ۵۲ ۵۵۳،۵۵۲ [2]

[2] الاسلام فی عصر العلم۔ علامہ وجدی ج ۱ ص ۲۳۵۔ حیات خاتم المرسلین

[3] کتاب الانبیار فصل ۱۷ بحوالہ مذکورہ ص ۲۳۶

ایشیا | ایشیا کا امن اور اجتماعی حالت یورپ سے زیادہ پیچیدہ تھی۔ ہندوستان تبت اور چین عجیب و غریب فلسفیانہ مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اجتماعی مسائل سے اجنبی اور افکار عامہ سے محروم، ہر ملک داخلی جنگوں کو اپنی تقدیر سمجھے ہوئے تھا۔ خارجی فوج کشی، اور ادنیٰ درجہ کی دینی اُلجھنیں اس کے علاوہ تھیں جن سے ایشیا کی قومیں پامال ہو رہی تھیں۔ شمالی روس کے حالات سے دنیا مطلقاً بیخبر تھی۔

مملکتِ فارس کی قسمت مغرب کے حالات سے وابستہ تھی۔ اسکندر مقدونی کے حملوں نے فارس کے نظام اجتماعی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ آخر میں کچھ تنظیمی صورت قائم ہوئی تو وہ روم کے مشرقی مقبوضات سے دست و گریبان رہی۔ افریقہ میں مصر کی عظمت فنا ہو کر روم کی حاکمیت کا اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ دنیا کے مختلف حصوں کے سپاہی، تجار اور حکام رومن اقتدار کے ماتحت مصر کی آزادی کی گردن مروڑ رہے تھے اور اہل ملک دم نہ مار سکتے تھے[۱]۔

موسیو گال لیبام ان تفصیلات کے بعد لکھتے ہیں "خلاصہ کلام یہ ہے کہ عالم ارضی کی فضا وحشیانہ بیچینیوں کے غلیظ و کثیف بادلوں سے تاریک تھی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ہر انسان اچھے ذرائع اختیار کرنے کی بجائے شرارت آمیز وسائل پر اعتماد کرتا تھا۔ امن اور اطاعت پر جنگ و میدان جنگ کو تفوق حاصل تھا۔ مال غنیمت سے خزانوں کو بھرنا، قوموں، شہروں اور شرفائ پر غارت ڈالنا ایسے کارنامے تھے جو اس ساری تاریخ میں قابل ذکر ہیں[۲]۔

فکر و نظر کے اس مرحلہ پر دنیا کی عقل اس نتیجہ تک پہنچ سکتی ہے کہ اسلام کن حالات میں روئے زمین پر آیا اور اُس نے انسانیت عامہ کی اجتماعی حالت کو اصلاح و ترقی اور سیاست و حکومت کی معراج پر کس طرح پہنچایا۔

---

[۱] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۵ ص ۳۴۲ [۲] الاسلام فی عصر العلم وجدی حیات خاتم المرسلین ج: ص ۲۲۴ و ۲۲۹

مشہور امریکن مورخ "ہسٹری آف دی مورس ایمپائر ان یورپ" کے لائق مصنف ڈاکٹر ایس پی اسکاٹ نے اس زمانہ کے حالات کا نقشہ اور بھی زیادہ دردناک الفاظ میں کھینچا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

"حضور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت باسعادت سے ایک صدی بیشتر سخت ترین اور افسوسناک جہالت نے مسیحی دنیا کا منہ کالا کر رکھا تھا۔ اس کے مقتدایانِ مذہبی بداخلاق اور فاسق و فاجر ہو گئے تھے ان کی بحثوں کا فیصلہ اکثر قتل عام سے ہوتا تھا۔ اسکندریہ اور نیشیا میں جبر و تشدد کا دور دورہ تھا۔ چھٹی صدی کا راہب مذہبی سردار بھی تھا اور دنیاوی حاکم بھی، ولی بھی تھا اور شیطان بھی۔ اس وقت کوئی مسلمہ مرکزی کلیسائی حکومت نہ تھی۔ جو کلیسائی حکومت قائم تھی وہ شتر بے مہار، خود مختار اور اتنی مستبد تھی کہ جس کی اپیل کہیں نہیں ہو سکتی تھی۔ پاپائے روم کی مذہبی حکومت ایسی مختار مطلق تھی کہ اس سے پہلے دنیا بھر کی کسی حکومت کو یہ اختیارات کبھی حاصل نہ ہوئے تھے۔ اس نے انسانی عقل کو قیدی بنا رکھا تھا اور انسانی خیالات کی آزادی کو بُری طرح شکنجہ میں کس رکھا تھا۔

سلطنت روما کے ہر صوبہ میں وحشیانہ لڑائی کے نشانات ہر جگہ موجود تھے۔ سیاسی خرابی اور اخلاقی ذلت نے جنگ سے زیادہ بربادی پھیلا رکھی تھی۔ گاتھ[2] اور لومبارڈ[3] کی سلطنتوں کے ہر نقشِ قدم پر انسانوں کی سفید ہڈیاں، منہدم شہر، تباہ شدہ کھیت اور آتش زدہ جھونپڑیاں

---

[1] اخبار الاندلس (ترجمہ) مولوی خلیل الرحمن صاحب ج ۱ ص ۹۴۔۱۰۰ طبع لاہور

[2] گاتھ (عربی قوط) زمانۂ قدیم کی ایک نہایت بہادر جرمن نسل جن کو غلطی سے بعض مورخین نے سکنڈی نیویا کا خیال کیا ہے۔ انہوں نے قدیم زمانہ میں روم پر شدید تاخت و تاراج کی ہے۔

[3] لومبارڈ (Lombard) وہ علاقہ ہے جس کو آج کل اٹلی کہتے ہیں۔ سیوائے اور وینس کے علاقے اس میں شامل نہیں ہیں۔ یہ مستقل سلطنت تھی جو فرانس کے حملوں سے مضمحل ہو گئی تھی۔

ہی نظر آتی تھیں۔

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں کلیسا اور بیزنطینی سلطنت دونوں بربادی کی حالت میں تھے۔ اگر یورپ کی پوری حالت کو دیکھا جائے تو وہاں کے معاملات اور بھی زیادہ افسوسناک تھے۔ قوم گاتھ تمام براعظم یورپ کی مالک بنی ہوئی تھی۔ وینڈل[1] قوم نے جزیرہ نمائے اندلس سے گذر کر اپنا فتحمندانہ علم افریقہ کے ساحل پر گاڑ دیا تھا۔ اور سخت بے رحمیاں کر کے اپنا نام بدنام کرلیا تھا ہینی بال اور ہیملکار[2] کی اولاد سمندر میں دھکیل دی گئی تھی۔ ایتھنز (یونان) کا واحد آزاد مدرسہ ڈیڑھ سو سال پہلے شاہ جسٹنین کے حکم سے بند ہو چکا تھا۔ قیاصرہ کی اولاد اپنے ورثہ سے محروم ہو کر باجگذار بن چکی تھی اور ان وحشیوں سے ڈر کر مری جاتی تھی جو چمڑے کا لباس پہنتے تھے اور جرمنی کے جنگلوں اور بالٹک کے سواحل پر اتنی تعداد میں رہتے تھے کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ روم کا نوے میل کا گلزار علاقہ کیمپےنا (Campayna) زہر کی دلدل بنا ہوا تھا۔ روم کو دو بار لوٹا گیا اور میلان[3] میں تو گویا گدھوں نے ہل چلا دیا تھا۔ ان تمام حوادث میں اس امر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہر طبقہ اور فرقہ کے مظلوم اصحاب ایسے موجود تھے جو بت پرستی اور مسیحی مذہب سے بد اعتقاد ہو چکے تھے اور ایک مصلح کے منتظر تھے جس کو فارقلیط یعنی نجات دہندہ کہتے تھے اور نہایت ہی قدیم روایات کے مطابق ایک پیغمبر کا انتظار بھی کیا جا رہا تھا جس کا نام احمد یا محمد ہوگا۔

---

[1] وینڈل (Vandal) سواحل بحر ازوف کی وحشی قوم جس نے پانچویں صدی میں یورپ اور سواحل اٹلانٹک کو خوب تاراج کیا اور افریقہ میں مسلمانوں سے متصادم ہوئے۔

[2] تاریخ قدیم میں سلطنت قرطاجنہ کا مشہور سپہ سالار ہےمل کار (Hamilcar) اسی کا بڑا لوکا تھا اور بہت بڑا سپہ سالار!

[3] میلان سلطنت لومبارڈ کا صدر مقام

اسلامی دور

عہدِ محمدیؐ، خلافتِ راشدہ دورِ اول، خلافت راشدہ دور دوم

عہد محمد صلی اللہ علیہ وسلم (سنہ ۵۷۱ء سنہ ۶۳۲ء)

حضرت محمد مصطفےٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے اوصاف اور اجتماعی برکات پر جس قدر بھی غور کیا جاتا ہے آنحضرت کی عظیم الشان شخصیت نگاہِ عقیدت کے سامنے آراستہ ہو جاتی ہے چھٹی صدی عیسوی سے پہلے بڑے بڑے فرمانروا پرشکوہ خطابات کے ساتھ دنیا کے اجتماعی نظام پر قابو پاکر نام پیدا کر چکے تھے۔

یونان کا شہنشاہ بطلیموس کے لقب سے سرفراز تھا، ترکوں کا خاقان کے لقب سے فارس کے شہنشاہ کا لقب کسریٰ تھا۔ روم کے شہنشاہ کا قیصر، اور حبش کے شہنشاہ کا نجاشی انسانی سوسائٹی جابر و قاہر شخصی حکومتوں اور غرور سے بھرے ہوئے خطاب یافتہ حکمرانوں کے شکنجہ میں قریب بہ مرگ تھی۔ ایسے شدید اور صبر آزما زمانہ میں پیغمبر اعظم رسول اللہ اور خلیفۃ اللہ کے پاکیزہ خطابات سے سرفراز ہو کر نازل ہوئے۔ اہل دنیا کو معلوم ہوا کہ دنیا کے سچے اور صحیح اجتماعی تصورات پہلی مرتبہ حقیقی انسانیت اور اور مثالی عمومیت (Democracy) کے مفہوم سے آشنا ہو رہے ہے۔ ہم آنحضرت کی پاک زندگی پر جس قدر غور کرتے ہیں ہمیں اس زندگی کا ہر دور ابتدا سے انتہا تک فیصلہ کن واقعات سے بھرپور نظر آتا ہے۔ دنیا تاریکی میں تھی۔ یکایک آفتاب اسلام کا طلوع ہوا۔ دنیا کی قسمت جگمگا اٹھی! دنیا بدی اور بدکاری میں مبتلا تھی یکایک کونین کے سردار اور دنیا و دین کی حکومت کے رہنما کا ظہور ہوا۔[۲] اہل دنیا کی تقدیر کے سیاسی نوشتے سیاہ

۱؎ سنہ عام فیل ۶۲ سنہ میلاد نبوی) دیکھو البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر۔ ۲؎ روض الانف علامہ سہیلی ۵۰۸ھ–۵۸۱ھ ج ۱ ص ۲۰۴ طبع جمالیہ مصر

سے سنہرے ہو گئے! دنیا انصاف سچائی، اور خوفِ خدا کے مطمع نظر سے دور تھی۔ یک بیک خدا کے محکم قوانین کا مجموعہ، حکمت و حکومت اور سیاست و سلطنت کا بے نظیر دستور (قرآن مسطور) انسان کے دل و دماغ پر نازل ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے انسانیت عامہ کے تمام فطری احکام ایک ایک کر کے بروئے کار آ گئے

پہلے روئے زمین کے سردار کا ظہور ہوا، اس کے بعد فطری قوانین نے اپنی جھلک دکھائی اور اس کے فوراً بعد ایک امت کی تشکیل عمل میں آئی جس کا کام ساری قوموں کو ایک کر کے ایک انسانیت عامہ کے عقیدہ پر جمع کرنا اور دنیا جہان کی واحد حکومت قائم کرنا تھا جب ہمارے نظام کا سردار پیدا ہو گیا تو دنیا کے تمام پرانے نظام ٹوٹ پھوٹ گئے پچیس سال کی مدت میں دنیا بدل گئی، ایک بڑی اور بے مثال تبدیلی رونما ہوئی جس نے مدت کے تصورات، زمانۂ دراز کے خیالات، عرصہ کی تنظیمات اور سالہا سال کی قوموں اور حکومتوں کو ختم کر دیا۔ ساری عمر کے دشمن دوست ہو گئے۔ صدیوں کے جنگجو قبائل ایک امت بن گئے۔ آپس میں قتل و قتال کرنے والے ایک دوسرے کی جان اور عزت کے محافظ بن گئے۔ تمام بھلائیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور برائیوں کی ہر عمارت اپنی بنیادوں پر بیٹھ گئی۔ اسلام کا دور شروع ہوا، اسلام کا نظام قائم ہوا، اسلامی حکومت کی تاسیس عمل میں آئی جو دنیا میں سب سے برے تھے سب سے اچھے ہو گئے۔ جو لوگ برے کاموں کے لیے مشہور تھے ان کے سارے کام اچھے ہونے لگے، خدا کی شان ہے کہ پلک جھپکتے ہی ساری دنیا میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اس سے بہتر انقلاب نہ تاریخ نے دیکھا اور نہ اسلام سے علیحدہ ہو کر آئندہ تاریخ دیکھیگی۔

(پیغمبر اعظم کی مبارک و مسعود زندگی سے نگاہوں کو آسودہ کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ

آپ کی پیغمبرانہ زندگی میں عالمگیر حکومت، ذمہ داری اور قوموں کی امامت کا احساس جوہر کی طرح موجود تھا۔ آپ کی زندگی میں ابتدا ہی سے سیاسی آثار موجود تھے اور ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کی عظیم و جلیل ہستی دو باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

"اسلام دنیا کی سب سے بڑی اور فاتح طاقت ہے اور انسانیت کا مفادِ عامہ صرف اسلام سے وابستہ ہے"۔

سیاسی آثار

ہر بڑے واقعہ کے ظہور سے پہلے کچھ ایسے آثار پائے جاتے ہیں جس سے اصل واقعہ کی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے پیغمبر اعظم ابھی جلوہ گاہ وجود میں تشریف فرما نہ ہوئے تھے کہ آپ کی والدۂ محترمہ نے اس شرف کو محسوس کر لیا جو آپ کے وجود گرامی سے ظاہر ہونیوالا تھا۔

اُس زمانہ میں انسان کی زندگی پر خواب کا زبردست اثر تھا۔ اشخاص خواب دیکھتے تھے، قبائل خواب دیکھتے تھے، قومیں خواب دیکھتی تھیں۔ خواب صادق کو ایک حقیقت سمجھا جاتا اور اس کی تعبیر سے عظیم الشان واقعات رونما ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے بزرگوار دادا عبد المطلب نے مشرق سے مغرب تک ایک سنہری زنجیر دیکھی تو زبانِ خلق نے یہ تعبیر دی (جو حرف بحرف پوری ہوئی) کہ اس شخص کی عالی پایہ نسل میں ایک ایسی ہستی پیدا ہو گی جس کے تابع فرمان اہل مشرق بھی ہونگے اور اہل مغرب بھی۔ پیدائش سے کچھ پہلے آپ کی قابلِ عزت ماں (آمنہ بنت وہب) نے ایک عجیب الاثر خواب دیکھا۔ تو اس کی تعبیر یہ دی گئی "دامن مراد اس اُمت کے سردار کا حامل ہے"[۲]۔ ان خوابوں میں جو واقعیت کارفرما ہے اُس کا اندازہ عربوں کے مزاج کے مطابق کیجیے تو مسئلہ کی اہمیت سامنے آجاتی ہے۔ ایک مرتبہ خالد بن سعید بن العاص نے خواب دیکھا کہ زمزم سے روشنی کا فوارہ بلند ہو رہا ہے۔ جب آنحضرت ؐ نے اپنی نبوت

---

[۱] روض الانف امام سہیلی ج ۱ ص ۱۰۵ اجمالیہ [۲] ابن الاثیر ج ۱ ص ۱۶۲۔

کا اعلان کیا اور اُمت اسلامیہ کی تنظیم کا وقت آیا تو خالد محض اس خواب کے اثر سے مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہو گئے۔ عبد المطلب اور حضرت آمنہ کے خوابوں کی تعبیروں نے وقت کی اجتماعی حسیات پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ اور اہل عرب کے صلاحیتمند دماغ ابتداہی سے آئندہ دور کی تنظیم کے خواب کی تعبیر دیکھنے لگے۔[1]

سردارِ اُمت کی پیدایش آپ جس سال دنیائے موجودات میں تشریف لائے تو یہ حادثۂ فیل کا سال تھا۔ یمن کا حبشی وائسرائے ابرہہ فیل (ہاتھی) پر سوار ہو کر کعبۃ اللہ کے انہدام کے لیے آیا[2] لیکن اللہ کے حکم اور قانونِ قدرت کے ماتحت شکست کھا کر رخصت ہوا۔ اس واقعہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ابرہہ کی نیت سے ہوتا ہے۔ بیت اللہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں "امن وسلامتی کا پایۂ تخت" بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ بنی اسمٰعیل نے اس کی اجتماعی تقدیس کی حفاظت کی قصی بن کلاب نے اس کی سیاسی مرکزیت کو تازہ کیا۔ ابرہہ کی اسکیم یہ تھی کہ خدا کی حکومت کے اس مرکزی ایوان کو مٹا دیا جائے لیکن قدرت نے حملہ آوروں کو مٹانے کا فیصلہ کیا اور وہ دنیا کی بساط سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ جب دنیا کے مذہبی مرکز میں یہ واقعہ ایک ہولناک سیاسی واقعہ کی حیثیت سے رونما ہو چکا تو وہ ہستی پیدا ہوئی جس کے دم قدم سے ساری دنیا کا امن وابستہ تھا جس سنہ میں یہ مقدس پیدایش ہوئی وہ واقعۂ فیل کا سال تھا حسن اتفاق یہ کہ اس زمانہ میں فارس کی سلطنت پر نوشیروانِ عادل حکمران تھا۔ تاریخی قیاس کے مطابق [3] جلوس نوشیراں تھا۔ محمد محمود پاشا فلکی (مصری) کی رائے کے مطابق آپ کی ولادت باسعادت یوم دوشنبہ ۹۔ ربیع الاول۔ ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی۔ مقام پیدایش دار ابو یوسف کے نام [4]

---

[1] روض الانف سہیلی ج ۱ ص ۱۰۵، ۱۱۲۔ [2] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۷ ص ۲۵۳ (عرب)
[3] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۲ ص ۱۲۷۔ تاریخ الاسلام السیاسی ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن پروفیسر جامعہ مصریہ ج ۱ ص ۹۱
[4] تاریخ ابن الاثیر ج ۱ ص ۱۶۲۔ روض الانف ج ۱ ص ۱۳۳۔

سے مشہور تھا۔

آنحضرت کی زندگی اوّل سے آخر تک بیشمار سیاسی واقعات کا مرقع ہے۔ اگر پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے وقت تاریخی ہستیوں اور مقدس مذہبی رہناؤں کا یہ خیال تھا کہ عبدالمطلب کے گھر میں دنیا کی قوموں کا واحد سردار پیدا ہوگا تو پیدائش کے بعد یہ خیال حقیقت بن کر سامنے آگیا۔

علامہ سہیلی۔ روض الانف میں لکھتے ہیں کہ حضرت آمنہ پہلے دن ہی آنے والے واقعات کی روشنی کو دیکھ چکی تھیں۔ اور یہ روشنی آنے والے دور کی حکومت تھی اور مستقبل کی فتوحات کا ابتدائی نظارہ[1]۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ آنحضرت پیغمبر تھے اور یہی آپ کی اصل حقیقت تھی لیکن بات یہ بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آپ حکومت کے کاموں اور کارناموں میں ایک بالادست حکومت کے نائب تھے۔ آپ نے دنیا کو سبق دیا کہ حکومت اور مذہب دونوں ایک معتدل اور متوازن نظام سے تعلق رکھتے ہیں، حکومت کا مطمح نظر مذہب ہے اور مذہب کی حقیقت حکومت ہے اس اعتبار سے آپ کا دورِ حیات سیاسی فرائض اور تصورات کے لحاظ سے بھی اتنا ہی بے مثال تھا جس قدر پیغمبر کی حیثیت سے عدیم النظیر اور سربسر اعجاز۔

واقعہ بحیرا کا سیاسی پہلو | ابتدائی واقعات میں سب سے زیادہ مہم واقعہ سفر شام میں پیش آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ خاندان کے تمام بڑے اور مربی بچپن میں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔ قدرت جس ہستی کو حکومت اور حکمت کی ہر ذمہ داری کو عطا کرنے والی ہے اس کو تمام سہاروں سے محروم کر دیتی ہے۔ جس انسان کو سب کچھ ملنے والا ہے اُس سے سب کچھ لے لیا جاتا ہے تاکہ

---

[1] روض الانف ج ۱ ص ۱۱۱۔۱۱۲۔

یہ معلوم ہو جائے کہ ایک انسان نے تن تنہا خدائے واحد کے لیے دنیا کو فتح کیا اور فتح کر کے فطری حکومت کی بنیاد قائم کی تاکہ خدا کی قوت اور اس کی مرضی کی تاریخ پھر ایک بار مکمل صورت میں دنیا کے سامنے آجائے۔ اور انسان کو معلوم ہو جائے کہ مادی طاقتیں خدا کے لازوال اختیار اور قانوں کے ماتحت ہی بے مثال سیاسی طاقت پیدا کرتی ہیں۔ اور اپنا فطری عکس دنیا کو دکھاتی ہیں۔

آنحضرت تمام بزرگوں سے محروم ہونے کے بعد اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کر رہے ہیں۔ بصریٰ (پایۂ تخت شام) کے قریب پہنچ کر عیسائی راہب بحیرا سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس وقت عمر مبارک نو سال یا بارہ سال ہے۔ با خدا راہب ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر جو پہلا کلمہ زبان سے ادا کرتا ہے وہ یہ ہے۔

"یہ ساری دنیا کا سیاسی سردار ہے۔ یہ ساری دنیا کے خداوند کا نمائندہ اور رسول ہے یہ ساری دنیا کے لیے رحمت ہے (ھٰذا سید للعالمین، ھٰذا رسول رب العالمین، یبعثہ اللہ رحمۃ للعالمین[1])

نو سال حد بارہ سال کی عمر میں ایک باخدا انسان کی پیشین گوئی ان آثار پر مبنی تھی جو انجیل مقدس کے صفحات سے اس زمانہ کے صادق انسانوں کے صفحات قلب تک پہنچی تھی۔ بحیرا کا یہ کہنا کہ یہ شخص ساری دنیا کا سردار ہوگا خاص طور پر سیاسی سیادت اور حکومت کی پیش بینی تھی۔ کیونکہ اُس نے اسی وقت اہل قافلہ کو ہدایت کی کہ اس ہونہار بچے کو روم کی قلمرو میں نہ لیجانا، اگر رومی حقیقت سے باخبر ہوگئے تو قتل کی اسکیم سوچینگے۔ اس قسم کی ہدایت ان صریح تاریخی واقعات کی پیش بندی تھی جو بعد میں آنحضرت کی زبان پر آئے۔ نوجوان اُسامہ

[1] روض الانف امام سہیلی۔ سیرت ابن ہشام حمیری۔ ج ۱ ص ۱۱۹

کی فوجی مہم کا روم کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے نکلنا ہی بحیرا کی سیاسی بصیرت کی صداقت کی پہلی تاریخی دلیل تھی۔[1]

پیغمبر اعظمؑ نے بیس سال کی عمر میں حرب فجار کے وقت پہلی مرتبہ میدان جنگ کا منہ دیکھا۔ اس جنگ کے بعد قریش نے ایک شریفانہ صلحنامہ کیا جس کو تاریخ میثاق فضول کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس معاہدہ کی واحد دفعہ یہ تھی کہ کوئی عرب مظلوم کے مقابلہ میں ظالم کی حمایت نہ کریگا۔[2]

اسلامی سوسائٹی کے بننے سے بیس سال پہلے یہ معاہدہ ہوا۔ اس سے پہلے ایسا شریفانہ معاہدہ قریش کی تاریخ میں نہیں ہوا تھا۔ اس معاہدہ کی مجلس میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود تھے۔ آپ کی تاریخ زندگی میں یہ پہلا سیاسی اجتماع تھا جس میں آپ نے شرکت کی۔ آپ خود فرماتے ہیں "میں حلف الفضول کے وقت موجود تھا۔ یہ معاہدہ میری رائے میں سرخ اونٹوں سے زیادہ قیمتی تھا۔ اگر اسلامی دور میں بھی کوئی شخص مجھے اس قسم کا معاہدہ کرنے کے لیے بلائے تو موجود ہوں۔"[3]

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی کے عالم میں بھی آپ کی سیاسی بصیرت میں قوتِ فیصلہ کا جوہر موجود تھا۔ اور یہ واقعہ ہونے والے عظیم الشان واقعات کے لیے ایک ایسا نشانِ راہ تھا جو حقیقی منزل پر پہنچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اجتماعی کردار چھٹی صدی عیسوی کے تمام عرب مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی کردار ہر اعتبار سے ایک مثال تھا، زمانۂ جاہلیت میں آپ کی

---

[1] دیکھو واقعہ بحیرا کی تاریخی تفصیل، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۸۳۔

[2] البدایۃ والنہایہ ج ۲ ص ۳۰۰ [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۹۱۔

[4] سیرہ ابن ہشام ج ۱ ص ۹۲۔ البدایہ والنہایہ ج

زندگی اجتماعی تمدن کے واجبات کا نمونہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قوم نے آپ کو امین کا خطاب دیا تھا۔ اور اسی بنیاد پر عرب کی شریف ترین خاتون خدیجۃ الکبریٰ نے اپنے اقتصادی معاملات میں آپ پر اعتماد کیا اور آپ کی اہلی زندگی میں شرکت کی۔ پچیس سال کی عمر کا واقعہ ہے۔ پینتیس سال کی عمر تھی کہ قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر حجر اسود کو رکھنے اور قبائلی نزاعی حقوق کا فیصلہ کرنے کے لیے آپ کو اپنا جج بنایا۔ آپ نے پتھر کو چادر میں رکھ کر قبائل کے نمائندوں سے بلند کرایا اور اپنے دستِ مبارک سے اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس سیاسی قوتِ فیصلہ سے ایک منٹ میں بہت سے قبائل کا اختلاف مٹ گیا اور ایک ہمہ گیر جنگ شروع ہونے سے پہلے ختم ہو گئی۔

اسلامی سوسائٹی کی بنا پیغمبر اعظمؐ نے بچپن اور جوانی کے چالیس سال مکہ میں بسر کیے۔ بنی ہاشم آپ پر فخر کرتے تھے، علمائے کلیسا، احبارِ یہود، موحدین جاہلیت اپنی جگہ مطمئن تھے کہ وہ ہستی پیدا ہو گئی جس کی بشارت تورات و انجیل نے دی تھی۔

آنحضرتؐ نے چالیس سال کے بعد خدا کا حکم پایا "آج سے جو حکم دیا جائے، اس کی تعمیل کی جائے" ایک بالادست اور مسلمہ طاقت کے اس فرمان سے پہلی مرتبہ یہ ظاہر ہوا کہ ہر اجتماعی تنظیم کے لیے ایک کامل اور مکمل انسان کی ضرورت ہے۔ ہر اجتماع سے پہلے ایک فرد کا ہونا ضروری ہے۔ جب یہ فرد اپنے تمام اوصاف کمال کے ساتھ ظاہر ہو گیا تو دنیا پر قدرت کا منشا کھل گیا۔ یہ منشا کیا تھا۔

تمام خرابیوں کا خاتمہ، تمام اچھائیوں کا ظہور، انسانیت عامہ کے منتشر اور رفاسد عناصر کا خاتمہ اور خدائے واحد کی حکومت کے لیے ایک عظیم الشان سوسائٹی کی تشکیل جو دنیا کی روحانی اور مادی طاقتوں کی ترکیب سے ایک ایسے فطری نظام حکومت کو بروئے کار لا سکے جس کا

مطمح نظر انسانیت ہو، اور اُس اقتدار بالادست کی وفاداری جس کو دنیا کے کروڑوں انسان کسی نہ کسی شکل سے تسلیم کرتے ہیں۔

انسانی سوسائٹی کی تنظیم | پیغمبر اعظمؐ نے منصب عظمیٰ کو قبول کرنے کے بعد خدا کے حکم پر عمل شروع کر دیا۔ علامہ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا منصب سنبھالا، ذمہ داریوں کے خداداد احساس نے یہ ظاہر کر دیا کہ معاہدۂ ربانی کے مطابق ایک ایسی ہستی دنیا کی جولانگاہ میں آچکی ہے جو دنیا جہاں کے لیے رحمت ہی رحمت ہے اور جو انسانیت عامہ کے اجتماعی شیرازہ بندی کے لیے بشارت ہے ہر فرد کو اس کا ساتھ دینا چاہیے، اس کو ماننا چاہیے اور اس کی فوج کا سپاہی بننا چاہیے۔ اس کی ذمہ داری زبردست ہے۔ اس کا کام قوت اور عقلیت پر مبنی ہے۔ اس کے ساتھ خداداد اقتدار اور عظمت و کرامت[1] ہے۔

ہر اجتماعی کام کے لیے ایک اجتماعی مرکز درکار ہے اس لیے ساری دنیا کے رہنما نے ساری دنیا کو امن و سلامتی کے پایۂ تخت میں کھڑے ہو کر جمع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی بنیاد شہنشاہیت، دستوریت اور جمہوریت کی جگہ انسانیت پر رکھی۔ آپ کے خطاب اور پیغام میں عمومیت تھی اور مقصد میں انسانی رجحان کارفرما تھا۔

خفیہ انجمن | حصول مقصد کے لیے جو اہم صورتیں، تجاویز، اسکیمیں بروئے کار آئیں۔ ان کا آغاز ابتداء کار کی شدید رکاوٹوں کی وجہ سے ایک خفیہ انجمن کی شکل میں ہوا۔ زمانہ کے تباہ کن عقلی رجحانات اور جہالت کی غلط رو کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کرنا پڑتا ہے جو زمان و مکان کے مطابق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے قدم اول پر بچی مصلحتوں کا لحاظ رکھنا مناسب سمجھا۔ انسانوں کی بہتری اور جنگ سے بچنے کے لیے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۱، ۱۵۲۔ روض الانف سہیلی ج ۱ ص ۱۵۱ و ۱۵۲۔ (طبع جمالیہ مصر)

محتاط حکمت عملی ہر عمل کا اولین عنصر ہے۔ آپ نے تیرہ سال مکہ میں بسر کیے اور دس سال[1] مدینہ میں گر مکہ کی سرگرمیوں کے پہلے تین سال ایک ایسا راز تھے جس سے صرف قابل اعتماد اصحاب واقف تھے، آپ کی اجتماعی سرگرمیاں گھر کی انجمن سے شروع ہوئی تھیں۔ گھر کے بعد شہر شہر کے بعد عرب، عرب کے بعد ساری دنیا کو ایک خدا کے نام پر جمع کر کے انسانی وفاق قائم کرنا آپ کے ارادوں کا جزو تھا، مگر جب اول اول حضرت علی اسلام سے روشناس ہوئے تو ان کو منع کر دیا گیا تھا کہ یہ راز ہے اور راز رہیگا۔ اس زمانہ میں پہاڑوں کے دامن جامع مسجد کی جگہ کام دیتے تھے اور چٹانوں کے پیچھے مسلمان جمع ہوتے تھے[2]۔

دارالاسلام | خفیہ انجمن کے بعد خدا کے نمائندہ اور نائب السلطنت[3] نے دارالندوہ کے مقابلہ میں ایک اجتماعی ایوان قائم کیا، اس کا نام مالک مکان کی نسبت سے دارارقم بن ابی ارقم تھا) مگر بعد میں اس کو دارالاسلام (ایوان اسلام یا ایوان حکمبرداری) کا مستقل نام[4] دیدیا گیا۔

ہجرت ایک سیاسی اصول کی حیثیت سے | دارالاسلام کے قیام کے بعد دشمنوں نے مقاومت کا فیصلہ کیا۔ انسانیت اور اصلاح ترقی کے دشمنوں نے بارہ سرداروں کی کمیٹی قائم کی۔ خدا کے سچے نمائندے کو دیوانہ، ساحر، شاعر قرار دیا گیا، اسلامی جماعت کے ارکان کو طرح طرح کے عذاب دیے گیے۔ اور اسلامی نظام کو پارہ پارہ کرنے کے لیے آنحضرت کے قتل کی اسکیم سوچی گئی اس نازک موقع پر آپ کی پیغمبرانہ فراست نے ہجرت کو ایک نوایجاد سیاسی اصول کی حیثیت سے پیش کیا جس کی پیروی میں حبش، طائف اور مدینہ کی ہجرت کی صورت عمل میں آئی۔

آنحضرت کی معنوی طاقت اور قوتِ فیصلہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے

---

[1] البدایہ والنہایۃ ابن کثیر ج ۳ ص ۴ [2] ایضاً ج ۱ ص ۴۲، تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۶

[3] طبقات ابن سعد (بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ) ج ۲ ص ۳۲۱۔ السیاسۃ فی الاسلام۔

[4] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴ و ۲۵ و ۲۶۔

ناکامی کے تمام تصورات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا مشکل مواقع پیش آئے مگر آپ نے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ

(۱) اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تو میں اپنے فیصلہ کو واپس نہ لونگا۔[1]

(۲) یہ ناممکن ہے کہ میں وہ بات نہ کہوں جو ان تمام باتوں سے اچھی ہے جو اب تک زبانوں پر آچکی ہیں۔ اور میں وہ نعرہ نہ بلند کروں جس سے عرب اور عرب کے علاوہ ساری دنیا (عجم) ایک مرکز اور ایک حکومت کے ماتحت آجائینگے۔[2]

آپ نے ترک وطن کے اصول کو قبول کیا لیکن اصل مقصد سے ایک انچ ہٹنا گوارا نہیں کیا۔ یہ ہجرت ہی تھی جس سے سیاسی توسیع کے نئے ذرائع ہاتھ آئے اور اسلامی تحریک محدود وطنی ماحول سے نکل کر ساری دنیا میں پہنچنے کے قابل ہوگئی۔ ہجرت حبشہ کے زمانہ میں شاہِ نجاشی کے دربار میں اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظام کا مقابلہ ہوا جس سے ایک حکمراں کی حمایت مسلمانوں کو حاصل ہوگئی۔ ایک نیک با اقبال اور بلند مرتبہ انسان اسلامی نظام کا مطیع و مداح بن گیا۔

پیغمبر اعظمؐ مدبر حکومت کی حیثیت سے

اگر ہم اس امر کی تحقیق کریں کہ پیغمبر اعظمؐ اسلام کی حکومت کے صدر کی حیثیت سے کس قدر عظیم ذمہ داری کے حامل تھے تو ہمیں ہر موقع پر یہ اعتراف کرنے کی سعادت حاصل ہوگی کہ آپ نے ایک بہت بڑے محسن کی حیثیت سے وہ دلیرانہ قانونی اور سیاسی کارنامے انجام دیے جو کارناموں کی دنیا میں اپنی مثال آپ تھے۔[3]

---

[1] روض الانف سہیلی، سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۰۔ [2] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴۔ (آنحضرت کے قول کا مفہوم یہی ہے) [3] مندرجۂ بالا عنوان کے ماتحت جو حقائق پیش کیے گئے ہیں ان کے متعلق تفصیلی نظائر آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے۔ تاریخ طبری، تاریخ ابن کثیر اور روض الانف میں بھی یہ نظائر جستہ جستہ مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔

آپ خداوند عرش کے قانونی نائب کی حیثیت سے حکومت کے امیر و آمر بھی تھے اور افواج کے کمانڈر اعلیٰ بھی۔ انصاف کی اعلیٰ عدالت کے حاکم بھی تھے اور اقتصادیات کے نگران اعظم بھی۔ ذاتِ واحد تمام ذمہ داریوں کی امانت بردار تھی۔ اجتماعی زندگی کے تمام فرائض، جملہ شعبے اور تمام محکمے ایک محکم و منتظم مرکز پیدا کرکے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے اور آپ کی گراں قدر ہستی انسانی معاشرہ کی ان تمام امیدوں کو پورا کر رہی تھی جن میں سے ہر ایک دنیا کے لیے ایک مثال بننے والی تھیں۔

خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے آپ کے کارنامے حیرت انگیز ہیں۔ آپ کی وجہ سے سیاسی دائرۂ کار میں نئے نئے اصول، قوانین، احکام، ہدایات اور اساسی تنظیمات نے اپنا خوبصورت چہرہ دکھایا اور ان کی بنا پر قدیم فطری تصورات ایک نئے اور متوازن نظام سے آشنا ہوئے۔

پیغمبر اعظم کے اجتماعی کارنامے

آنحضرت نے اول درجہ کے عامل حکومت کی حیثیت سے انسانی سوسائٹی کی تشکیل جامعہ اسلامیہ کی تنظیم اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جو کارنامے انجام دیے وہ مختصر سے مختصر اور مستند سے مستند الفاظ میں یہ ہیں۔

(۱) حکومت کی ہستی کو تمام بے فائدہ نمائشوں، تباہ کن جعلسازیوں اور سرمایہ دارانہ آرائشوں اور آلائشوں سے پاک و صاف کیا اور قدرت کے قابل عمل قوانین کو حقیقی عدل اور سچے اعتدال کے ساتھ نافذ کرکے دکھایا۔ دنیا کے دائرہ میں حکومت کو عوام کی چیز بنایا اور عوام کے اختیار کو اس کے سیاسی مزاج میں داخل کیا۔[۳]

[۱] عن ابی سلام۔ انا امرکم بخمس الخ۔ مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۱۷

[۲] دیکھو احادیث مندرجہ مجمع الزوائد و تبیع الفوائد العراقی و ابن حجر ج ۵ کتاب الخلافت (مکمل)

[۳] مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۱۱ باب حق الرعیۃ والنصح لہا۔

(۲) شہنشاہیت کے نظریہ کو عقیدہ اور عمل کی دنیا سے خارج کرکے حکومت کو "ریاست عامہ" قرار دیا۔ اور اس کی فطرت میں اس درجہ سادگی کو داخل کیا جس کی وجہ سے تاج وتخت قصور ومحلات، حاجب ودربان، حشم وخدم بڑی بڑی تنخواہوں والے حکام اور رشوت خور عمال سب ختم ہوگئے۔[1]

(۳) انصاف کی حقیقت کو نافذ کیا، جس سے انصاف کا حصول آسان اور خود انصاف سستا ہوگیا۔ انصاف کا مقصد ٹھہرا؛ کمزور کی حمایت[2] اور فریقین مقدمہ کی باہمی صلح اور اصلاح! نہ کہ دونوں کے مفاد کی تباہی اور گھروں کی ویرانی۔

(۴) آپ نے انسانی حقوق کی مساوات کا اعلان کیا، شہریوں کی حیثیتیں متعین کیں اور مناسب محصول عائد کیے اور ہر محصول کا مستقل نام تجویز کیا۔ آپ نے اس کام کے لیے مالیات کے افسر مقرر فرمائے اور دفتر مالیات قائم فرمایا۔

(۵) اجتماعی کوششوں سے حاصل ہونے والے سرمایہ دولت کو عوام کی دولت قرار دیا اور سرکاری روپیے کے لیے یہ قانون مقرر کیا کہ امیروں پر ٹیکس لگایا جائے اور غریبوں پر خرچ کردیا جائے

(۶) آپ نے انتظامی حلقے قائم کیے، مدینہ کو دارالسلطنت بنایا، اطراف کے لیے حکام کا تقرر کیا، اور تقرر کا معیار یہ قرار دیا کہ کیرکیٹر اول درجہ کا ہو، کام کی اہلیت ہو، علم سے بہرہ مند ہو، اور حاکم رائے عامہ کے مطابق مفاد عامہ کے لیے کام کرے۔

(۷) آپ نے شوریٰ کو سلطنت کے کاموں کی روح قرار دیا، حکومت کے مزاج میں

---

[1] فالامیر راع علی الناس ومسئول عن رعیتہ الخ جمع الزوائد ومنبع الفوائد عن انس ج ۵ ص ۲۰۷

[2] حوالۂ بالا ص ۲۰۹ عن معاویہ۔

مرکزیت، قوت اور استحکام پیدا کرنے کے بعد حکم دیا کہ حکومت کے کام شوریٰ سے طے کیے جائیں۔

(۸) آپ نے فوجوں کی تنظیم کی اور نو جنگوں اور اٹھارہ دفاعی اور اکتشافی حربی مہموں میں حصہ لیا[1] انتالیس عسکری مہموں کو اپنے حکم سے محاذ پر بھیجا اور افواج کے کمانڈر مقرر کیے۔ جنگ میں انسانیت کے طریقوں کو جاری کیا۔ فتح میں انسانی خون کی قدر و قیمت کی حفاظت کی اور صلح کے وقت معاہدوں کے لیے نیا معیار[1] قائم کیا۔

آپ نے انسانی سوسائٹی کے لیے فطری مذہب کے اصولوں کو لازمی گردانا، اخوت کے قانون کو حکمت علی کے رنگ میں پیش کر کے دکھایا، بیعت کو مرکزی ہیئت کے قیام کے لیے ایک اصول بنایا۔ انسانی معاشرہ کے گمراہ ارکان کے لیے نمائندے اور نقیب مقرر کیے ان کے پاس اپنے وفد بھیجے اور ان کے وفود کو اصلاح حال کے لیے طلب کیا۔ اور نافرمان لوگوں کی سرکشی کو بہ طریق محمود دبایا۔

(۹) بین الاقوامی معاملات کی درستی کے لیے سلاطین، امراء اور والیانِ ریاست کو فرمان لکھے اور سب کو ایک خدا کے نام پر جمع ہونے کی دعوت دی۔

مختصر یہ ہے کہ پیغمبری، سیاست اور حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس کے لیے آپ نے کوئی اصول اور قانون نہ پیش کیا ہو۔

سردار دو عالم سنہ فیل (۵۷۱ء) میں عالم قدس سے دنیائے وجود میں تشریف لائے، پندرہ سال کی عمر تھی کہ حرب فجار کا محاذ دیکھا پینتیس سال کی عمر میں "امین" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ چالیس سال کی عمر میں پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور تیئیس

---

[1] دیکھو کتاب المغازی والسیر ج ۶ ص ۱۴۔۲۰۸۔ تاریخ طبری ج ۲ (ہجرت کے دو سال) ج ۳ ص ۲ تا ۱۷۱)

سال کی عمر تھی کہ حکومتِ الٰہی کے واجبات اور احکام خداوندی پر مامور ہوئے۔ آنحضرت نے نبوت کے بعد مکہ معظمہ میں بارہ سال اور چند دن زائد پانچ ماہ قیام فرمایا۔ یہ زمانہ اساسی عقائد بنیادی قوانین کے ظہور اور اسلامی معاشرہ کی ابتدائی تنظیم کا زمانہ تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں دس سال قیام ہوا۔ یہاں "دینی جماعت" نے ملی نظم سے ربط پیدا کیا، اجتماعی ہیئت قائم ہوئی۔ میدانِ جنگ گرم ہوا مگر کسی جنگ میں مسلمانوں نے جارحانہ حملہ نہیں کیا۔ معاہدے طے پائے، معاہدہ شکنوں کے خلاف انضباطی کارروائی عمل میں لائی گئی۔ اسلام کے اصولوں کی حکومت قائم ہوئی اور ایک خدا کے نام پر ساری دنیا کو جمع کرنے کے لیے عالمگیر فتح کا رُخ متعین ہوا۔

آنحضرت نے ۱۱ھ[1] میں وفات پائی مگر اس وقت اسلام کے بلند کردار سپاہیوں کے ہراول دستہ کے اُنیس سالہ کمانڈر نوجوان اُسامہ کا مُنہ شام کی طرف تھا، اور صاف طور پر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ آنحضرت کے بعد آپ کی نیابتی حکومت خلافت راشدہ اور ریاست عامہ کی حیثیت سے عالمگیر نظم اور صلاح و فلاح کے متعلق اپنے رجحان کو ظاہر کریگی۔

آنحضرت کے وصال کے بعد دین و دنیا کے تقاضوں نے جس تیزی سے اپنی شیرازہ بندی پر توجہ کی اور آناً فاناً جس طرح سیاست و سلطنت کی تنظیم عمل میں آئی وہ اس بات کا محکم ثبوت ہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد عصر نبوت میں پڑ چکی تھی۔ اگر مسلمانوں نے آپ کے بعد اس کو خلافت راشدہ، ریاست عامہ، امارت مومنین کے نام سے یاد کیا تو یہ اس طرز حکومت کی واقعی حیثیت کا اظہار مقصود تھا۔

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۱۳۔

اسلامی حکومت

خلافت راشدہ دریاست عامہ
دور اوّل

اسلامی حکومت کا زمانہ اپنے صحیح اور سچے آثار کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ تاریخی واقعیت کے اعتبار سے صدیقی اور فاروقی عہد دور اوّل[1] ہے اور عثمانی اور علوی عہد دور ثانی۔ تاریخ کی نظر میں دونوں دور بابرکت ہیں اور ہر دور کی ہر ایک شخصیت اپنے اوصاف کمال میں بلند مرتبہ اور باکمال ہے لیکن پہلا دور اجتماعی زندگی کے محاسن اور امت کے اتحاد و اتفاق کے لحاظ سے زیادہ مکمل زیادہ معیاری اور مثالی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دور اول کے دونوں اصحاب کی قانونی اہمیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ وزیرائ من اھل الارض فابوبکر وعمر[2] (ابوبکر اور عمر زمین کے لوگوں میں میرے وزیر ہیں) اس فرمان سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اصحاب جو پیغمبر اعظمؐ کے ساتھ رہ کر خدا کی حکومت کا کام وزیر کی حیثیت سے کر چکے ہیں کس مرتبہ کے مالک ہیں۔

ہمارے زمانہ کے ایک اطالوی لارڈ، کاؤنٹ ہنری دی کاسٹری نے اپنی کتاب "اسلام" میں بجا طور پر پادری برو گلے کا یہ بیان نقل کیا ہے

"ابوبکرؓ اور عمرؓ نے اپنے ہاتھ میں سلطنت کی زمام لے کر اس کو چار چاند لگا دیے اور سیاسی حکمت عملی کا ایک ایسا نقش پیش کر کے دکھایا جس نے ساری دنیا سے خسراج

[1] ابن الطقطقی نے خلفاء اربعہؓ کی حکومت کو دور اوّل قرار دیا ہے۔ دیکھو الفخری۔ فی الآداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ مع فصل ۲ ص ۵۰ [2] اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۱۳۔ (باب العین والباء)

تحسین حاصل کیا۔ یہ کہنا بغیر کسی مبالغہ کے صحیح ہوگا کہ یہ دونوں مشرقی یونان کی بیزنطینی سلطنت کے جن حکمرانوں اور اعلیٰ کمانڈروں سے برسرِ جنگ تھے اُن کے مقابلہ میں دونوں زیادہ مستقل مزاج، زیادہ انصاف پسند۔ زیادہ بردبار اور قانع، زیادہ شریف طبع، باعظمت، جری، اولو العزم اور زیادہ بلند مرتبہ تھے۔[1]"

خلافتِ راشدہ کا دورِ اول انہی دونوں ہستیوں کا دور ہے یہاں پہلے صدیق اکبرؓ کی حکومت اور نظام حکومت کا حال درج کیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت صدیق اکبرؓ کے عہد[2] میں ۱۱ھ ۶۳۲ء سے ۱۳ھ ۶۳۴ء

صدیق اکبرؓ کا نام عبداللہ تھا اور لقب عتیق۔ صورت سے وجاہت مند تھے اور سیرت کے اعتبار سے سربلند۔ آپ نے دو سال تین ماہ، دس دن پیغمبر اعظم کے جانشین کی حیثیت سے ریاست عامہ کی ذمہ داریوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس قلیل مدت میں وہ کارنامے انجام دیے جو فوجی اور سیاسی لحاظ سے حیرت انگیز قرار دیے گئے ہیں۔

ہمارے علماء اجتماعیات اس باب میں بالکل متفق ہیں کہ صدیق اکبر حکومت سے پہلے اور حکومت کے بعد تمام عمر اعلیٰ خصوصیات کے مالک رہے۔ آپ آزاد لوگوں میں۔ اسلام کا کلمہ پڑھنے والے پہلے شخص ہیں، اور اس بات پر خود بھی فخر کرتے ہیں کہ میں اسلام لانے والا پہلا شخص ہوں۔[3]

صدیق اکبر کا سیاسی مرتبہ

صدیق اکبر پہلے شخص ہیں۔ جنہیں اسلام کی حکومت کے قائد اول ہونے کا شرف حاصل ہوا حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "حضور اکرم نے ہم کو کوئی ایسی کھلی دستاویز

---

[1] الاسلام۔ ہنری دی کاسٹری۔ ترجمہ بزبان عربی احمد فتحی زغلول پاشا (مصری) ص ۳۲

[2] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶۱۔ تقویم ہجری وعیسوی (ترقی اُردو) ص ۱۔ دائرۃ المعارف بستانی ج، ص ۴۳۰، اسلامی اٹلس محمد اسحاق دیکھو نقشہ ص ۸

[3] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۲۰۹ (عین۔ باد)

نہیں دی جس کے مطابق حکو[illegible]ں شخص کو سپرد کی جاتی، لیکن ہم پہلے سے جانتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے چنانچہ آپ کے بعد ابوبکرؓ منصب خلافت پر متمکن ہوئے[1]۔

اسلامی حکومت ایک ریاست عامہ ہے۔ یہ عوام کی تنظیم ہے اور عوام کا حق ہے اگر پیغمبرِ خدا قطعی، قانونی اور تحریری فرمان کی رو سے اپنا جانشین اور ولی عہد نامزد کر دیتے تو امت پر اس کی پابندی واجب ہو جاتی اس سے روگردانی بغاوت ہوتی اور موجبِ عذاب اس لیے آنحضرتؐ نے خلیفۂ اول کے انتخاب کو عوام کے لیے چھوڑ دیا اور عوام ہی نے یہ فیصلہ کیا کہ پیغمبرِ اعظمؐ کے بعد اُن کا جانشینِ حکومت کون ہوگا۔ آج تیرہ سو سال کی طویل تاریخی مدت گذرنے کے بعد اُمتِ اسلامیہ کے عام اتحاد کے صادق جذبات کے ماتحت اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عہدِ نبوی کے راستباز بلند کردار، خدا پرست اور خدا ترس ہزاروں مسلمان صدیق اکبر کے نام پر کیوں جمع ہوئے۔ انہوں نے اوّل اوّل کس طرح تیز تیز اور صاف صاف بحثیں کیں، پھر کس طرح شخص واحد کے نام پر جمع ہو گئے

رائے عامہ کی اکثریت اس زمانہ میں بھی اپنے اندر سب سے بڑا قانونی جواز رکھتی ہے حالانکہ اس زمانہ کی اخلاقی حالت اور سیاسی حقیقت سے ہر شخص باخبر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ زمانہ کیسا زمانہ ہے اور انسانی معاشرہ کے افراد کس درجہ کے ہیں۔ بہترین زمانہ کے بہترین افراد سب جمع ہو جاتے ہیں اور سب مل کر ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ گمراہی پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ یہ سچی رائے عامہ کا طاقتور رجحان تھا جس کو کسی زمانہ میں کوئی قانونی دماغ رد نہیں کر سکتا کیونکہ اس کو رد کرنا ساری اسلامی تاریخ کو پامال کرنا ہوگا۔ اس سے اسلام

[1] عن علی انہ قال یوم الجمل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یعہد الینا عہداً ناخذ بہ فی امارۃ الخ مجمع الزوائد و منبع الفوائد۔ الہیثمی (ششم) کتاب الخلافۃ ص ۱۷۵۔

کی حقیقت مجروح ہو جائیگی اور دنیا کی عظیم الشان شخصیتوں پر اتنے بڑے بڑے الزام عائد ہونگے جن کو کوئی ایک مسلمان بھی پسند نہ کریگا۔ اور جن شخصیتوں کو بچایا جائیگا وہ بھی نہ بچ سکینگی۔

صدیق اکبر کے متعلق رائے عامہ ہمیشہ سے بہت صاف تھی۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے۔ خیر ھذہ الامۃ بعد نبیھا ابو بکر الخ[1] (اسلام کے اجتماعی نظام میں نبی کے بعد بہترین فرد ابو بکر ہیں)۔ ابن عمر بھی اس زمانہ کے عام رجحان کو دو جملوں میں بیان کرتے ہیں:۔ کنا نتحدث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر ھذہ الامۃ ثم ابو بکر ثم عمر[2] (ہم آپس میں اس رائے کا اظہار کیا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ اس امت میں اعلیٰ ترین فرد ہیں آپ کے بعد ابو بکر درجہ اوّل پر ہیں۔ اور آپ کے بعد عمر دوسرے موقع پر کہتے ہیں۔ کنا نقول فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یکون اولی الناس بھذا الامر فنقول ابو بکر الخ[3] (ہم رسول اللہ کے عہد مبارک میں یہ بحث کیا کرتے تھے کہ آپ کے بعد کون حکومت کی ذمہ داری کے لیے قابل ترجیح ہوگا ہم سب کی زبان پر یہ ہوتا تھا کہ ابو بکر) صدیق اکبر کی اس مقبولیت عامہ کے علاوہ دوسرے مستقل اسباب بھی تھے جن کی بنا پر آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جب ہم خاص طور پر اسلامی عہد کی ابتدا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس وقت تاریخ اسلام کی متعدد جمیل الشان اور جلیل القدر ہستیاں اپنے پاکیزہ اوصاف کے ساتھ موجود نظر آتی ہیں حضرت علی حیدر فاتح خیبر موجود ہیں۔ حضرت امین امت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت عمر فاروق اعظم موجود ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تشریف رکھتے ہیں جنہیں آنحضرت کی بارگاہ سے زمین و آسمان کے امین کا خطاب ملا ہوا ہے۔ جو صف اول اور عصر اول کے

[1] عن ابی حجیفہ السوائی۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۵

[2] عن عمر بن اسید عن ابن عمر اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۴

[3] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج ۵ ص ۱۷۷، کتاب الخلافۃ (باب الخلفاء الاربعہ)

آٹھ مسلمانوں میں سے ہیں۔ اور حضور اکرم کی طرف سے دومۃ الجندل کی سفارت پر جا چکے ہیں[۱]۔
حضرت عثمان ذی النورین کی بابرکت ہستی مسلمانوں میں نظر آتی ہے، آپ حضور کی پیشی میں
نظامِ حکومت کا درس حاصل کر چکے ہیں، حضرت خالد بن ولید ایسے فاتح بھی ہیں جو آنحضرت
کے سفیر فوق العادہ کی حیثیت سے نجران کی علمی، قانونی اور عسکری مہم پر جا چکے ہیں[۲]۔ سعد بن
عبادہ موجود ہیں جو انصار کے سردار ہیں، ان کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اسلامی حکومت
کے مطلع پر ستاروں کی طرح نظر آرہے ہیں۔ مگر جب اُمت اپنی رائے، اپنے رجحان اور اپنے
فیصلے سے اسلامی حکومت کے قائد عام اور ریاست عامہ کے رئیس اول کا انتخاب کرتی
ہے تو بالآخر صدیق اکبر پر سب کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انتخاب ذاتی خوبیوں
اور اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے ہوا ہے تو صرف اتنی بات انتخاب کی کافی وجہ نہیں ہو سکتی۔
یہ اوصاف کس میں نہیں تھے، صدیق اکبر سے لے کر حضرت علیؓ فاتح خیبر تک ہر شخص بے
شمار خوبیوں اور بے نظیر اوصاف کا مالک ہے۔ ہر شخص فیض یافتۂ نبوت ہے۔ اُمت کے
عام افراد کے سامنے ہر شخص کی اتنی خوبیاں ہیں کہ اُن کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا
ہے۔ اس کے باوجود اُمت صدیق اکبر کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے بزرگوں کی موجودگی
میں کرتی ہے۔ خود صدیق اکبر مدینہ کے عام شہری کی حیثیت سے اجلاس عام میں تجویز پیش
کرتے ہیں۔ "یہ عمر ہیں اور یہ اس امت کے امین ابو عبیدہ ہیں۔ اُمت ان میں سے کسی کو
چُن لے"۔ اس کھُلی پیشکش کے باوجود جب نام سامنے آتا ہے تو صدیق اکبر کا۔ آخر اس کی وجہ!
اُمت نے جو فیصلہ کیا، کیوں کیا؟ اور وہ کون سے بنیادی اصول ہیں جن کو اس انتخاب میں
ملحوظ رکھا گیا اور جنہوں نے بھرے اجلاس میں تمام تجویزوں کو ایک تجویز کی صورت میں جمع

---

[۱] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۳۱۳ [۲] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۱۲

کر دیا۔

تاریخ اسلام کی ایک سیاسی حقیقت

صدیق اکبر کے انتخاب کو اگر ایک سیاسی حقیقت تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد خود بخود وہ بنیادی اصول سامنے آجائینگے جن کی بنا پر یہ انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔

یاد رکھیے کہ آنحضرت وفات فرما چکے ہیں، جسد اطہر بجنسہ موجود ہے، اور اُمت تجہیز و تکفین کی اہم تقریب سے پہلے حضور اکرم کے قائم کردہ نظام اور اسلام کی سلطنت کے پہلے امیر کا انتخاب کر رہی ہے۔ وقت کے تمام تقاضوں پر ایک تقاضہ غالب ہے آنحضرت کے بعد نبوت کے مقرر کردہ معیار و منہاج پر قائم رہنے والی حکومت کے لیے کس انسان کو رائیں دی جائیں؟ یہ وقت محض اخلاق وعادات، اطوار و خصائل، فضائل اور کمالات کا جائزہ لینے کا نہیں ہے۔ سب رسول معظم کے اصحاب ہیں اور اوّل درجہ کے اصحاب ہیں، بلکہ اُمت کو ضرورت ہے صدر حکومت کی اس لیے افراد اُمت نے تمام اصحاب کا جائزہ لیا اور آخر میں اُس شخص کا انتخاب کیا جو صرف اعلیٰ اوصاف سے آراستہ ہی نہیں تھا بلکہ اُن تمام اجتماعی قابلیتوں کا مظہر تھا، جو حکومت و سلطنت کے کام کے لیے لابدی اور ضروری ہیں۔ اجتماعی زندگی کو بنانے، ترقی دینے اور مضبوط کرنے کے لیے جس قسم کے دل و دماغ اور جس تدبر اور جس شان کے تاریخی تجربوں اور روایات کی ضرورت تھی اُمت نے فیصلہ کیا کہ اس کی رُو سے صدیق اکبر ہی ایک ایسی ہستی ہیں جن کو سب سے پہلے اور سب سے نازک اور غیر معمولی موقع پر خلافت کبریٰ کا منصب عطا کیا جائے۔

اُمت کا فیصلہ اصطلاحی طور پر سواد اعظم (طاقتور اکثریت) کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ اس میں مکمل طور پر اجماع اُمت (تمام سوسائٹی کے اتفاق) کے آثار موجود تھے۔ یہاں صدیق اکبر

کی زندگی کے بیشمار واقعات میں سے وہ چند واقعات درج کیے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اُمت کے لیے ان سے بہتر مدبر موجود نہیں تھا۔

(۱) ایک نازک موقع پر اسلام کی تنظیمات کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس وقت تنہا صدیق اکبر ہی تھے جنھوں نے تمام سرمایہ پیغمبر اعظم کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ اور خود اُمت کے محنت کش فقرار کی صف میں کھڑے ہوگئے۔ اہل و عیال کی ضرورتوں کا سوال پیدا ہوا تو فرمایا۔ "علیٰ اللہ و علیٰ رسولہ" (ان کو اللہ اور اللہ کا رسول کافی ہے۔ فاروق اعظم اپنی کل دولت کا آدھا لائے اور حضرت صدیق سے یہ کہہ کر خاموش ہوگئے "آپ ہر موقع پر سبقت لیجاتے ہیں"[1]

(۲) جب آنحضرت کو معراج کا شرف حاصل ہوا تو ابوجہل نے انکار کا فتنہ کھڑا کردیا بہت سے مسلمان بھی برگشتہ ہوگئے۔ مگر جب حضرت ابوبکر نے یہ واقعہ سُنا تو سب سے پہلے اعلان کیا "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں کہ ایسا واقعہ ہوا ہے تو یہ عین حق ہے اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں"۔ اس سے آنحضرت کو بیحد اطمینان حاصل ہوا اور حضرت ابوبکر "صدیق" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

(۳) ہجرت مدینہ کے خطرناک سفر میں صدیق اکبر نے جانبازی کا پورا مظاہرہ کیا۔ غار کی روپوشی میں ساتھ رہے اور اس صلہ میں "ثانی اثنین" (دو ساتھیوں میں سے دوسرے ساتھی) کا خطاب ملا۔

(۴) پیغمبر اعظم کی وفات مسلمانوں کے لیے تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ عام مسلمانوں کے حواس بھی بجا نہ تھے۔ کوئی شخص آپ کی وفات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

---

[1] تاریخ الکامل ج ۲ ص ۲۰۔

فاروق اعظم بھی بڑے جوش میں تھے اور سر منبر یہ کہہ رہے تھے: "جو حضور کی وفات کا ذکر زبان پر لائیگا گردن اُڑا دونگا" مگر عین اس موقع پر صدیق اکبر نمودار ہوئے اور کہا: "عمر! بس خاموش۔ آنحضرت وفات پا چکے ہیں، اس سے پہلے بھی رسولوں نے وفات پائی ہے، کیا تم لوگ اسلام سے پھر جاؤگے" "فمن کان یعبد محمداً فقدمات ومن کان یعبد اللہ فاِنَّ اللہ حیٌّ لایموت" (اب جو محمد کا پرستار ہے تو وہ سمجھ لے کہ وہ وفات پاچکے ہیں۔ اور جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہے تو وہ یقیناً زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا"

صدیق اکبر کے اس برمحل اقدام نے جامعہ اسلامیہ کو تباہی سے بچالیا۔ اور مسلمان پھر امر حق پر جمع ہوگئے۔

(۵) پیغمبر اعظم کے انتقال کے بعد جامعہ اسلامیہ کئی جماعتوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس وقت کا اختلاف بہت تباہ کن ہوتا اگر صدیق اکبر بروقت شوریٰ عام میں پہنچے اور سب کو ابوعبیدہؓ یا عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اسلامی نظام اس بحران سے نکل گیا اور بالآخر خاندان نبوت کے اکابر، خاندان ہاشمی کے بزرگ، انصار اور مہاجرین سب ایک فیصلہ پر متفق ہوگئے۔

(۶) حضور اکرم کی وفات کا داغ تازہ تھا کہ چارطرف بغاوت اور ارتداد کا فتنہ رونما ہوگیا ایسا معلوم ہوا کہ اسلامی تصورات کا تمام سلسلہ یک بیک خدانخواستہ ختم ہوجائیگا یمامہ میں مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اسلامی سلطنت کو تقسیم کرنے کی اسکیم سوچی یمن میں اسود عنسی نے اور نجد میں طلیحہ نے سر ابھارا، بنی اسد، بنی طے، بنی غطفان کا لشکر جرار اس کے ساتھ ہوگیا۔ آنحضرت نے قبائل تمیم میں جو امراء مقرر کئے تھے ان میں بھی انتشار

ك تاریخ الامم والملوک طبری ج ۳ ص ۱۹۹۔

پیدا ہو گیا بحرین تک ارتداد کا اثر پہنچا۔ بنی بکر کا سردار حطم بھی باغی ہو گیا۔ اُس نے قطیف اور ہجر کے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔

باغیوں کے ایک وفد نے صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم نماز، روزہ کے لیے تیار ہیں مگر زکوٰۃ کا تحصول معاف کر دیجیے۔ اس موقع پر حضرت عمر کی قوتِ فیصلہ بھی رعایت کرنے کے حق میں تھی مگر تمام عرب ایک طرف تھا اور صدیق اکبر ایک طرف آپ نے فیصلہ کیا خدا اور رسول کی حکومت کے قانون کا ایک نقطہ نہیں بدل سکتا جو واجبی حق ہے وہ لیا جائے گا، چنانچہ آپ کا فیصلہ نافذ ہوا اور آپ کی قابلیتوں نے تمام طوفان پر قابو پایا۔

(۷) آنحضرت نے شام کے لیے حضرت اُسامہ کی کمان میں فوج بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضور کے بعد صحابہ کی رائے یہ تھی کہ اس مہم کو ملتوی کر دیا جائے۔ صدیق اکبر نے فرمایا۔ جس لشکر کو آنحضرت نے ایک خاص محاذ کے لیے منظم کیا تھا میں اُس کو محاذ پر ضرور بھیجونگا۔ حضرت اسامہ شام کی مہم پر گئے، اس سے باغی افواج پر یہ اثر ہوا کہ مدینہ میں ابھی کافی فوج ہے، ورنہ بیرونی مہم پر اتنا بڑا لشکر نہ جاتا۔ صدیق اکبر نے حضرت اسامہ کی واپسی کے بعد اس لشکر کی امداد سے بغاوت کو فرو کرنے میں مدد لی اور اس موقع پر خود فوج کی کمان کی۔

ایک سال نہ گذرا تھا کہ تمام نظم درست ہو گیا اور ایران و روم کے محاذ پر دفاعی کوششوں کا اس طرح ظہور ہوا جس سے اسلامی سلطنت کا دائرہ خلیج فارس سے بحرِ روم تک وسیع ہو گیا۔

صدیق اکبر کے ذاتی اوصاف کو میزانِ عدل میں ایک طرف رکھیے اور مندرجہ بالا

قوی الاثر سیاسی واقعات اور زبردست فیصلوں کو ایک طرف۔ اس طرح اندازہ کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ عہد نبوی کے اصحاب نے اسلامی حکومت کا پہلا قائدِ عام منتخب کرنے میں کس درجہ سیاسی بصیرت اور ایمانی قوت کا اظہار کیا۔ حکومت کے کاموں کے لیے ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو شدید سے شدید طوفان کے وقت دل و دماغ سے کام لے چکا ہو، جو فیصلہ کرنے میں فرد ہو۔ اور اجتماعی کام کرنے میں ہر موقع پر صف اوّل کا پہلا شخص ثابت ہوا ہو۔

نظامِ حکومت

اُمت کے افراد نے صدیق اکبر پر جو اعتماد کیا تھا وہ درست ثابت ہوا اور مرحلۂ اول پر یہ معلوم ہو گیا کہ اسلامی حکومت کے لیے ان کا انتخاب حق بجانب تھا۔ ان کے سامنے چار اہم کام تھے، جن میں سے ہر ایک درجۂ تکمیل تک پہنچا۔

(۱) داخلی امن (۲) ایرانی محاذ (۳) شام کا رومی محاذ (۴) اسلامی نظام حکومت کی تشکیل۔

(۱) آنحضرتؐ کے وصال کے بعد مملکت کا داخلی امن برباد ہو گیا اور چار طرف زکوٰۃ کے خلاف بغاوت رونما ہوگئی۔ صدیق اکبر نے تمام علاقوں کو گیارہ منطقوں میں تقسیم کر کے گیارہ فوجی دستے علیحدہ علیحدہ کمانڈروں کے ماتحت مقرر کیے۔ پہلے باغیوں کو امن کا پیغام دیا اور ناکامی کے بعد جنگ کا حکم دیا جس کے نتیجے میں سالہا سال کے لیے داخلی امن قائم ہو گیا[1]۔

(۲) ایران کی ساسانی سلطنت کا پایۂ تخت مدائن تھا۔ یہاں پیشدادی، اشکانی، اور ساسانی قومیت کی روح حکمراں تھی۔ اسکندر مقدونی کے بعد اردشیر بابکان نے میلاد

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۶ ص ۳۱۳ ۔ تاریخ الکامل ج ۲ ص ۱۲۸ ۔ ۱۴۷

مسیح سے دوسو سال بعد ایران کے ملوک طوائف کے پراگندہ شیرازہ کو جمع کرکے اس سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی ساسانی سلطنت نے حیرہ و انبار (عراق) کے عربی علاقوں پر بھی قبضہ کر رکھا تھا، یمن پر بھی اس کا اثر تھا۔ یہ قبضہ عہد صدیقی میں ایک تہدید کی شکل اختیار کر گیا۔

صدیق اکبرؓ نے پہلے اس محاذ کی نگرانی کی اس کے بعد ایران گے گورنر جنرل ہرمز کو اطلاع دی کہ تمہارے مقابلہ میں ایک ایسا لشکر آرہا ہے جس کا ہر سپاہی موت کو اسی طرح دوست رکھتا ہے جس طرح تم زندگی کو دوست رکھتے ہو۔ حضرت خالدؓ کی کمان میں یہ مہم شروع ہوئی بانقیا سے فراض تک ایرانی قوت ٹوٹ گئی اور فارس کی تباہ کن شہنشاہیت کا خطرہ پامال ہو گیا۔

(۳) روم کی سلطنت دنیا کی بڑی سلطنت تھی اگرچہ اس کے دو حصے ہو چکے تھے مگر مشرق کی بیزنطینی سلطنت جس کا پایہ تخت قسطنطینہ تھا، ناروا طور پر شام فلسطین، مصر اور ساحل بحر روم پر قابض تھی یہ رومی اپنے زمانہ میں جاہلیت کے نقیب[۱] تھے" اور اسلامی نظام کے اصلاحی فیضان کو ختم کرنا چاہتے تھے، اس لیے ۸ھ میں موتہ کے مقام پر اور ۹ھ میں تبوک کے مقام پر دونوں طاقتوں کا مقابلہ ہوا ۱۱ھ میں نوجوان اسامہؓ کی کمان میں حضور اکرمؐ نے اس محاذ کے لیے لشکر تیار کیا۔ ۱۲ھ میں صدیق اکبر نے اس محاذ کو اپنی کمان میں لیا اور یرموک کی جنگی لائن کو فتح کرکے آئندہ کے لیے میدان صاف کر دیا۔

حکومت نظام | صدیق اکبر نے خلیفہ اول کا لقب حاصل کرکے اسلامی حکومت کا کام اپنے مبارک ہاتھوں میں لیا تھا۔ ان کی امامت کی قوت سے ۱۳ھ میں اسلامی حکومت ایران و شام تک پہنچ گئی۔ عراق حیرہ سے انبار تک اور شام اجنادین تک اسلامی مملکت

[۱] جگ بیتی - جواہر لال نہرو - ج ۱ - ۴۷ ص ۲۰۹ -

کا جزو ہو گیا۔ آپ نے مالیات، انصاف اور دفتر تحریرات پر مستند لوگوں کو مقرر فرمایا۔ ملک کو صوبوں کی شکل میں منظم کیا۔ فوجی دستے ترتیب دیے اور جنگی علاقوں میں جنگی افسروں کو انتظامی حکومت سپرد کی۔ آپ کا قول تھا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میں مذہب و حکومت کے معاملہ میں جانشین رسول ہوں اس لیے آپ کو خلیفۂ رسول اللہ کا لقب حاصل تھا۔ آپ نے کامیابی سے حکومت کی اور ۱۳ھ میں ترسیٹھ[۱] سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

اسلامی حکومت فاروق اعظم کے عہد میں
۱۳ھ ۶۳۴ء — ۲۳ھ ۶۴۴ء

صدیق اکبر کے بعد ۲۳ھ میں فاروق اعظم اسلام کی ریاست عامہ کے رئیس عام بنائے گئے۔ اسلام نے اس زمانہ میں جو اثر و اقتدار حاصل کیا اس کی مثال بعد کے کسی دور میں نہیں ملتی۔

مسلمان ابتدا ہی سے عمر بن الخطاب کی شہ زوری اور قوت سے واقف تھے۔ آنحضرت کی دعا یہ تھی کہ عمر[۲] اسلام کے حلقۂ اثر میں داخل ہو جائیں اور اسلام کا اقتدار اس سے ترقی اور قوت پائے۔

جب یہ دعا درجۂ قبول تک پہنچ گئی تو دشمنوں نے محسوس کیا کہ اب ان کی قوت اور مسلمانوں کی طاقت برابر ہو گئی۔ حضرت عمر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے صحابہ نے خود بخود قبول اسلام کا شرف حاصل کیا اور آپ کا اسلام لانا پیغمبر اسلام کی آرزوؤں میں سے بجائے خود ایک آرزو تھا۔

ذاتی اوصاف کو دیکھا جائے تو کسی وصف کی کمی نہ تھی۔ مزاج میں زمانۂ

---

[۱] ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۶۰-۱۶۱۔ مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۹۸، مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۹، تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۰۔ [۲] مجمع الزوائد و منبع الفوائد (الہیثمی) ج ۹ ص ۶۲ (باب اسلام عمر)

جاہلیت سے سختی تھی۔ اسلام کے بعد یہ سختی صرف اس لیے رہ گئی کہ نیک کاموں کو قوت پہنچائے
فاروق اعظم سے پہلے اسلامی جماعت کے افراد پچاس کے قریب تھے، خوف زدہ مغلوب
اور عدم تشدد پر مجبوراً عمل پیرا۔ مگر آپ کے مسلمان ہونے کے بعد اسلام کے قلعہ کا دروازہ
کھل گیا اور باہر سے فوجیں داخل ہونے لگیں، اسلام کا اقتدار بڑھ گیا اور مسلمانوں کا سر
بلند ہو گیا[1]۔

منصب خلافت | فاروق اعظم ۲۲۔ جمادی الثانی ۱۳ھ (۲۳۔ اگست ۶۳۴ء) کو منصب خلافت
پر فائز ہوئے۔ صدیق اکبر نے اپنی زندگی میں یہ دستاویز تحریر فرما دی تھی کہ عمر اسلامی حکومت
کے کام میں ان کے جانشیں ہونگے۔ حضرت صدیق نے سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن
بن عوف، حضرت عثمان اور ان اصحاب سے مشورہ کیا جو حکومت کے معاملہ میں اُمت
کے نزدیک رائے دینے کے مجاز تھے۔ مشورہ طے پانے کے بعد اپنے بالاخانہ سے عوام
کو رائے سے مطلع کیا اور منظوری لی۔

اُمت نے خلیفۂ اوّل کی تجویز کو منظور کر لیا۔ کیونکہ اُس وقت مسلمانوں کے سامنے
فاروقِ اعظم کی زندگی کے حسب ذیل واقعات موجود تھے۔

(۱) فاروق اعظم کو حکومت کے کاموں کا وسیع تجربہ حاصل تھا وہ عہد نبوی میں
حضور اکرم کے دوسرے وزیر تھے۔ عہد صدیقی میں محکمۂ انصاف کے امیر اور مشیر اوّل
تھے۔ سالہا سال کے تجربات نے ان کے مزاج میں حکومت کی بہترین استعداد اور
اعتدال پیدا کر دیا تھا۔

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ۱۔ مقصد اوّل (خلفاء اربعہ ص ۵۵) فضائل خلفاء ص ۵۸۔۱۔۲۵۴۔۲۔ مقصد دوم مآثر فاروقی
ص ۴۲۔ ۸۵۔

(۳) آنحضرت کا حکم تھا کہ "میرے بعد ابو بکر کی پیروی کی جائے اور ابو بکر کے بعد عمر کی[1]۔ صحابہ کی بھی رائے عامہ یہی تھی کہ "حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی ہستی امت کے لیے بہترین ہے۔ روزانہ کی گفتگو میں بھی اسی حیثیت سے حضرت عمر کا ذکر آتا تھا[2]۔" یہاں اس امر کو بھول نہ جانا چاہیے کہ حضرت عمر جہاد کے ہر محاذ پر آنحضرت کے ساتھ رہے اور آپ کی فراست نے کئی بار اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ آپ کے فیصلوں کی تصدیق کے لیے قرآن کی آیات نازل ہوئیں۔ امن اور جنگ کے زمانہ کا یہی وسیع تجربہ تھا جس کی بنا پر فاروقی عہد میں اسلامی حکومت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا بیان ہے کہ حضرت عمر کا اسلام ایک فتح، ہجرت ایک امداد اور حکومت ایک رحمت تھی جب تک حضرت عمر اسلام نہیں لائے تھے ہم کھلے میدان میں نماز تک نہیں پڑھ سکتے تھے[3]۔

نظامِ حکومت فاروق اعظم کو امت نے امیر المومنین کا خطاب دیا اور آپ نے اس کو قبول کرکے پسندیدگی کا اظہار فرمایا[4]۔ ہر مسلمان آپ کی مجلس شوریٰ کا رکن تھا۔ مرد ہی نہیں عورتیں بھی بحث میں حصہ لیتی تھیں۔ دنیا نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی دوسری مثال پھر پیدا نہ ہو سکی۔ اس مرتبۂ بلند کے باوجود آپ نے اسلامی حکومت میں عمومیت (Democracy) کی روح ڈالی۔ ہر عام آدمی کو حکومت کے کام میں شریک کیا۔ آپ نے دس سال چھ ماہ اسلامی حکومت کے فرائض انجام دیے اور اسلامی قلمرو کو ایران، آذر بائجان، دمشق، انطاکیہ اور اسکندریہ تک پہنچا دیا۔ عدن سے انطاکیہ تک اور

---

[1] اسد الغابہ جلد ۳ ص ۲۲۰ (عن عبد اللہ بن مسعود) [2] ایضاً ص ۲۱۴-۲۱۵۔
[3] مجمع الزوائد و منبع الفوائد ج ۹ ص ۶۲ [4] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۱۳۷۔

بحرین سے کاکیشیا تک اسلام کی حکومت قایم ہوگئی ۔ آپ کے زمانہ میں دفترِ حکومت کے باضابطہ مشیر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمان اور حضرت علی تھے ۔ مگر مسجدِ نبوی کے ایوانِ عام میں جو مسائل امیرالمومنین کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے ان پر رائے دینے اور ان کی مخالفت یا موافقت کرنے کا ہر شخص مجاز تھا ۔

آپ نے عوام کی خدمت کو حکومت کے اولین قوانین میں سے ایک قانون قرار دیا۔ محنت طلب کاموں میں خود حصہ لیا اور اپنے گورنروں کو یہ ہدایت کی کہ "عام شہری ناراض نہ ہونے پائیں ۔ شہری مسلمان ہو یا غیر مسلم کوئی گورنر ان کے حقوق کو پامال نہیں کرسکتا"۔

حضرتِ فاروق کے بڑے بڑے کارنامے یہ ہیں ۔

(۱) آپ نے اسلامی سلطنت کے تمام شہریوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور آپس کی محبت کو سلطنت کی قوت کے لیے قانونی اہمیت دی ۔

(۲) سلطنت کو ایران، روم، روس اور مصر کی حدود تک پہنچا کر وسیع کیا ۔

(۳) امیرالمومنین کی حیثیت سے دنیا میں اسلامی نظام قائم کیا اور نئے شہر آباد کیے ۔

(۴) محصولات عائد کیے اور ان کی قسمیں متعین کیں ۔

(۵) حکومت کے دفتر کو باضابطہ بنایا ۔ اور فوجوں کی نئی تنظیم کا طریقہ ایجاد کیا ۔

(۶) سلطنت کے علاقوں کو تقسیم کیا اور نئے صوبے قائم کیے[1]۔

(۷) فاروق اعظمؓ گورنروں کا تقرر فرمانِ خاص سے کرتے اور ہر تقرر کے ساتھ ہدایات

---

[1] اسد الغابہ فی احوال الصحابہ ج ۴ ص ۱۷۰-۸۷، سیرت عمرؓ

کی دستاویز ہوتی، گورنروں کو ہدایت تھی کہ رشوت نہ لیں، خدا کی رعایا پر ظلم نہ کریں، عیش کا لباس اختیار نہ کریں، عام لوگوں پر اپنے دفتر اور گھر کا دروازہ بند نہ کریں۔ اگر خلاف ورزی ہوتی تو بے تکلف بڑے سے بڑے افسر کو ایک عام آدمی کی طرح سزا دی جاتی۔ آپ کا فرمان تھا جو گورنر یا فوجی افسر کسی شہری کو بے وجہ سزا دیگا میں اُس کو سزا دونگا۔ چنانچہ آپ نے کوفہ کے گورنر کو عام شکایت پر معزول کیا۔ بصرہ کے گورنر سے ایک شکایت پر جواب طلب کیا۔ قادسیہ اور مدائن کے کمانڈر کے خلاف ایک شکایت کی تحقیقات کی۔ مصر کے گورنر اور اُن کے بیٹے کے خلاف ایک قبطی شہری کی شکایت پر مقدمہ قائم کیا۔ آپ خدا کی حکومت کے معاملہ میں بہت سخت تھے اور اصول کے پابند۔ آپ کا قول تھا کہ "عام لوگ جس قدر مجھ سے ڈرتے ہیں اُس سے زیادہ میں ان سے ڈرتا ہوں"۔

امر واقعہ یہ ہے کہ آپ نے پیغمبر اعظم کے عہد میں وزارت کے فرائض انجام دیے اور حضور اکرم زندگی بھر آپ سے خوش رہے۔ اس کے بعد منہاج نبوت پر حکومت قائم ہوئی تو صدیق اکبر کے وزیر ہوئے۔ تمام عمر وہ بھی خوش رہے۔ آخر میں خود امیرالمومنین منتخب ہوئے۔ جب انتقال ہوا تو انسانی سوسائٹی کا ہر رکن اور ہر شہری آپ سے خوش تھا۔ آپ کے متعلق بالکل درست کہا گیا ہے: "ان عمر کان حصنا حصینا علی الاسلام یدخل الناس فیہ ولا یخرجون منہ" (لاریب! عمر اسلام کا مضبوط قلعہ تھے۔ جب انسانوں کی ایک جماعت اس میں داخل ہو جاتی تو پھر کبھی اس سے باہر نہ نکلتی[1]) اگر فاروق اعظم ایسا مدبر حکومت ایک اور پیدا ہو جاتا تو تمام دنیا اسلامی نظام کے ماتحت انسانیت کے اعلیٰ قوانین کی پابند نظر آتی اور اگر آج بھی اس طرز کا ایک انسان پیدا ہو جائے تو دنیا سے تمام خرابیاں مٹ جائیں

---

[1] مجمع الزوائد و منبع الفوائد ج ۹ ص ۷۷، (باب وفات عمرؓ) البدایۃ والنہایہ ج ۷، ص ۱۳۳-۱۳۷۔

اور تمام نیکیاں زمین و آسمان پر چھا جائیں۔

فاروقِ اعظم نے ابو لولو فیروز مجوسی کے قاتلانہ حملہ سے وفات پائی۔

خلافت راشدہ، دور دوم

اسلامی حکومت حضرت عثمانؓ کے عہد میں ۲۴ھ / ۶۴۴ء تا ۳۵ھ / ۶۵۵ء

فاروق اعظم کی شہادت کے بعد حضرت عثمان بن عفانؓ اسلامی حکومت کے امیر و امام منتخب ہوئے۔ یکم محرم ۲۴ھ (۷۔ نومبر ۶۴۴ء) کو ان کی خلافت کا اعلان کیا گیا اور مدینۃ النبی میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

فاروق اعظم نے زخمی ہونے کے بعد جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنے جانشین کے مسئلہ کو ایک خاص اصول کے مطابق چند اصحاب پر منحصر کر دیا، دو مجلسیں مقرر کیں جن کا کام انتخاب کرنا تھا۔ ایک صاحب داعی مقرر کیے گئے جن کا فرض قرار دیا کہ وہ مجلس کے ارکان کو جمع کر کے جلد جانشین حکومت کا انتخاب کرائیں۔

فاروقِ اعظمؓ نے ابتداء ہی میں اپنی اس رائے کو ظاہر کر دیا تھا کہ کتنے اصحاب منصب حکومت پر فائز ہونے کے اہل ہیں۔ رائے عامہ کا رجحان یہ تھا کہ امیر المومنین اپنے جانشین کے متعلق دستاویز لکھ دیں یا وصیت کر دیں۔ جب عام طور پر اس خواہش کا اظہار ہوا تو انہوں نے فرمایا:۔ ما اجد احدًا احق بھٰذا الامر من ھٰؤلاء النفر او الرھط الذین توفّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو عنھم راضٍ الخ (میں اُس جماعت سے زیادہ اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کا کسی کو اہل نہیں سمجھتا جن سے آنحضرت زندگی بھر اور زندگی کے آخری لمحات تک خوش رہے۔ ان الفاظ کے بعد اُنہوں نے نام بنام اس جماعت کے افراد کا نام لیا۔

علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ، عبدالرحمٰنؓ۔ آخر میں فرمایا عبداللہ بن عمرؓ بھی ان اصحاب کی مجلس شوریٰ میں موجود رہینگے۔ وہ انتخاب میں مدد دینگے لیکن خلافت کے منصب سے اس موجودگی کو کوئی تعلق نہیں رہیگا" مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حکومت کے اہل نہیں یا اس امانت کے مستحق نہیں

اس جماعت میں سب سے پہلے عبدالرحمٰن بن عوف نے ایثار کیا اور منصب خلافت حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ حکم بن گئے اُنہوں نے خوش تدبیری سے حضرت عثمان کے حق میں فیصلہ کیا، ان کو اسلامی حکومت کا قائدِ عام منتخب کر کے سب کو بیعت پہ آمادہ کر لیا۔

حضرت عثمان یقیناً اپنے کردار کے لحاظ سے اس منصب کے مستحق تھے۔ اسلامی اجتماعیات کے وسیع میدان میں آپ کی فرض شناسیوں کی روداد بہت ہی طویل اور زر و جواہر کے برابر قیمتی ہے۔ خود فرماتے ہیں کہ میں پہلے پہل اسلام لانے والے چار اشخاص میں چوتھا شخص ہوں مشکلات و مصائب کے زمانہ میں اسلام کی سربلندی کے لیے وطن کو چھوڑنا ایک جدید سیاسی اصول تھا۔ اس کی ایجاد کا فخر اسلام کو حاصل تھا۔ جب ترک وطن کا سوال پیش ہوا تو عثمان غنی اور اُن کا گھرانہ سب سے پہلے حبش پہنچا۔ ہجرت مدینہ کے وقت بھی وطن کی محبت پر اسلام کے قائم کردہ اصول کی محبت کا غلبہ رہا۔ ایثار اور قربانی، انسان کے مرتبہ کو فرشتوں کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ کی سیاسی زندگی میں پیغمبر اعظم کے تیسرے رفیق کی قربانیوں کو زبردست دخل تھا۔

آپ عہدِ نبوی میں قانون الٰہی کے کاتب اور دفتر رسالت کے معتمد تھے۔ قرآن کو ایک قرأت پر جمع کرنے، مصحف اصلی کو محفوظ رکھنے اور امت کو اختلاف سے بچانے کا فخر حضرت

عثمان کے علاوہ کسی کو حاصل نہ ہوسکا، قانونِ الٰہی سے شغف ظاہر کرنے میں کوئی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ ان کمالات کے علاوہ آپ کی تنہا ذات اسلام کا بیت المال تھی۔ جو ہاتھ آپ کی طرف بڑھتا خالی واپس نہ آتا۔ آپ کے سیاسی کارنامے جنہوں نے آپ کے حق خلافت کو نمایاں کیا کچھ کم نہ تھے۔ ایک موقع پر جیش عسرت مرتب ہوا تو آپ نے اس کی امداد کے لیے ایک ہزار اونٹ، پچاس گھوڑے اور ایک ہزار دینار دیے۔ ایک کنواں جس کا نام رومہ تھا۔ آنحضرت کے ادنیٰ اشارے پر بیس ہزار درہم یہودیوں کو دے کر خریدا اور عام مسلمانوں کے لیے خاص کر دیا۔ ۲۶ھ میں ایوان کعبہ کے قرب و جوار کے مکانات خریدے اور مسجد حرم کو وسیع کیا۔ ۲۹ھ میں مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کے لیے روپیہ خرچ کیا اور تعمیر پر پختہ ساز و سامان صرف کیا۔ یہی وہ ایثار تھا جس کی بنا پر آپ کو حضور اکرم نے رفیق کا خطاب دیا اور عوام اُمت سے غنی کا لقب ملا[1]۔

نظامِ حکومت

حضرت عثمان اسلامی حکومت کے تیسرے رئیس تھے اور امیر المومنین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ آپ نے نظامِ حکومت کی عمومیت اور سادگی کو ترقی دی بیت المال کے معاملہ میں بڑے انصاف پسند اور اپنے اخراجات کے معاملہ میں بہت محتاط اور صاف رویہ رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں عوام کی معاشی ضرورتوں کو اعلیٰ معیار پر پورا کرتے تھے اور خود احتیاط کا یہ عالم تھا کہ معمولی کھانا کھاتے تھے۔ بیت المال (اُمت کے عام خزانے) سے کبھی ایک پائی نہیں لی اور ہزاروں روپیے کی رقمیں مفاد عامہ پر خرچ کر ڈالیں۔ جس انسان نے ہزارہا درہم حرم مکہ کے ایوان امن اور حرم مدینہ کے ایوانِ

[1] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۳۷۶ و ۳۸۳۔ مجمع الزوائد (الہیثمی) ص ۹، ج ۹

[2] دیکھو "خلافۃ امیر المومنین عثمان" البدایۃ والنہایۃ ج ۷، ص ۱۴۴۔

حکومت پر خرچ کیے مسلمانوں کے امیر کی حیثیت سے اس کا یہ حال تھا کہ سادہ اور غریبانہ لباس کے علاوہ کبھی کوئی لباس نہیں دیکھا۔

حسن بصری فرماتے ہیں کہ حضرتِ عثمان کو امیرالمومنین کی حیثیت میں دیکھا کہ وہ مسجد میں تنہا ہیں، کوئی خادم پاس نہیں۔ عبداللہ ابن شداد کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ امیرالمومنین جمعہ کا خطبہ دے رہے ہیں، ان کے جسم پر صرف چار درہم کی قیمت کا لباس ہے۔ مفادِ عامہ پر ہزاروں درہم خرچ کرنے والا انسان اپنے لباس پر چار درہم خرچ کرتا ہے۔ اس سے اس عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس عہد کی حکومت میں کارفرما تھی۔

حضرت عثمان غنی، حکومت اور عدالت کا کام مسجد نبوی میں کرتے تھے حرم نبوی میں اسلامی حکومت کا مرکز بھی تھا اور انصاف کی اعلیٰ کونسل کا دفتر بھی۔ آپ کی حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ فوج کے سپہ سالاروں اور صوبوں کے گورنروں کو یہ ہدایات جاری کیں کہ عوام سلطنت کے شہریوں کے ساتھ اچھا معاملہ کریں۔ حکومت کا کام امانت سمجھ کر انجام دیں اور معاہدوں کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھیں"۔ آپ کی عدالت میں پہلا مقدمہ حضرت عبیداللہ بن عمر پر قائم ہوا کیونکہ اُن پر ہرمزان عیسائی کے قتل کا الزام تھا۔

عہد عثمانی میں ساسانی سلطنت کا آخری تاجدار یزدگرد مارا گیا اور اس طرح مدتوں کے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو گیا۔ اس عہد میں آذربائجان، آرمینیہ، خُراسان میں بغاوت نے سر اُٹھایا اور اُس کو دبا دیا گیا۔ حضرت عثمان کے حکم سے آپ کے سپہ سالاروں نے مکران، سیستان، کابلستان، زابلستان، شمالی افریقہ میں ساحل بحر احمر کا کچھ حصہ اور شمالی افریقہ کے علاقے فتح کیے۔ اسلامی لشکروں نے اسلام کی سلطنت کی نئی حد ٹیونس کے حدود پر قائم کی۔ اس عہد میں مسلمانوں کا پہلا جنگی بیڑا تیار ہوا جس نے بحر روم میں روم کی قوت کو شکستِ

فاش دے کر سلطنت کے ساحلوں کو محفوظ کر دیا۔

حضرت عثمان غنیؓ نے بارہ سال تک حکومت کا نظام قائم رکھا۔ کوفہ، بصرہ اور مصر میں عبداللہ بن سبا نے جو جال پھیلایا تھا اس نے تشدد پسند مفسدوں کی ایک جماعت پیدا کر دی تھی۔ یہ فتنہ بڑھتے بڑھتے مدینہ تک پہنچا۔ بڑے بڑے صحابہ مدینہ سے غیر حاضر تھے ایسی حالت میں سازشی جماعت کے مسلح دستوں نے اسلامی حکومت کے تیسرے صدر کو محاصرہ کر کے شہید کر دیا یہ پہلا فتنہ تھا جس نے اسلامی سلطنت کی تاریخ اور ارتقائے سلطنت کا رُخ بدل دیا۔ خلیفہ ثالث کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ وقت سے پہلے اس جماعت کے سرغنوں کو قتل کر دیتے لیکن اُنھوں نے فرمایا میں جان دینا گوارا کرونگا مگر اس طرح قتل کا بازار گرم نہ کرونگا۔

آپ نے آخری مرتبہ جو خطبہ دیا اس میں اُمت کو یہ ہدایت کی کہ "وہ متحد رہے، اخوۃ کے قانون کو نہ چھوڑے اور خدا ترسی کا خیال رکھے"۔[1]

اسلامی حکومت حضرت علی کے عہد میں ۳۵ھ تا ۴۰ھ / ۶۵۵ء تا ۶۶۰ء

حضرت علی حیدرؓ۔ فاتح خیبر جمعہ کے دن ۲۵۔ ذی الحجہ ۳۵ھ کو اسلامی حکومت کے تیسرے صدر مقرر ہوئے۔

حضرت عثمان کے قتل نے مسلمانوں کے شیرازۂ افکار کو درہم برہم کر دیا تھا۔ قاتل معمولی درجہ کے لوگ تھے مگر حادثہ غیر معمولی تھا اس لیے اس کا اثر غیر معمولی صورت میں ظاہر ہوا۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں تمام صحابہ اور صحابہ کو دیکھنے والے صورتِ حال کی رفتار سے بےچین تھے۔ مدینہ میں قدرۃً خوف و دہشت کی فضا زیادہ تھی اول درجہ کے اصحاب شہر سے غیر حاضر تھے، جو لوگ موجود تھے اُن کے سامنے ایک ہی مصلحت تھی اور وہ یہ کہ جلد سے جلد نئے امیر کا انتخاب عمل میں آجائے۔ اس وقت اسلامی

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج، ص ۲۲۲-۳۵۷۔

سوسائٹی کئی خیال کے لوگوں میں تقسیم تھی۔ جن اصحاب کے نام زیر تجویز تھے وہ تیار نہ تھے۔ حضرت علی سے کئی بار عرض کیا گیا۔ اُنھوں نے ہر بار انکار فرمایا۔ آخری مرتبہ کوشش کی جا رہی تھی تو وہ خانہ نشین ہو گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ جب عوام حضرت طلحہ اور زبیر کے ساتھ پہنچے اور برملا یہ کہا گیا کہ اب آپ کے علاوہ کوئی نظام حکومت کو نہیں چلا سکتا تو حضرت علی نے رائے عامہ کے سامنے سر خم کر دیا۔

حضرت علی کے تاریخی کمالات[1]، اور اعلیٰ اوصاف سے انکار نہیں کیا جا سکتا پیغمبر اعظم سے اُن کی قرابت اتنی بڑی فضیلت ہے جس میں ان کا کوئی دوسرا ہمسر نہیں ہے حضرت علی سب سے پہلے اس وقت اسلامی نظام میں داخل ہوئے جب اتنی عمر کے کسی بچہ نے یہ فخر حاصل نہیں کیا تھا۔ اسلامی نظام کے قیام کے بعد بین الاقوامی اور خارجی تعلقات کے شعبہ کا کام ان کے سپرد تھا۔ ایک محاذ کے علاوہ ہر محاذ پر پیغمبر اعظم کے رفیق رہے۔ آنحضرت تبوک کے محاذ پر جہاد کے لیے تشریف لے گئے تو ان کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس موقع پر مرکز نبوت کا تمام انتظام انہی کے دست تصرف میں تھا۔ عہد نبوی میں یمن کے امیر و حاکم (گورنر) کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اور اُنھوں نے اس منصب پر باضابطہ کام کیا۔ خیبر کے محاذ کی سپہ سالاری ملی تو فتح خیبر کا اعزاز حاصل ہوا[2]۔

خلافتِ راشدہ کے پہلے دور میں اہم عہدوں پر کام کیا۔ حضرت صدیق کے عہد میں مشیر اعلیٰ رہے۔ قیامِ امن اور محاذِ جنگ کے اہم معاملات ان کے مشورے سے طے پاتے تھے۔ حضرت عمر نے اپنے بعد جو صحابہ کی کونسل مقرر کی تھی حضرت علی اس کے رکن تھے۔

---

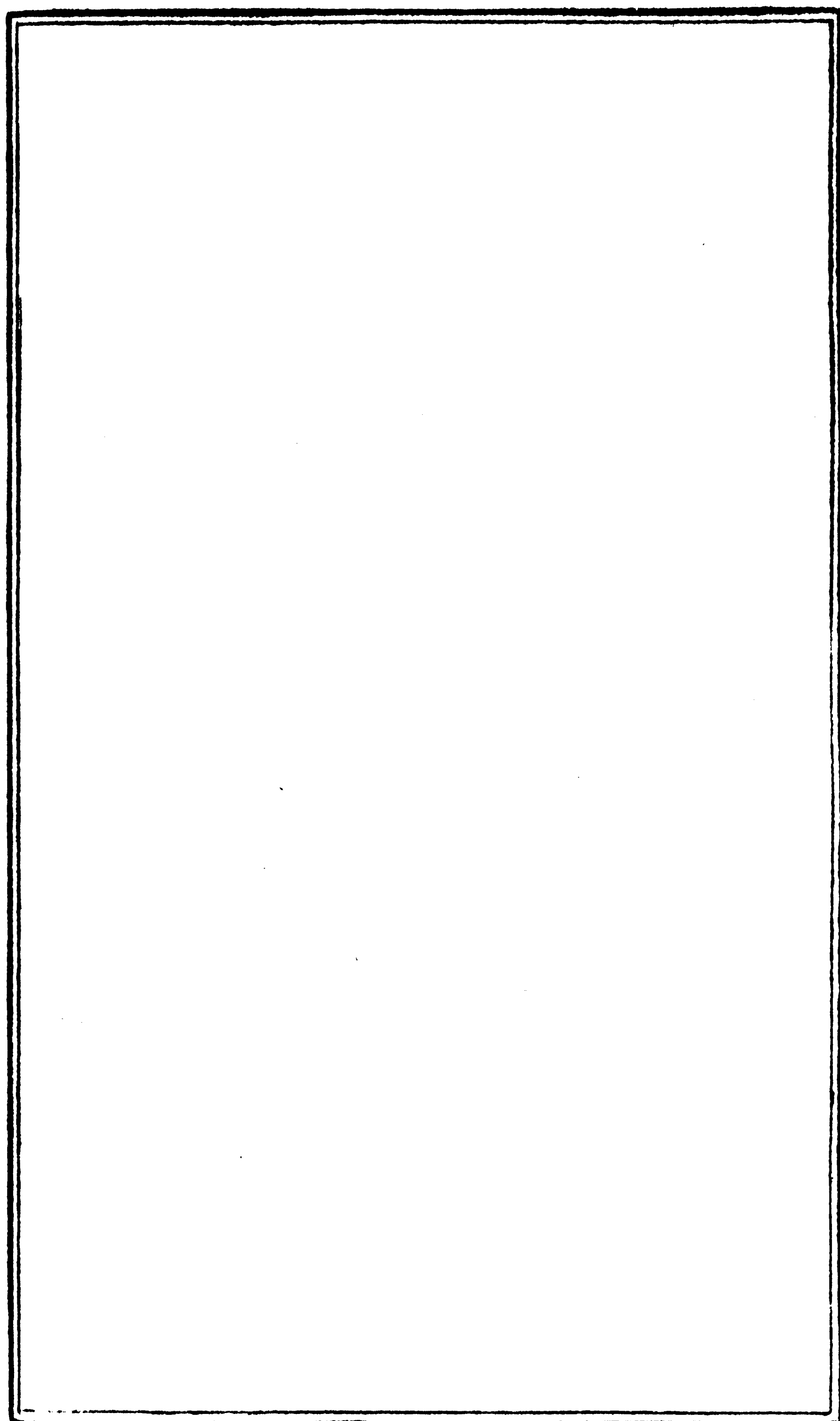
[1] اسد الغابہ ابن اثیر ج ۴ ص ۱۶ - ۳۹ -

[2] فتوحات الاسلامیہ (دحلان) ج ص ۲۷۸ - ۲۹۶ -

حضرت عثمان کے عہد کے بعض واقعات ایسے تھے جن کا اثر حضرت علی کے عہد حکومت پر بھی حاوی رہا۔ مدینہ کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ عراق، شام اور مصر میں علیحدہ علیحدہ مرکزی استعداد کو ابھارا گیا۔ خیالات کے اختلاف نے امت کے نظام اجتماعی کے قلعہ کو پاش پاش کر دیا۔

صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے زمانہ کا امن و اتحاد ختم ہو گیا۔ صوبے اس خلفشار میں خود سر ہونے لگے حضرت علی نے قیام امن کے لیے صوبوں کے اعلیٰ حکام کو بدلنے کا فرمان جاری کیا۔ خلافت کی سیاسی قوت پوری طرح کام نہ کر سکی، خلیفۂ وقت نے اپنے فیصلے کے نفاذ کو ضروری قرار دے دیا۔ اس ہنگامہ میں دوسرا عظیم حادثہ ظاہر ہوا۔ تشدد پسندوں کی ایک جماعت نے "انسداد جنگ کے لیے جنگ" کا مکروہ اصول وضع کیا اور طے کیا کہ حضرت علی، امیر معاویہ، اور عمرو بن العاص تینوں کو قتل کر دیا جائے۔ تاکہ ہنگامۂ اختلاف ختم ہو کر امن قائم ہو جائے۔ تین آدمی مقرر ہوئے۔ ابن ملجم نے ۱۵ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کو شہید کر دیا۔ برک بن عبداللہ نے دمشق میں حضرت معاویہ پر حملہ کیا، معمولی زخم آیا جو اچھا ہو گیا۔ عمرو بن العاص کی جگہ خارجہ بن حذیفہ قتل کر دیے گئے، قاتل کو غلط فہمی ہوئی جس سے عمرو بن العاص کی جان بچ گئی۔

حضرت علی کی شہادت سے خلافت راشدہ کے دوسرے دور کا خاتمہ ہو گیا اسلامی سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ ریاستِ عامہ ختم ہو گئی اور شہنشاہیت منظر عام پر آ گئی۔ بنی امیہ، بنی عباس، خاندان مغلیہ، اور آل عثمان وغیرہ نے بڑی بڑی شاہی حکومتیں قائم کیں۔ جن میں کبھی کبھی ریاستِ عامہ کے پر جوش اور حاصل خیز نظارے بھی دیکھے گئے۔



اسلام کا نظامِ حکومت

دفعہ (۱) اسلام اور حکومت

(اسلام دُنیا کی سب سے بڑی طاقت اور ہماری دُنیا کا یگانہ مذہب ہے۔ ایسا مذہب جو انسانوں سے خطاب کرتا ہے اور انسانوں کے عام فائدے، عام بہتری اور عام تنظیم کے لیے حکومت سے اپنے تعلق کو برملا ظاہر کرتا ہے۔ اسلام کی تاریخ، اسلام کا قانون اور اسلام کی سیاست اسلام اور حکومت کے باہمی ربط وضبط پر حجت ہیں۔ اسلام کو ہر اس چیز پر دسترس حاصل ہے جس کا تعلق حکومت سے ہے یا حکومت کے کسی شعبے سے منظم انسانی سوسائٹی، رقبۂ زمین، اقتدار و اختیار اور ہر وہ شے جس کا مطالبہ ایک اچھی حکومت کرتی ہے۔ اسلام کے قانونی تصرف میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔)

قانونی تشریحات اور نظائر

اسلام اور حکومت کے درمیان کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اسلام صرف ایک مذہب ہے یا مذہب کی حیثیت سے کچھ اور بھی ہے؟ اس کو حکومت، حاکمیت، سیاست اور سلطنت سے کوئی واسطہ ہے یا بالکل بے واسطہ و تعلق ہے، وہ مذہب ہے سیاست سے جدا گانہ؟ یا سیاست ہے مذہب سے بیگانہ؟ ہم اس کو صرف ایک ایسا نظام کہیں جو باطن کی تا جداری

کا فرض انجام دیتا ہے یا ایک ایسا دینی نظام سمجھیں جو روح کی قوت سے دنیا کے مادی نظام پر عالمگیر غلبہ کا دعویٰ رکھتا ہے اور ساری دنیا کو ایک خدا کی ایک قوم کی صورت دے کر اپنی حکومت کے کارخانے کو انسانیتِ عامہ کے تابع فرمان افراد کی میراث قرار دیتا ہے؟

یہ وہ اثر انگیز سوالات ہیں جو اکثر یورپ کے الجھے ہوئے دماغ سے پیدا ہوتے ہیں اور کبھی ایشیا کے سادہ فطرت انسانوں کی طرف سے سامنے آتے ہیں اور کبھی کبھی بعض مسلمانوں کے بنیادی فلسفہ کی قوت سے منظرِ عام پر آجاتے ہیں

جواب سے پہلے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام کا مقصد اسلام کی حکومت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسلام کی حکومت کا مفہوم کیا ہے، صرف یہ کہ ہم سب خدا کے اطاعت گزار اور خدا کی حکومت کے علمبردار ہیں (الاسلام ھو التسلیم والانقیاد لاوامر اللہ تعالیٰ) یہ وہ تعریف ہے جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے[1] جب جرمنی میں یہی الفاظ گوئٹے نے سنے تو وہ تڑپ گیا اور پکار اٹھا کہ کیا ہم سب حلقہ بگوش اسلام نہیں ہیں[2]۔ اسلامی حکومت کا یہ وہ تصور ہے جس کو اول دن سے مقصد کا درجہ حاصل ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اور حکومت کا تعلق ایسا ہے جیسا کہ فولاد کا تعلق فولاد سے ہے۔ انبیاء کی تاریخ کے تمام نوشتے اور جملہ مقدس الہامی صحیفے گواہ ہیں کہ آدم سے لے کر پیغمبر اعظم تک خدا کا ہر نمائندہ اس حکومت کا علمبردار رہا ہے۔

قرآن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور حکومت کے تعلق کی ایک عمارت موجود ہے اور اس کی صدہا بنیادیں قائم ہیں۔ قرآن نے ہمیں بتایا کہ حکومت کو خدا نے پیدا کیا ہے اور حکومت خدا کا حق ہے۔ خدا نے انسان کو چار چیزیں دی ہیں۔ کتاب

---

[1] فقہ الاکبر ص ۹۷ (منسوب بامام اعظم) طبع مصر [2] پستالوزی ڈاکٹر عبدالحمید۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (دہلی) ص ۱۲۶

(قانون، حکم (حکومت)، نبوت[1] (پیغمبری)، حکمت (ریاست))

حکومت ایک نیابتی حق ہے۔ حکومت ایک رہنمائی ہے۔ قرآنِ حکیم دنیا کے اوّل درجہ کے پیغمبروں کا نام لے کر حکومت کا ذکر کرتا ہے اور ہم پر ظاہر کرتا ہے یہ ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے اپنی برگزیدہ آرزوؤں میں سے حکومت کو مستقل آرزو قرار دے کر خدا کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور خدا نے ان کو حکومت[2] عطا کی۔ قرآن میں عبادت گذار قوم کے لیے یہ بلاغ (سرکاری فرمان) بھی موجود ہے (ان الارض یرثھا عبادی الصالحون)[3] یقیناً روئے زمین کے وارث میرے صالح وصلاحیت مند بندے ہونگے"۔ دوسری جگہ اعلان ہے ہم نے اس قوم کو زمین کے مشرقی منطقوں اور مغربی منطقوں کا وارث کر دیا ہے۔ جس کے افراد کمزور سمجھے جاتے تھے[4]۔

(قرآن اسلامی تصورات کا سرچشمہ ہے اس کے بیانات اس سے نکلے ہوئے سوت ہیں جن کو بند کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ تقریب قریب نصف قرآن اسلام اور حکومت کے تعلق کی تاریخ سے بھرا ہوا ہے جس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ قرآنِ عظیم میں حکومت الٰہی کی طرح انسانوں کی نیابتی حکومت (خلافت الٰہی) کا ذکر بھی بدرجۂ اہمیت موجود ہے[5]۔ علامہ ابوحیان اندلسی (م ۷۴۵ھ) نے تفسیر قرآن میں لکھا ہے (الانبیاء ھو خلائف اللہ فی ارضہ) پیغمبر روئے زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ تھے (والانبیاء اسم لکل من انتقل الیہ تدبیر اھل الارض، والنظر فی مصالحھم) اور خلیفہ اس انسان کا خطاب ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں روئے زمین کے انسانوں کی تدبیر و تنظیم کا کام اور مفاد عامہ کی نگرانی کا معاملہ کسی طرف

---

[1] قرآن عظیم۔ آل عمران، پ۳ شیخ المندس ۲۰۰۔ [2] پ۱۷ الانبیاء (۲۱) ص ۴۲۵۔
[3] دعائے سلیمانؑ) رب اغفر لی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد الخ پ۲۳ سورہ ص ع ۳
[4] پ۱۷ الانبیاء شیخ المندس ۳۰۴ [5] پ۹ الاعراف (۷)، ص ۲۱۵۔

سے انتقال پا کر پہنچے[1]۔ یہ بیان واضح طور پر حکومت کی ان ذمہ داریوں کا ذکر کرتا ہے۔ جن کا تعلق اسلام کے بلند مرتبہ پیغمبروں سے ہے۔

احادیث میں کثرت سے حکومت کے متعلق ذکر آتا ہے اور نمایاں ہدایات ملتی ہیں۔ حضرتِ نعمان بن بشیر نے مندرجہ ذیل روایت کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں"۔ تم میں نبوت کی حکومت رہیگی وہ ختم ہوجائیگی تو منہاج نبوت پر خلافت قائم ہوگی۔ اس کے بعد وہ بھی دنیا سے اُٹھ جائیگی تو (ملک عاض) سخت گیر اور ظالم حکومت قائم ہوگی۔ ابی ثعلبہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آخر میں جابر مطلق آمریت ہوگی اور اُمت کی خرابی کا سامان پورا ہوجائیگا[2]۔ اس حدیث میں حکومت کے چار درجے ذکر کیے گئے ہیں۔ حکومتِ الٰہی کو پہلے درجے پر رکھنے کے بعد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس پہلے درجہ کی حکومت کو اسلام سے ایسا تعلق ہے جیسا ایک سوسائٹی کا تعلق اپنے اصل مطمح نظر سے۔ دوسرے اور تیسرے درجہ کی حکومت سے اسلام کا تعلق ایسا ہے جیسے مقصد کا ذریعۂ مقصد سے۔ گویا حکومت اصل دین تو نہیں ہے دین کی طاقت کا وسیلہ ہے یہ ایک ایسا پہلو ہے جس نے حکومت کو عام نقطۂ خیال کے مطابق ایک مستقل مقصد بنا دیا ہے۔ البتہ چوتھے اور پانچویں درجے کی حکومتیں اپنی خرابی پر آپ گواہ ہیں۔ ان سے اسلام کو کوئی تعلق نہیں۔ اگر مسلمانوں کے غلبہ اور قوت سے بھی ایسی حکومتیں قائم ہوں تو اس سے اسلام کے نام پر حرف لانا حرفِ غلط ہوگا۔ یہ بات واضح طور پر صحیح ہے کہ اسلام کو (مملکت عضوض) مطلق العنان شہنشاہیت اور (مملکت جبر) حکومتِ جبریہ

---

[1] مجمع الزوائد الہیثمی (۵؍۱۸۸) (باب کیف بدأت الامارت والخلافت والملک) یہ روایت متعدد طریقوں سے مذکور ہے۔ دیکھو جلد ۵ کتاب الخلافت ص ۱۸۸۔ ۱۹۰۔

استبداد سے کوئی علاقہ نہیں۔ کیونکہ یہ بات اسلام کی عام حقیقت کے خلاف ہے۔

اسلامی دور

اسلام دنیا کے سیاسی ماحول میں ایک قوی الاثر واقعہ کی حیثیت سے علی الاعلان ظاہر ہوا ہے۔ یہ ایک قدیم الہام تھا جو انسانی فطرت کے مقدس رجحان کی شکل میں نازل ہوا اور انسان کے پاکیزہ ضمیر تک پہنچ کر از سر نو خدا کی امانت بنا۔ یا ایک امر خداوندی تھا اجتماعی اعتبار سے سر بسر حیرت انگیز۔ گویا عقیدہ اور عمل۔ اصول اور حکمت عملی، سیاست اور حکومت، مذہب اور سلطنت کے مکمل اتحاد سے وہ بات ظاہر ہوئی جو معجزہ تھی اور جس کو اس سے پہلے انسانی نظریوں کی جعلی دنیا میں کسی نے نہ دیکھا تھا۔

ظہور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو چکی تھی کہ اسلام اپنی دینی تنظیم سے ایک دنیاوی نظام بھی پیدا کریگا۔ مکہ معظمہ میں جو واقعات رونما ہوئے وہ مدینہ میں ظاہر ہونے والے سیاسی واقعات کا مبارک پیش خیمہ تھے۔ خدا کے مقدس شہر سے اس کے نکو کار بندوں کا جلا وطن ہونا فتح مکہ کا پیغام تھا۔ اور امن کے پایۂ تخت (حرم امن) میں مفسدوں کا غلبہ مدینہ میں ایک ایسے نئے اور عظیم الشان تاریخی دار السلطنت کا سنگ بنیاد تھا۔ جس کا نام تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ مکہ میں جو بات ہو سکتی تھی رونما ہو کر رہی۔ لیکن اسی دور کے تاریخی انسان زید بن عمرو بن نفیل نے اسلام کی ہمہ گیر کامیابی اور اقتدار کی جو پیشین گوئی کی تھی[1] وہ بھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے پوری ہو کر رہی۔

(عرب کی نامور خاتون خدیجۃ الکبریٰؓ نے ظہور اسلام کے وقت پیغمبر اعظمؐ سے پہلا جملہ یہ کہا تھا کہ "خدا کی قسم آپ دنیا میں کبھی عزت سے محروم نہ ہونگے" مشرق و مغرب نے

---

[1] تاریخ الکامل ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۔

دیکھا کہ عہد نبوی کے آخر دن تک اسلام کی اجتماعی شان عروج و ترقی کا ہر پیغام کو قبول کرتی رہی۔ جس روز آنحضرتؐ وفات پا رہے ہیں اُس دن بھی آپ کے نوجوان سپہ سالار اسامہ بن زید کی ایمانی قوت شام والوں کو صبح کا پیغام دے کر اسلام کی حکومت کے لیے ایک نیا میدان تیار کر رہی تھی۔

مذہب اور سیاست

اسلام ایک مذہب ہے اور مذہب ہی کی حیثیت سے دنیا کے قلب اور قالب پر صحیح معنی میں حکومت کرنے کے لیے ظاہر ہوا ہے۔ جہاں تک دنیا میں فطری قوانین کے نفاذ۔ برائیوں کی تباہی، بہترین اصولوں کی ترویج۔ انسانوں کے اتحاد اور انسانیت کے رواج کا تعلق ہے اسلام کا مطمح نظر دفاعی نہیں جارحانہ ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس سے اسلامی فکر کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی وہ قوتیں جو اسلامی اقتدار کی جولانگاہ میں نئی جاہلیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اور تمام برائیوں کی بقا کے لیے تمام بھلائیوں کی حکومت کو مٹانا چاہتی ہیں برسوں سے مسلمانوں کی فکر کے شیریں چشموں میں زہر گھول کر پلا رہی ہیں۔ وہ خود حقیقی معنی میں حکومت کو کلیسا سے آج تک علیحدہ نہیں کر سکیں لیکن مسلمانوں کے دماغوں میں دین و دنیا کی علیحدگی کا خیال ٹھونسنے پر مصر ہیں۔ امریکہ، انگلستان اور روم کے کلیسا ایشیا اور افریقہ تک متعلقہ حکومتوں کے لیے سیاسی میدان تیار کر رہے ہیں لیکن مسلمانوں کی سیاسی پرواز اور ہمہ گیر پیش قدمی کو مضمحل کرنے کے لیے "حکومت، مذہب اور سیاست" کی مستقل بحثیں پیدا کر کے اپنا کام نکالنا چاہتی ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کو صدیوں سے جو چیلنج دیا جا رہا ہے اُس کو پکے عزم کے ساتھ

قبول کرنا چاہیے۔ بحث و مباحثہ کی تمام الجھنوں کا ہمارے پاس ایک ہی سلجھا ہوا جواب ہونا چاہیے کہ اسلام ایک آزاد طاقت ہے اور حکومت پر حاوی ہے۔ تمام دنیا کو اس حقیقت سے خبردار ہو جانا چاہیے کہ ہم پیغمبر اسلام کو "ساری دنیا کا سردار" اور اول درجہ کا قائد مانتے ہیں۔ ہم نے آنحضرت کی عظیم الشان زندگی سے حکومت و ریاست کے متعلق جو سبق پایا ہے اُس سے دستبردار ہونا ہمارے قانونی اختیارات کی حد سے باہر ہے ہمیں اپنے دانا دشمنوں، نادان دوستوں اور اپنی مسجدوں کے خطیبوں سے بھی کہہ دینا چاہیے کہ ہم دنیا کو بُرا نہیں سمجھتے اور دین کے ساتھ دنیا کی عزت بھی چاہتے ہیں۔ اور دنیا میں وہ فتح و فوز بھی جس کا نتیجہ دنیا کی حکومت ہے

ہمیں خدا کے قرآن، پیغمبر برحق کے فرامین اور ہمارے علماء اجتماعیات کی ہدایتوں نے یہ یقین دلا دیا ہے کہ اسلام اور حکومت کا تعلق کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ اسلام اور حکومت کے تعلق کا انکار ایک ناقابل قبول دعویٰ ہے جسے ڈاکٹر آرنلڈ کے ان الفاظ میں مسترد کر دینا چاہیے۔

"اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ فتح و جنگ میں حصہ لینا ہی شانِ رسالت کے خلاف تھا تو یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت کی تلقین میں یہ قول شامل نہ تھا — کہ میری بادشاہی اس دنیا کی نہیں"[1]

چند قانونی حوالے اسلام نے آج تک حکومت سے دستبردار ہونے کے متعلق کوئی دستاویز نہیں لکھی کیونکہ ہمیں مندرجۂ ذیل خالص قانونی حوالوں سے یہ علم ہے کہ اسلام دنیا کی حکومت کو اپنا منصب قرار دیتا ہے۔

[1] دعوت اسلام (پریچنگ آف اسلام)، ڈاکٹر ٹی ڈبلیو۔ آرنلڈ ص ۲۸ (بادشاہی کی جگہ خلافت ہونا چاہیے)

۱۔قرآن حکیم اسلام کا قانون کلی ہے۔ اس کے صفحات پر جابجا حکومت کا ذکر ہے۔ اس میں اسلام کی تخلیق اور اسلام کی تکوین کے ساتھ عالمگیر نیابتی حکومت کا ذکر ہے۔ اس کے مختلف پاروں میں خدا کی حکومت و حاکمیت، بندگانِ خدا کی امامت و ریاست کا تذکرہ موجود ہے۔

یہ قرآن حکیم ہی ہے جس نے انسانوں کو یہ بتایا ہے کہ حکومت ایک قسم کی امانت ہے، ایک خاص قسم کا معاہدہ ہے۔ خدا کے بندوں کے لیے خداداد ورثہ ہے، انسانیتِ عامہ کے فرمانروائے اعلیٰ (ملک الناس) کی طرف سے ایک نیابتی حق ہے۔ حکومت جابرانہ فعل نہیں ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی رہنمائی ہے جس میں سرتاسر رشد و ہدایت اور مرضی عامہ کو دخل ہے۔ حکومت کا تعلق روئے زمین کے اقتدار و استقرار، تمکن و وقار اور سکونت و استعمار (آبادی اور عمرانیت) سے ہے۔ حکومت جاہلیت کے طرز پر نہ ہونی چاہیے بلکہ بہتر سے بہتر طریقہ پر خدا کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق ہونی چاہیے۔

یہ الفاظ بھی قرآن ہی میں ہیں "ہم نے آدم کو روئے زمین کا خلیفہ (نائب السلطنت) بنایا۔ خدا تم کو اور نیک کردار لوگوں کو روئے زمین کی حکومت دیگا۔ ہم نے ابراہیم کو مملکت عظمیٰ عطا کی ہے" حضرت سلیمانؑ نے دعا کی تھی مجھ کو اتنی بڑی مملکت دی جائے کہ اس کی مثال نہ لائی جاسکے قرآن کہتا ہے کہ ہم نے داؤد و سلیمان کو حکومت دی اور حکومت کا علم عطا کیا۔

اسلام کا ظہور اور اسلامی حکومت کا تاریخی طور پر منظر عام پر آنا قرآن ہی کے وعدہ کی تکمیل ہے جو از اول تا آخر اسلام اور حکومت کے ربط کو ظاہر کرتا ہے۔[۱]

---

[۱] حوالوں کے لیے قرآن حکیم کے ان حصوں کا تفصیلی مطالعہ کیجیے جن میں انبیاء کی امامت و ریاست کا ذکر ہے۔

(۲) پیغمبرِ اعظمؐ نے اوّل اوّل جو فرمان نافذ کئے ہیں ان میں وہ فرمان بھی ہے جس میں اپنے خاندان کو خطاب کرکے تمام دنیا کو پیغمبرانہ اقتدار کی اطلاع دی گئی ہے۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:-

"آج تک کوئی جوان ایسا پیدا نہیں ہوا جو تم کو مجھ سے بہتر مطمعِ نظر سے باخبر کرتا۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بہتری کے لیے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت سے مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں تم کو اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت کے کام میں وزراء کی ضرورت ہے۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے[1]۔

اس فرمان میں "دنیا کے مفاد" کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مفاد کی بہتری آنحضرتؐ کے اول درجہ کے مقاصد میں داخل تھی۔ کیا اس کے بعد بھی ہمیں یہ حق ہے کہ ہم دنیا کے بہترین فائدوں کو نظر انداز کر دیں؟

ابن کثیر اس فرمان کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ نبوت کے تین سال بعد آنحضرتؐ نے "خدا کے حکم" پر انسانوں کو جمع ہونے کی دعوت دی"—— بڑا صبر آزما زمانہ تھا مگر آپ کی قوتِ فیصلہ کا اعلان یہ تھا "یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا یا میں اپنی جان سے گذر جاؤنگا"۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۳) سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا کے حکم کے لیے حکومت ضروری نہیں ہے۔ اور کیا اس کا تعلق اسلام سے نہیں ہے۔

(۳) دوسری صدی ہجری کے امام ابوعبید قاسم بن سلام[2] نے اپنی کتاب[3] میں حضرت تمیم داریؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تاریخ الکامل ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲۔

[2] امام ابوعبید قاسم بن سلام۔ پیدائش (۱۵۴ھ)، وفات (۲۲۴ھ)

[3] کتاب الاموال۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی بہت قدیم تصنیف ہے جو آج سے گیارہ سو سال پہلے مرتب کی گئی ہے۔

سے ایک صحابی نے دریافت کیا (ما الدین) دین کیا ہے؟ حضور نے فرمایا (الدین النصیحۃ) دین نام ہے خیر خواہی کا۔ حدیث کی پوری عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دیں عبارت ہے اُس خیر خواہی سے جو اللہ، اللہ کے رسول، اللہ کے قانون، اسلامی حکومت کے قائد (امام) اور مجموعی طور پر تمام اسلامی ہیئت (جماعۃ المسلمین) کے ساتھ کی جائے۔ اسی کتاب میں عطار بن یسار سے یہ روایت نقل ہے کہ ایک شخص نے کہا:۔ (بئس الشیٔ الامارۃ) حکومت بری چیز ہے" آنحضرت نے حکومت کی برائی اور بھلائی ظاہر کرنے سے پہلے فرمایا (نعم الشیٔ الامارۃ) حکومت اچھی چیز ہے" حضرت ابو ذر غفاری کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت اس قدر اچھی چیز ہے کہ اگر اُس کی ذمہ داریوں کو پورا کیا جائے تو وہ امانت کے برابر اہمیت حاصل کرلیتی ہے[1]۔

اگر دین نام ہے دنیا اور دنیا کے تمام اجتماعی عقائد اور عوامل کے ترک کر دینے کا تو ان احادیث کا کیا مفہوم ہے اور اگر اسلام نے دنیا کو خدا کی طرف بلانے کے ساتھ انسانی تنظیم اور انسانی معاشرے کی عام بھلائی کے لیے نہیں پکارا تو اس قسم کے مستند قانونی فرامین کا کیا مقصد ہے۔

(۴) خدا کے بلند و برتر پیغمبر نے انسانیتِ عامہ کے ہر ہر فرد کو بتایا (الدین یُسر) مذہب ایک آسان اور سمجھ میں آنے والا نظام ہے (الارض ارض اللہ والعباد عباد اللہ) زمین؛ اللہ کی زمین ہے۔ بندے اللہ کے بندے ہیں[2]۔" اگر خدا کی زمین اور خدا کے بندوں کو ایک جماعت کی شکل میں جمع کرنا پیغمبر خدا کی دینی شان کے خلاف اور اسلام کی ذمہ داریوں کا جز نہ تھا اور اس مقصد کے لیے عرب کے علاوہ دنیا کے

---

[1] کتاب الاموال ص ۳-۴ [2] عن فضالہ بن عبید للطبرانی فی الکبیر بحوالہ جامع الصغیر ۳۰۴۹ ج ۱ ص ۲۱۵

جارحانہ عواطف اور شہنشاہیتوں کو ختم کر کے اسلام کی حکومت اور سلطنت کا قیام مقصود نہ تھا تو آپ نے دنیا کی فتح اور غلبہ کی خبر کیوں دی ؟

ہم جانتے ہیں کہ آپ نے اپنی زندگی میں آنے والے واقعات کو ظاہر کر دیا تھا آپ نے اعلان کر دیا تھا کہ زمین کے مشرق و مغرب کے علاقے میرے ہاتھ میں دیے گئے ہیں[1] اور میری اُمت ان کا نظام اپنے ہاتھ میں لیگی۔

آپ نے فرمایا کہ قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیتوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور یہ بھی اشارہ کیا کہ اس قسم کے شاہی نظام پھر نہ قائم ہونے چاہییں[2]۔

آپ نے عالمگیر فتوحات کے متعلق اپنے پیغمبرانہ حوصلوں اور اپنے جانشینوں کے جہاد و عمل کی واقعیت کو دنیا سے چھپائے بغیر ان الفاظ میں ظاہر فرمایا تھا :-

"یمن فتح ہو جائیگا، شام فتح ہو جائیگا، عراق فتح ہو جائیگا، اور عرب و عجم کے علاقے فتح ہو جائینگے[3]۔"

(۵) ایک عظیم تاریخی واقعہ | اسلام اور حکومت کے محکم ربط کو ایک اور عظیم تاریخی واقعہ سے بھی قوت حاصل ہوتی ہے۔ جس کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم کچھ لوگ پیغمبر اعظمؐ کے دربار میں حاضر تھے کہ بنی عامر کا سردار ہاند از خاص عصائے پیری کا سہارا لیے حلقۂ حضور تک پہنچا۔ اس نے آنحضرتؐ سے بہت سے سوالات کیے اور کہا (انّ لکلِّ قول حقیقۃً وما حقیقۃ قولك) ہر دعوے کی ایک حقیقت ہوتی ہے آپ کے دعوے کی کیا حقیقت ہے آنحضرتؐ نے جواب

---

[1] تفسیر قرآن عظیم ابن کثیر دمشقی ج ۳ ص ۳۰۱ [2] رواہ البخاری عن ابی ہریرہ التاج الجامع للاصول استاذ ناصف ازہری ج ۳ ص ۳۰۷ تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷ - [3] الجامع الصغیر سیوطی ج ۱ حرف الثاء ص ۴۵۰ - تینوں روایتیں ابن ماجہ، بخاری اور مسلم میں موجود ہیں۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۱۹۲-۱۹۳۔

دیا کہ میں اپنے بزرگوار باپ ابراہیم اور اپنے بھائی عیسٰیؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں"۔ عامری نے یہ سُن کر کہا "آپ کا فرمانا بجا ہے"۔ سوال وجواب کے اس مفید سلسلہ میں عامری نے عرض کیا "کیا برائیوں کی موجودگی میں نیکی کا فائدہ مرتب ہوتا ہے؟" ارشاد ہوا "کیوں نہیں، توبہ برائیوں کے داغ کو دھو دیتی ہے۔ خوبیاں برائیوں کو بہا لیجاتی ہیں۔

اس جواب کے بعد عامری نے اپنے فرائض اور واجبات کے متعلق سوال کیا۔ حضور اکرم نے جواب میں دین کے فرائض کی تفصیل بیان کی۔ عامری نے عرض کیا اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کردوں تو مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ آنحضرت نے فرمایا۔

"جنت" یعنی باغ و بہار آخرت، جاری و ساری نہریں۔ ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی! کیونکہ یہ ایک پاک نفس انسان کا قدرتی حق ہے۔

عامری نے پھر عرض کیا۔ یہ تو بعد کی بات ہے میں اس دنیا کے فائدہ کو معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس یادگار سوال کا تاریخی جواب پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ملا (نعم النصر والتمکین فی البلاد) خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت[۲]۔

اس زبردست تاریخی واقعہ کا علم ہونے کے بعد دل میں اسلام اور حکومت کے تعلق کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ہی واقعہ حکومت و مذہب کی علیحدگی کا اعلان کرنے والے سیاستدانوں اور دین و دنیا کی علیحدگی ماننے والے تارک الدنیا مسلمانوں کا جواب ہے۔ اگر دین کو دنیا سے بالکل علیحدہ کردیا جائے اور علیحدگی کے راہبانہ اصول کو مان

---

[۱] سیدنا عیسٰیؑ نے خدا کی بادشاہت کا اعلان کیا اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نظام کو اپنے جہاد و عمل کی قوت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دیکھو انجیل مقدس لوقا ۴۳، ۱

[۲] تاریخ الکامل ۔ ابن اثیر الجزری ج ۱ ص ۱۶۵۔

لیا جائے تو دین ختم ہو جائیگا. کیونکہ دنیا کا مقصد دین ہے اور دین کے ثمرات و برکات میں دنیا کی حکومت بھی داخل ہے پیغمبر اسی دنیا میں آئے ہیں۔ مذہب اسلام اسی دنیا کے دل پر نازل ہوا ہے۔ اسلام کا قانون حکومت اور اسلامی سیاست اسی دنیا کی بہتری کے لیے پیدا کئے گیے ہیں، اگر حکومت کسی حیثیت سے کوئی مقصد نہیں تو الحکومۃ للہ کے کیا معنی ہیں اور قرآن میں تکوین خلافت اور تکوین ارض کا مسئلہ کیوں درج کیا گیا ہے۔

حکومت کا زمانہ

اسلام اور حکومت کے تعلق کے لیے مکمل ثبوت اور محکم تر دلیل وہ زمانہ ہے جو سنہ ہجری سے شروع ہو کر سنہ ہجری پر ختم ہوتا ہے۔

آنحضرت نے مدینہ پہنچ کر بنی سالم بن عمر کے یہاں پہلی مرتبہ جمعہ کا اجتماع منعقد فرمایا تھا ہجرت کے بعد یہاں پہلا خطبہ عوام الناس نے سنا۔ آپ نے اس میں صاف طریقہ پر یہ اعلان کیا کہ "جو شخص خدا ترسی کے اصول پر قائم رہیگا اس کو فتح عظیم حاصل ہوگی۔ اللہ کے راستہ میں جہاد کے محاذ کو گرم رکھو۔ اللہ نے تم کو بلند مرتبہ عطا کیا ہے اور تم کو مسلمان کے خطاب سے امتیاز بخشا ہے۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ آنحضرت نے اپنے خطبہ میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور اس کی کامیابی کے متعلق جو اشارہ فرمایا ہے اس کا مقصد حکومت کا قیام ہے۔ مسجد کی تعمیر کے وقت حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان مخلص مزدوروں کی طرح پتھر لا رہے تھے۔ ان اصحاب کو دیکھ کر رسالتمآب نے فرمایا (ھؤلاء ولاۃ الامر بعدی) یہ وہ افراد ہیں جو میرے بعد حکومت کے اعلیٰ انتظامی افسر ہونگے۔[1]

اسلامی تاریخ میں موتہ کی جنگ بیحد اہم سمجھی گئی ہے اس محاذ کے لیے آنحضرت نے

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۲۱۳ - ۲۱۸ -

جو لشکر روانہ کیا تھا اس کی کمان زید بن حارثہ کے ہاتھ میں دی گئی تھی۔ زید فوج کے کمانڈر بھی تھے اور محاذ کے انتظامی افسر بھی[1]۔ اس قسم کی انتظامی تشکیلات تاریخ کے صفحات پر اور بھی موجود ہیں۔ آنحضرت کا اصول تھا کہ جب مدینہ سے کسی دفاعی مہم پر تشریف لیجاتے تو اپنا جانشین مقرر کر کے انتظام کی زمام اس کے سپرد[2] فرما دیتے۔ آنحضرت نے فتح مکہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد اور مدینہ واپس جانے سے پہلے حضرت عتاب بن اَسید کو مکہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا اور جانشین کی حیثیت سے جملہ اختیارات ان کو سپرد فرمائے[3]۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس قسم کے تقرر میں نبوت کی نمائندگی اور نیابت کرنا کسی کا حق نہ تھا۔ نبوت ایک ایسی حقیقت تھی جو ختم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ہر تقرر ایک انتظامی فعل تھا جس کا مقصد و منشاء اسلامی حکومت کی ابتدائی تنظیمات سے متعلق تھا

سنہ ۹ ہجری اسلامی تاریخ میں اپنے واقعات کے لحاظ سے یادگار ہے۔ اس سال بہت سے باقاعدہ وفد باہر سے آکر بارگاہِ نبوی میں باریاب ہوئے۔ بنی تمیم کا وفد بھی آیا۔ اس موقع پر اسلام کے خطیب ثابت ابن قیس نے آنحضرت[4] کے حکم سے وفدِ تمیم کے خطیب عطارد کے جواب میں زبردست تقریر کی۔ یہ تقریر خدا کی حکومت کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور اس جملہ کی حامل ہے "یہ خداوند برتر کی قدرت ہی کا کرشمہ ہے کہ کہ اس نے ہم کو حکومت کا مالک بنا دیا[5]۔

اس موقع پر آنحضرت[ص] کی موجودگی اور تقریر کے لیے حکم قانونی اہمیت رکھتا ہے اور اسلام و حکومت کے ربط کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۲۴۱ - [2] ایضاً ص ۲۰۵ - ۲۹۰ [3] ایضاً ج ۴ ص ۲۶۸

[4] سیرۃ ابن ہشام حصہ دوم (سنۃ الوفود)

[5] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر دمشقی ج ۵ ص ۴۲ -

آنحضرت کے وصال کے بعد اسلامی سوسائٹی میں کچھ ابتری کے آثار نمایاں ہوئے۔ مکہ میں حضرت سہیل بن عمرو دروازۂ کعبہ پر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا۔

خدا کی قسم اسلام کا کام پورا ہو کر رہیگا۔ میں نے حضور کی زبان سے یہ سنا ہے:۔

لوگو! میرے ساتھ لاالٰہ الا اللہ کہو۔ عرب تمہارے تابع فرمان ہو جائینگے اور عجم باجگزار۔ خدا کی قسم تم قیصر و کسریٰ کے خزانے کو اللہ کی راہ میں خرچ کروگے[1]

اس تقریر سے ذہنی انتشار دور ہو گیا، اور اہلِ مکہ خدا کے لیے دنیا کی حکومت اور دولت کو فتح کرنے کے لیے پھر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ یہ خدا کی حکومت کا تصور اور اسلامی حکومت کے قیام کا یقین ہی تھا جس نے مسلمانوں کو آنحضرت کے ایک فرمان پر جمع کر دیا۔

اس وقت تک جو نظیریں پیش کی گئی ہیں اُن کا منشا صرف یہی نہیں ہے کہ اسلام حکومت کی دنیاوی تنظیمات سے براہ راست تعلق رکھتا ہے بلکہ ثابت یہ کرنا ہے کہ اسلام اور حکومت میں اول درجہ کا تعلق ہے۔ مذہب ایک عالمگیر اور فاتح طاقت ہے۔ مگر یہ طاقت حکومت کے تصرفات کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتی بلکہ ان تصرفات کو ضروری امداد سمجھ کر قبول کرتی ہے۔

آنحضرت کی وفات اور خلفاءِ راشدین کی رحلت کے موقع پر حکومت کے تصورات نے جو صورت اختیار کی اس سے زیادہ کوئی چیز قابل لحاظ نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت نے اپنے آخری قیمتی لمحات میں مسلمانوں کے لیے جو منشور ہدایات چھوڑا ہے اُس میں صاف موجود ہے (اطیعوا اذا امرتم) جب تمہارا اجتماعی نظام اور حکومت قائم ہو جائے تو تم کو اس کا وفادار رہنا چاہیئے[2]۔

---

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ص ۱۲۴۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۱۹۸۔

اس معاملہ میں عقلوں کو حیرت میں ڈالنے والی بات وہ ہے جس کا ظہور تمام اُمت کی طرف سے پیغمبر اعظم کی وفات کے وقت ہوا۔ آنحضرت اپنے پروردگار کے دربار میں تمام عمر کے لیے حاضر ہو چکے ہیں، اس موقع پر اُمت کا سب سے بڑا فرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول اور دنیا کے عظیم و جلیل سردار کی تدفین کے اہم کام کی طرف توجہ کی جاتی لیکن اُمت کا ہر فرد اس وقت محض ایک فرض کی ادائگی کے لیے تمام فرائض سے سبکدوش نظر آتا ہے۔ اسلام نے اپنے مذہبی نظام کی قوت سے جو سیاسی نظام اور انتظامی حکومت (ریاست عامہ) قائم کی تھی اُس کے لیے رئیس عام اور امام کے انتخاب کا مسئلہ شوریٰ میں درپیش ہے۔ نبوت ختم ہو چکی ہے اب خلافت (اسلامی حکومت) کا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے تمام اصحاب نبوت پہلے حکومت کے نظام کے لیے صدر منتخب کرتے ہیں اس کے بعد تدفین عمل میں آتی ہے[1]۔

صدیق اکبر نے اپنی وفات سے پہلے آخری لمحات میں حکومت کے کام کو ہر دوسرے کام پر ترجیح دی۔ اپنے جانشین کے متعلق دستاویز قلمبند کرائی اور مسلمانوں کی رائے عامہ سے اپنے فیصلے پر منظوری دی۔

فاروق اعظم نے زخمی ہونے کے باوجود جامعۂ اسلامیہ کے نظام اور انتظام حکومت کی طرف توجہ ظاہر کی، حضرت عمر بن الخطابؓ کی شخصیت کو نظر میں رکھیے، قاتلانہ حملہ کی دہشت پر غور کیجیے۔ امیر المومنین پر حملہ کیا گیا ہے، زخم متعدد ہیں اور ہر زخم سے خون جاری ہے۔ اُمت اور اُمت کا امیر ہر چیز کو چھوڑ کر اور علاج کو نظر انداز کر کے حکومت کے مستقبل کی حفاظت پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے ہولناک حادثے کے بعد بھی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۴۸

اُمتِ اسلامیہ کے افراد نے جو پہلا کام کیا وہ حکومت کے رئیس اور خلیفہ وقت کے جانشین کا انتخاب[1] تھا۔

غور فرمائیے کیسے کیسے اہم اور تاریخی اوقات میں اوّل درجہ کے مسلمانوں نے حکومت کے دنیاوی نظام کو ایک بڑے مقصد کے لیے اپنا مقصد بنایا۔ اس مرحلہ پر ہمیں اپنے فقہاء اور علمائے اجتماعیات کے نظریہ کی قدر و قیمت محسوس کرنا چاہیے۔ نماز کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مقصد تخلیق ہے۔ نماز کی امامت کو اس نسبت سے جو اہمیت حاصل ہو سکتی ہے اُس کا اندازہ کرنا آسان ہے۔ نماز کے پہلو بہ پہلو اسلامی حکومت اپنے منصب کے اعتبار سے امامت سیاسی قیادت ہے۔ بظاہر نماز کی امامت کا منصب، سیاسی امامت سے زیادہ اہم ہونا چاہیے لیکن ہمارے فقہاء اور علماء کسی ایک رائے کے اختلاف کے بغیر یہ کہتے ہیں کہ "نماز کی امامت سے اُمت کی سیاسی امامت بڑی چیز ہے۔ اول الذکر امامت صغریٰ ہے اور ثانی الذکر امامت کبریٰ[2]"۔

اگر اس علمی حکم کے بعد بھی یہ کہا جائے کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور سیاست و سلطنت کے کام میں آگے بڑھ کر حصہ نہیں لیتا تو یہ ایک ایسی جسارت ہوگی جس کو بہر نوع غیر قانونی قرار دیا جائیگا۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۱۸

[2] ان الخطط الدینیۃ الشرعیۃ من الصلاۃ و والقضاء والجہاد والحسبۃ کلہا مندرجۃ تحت امامۃ الکبریٰ۔ مقدمہ ابن خلدون مصری ص ۱۵۳

دفعہ ۲

اسلامی حکومت کی عام حقیقت

اسلامی حکومت کی عام حقیقت کا پہلا درجہ یہ ہے کہ وہ خدا کی بالادست حکومت ہے اس کا سرچشمہ خدا کا پیغام ہے اور اس کی حقیقت خدا کے حکم میں مرکوز ہے[1]۔

اسلامی حکومت دوسرے درجہ میں ایک عظیم الشان نمائندگی اور نیابتی ذمہ داری (خلافت[2]) ہے جو "حکومت در حکومت" یا "خدا داد حکومت" کے اصول پر اپنے حقیقی اقتدار کو ظاہر کرتی ہے اسمیں صحیح رہنمائی (امامت کبریٰ) کو زبردست دخل ہے۔ اور اس کو صلاحیت مند انسانوں کی میراث ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

یہ حکومت ایک ایسے اقتدار و اختیار کو بروئے کار لاتی ہے جس کو انسان کے بہترین کاموں کا ثمرہ اور خدا کی نعمت کہنا موزوں ہے۔ اس کا تعلق معاہدۂ ربانی[3] سے ہے۔ انسان ایک ازلی معاہدہ کی رو سے دنیا کے یگانہ خدا کی اطاعت کرتا ہے اور خدا اپنے وعدۂ برحق کے مطابق اپنے بندوں کو حکومت عطا کرتا ہے[4]۔

حکومت کی تعریف | حکومت ایک فعل ہے جس کا سرچشمہ حکم[5] ہے۔ علامہ ابوالبقا حنفی حکم کی تعبیر

---

[1] دیکھو قرآن حکیم (ان الحکم الا للہ ۱۲/۶) (الحکم للہ العلی الکبیر ۱۲/۲۴) (الا لہ الحکم ۶۲/۶)

[2] بحر المحیط ابو حیان ج ۱ ص ۱۴۲۔

[3] ان العھد ھی الامامہ۔ عہد کا مفہوم یقینی طور پر امامت و حکومت ہے۔ بحر المحیط ج ۱ ص ۳۷۷

[4] قرآن عظیم پ۱۵ بنی اسرائیل ۱۷۔ روح المعانی ج ۱۸ ص ۱۸۲-۱۸۳۔

[5] علامہ زمخشری حکم کے معنی حکومت کرتے ہیں۔ دیکھو (حکما من اھلہ) کشاف ج ۱ ص ۲۶۷۔

کے لیے لغت سے امداد لے کر یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ حکم ایک تصرف ہے جس کا مطمع نظر دو پہلو سے سامنے آتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان کو ایسا کرنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے[1]۔ حکومت کے نصب العین کو خواہ کتنا ہی وسیع کیا جائے وہ امر اور نہی (ایک کام کو کرنے اور ایک کام سے باز رہنے) کے دائرہ سے باہر نہیں جائیگا۔

امام راغب اصفہانی قرآن کے لفظ (حکم) کی تعریف میں کہتے ہیں کہ حکم کی اصل ممانعت ہے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ "ایسا اور ایسا نہیں کرنا چاہیے" اور اس امتناع کا مقصد عام صلاح و فلاح ہو تو اُس کو حکم کہا جائیگا۔ یعنی حکومت کا ایک فعل۔ اگرچہ ابوالبقاء کی تعریف کے مقابلہ میں یہ تعریف محدود ہے۔ تاہم اسلامی حکومتوں کی ساری تاریخ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ جمہور کو اُن امور کا پابند بنانے پر زور دیتی ہیں جن سے عوام الناس کی بہتری کے پروگرام کو تقویت پہنچے۔ امام راغبؒ قرآن کے نظریہ کی وضاحت میں حکومت کو حکم کے صدور کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور خدا کی حکومت کو خاص قسم کی حکومت سے تعبیر کرتے ہیں[2]۔

ان تصریحات سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ملک اور مملکت کی روح حکومت ہے۔ اور حکومت کی روح "حکم" اسلامی نقطۂ نگاہ سے حکومت اور مملکت میں فرق ہے۔ مملکت ایک نظام ہے اور اپنی حدود پر حاوی ہے اور حکومت اس کی جان ہے۔ زمانۂ حال کے علماء نے بھی حکومت و مملکت میں فرق کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مملکت آقا ہے اور حکومت اس کا آلۂ کار، غلام، یا فرمانبردار کارندہ۔ یہ خیال اصلاً غلط ہے۔ کیونکہ اس کے

---

[1] کلیات العلوم ابی البقاء الحسینی الحنفی (الحکم) باب الحاء ص ۲۸۰

[2] امام راغب نے اپنی تائید میں امام اعظم ابوحنیفہ کا قول بھی پیش کیا ہے دیکھو مفردات امام راغب لفظ (حکم) ص ۱۲۵ طبع خیریہ۔ کلیات العلوم ابوالبقاء لفظ الحکم ص ۲۸۰ مطبوعہ عامرہ ۱۲۸۶ھ استنبول۔ مفردات امام راغب (حکم) ص ۱۲۵ الخ

حامیوں نے حکومت کی اصل (حکم کی قوت) اور اس روح کی طرف دھیان نہیں دیا جس کا رجحان ہمیشہ غلبہ کی طرف رہتا ہے۔

جدید زمانہ کے علماء نے ایک اور غلطی کی ہے وہ یہ بھی سمجھ بیٹھے کہ حکومت بدلتی رہتی ہے اور سلطنت مدت تک باقی رہتی ہے۔ اُن کی یہ غلطی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حکومت اور حکومت کی ہیئت یعنی حکمرانوں کی جماعت میں فرق نہیں کر سکے۔ نظریہ ربانی یہ ہے کہ حکومت اپنے مرکز اقتدار میں ہمیشہ مستقل اور مسلسل باقی رہتی ہے۔ بدلنے والی چیز حکومت نہیں بلکہ حکومت کی وہ جماعت ہے جس کے ہاتھ میں مکان و زمان کی قید کے ساتھ حکومت وقتی طور پر رہتی ہے۔ روح یعنی حکومت ایک شخص اور ہیئت سے دوسرے شخص اور اولوالامر کی جماعت کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے کسی حالت میں ختم نہیں ہوتی

قرآن حکومت اور حکم کو آسمانی اقتدار کا جوہر سمجھتا ہے۔ انسان میں جو اختیار آتا ہے وہ بھی اسی جوہر کا فیض ہے۔ اس جوہر کا جو عطیہ انسان تک پہنچتا ہے وہ اس وقت تک مستقل باقی رہتا ہے جب تک کہ اس کے لیے مظاہر خارجی میں صلاحیت مند قالب یا ہیئت موجود ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے اصل سرچشمہ کی طرف لوٹ جاتا ہے اور سازگار زمانہ اور صلاحیت مند قوم کا انتظار کرتا ہے۔

قانونی تشریحات | اسلامی حکومت کی عام حقیقت کا اظہار سب سے پہلے "اسلام" کے موثر لفظ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اسلام دین و مذہب کی حیثیت سے معجزہ ہے تو اسلامی حکومت سیاسی اصول کے لحاظ سے ایک مستقل اعجاز جس طرح اسلام خود اپنا نمونہ آپ ہے اسی طرح اسلامی حکومت بھی اپنی عام حقیقت کی آپ مثال ہے۔

اسلام کا مفہوم کیا ہے؟ حکومتِ الٰہی کے احکام کی حکمبرداری "مکمل اطاعت" اور

امن وسلامتی کے نظام کا قیام[1]" اس مفہوم ہی سے یہ ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے حکمبردار اور صالح بندے مل کر دنیا کی شیرازہ بندی کے لیے متوجہ ہوں اور خدا کی حکمبرداری کے قانون (اطیعوا اللہ) کے پابند بن کر اپنے اجتماعی واجبات کو پورا کریں۔

قرآن عظیم کے نظریات

قرآن جو حکومت کا سرچشمہ ہے سلطنت کا ضابطہ، اور اخلاق وتمدن کا اساسی آئین ہے بیس سے زیادہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کا تعلق حکومت اور متعلقات حکومت سے ہے۔ قانون وآئین کی اس کتابِ مبین میں حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کے لیے ملکوت کا لفظ موجود ہے۔ ریاست ومملکت کے لیے ارض اور مُلک۔ حکومت کے لیے حکم، امانت، وراثت خلافت، امامت، ولایت، امارت، نعمت، عہد، رُشد، عزت اور قوت اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے حکومت کی غایت بھی معلوم ہوتی ہے۔ حکومت ومملکت کا ذکر بھی تفصیل سے موجود ہے۔ اس ضمن میں قرآن کے صفحات پر فتح ونصرت، تسخیر، تسلط، غلبہ، تمکین اور استعمار کے الفاظ بھی موجود ہیں۔

یہ الفاظ جا بجا قرآن کے قانون مسطور (ضابطہ تحریری) میں موجود ہیں۔ علماءِ قرآن کی تشریحات کا جائزہ لینے سے کسی لفظ کے متعلق یکجا اور کسی لفظ کے متعلق منتشر ذخیرہ ایسا ملیگا جس سے پہلی مرتبہ یہ یقین پیدا ہوگا کہ ان میں سے ہر لفظ کا تعلق حکومت سے ہے اور ہر لفظ

---

[1] دیکھو فقہ اکبر (جو امام اعظم کے نام سے منسوب ہے) (الاسلام ھو التسلیم والانقیاد لاوامر اللہ تعالیٰ) شرح فقہ الاکبر امام ناصر السنۃ ملا علی قاری حنفی (سنہ ھ) ص ۹، طبع دار الکتب العربیہ مصر۔ کلیات العلوم، ابو البقا حنفی، الاسلم، ص ۲۷۲۔

حکومت کی حقیقت کو ایک مستقل نظریہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

یہاں قرآنِ حکیم کے چند مخصوص الفاظ زیرِ بحث لائے جاتے ہیں تاکہ ان سے اسلامی حکومت کی حقیقت کے سمجھنے میں امداد مل سکے۔ باقی الفاظ کے متعلق مناسب موقع پر تصریحات مل سکینگی۔

حکم | سب سے پہلے اسلامی حکومت کی حقیقت کا اظہار قرآن کے لفظ حکم سے ہوتا ہے۔ قرآن میں جابجا (حکم) کا ذکر ہے اور اس سے حکومت مراد ہے۔ متعدد آیتوں میں خدا کی حکومت کو حکم کے اصطلاحی الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے اور متعدد سورتیں ایسی ہیں جن میں خدا کے پیغمبروں کی نیابتی حکومت کو (حکم)، سے تعبیر کیا گیا۔

قرآن میں ایک جگہ ذکر ہے۔ ان الحکم الا للہ ﷺ حکومت کسی کا حق نہیں مگر خاص خداوند بلند و برتر کا۔ دوسری جگہ ہے۔ لا یُشرِكُ فِی حُکمِهٖ احدا خدا کے حق حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں تیسری جگہ مذکور ہے۔ فالحکم للہ العلی الکبیر (۴۳) حکومت کا منصب خدائے بلند و بزرگ ہی کے لیے ہے۔

ایک دوسرے موقع پر پیغمبروں کی ان حاکمانہ نیابتی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے جو خدائے واحد کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ یہاں پہلے یہ ذکر ہے کہ لوط کو حکومت کا منصب حاصل تھا، اس کے بعد داؤد و سلیمان کی حکومت پر گواہی دی گئی ہے۔ اسی موقع پر یہ اعلان ہے کہ انبیاء کو پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں۔

کتاب (مجموعۂ قانون)۔ حکم (منصب حکومت)۔ نبوت، معاشی ضروریات، اور دنیا کی سرداری[1]۔

---

[1] بحر المحیط ابو حیان ج ۶ ص ۳۲۷۔

قرآنِ حکیم میں ایک جگہ اللہ کی حکومت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمانہ ذمہ داریوں کا ذکر ہے ۔ اس کے متعلق علامہ آلوسی بغدادی لکھتے ہیں (وان حکمہٗ فی الحقیقۃ حکم اللہ عز و جل[1]) اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرتؐ کی حکومت درحقیقت خدا کی حکومت ہے۔

مندرجہ بالا آیات کے مطابق اسلامی حکومت کی عام حقیقت کو دو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے ۔

حکومتِ الٰہی (خدا کی بالادست حکومت) خلافت الٰہی (وہ حکومت جو خدا کے پیغمبروں اور اس کے جانشینوں کو نیابت کے طور پر حاصل ہوتی ہے ۔ قرآن میں حکومت کی اس حقیقت کو خلافت اور امامت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ علماءِ اسلام نے اسی حکومت کو ریاستِ[2] عامہ کا نام دیا ہے ۔

امانت | قرآن میں حکومت کے لیے امانت کا لفظ بھی موجود ہے یہ ایک اصطلاح ہے جو انسان کو یہ سمجھنے پر آمادہ کرتی ہے کہ حکومت انسان کے ہاتھ میں ایک سنگین امانت[3] ہے

اس نظریہ کے مطابق حکومت کی حقیقت کا اظہار امانت کے لفظ سے ہوتا ہے کہ حکومت کسی شخص کا ذاتی فعل نہیں ہے بلکہ ایک خدائی امانت ہے اس امانت کا تحمل کرنے والا ایک برتر ذات کے سامنے جواب دہ اور عوام کے سامنے مسئول ہے ۔

اس کا ہر فعل ایک قانونی حق ہے ۔ ہر حق کے ماتحت ایک ذمہ داری ہے اور ہر ذمہ داری ایک امانت ہے ۔ خدا کی امانت اور جمہور امت کی امانت ۔ جب تک حکومت کا امیر اس تصور کے ماتحت اپنے فرائض انجام دیگا اسلامی سوسائٹی کا رئیس متصور ہوگا اور جب

---

[1] روح المعانی ج ۲ ص ۱۷۶ ۔ [2] ردالمختار ابن عابدین ج ۱ ص ۵۱۱ (باب الامامۃ)

[3] حجۃ اللہ البالغہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ دیکھو نظریہ بیضاوی اور نظریہ غزالی باب سر التکلیف ص ۱۹ ۔ سیاست الاعوان ص ۴۶ ۔

اس کے خلاف اپنی شخصی رائے سے کام کریگا تو حکومت کا مقدس قانونی رجحان ختم ہو جائیگا اور جمہور یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ حکومت اپنی اعلیٰ حقیقت سے محروم ہو چکی ہے۔

علامہ زمخشری کے نزدیک امانت عظیم القدر سنگین اور گرانبار ذمہ داری ہے امانت سے مراد اطاعت ہے۔ اللہ کے حکم اور امتناعی احکام کی اطاعت[1]۔

علامہ ابوحیان[2] غرناطی کے الفاظ میں انسان عظیم و جلیل ذمہ داریوں کا مکلف ہے ان کا صحیح احساس اور اس احساس کے ساتھ ساتھ خدائی حکومت کے احکام سے وفاداری امانت ہے۔ جب تک حکم کی اطاعت کی جائیگی امانت باقی رہیگی کیونکہ آغاز تخلیق سے امانت کا تعلق حکومت سے رہا ہے[3]

زید ابن اسلم اور جبائی کی تحقیق یہ ہے کہ نظریہ امانت کا تعلق حکومت کے کارپردازوں سے ہے امانت یہ ہے کہ حکومت کی ذمہ داری اور عوام کے حقوق کے لیے فرض شناسی کے ساتھ کام کیا جائے اور ان کو مذہب اور قانون کے مطابق پورا کیا جائے۔

قرآن نے جہاں امانت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے وہاں یہ بھی حکم ہے کہ جب تم لوگوں کے درمیان حکومت کے کام کو چلاؤ تو انصاف کو مدنظر رکھو[4]۔

حدیث اور تاریخی آثار سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ حکومت کی حقیقت کے اظہار میں امانت کا بڑا دخل ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے سردار دو عالم سے عرض کیا کہ مجھے بھی حکومت کا کام سپرد کیا جائے۔ اس کا جواب ملا "انہا امانت[5]" ابوذر حکومت امانت ہے" یہ ہر شخص کو نہیں دی جا سکتی۔ اس کی تائید امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

[1] کشاف زمخشری (انا عرضنا الامانۃ الخ) ج ۲ ص ۲۴۹۔ دیکھو مفہوم کلام۔

[2] ابوحیان (۶۵۴ھ - ۷۵۴ھ) [3] بحر محیط ج ص ۲۵۳-۲۵۴۔

[4] (اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل) [5] کتاب الاموال امام ابوعبید قاسم بن سلام ص ۴

کے قول سے بھی ہوتی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"امام کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق حکومت کرے، امانت کو ادا کرے۔ جب امام اس طرح حکومت کا فرض انجام دے تو عوام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کو سنیں اور اطاعت کریں اور جب وہ میدانِ عمل میں بلائے تو اس کی آواز پر لبیک کہیں۔

امیر المومنین فاروق اعظم کا قول ہے "جو شخص حکومت کی ذمہ داریوں کو مناسب صورت میں تقسیم نہیں کرتا وہ اللہ، رسول، اور مسلمانوں کے حق اور ان کی امانت میں خیانت کرتا ہے[1]۔

علامہ ابن تیمیہؒ اچھی حکومت کے دو ستون قرار دیتے ہیں۔ امانت[2] اور انصاف۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امانت کا اساسی مفہوم حکومت ہے اور اچھی حکومت کے آئینہ میں امانت ایک مؤثر عنصر کی طرح کارفرما ہے۔

اِن تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی حقیقت کے اظہار میں امانت ایک مؤثر عنصر کی طرح کارفرما ہے

وراثت اسلامی حکومت کی حقیقت کا اظہار وراثت کے لفظ سے بھی ہوتا ہے قرآن کی رو سے حکومت صالحین[3] کی میراث ہے۔ نسل انسانی کے جو افراد قانون کے مطابق صحیح معنی میں نیک کردار اور بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اگر وہ دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہیں تو روئے زمین کی سلطنت اُن کا حق اور میراث ہے اور اُنہیں اس میراث پر قابض و متصرف

---

[1] کتاب الاموال امام ابو عبید قاسم بن سلام (۱۵۴ھ-۲۲۴ھ) ص ۴-۵

[2] السیاسۃ الشرعیہ ابن تیمیہ ص ۳

[3] (الصالح، ھو الخالص فی کل فساد) دیکھو تعریفات سید شریف طبع استانہ ۱۳۲۷ھ

ہونا چاہیے۔

یہ ایک ازلی قانون ہے۔ جس کا ذکر مقدس صحیفوں میں موجود ہے۔ زبور نے اس کو تحریری قانون کی صورت میں پیش کیا ہے[1]۔ قرآنِ حکیم نے انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تصدیق کی ہے اور اسے ہمیشہ کے لیے ایک مستقل قانون بنا دیا ہے[2]۔

حضرتِ ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ وراثت ارض سے تمام روئے زمین مراد ہے۔ جس کے مالک مسلمان ہونگے۔ اور جس کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئیگی۔ علامہ زمخشری قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زبور داؤد اور قرآن کا نوشتہ یہ ہے کہ روئے زمین سے باغیوں کے اقتدار کو ختم کردیا جائیگا اور ایماندار انسان اس کے وارث ہونگے[3]۔

ابوحیان غرناطی تصریح کرتے ہیں کہ وراثت اسلام کے فرمانبردار انسانوں کی حکومت کا نام ہے۔ یہ وہ ذمہ داری ہے جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت[4] کو حاصل ہوگی۔

نظریہ وراثت کی رو سے مسلمان ایک صالح، اصلح اور صلاحیت مند قوم ہیں۔

---

[1] دیکھو زبور کی کتاب (بائیبل سوسائٹی لاہور) (۱۰۵ ۱۱/۱۲) ص ۹۴۔
خدا کا عہد "میں ارض کنعان تجھے دیتا ہوں یہ تیری میراث کا حصہ ہے۔"

[2] کشاف زمخشری ج ۳ ص ۲۲ حوالہ بالا میں حسب ذیل تین آیتیں مذکور ہیں۔
ا۔ ان الارض یرثھا من عبادی الصالحون۔ یقیناً روئے زمین کے وارث میرے صالح اور صلاحیت مند بندے ہونگے۔ (انبیاء ۱۰۵ پ ۱۷)
ب۔ اورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا۔ ہم نے اس قوم کو وارث بنایا جو مشرق و مغرب کے اطراف میں بے اقتدار اور کمزور تھی۔
ج۔ ان الارض یورثھا من یشاء من عبادہ (موسیٰ علیہ السلام کا قول) یقیناً حکومتِ ارضی کا وارث وہ ہوتا ہے جس کو خدا اپنے بندوں سے انتخاب کرتا ہے۔

[3] روح المعانی ج ۱۷، ص ۹۵۔ [4] بحر المحیط ج ۶ ص ۳۴۴۔

حکومت ان کی میراث ہے۔ جب تک مسلمان اپنے تمام عقائد و اعمال کے ساتھ حقیقی معنی میں مسلمان ہیں۔ زمین ان کی میراث ہے اور ان کے قبضے میں ہونی چاہیے۔ اسلام صلاحیت کا معیار ہے۔ اس معیار کی موجودگی میں کوئی قوم ان کی میراث پر جائز قبضہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

اگر کسی وقت حکومت اصل وارثوں کے ہاتھ سے نکل جائے اور غیر وارثوں کے حملہ سے مرعوب ہو جائے تو اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ملکیت اور مملکت کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ملک کسی کی ہے، میراث کسی شخص کی ہے۔ قابض اور متصرف کوئی ہو جاتا ہے۔ اصل وارث کے لیے ضروری ہے کہ وہ گمشدہ صلاحیتوں کو دریافت کر کے میدانِ عمل میں آئے، اپنے حق کو حق سمجھے، صورتِ حال سے مرعوب نہ ہو، غاصبوں کو صلاحیت مند ہونے کی دستاویز نہ دے، اپنی میراث کو واپس لینے کے لیے عقیدہ و عمل کی فوجوں کو میدان میں لائے اور دنیا میں اپنے حق کو حاصل کر کے دم لے۔

نعمت اسلامی حکومت کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ یہ سیاسی سوسائٹی کا شیرازہ قائم کرتی ہے، دشمنوں کو دوستی کا سبق دیتی ہے۔ انسانوں میں قانون اخوت کو جاری کرتی ہے۔ اس کائنات میں ہر ضروری شے ایک نعمت ہے۔ چونکہ حکومت ایک موثر شے ہے اس لیے سب سے بڑی نعمت ہے[1]۔ جس طرح کائنات کے لیے خدا کا پیغام (نبوت) نعمت عظمیٰ ہے اسی طرح اس پیغام کے ماتحت جو حکومت قائم ہوتی ہے وہ بھی بے مثال نعمت ہے[2]۔

---

[1] روح المعانی ج ۷، ص ۹۴ (خلافت ارضی نعمت عامہ) دیکھو ج ا ص ۲۰۰۔ [2] اذکروا نعمت اللہ علیکم (مائدہ)

قرآن میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ہم نے تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمانوں کو فتح دی گئی، حکومت دی گئی جاہلیت کے منار کو منہدم کرنے کا موقع دیا گیا[1]۔

قرآن میں ایک مقام پر امت ابراہیمی کو مطیع اور نعمتوں پر شاکر کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس جگہ امامت ابراہیمی کے ساتھ نعمت کا بھی ذکر ہے اور دنیا کے عطیہ کا بھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت بھی دنیا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور خدا کا پسندیدہ عطیہ[2] ہے۔

علماءِ اُمت کے نظریات

اسلامی حکومت کی عام حقیقت کے متعلق علماءِ اسلام نے جستہ جستہ جن آراء کا اظہار کیا ہے اُس سے ہمارے علم و فکر کی صحیح رہنمائی ہوتی ہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی بیان کردہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی حکومت کی اصل نبوت ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ حکومت الہام کی قوت سے فیضیاب ہے[3]۔

امام ابو یوسفؒ کی تصریحات کے مطابق حکومت، ایک عظیم اور منجانب اللہ ذمہ داری ہے جس کا تعلق اُمت کی مجموعی ہیئت سے ہے[4]۔

علامہ ابن قیم الجوزی کی پیش کردہ ایک قانونی نظیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت،

---

[1] روح المعانی ج ۶ ص ۵۴۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۹۰ مزید تفصیل کے لیے دیکھو ص ۵۸۹-۵۸۰

[3] مجمع الزوائد و منبع الفوائد حافظ علی الہیثمی (۸۰۷ھ) ج ۵ ص ۱۸۹۔ کتاب الخلافۃ (باب کیف بدء الامامۃ)

[4] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صاحب الامام ابی حنیفہ۔ موعظۃ المولف ص ۳۔

ایک حاکمانہ قوت ہے جس کو اجرائے احکام کا اختیار حاصل ہوتا ہے[1]۔

محمد ابن الطقطقی اپنی تصنیف میں حکومت کو ریاست کی حیثیت دیتا ہے اس طرح اس کے اقتدار کی عمومیت اور اس کی شان کو ظاہر کرتا ہے[2]۔

علامہ ابن تیمیہ کی تصریح یہ ہے کہ حکومت ایک بہترین تنظیم ہے جس کا ذمہ دار اعلیٰ بہترین ہوتا ہے۔ حکومت کی مضبوط عمارت کے دو محکم ستون ہیں۔ قوت اور امانت، حکومت کو طاقتور رہنا چاہیے اور حکومت کو ان ذمہ داریوں کا پابند ہونا چاہیے جو خدا اور خدا کے بندوں کی امانت کے طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہیں[3]۔

علامہ ماوردی شافعی کی رائے میں حکومت مفوضہ قانونی (شرعی) ذمہ داری ہے، جس کی زمام زمانہ کے مدبر کے ہاتھ میں ہوتی ہے[4]۔

---

[1] الطرق الحکمیۃ علامہ ابن الجوزی (۷۵۱ھ) طبع الآداب والموید۔ مصر ۱۳۱۷ھ

[2] الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ محمد ابن الطقطقی ص ۱۰

[3] السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ ص ۷ طبع خیریہ ۱۳۲۲ھ

[4] الاحکام السلطانیہ ابوالحسن الماوردی باب فی عقد الامامۃ ص ۳۔

حکومتِ اعلیٰ

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱)

دفعہ (۳)

حکومت[1] بالادست (Paramomount Power)

حکومتِ الٰہی | اسلام کی حکومت اپنے اختیار و اقتدار، اپنی زندہ اور کارفرما طاقت، اپنی مذہبی تشکیل و تنظیم اور اپنی اجتماعی شیرازہ بندی کے لحاظ سے عرش عظیم کے فرمانروا کی حکومت ہے جو اعلیٰ اور بالادست حکومت کی حیثیت سے حکومتِ الٰہی (خدا کی حکومت) کے نام سے سرفراز ہے۔ اس حکومت کی رو سے دنیا ایک تکوینی وجود ہے۔ انسانی نظام ایک ربانی نظام ہے۔ حکومت ایک بلندپایہ ربانی حق ہے اور حکم ایک ربانی فعل ہے۔

دنیا کے انسان مجتمع ہو کر ایک بہترین معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ خدا کی بالادست طاقت اس پر حکومت کرتی ہے حکومت خدا کی چیز ہے اور وہ اس کو دے بھی سکتا ہے اور دے کر واپس بھی لے سکتا ہے[2]۔

---

[1] حکومت اللہ ہی کی ہے جو بالادست اور بڑا ہے۔ [2] توتی الملک الخ قرآن آل عمران۔ کشاف زمخشری ج ۱ ص ۱۸۲

فرمانروائے اعلیٰ

فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

اللہ فرمانروائے اعلیٰ اور شہنشاہ برحق ہے

دفعہ (۴)

حاکمِ بالادست

حکومت وسلطنت میں سب سے پہلی ہستی فرمانروائے اعلیٰ ہے۔ اسلامی حکومت اپنی موثر تنظیمات، اپنے احکام وقوانین کے اجراء اور اپنے اقتدار کے دائرہ میں خداوند تعالےٰ کی واحد ہستی کو فرمانروائے اعلیٰ (حکومت کا اصل مالک) سمجھتی ہے۔ یہ ہستی اعتقاد کا مرکز، اعمال کا محور، ضابطہ ودستور کا سرچشمہ، سیاست وسلطنت کا مبدأ، عاملانہ تدبر، حکیمانہ انصاف اور حاکمانہ تشکیلات کا مرجع اول ہے۔

اُس نے دنیا کو پیدا کیا ہے اور دنیا کی طرح حکومت کو بھی پیدا کیا ہے۔ حکومت اس کے فعل کا نام ہے اور حکم اس کے قانون کا جوہر۔ اس کی اعلیٰ طاقت نظامِ حکومت کی روح ہے اور اس کا قانونی ارادہ سلطنت کی عام تنظیم وترقی کی حقیقت ہے وہ اپنی بلند و برتر، مبارک ومعزز، غالب اور حاوی، غیر معمولی مگر واحد — یگانہ ویکتا — ہستی کے اعتبار سے حکومت کی فرض شناسی اور جد وجہد کا نشان امتیاز ہے۔ وہ ایک حقیقی وحدت ہے جس کے نام پر قوموں اور ملتوں، ملکوں اور مملکتوں۔ طبقوں اور جماعتوں مذہبوں اور سیاسی مسلکوں کی تمام تقسیمیں سمٹ کر ایک ہو جاتی ہیں اور اپنے عالمگیر توحد

کے لیے اپنے فطری رجحان کو ظاہر کرتی ہیں۔

دفعہ ۵ "فرمانروائے اعلیٰ کے نام"

وَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی[۱]

اسلامی حکومت کے فرمانروائے اعلیٰ کی حیثیت سے خداوند تعالیٰ کے اسمارِ حُسنیٰ یہ ہیں:۔

(ا) رب العالمین[۲] ـــــ فرمانروائے عالم (قرآن ۲/۱)

(ب) الملك القدوس ـــــ مقدس بادشاہ (قرآن ۲۳/۵۹)

(ج) الملك الحق ـــــ بادشاہ برحق (قرآن عظیم[۳] ۱۱۴/۲۰، ۱۱۶/۲۳)

(د) مالك الملك ـــــ فرمانروائے مملکت (۲۶/۳)

(ہ) احکم الحاکمین ـــــ حکمرانوں کا حکمراں (۴۵/۱۱)

(و) خیر الحاکمین ـــــ بہترین حکمراں (قرآن عظیم ۸۷/۷، ۱۰۹/۱۰، ۸۰/۱۲)

(ز) ملك الناس ـــــ انسانیت عامہ کا فرمانروا (۲/۱۱۴)

(ح) رب العرش العظیم ـــــ عرش عظیم کا فرمانروا (۱۲۹/۹)

دفعہ ۶ فرمانروائے اعلیٰ کی خصوصیات[۴]

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ[۵]

---

[۱] اللہ کے نام پسندیدہ ہیں۔ [۲] رب العالمین اپنے ایک خاص اور مستقل مفہوم کے لحاظ سے فرمانروائے عالم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دیکھو البحر المحیط امام ابوحیان اندلسی ج ۱ ص ۱۸ روح المعانی علامہ آلوسی ج ۱ ص ۷۳ (رب العالمین)
[۳] قرآن عظیم کی جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، ان کو ملاحظہ کیجیے ۲۷/۴۵ میں ۴۵ سے مراد سورت ہے اور ۲۷ سے آیت ہے۔ باقی حوالے بھی اسی طرز پر ہیں۔ [۴] اللہ اپنی حکومت کے کاموں میں غالب ہے، لیکن انسانی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔

اسلام کی حکومت کا فرمانروائے اعلیٰ بذاتِ خود ایک اعلیٰ مثال ہے (۲۷/۶) جس کی کوئی مثال موجود نہیں (۱/۱۱۲) بلند و بالا دست اور برحق حکمراں ہے (۱۶/۲۲) ہر دن نئی شان کا مالک ہے (۲۹/۵۵) اپنے کام میں غالب ہے (۲۱/۱۲) اپنے حکمبردار افراد پر بالادستی رکھتا ہے (۶۱/۶) انسان کی معاشی ضروریات کا ذمہ دار اور مضبوط قوت والا ہے (۵۸/۵۱) حق ہے عالی مرتبہ ہے۔ بڑا ہے (۶۲/۲۲) رب العرش (تخت اقتدار کا پروردگار ہے (۱/۱۱۴) حکمراں ہے، یگانہ ہے (۶/۱۱۲) باقی رہنے والی جلالت اور منزلت عامہ کا مالک ہے (۲۷/۵۵) قرآن حکیم

دفعہ۔ فرمانروائے اعلیٰ کے حقوق۔اختیارات

هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶۱/۶)

اسلام کے نظامِ حکومت میں فرمانروائے اعلیٰ کے حقوق و اختیارات سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کی طرح سیاست و سلطنت کے دائرہ میں اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ شاہانہ تصرفات کا حق رکھتا ہے اور مختار کل ہے (۲/۹۶) اگرچہ وہ سب کو دیکھتا ہے اور اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا (۱/۶) مگر حکومت اس کا خاص حق ہے (۴/۱۲) اسی کا حکم چلتا ہے (۱۲/۴۰) وہ اپنے عرشِ حکومت سے حکومت کرتا ہے (۳/۱۰) اس کا حکم زمین و آسمان ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے (۱۲/۶۵) اس نے معزز، مقتدر اور فرمانروائے عالم کی حیثیت سے روئے زمین کو انسانیت کا وطن بنایا انسانی زندگی کی تصویر احسن بنائی۔ معاشی لوازم پر انسان کو اختیار دیا (۶/۴۰)

اس نے اپنے اختیار سے بنی آدم کی عظمت کو قانون محکم کی صورت دی۔ خشکی کی سواریاں اور سمندر کے بحری بیڑے اس کے ہاتھ میں دیے اور معاشی ضرورتوں کے خزانوں

ل اللہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

سے مالا مال کیا اور روئے زمین کی اکثر چیزوں کے مقابلہ میں بلند پایہ گاہ بنایا (۷۰/۱۷) وہ اپنی بالادست اور اعلیٰ حکومت کے ماتحت انسان کو نمائندہ حکومت کا اختیار دیتا ہے (۳۹/۳۵) اور اپنے پیدا کیے ہوئے انسانی معاشرہ کے ہر رکن کو قانونِ عدل کے مطابق جزا و سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے (۲۶/۳۸) اس کے نظامِ تخلیق کا کوئی شعبہ بے کار نہیں (۱۹/۱۵) دنیا کا نظام اس کے حکم سے قائم ہے (۵/۳۲) سمندر کے بحری بیڑے اس کے حکم سے حرکت کرتے ہیں (۶۵/۲۲) اور دنیا کی ہر شے اس کے حکم سے انسان کے تصرف میں ہے (۱۳/۴۵) قرآنِ حکیم

قانونی تشریحات

اسلام کی حکومت اپنی سیاسی اور قانونی حیثیت میں فی نفسہ تمام حکومتوں کے مقابلہ میں جداگانہ اور خاص وجود رکھتی ہے۔ وہ اپنی بالادست حاکمیت کے اعتبار سے عصرِ حاضر اور عصرِ قدیم کے تمام انسانی نظریوں سے علیحدہ اپنا نظریۂ مستقل قائم کرتی ہے۔ اسلامی حکومت سب سے پہلے اعتقاد اور اعمال کے لیے ایک ایسی با اختیار ہستی کی حکمبرداری کا نظریہ پیش کرتی ہے جو اپنی مافوق العادہ اور حقیقی بالادستی کی بنا پر تمام انسانوں سے بالاتر اور تمام انسانوں کو بشرطِ اطاعت و استقامت برابر کا درجہ دیتی ہے۔

خدا کی حکومت کی بالادستی کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ تمام دنیا ایک بالادست وجود کے سایہ میں آباد ہے۔ تمام انسان انسانیت میں برابر ہیں۔ جملہ انسانوں کے حقوق یکساں ہیں۔ ہر انسان اپنے برابر کے درجہ کے انسان کی غلامی سے آزاد ہے۔

حکومتِ اعلیٰ کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔ اس اختیار میں شرکت کا دعویٰ ایک سرکشی اور طغیان ہے، جس کا مقابلہ کرنا خدا کے تمام آزاد، مساوی درجہ اور حکمبردار بندوں کا

فرض ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ ایک مطمع نظر ہے جس کا مقصد ومنشا یہ ہے کہ انسانی عقائد اور اعمال، رجحانات اور نظریات کے لیے ایک مرکز حقیقی پیدا ہو جائے دنیا آج تک اختیار و اقتدار کے جن مرکزوں کو تسلیم کرتی ہے وہ عقلاً نا قابلِ فہم ہیں۔ انسان کے لیے یہ بات کہیں زیادہ قرینِ عقل ہے کہ اپنے ہمسر اور برابر کے انسانوں کی جگہ اُس خدا کو حکومت کا مرکز تسلیم کرے جو بلند و برتر ہے اور تمام انسانوں کا یکساں مالک ہے اسلامی حکومت ہی وہ قانونی حکومت ہے جو خدا کی بالا دست حکومت کو حکمت عملی کا سرمنشا سمجھتی ہے

خُدا کی دنیا میں خدا کے نمائندے (رسول) جس نظریہ حکومت کو پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کا تعلق سرتاسر خدا کی بالا دست حکومت ہی سے رہا ہے۔

ہم مسلمانوں کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہستی عظیم و جلیل امام و رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن کے فرمان کی رو سے ان کو حکومت و امامت کا منصب حاصل تھا۔ یہ منصب بھی خدا کی بالا دست حکومت کے اعلیٰ تصورات ہی کا ثمرہ تھا۔

قرآن میں خداوند برتر کا فرمان ہے کہ ہم نے ابراہیم کو آسمان و زمین کے اقتدار اعلیٰ کا نظارہ دکھایا[1]۔ خود ابراہیم علیہ السلام درخواست پیش کرتے ہیں (رَبِّ هَبْ لِی حُکْمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ) اے حکمرانِ اعلیٰ! مجھ کو منصب حکومت پر سرفراز فرما اور مجھے دنیا کے اچھے انسانوں کی سوسائٹی میں جگہ مرحمت کر[2]۔

قرآن کے فرمان اور دعائے ابراہیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و اختیار کا سرچشمہ خدا کی بالا دست حکومت ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں جب تمام عرب خدا کے تصور سے بیگانہ ہو گیا تھا مکہ میں ایک خفیہ

---

[1] قرآن عظیم سورۂ الانعام (کذلک نری ابرٰھیم الخ)

[2] سورۃ الشعراء

سوسائٹی قائم ہوئی تھی، اس کے چار رکن تھے۔ ورقہ بن نوفل۔ عبیداللہ بن جحش، عثمان بن حویرث
زید بن عمرو بن نفیل۔ اس کے ارکان نے یہ عہد کیا تھا کہ قوم بالکل گمراہ ہوگئی ہے اس لیے ہم
مل کر ابراہیمی تحریک کو زندہ کریں گے۔

ان میں سے زید نے یہ اعلان کیا "میں ابراہیم کے دین پر قائم ہوں"۔ اس اعلان کی
ان کو کافی سزا ملی لیکن اس نے پھر ان الفاظ میں ، ابراہیمی مطمح نظر (حکومت الٰہی) کا اعلان کیا۔
"میں فرمانروائے واحد کو تسلیم کروں یا ہزاروں کو ایسی حالت میں جبکہ دینی امور
کا شیرازہ بکھر گیا ہے" زید کے قصیدہ کا ایک زبردست شعر یہ ہے

الی الملک الاعلیٰ اللذی لیس فوقہ — الٰہ ولا ربٌ یکون مدانیا

میں اس فرمانروائے اعلیٰ اور شہنشاہ بالادست کی جناب میں تعریف و تحسین کا ہدیہ بھیجتا ہوں
جس کے بعد نہ کوئی بالادست معبود ہے اور نہ فرمانروا اور پروردگار[1]۔

یہ عہد جاہلیت کا واقعہ ہے ظہور اسلام کے بعد اسلامی تصورات صاف طور پر نمایاں
ہوگئے اور خدا کی بالادست حکومت کا یہی نظریہ حکمت عملی کی صورت میں نظر آنے لگا۔ پیغمبر
اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلا حکم یہ ملا تھا (فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ) تم کو جو حکم دیا جائے اس کی تعمیل
کرو۔ علامہ سہیلی لکھتے ہیں کہ اس فرمان میں (خدا کی بالادست حکومت کا تصور بھی موجود ہے
وہ امر کے متعلق لکھتے ہیں "ھو امر اللہ تعالیٰ[2]" امر سے مراد خداوند اعلیٰ و برتر کی حاکمیت ہے"
یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی تنظیم و تدبیر کے کام میں شہنشاہ نہ تھے بلکہ حکومتِ
بالادست کے نمائندے تھے۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ مکہ کے امراء اور سرداروں نے جمع ہو کر کہا

---

[1] زید نے اپنی اس نظم کو غیر معمولی قوت کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پیش کیا ہے۔ مکمل نظم کے لیے دیکھو سیرت ابن ہشام
[2] روض الانف سہیلی ج ۱ ص ۱۴۸۔

کہ ہم آپ کو شہنشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں تو آپ نے شہنشاہیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں نہ سرمایہ دار بننا چاہتا ہوں نہ شہنشاہیت کا حریص ہوں بلکہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اور اُس کے حکم سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر رہا ہوں۔ میں تمہارے واسطے دنیا بھی لایا ہوں اور دنیا کے بعد کی زندگی بھی۔ اگر تم سرتابی کروگے تو میں اس وقت کا انتظار کرونگا، جب خدا کی حکومت منظر عام پر آئیگی اور خدا کا حکم فریقین میں فیصلہ کر دیگا۔[1]

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آنحضرت نے ایک مرتبہ منیٰ میں بلاد عرب کے نمائندوں کے سامنے ایک تقریر کی، آپ نے اس میں دنیا کو اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی، اس کے بعد ایک ایک قبیلے کے پاس پہنچے۔ ایک قبائلی عرب بحیرہ بن فراس نے سمجھا کہ آپ اپنی شہنشاہیت کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں۔ اس نے آپ سے بے واسطہ گفتگو کی اور کہا اگر ہم تمہاری رعایا بن جائیں، تم سے تعاون کریں اور آپ اپنے دشمنوں پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم تمہارے جانشین حکومت قرار دیے جائیں۔ آپ نے اس کا جواب یہ دیا (الامر الی اللہ یضعہ حیث یشاء)[2] حکومت کا معاملہ خدا سے متعلق ہے۔ وہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ حکومت کس کو ملیگی اور کس کو نہیں۔

آپ کا یہ جواب درحقیقت قرآن کے اس فرمان کے عین مطابق تھا کہ "حکومت خدا کی چیز ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کے ہاتھ سے چاہتا ہے نکال لیتا ہے" یہی وہ نظریہ ہے جو عہد رسالت اور عہد خلافت میں کارفرما تھا۔ اور جس موروثی بادشاہت کی تردید ہوئی ہے۔

اسلامی دور کی تمام تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ اسلامی تصورات کا پہلا مرکز ایک ایسے فرمانروائے اعلیٰ کا وجود ہے جو بالادست ہے اور حکومت بالادست کا سرچشمہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۶ (اسلام حمزہ) [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۶۴۔

(الحاکم با مراللہ) خدا کی حکومت کے ذمہ دار تھے اور خلفاء راشدین کی حکومت بھی اسی حکومت اعلیٰ کا عکس تھی وہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ان الحکم الا للہ پر ایمان رکھتے تھے اور دین کے دائرہ کی طرح دنیا کے دائرہ میں بھی خدا کی حاکمیت کو اپنے عقیدہ کی جان سمجھتے تھے۔

سنہ ۹ھ میں اسلامی حکومت کے صیغۂ خارجہ کے خطیب

ثابت بن قیس نے بنی تمیم کی سفارت کے سامنے حضور کے حکم سے تقریر کی تھی اُس کا پہلا جملہ یہ تھا:-

"ہم ہر قسم کی تعریف و تحسین کو اُس خدا کے لیے سزاوار سمجھتے ہیں جس نے دنیا کو پیدا کیا اور اس میں اپنی حکومت قائم کی"[1] یہ وہ طاقتور عقیدہ تھا جس نے فراموشکار دنیا کو ایک نئی سوسائٹی اور نئے نظریۂ حکومت سے آگاہ کیا۔ اور دنیا میں خدائے واحد کو فرمانروائے واحد ماننے کی طرح ڈالی۔ یہی وہ خیال تھا جس نے ایک خدا ترس قوم کی تشکیل کی۔ جس کا ہر فرد اچھا تھا اور خدا کی دنیا میں انسانی بہتری کو مقصد سمجھتا تھا جو تمام بھلائیوں کو رواج دیتا تھا اور تمام برائیوں کو ختم کر دیتا تھا۔ یہ وہ قوم تھی جو ساری دنیا کو خدا کے کلمۂ بلند کے نیچے آزاد، برابر اور بھائی بھائی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے تمام کام، حکومت کی ذمہ داریاں، تدبیر و تنظیم، تبلیغ و تعلیم، تعمیر و اصلاح، صلح و جنگ، معاہدے اور میثاق خدا کے نام سے شروع ہوتے تھے اور خدا کی ذمہ داری پر ختم کیے جاتے تھے۔ خدا کے حقیقی تصور اور سچے عرفان نے ان کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ کا انکار کر کے دنیا میں کوئی اچھی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے خدا کو اپنا پالن ہار فرمانروا سمجھا، وہ دنیا کی قوموں سے ٹوٹ کر ایک خدا کی عبادتگذار اور اطاعت شعار قوم بن گئے اور ایک ہو گئے۔ اُنہوں نے دنیا

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۵۔

میں اس طرز سے حکومت کی کہ دنیا آج تک اس کی مثال نہیں پیش کر سکی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے اوپر بالادست حکومت موجود ہے، کل اُس کے سامنے پیش ہونا ہے اور ایک ایک غلطی کی جوابدہی کرنی ہے۔

اقتدارِ اعلیٰ

وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ [1]

دفعہ ۸ اقتدار اعلیٰ

وہ اقتدار جس کے اوپر کوئی اقتدار نہ ہو۔ وہ بالادست طاقت جس سے بالا کوئی طاقت نہ ہو، اقتدار اعلیٰ ہے اور وہ ہستی جو اس اقتدار کی مالک ہو" صاحب اقتدار اعلیٰ" ہے یا مقتدر اعلیٰ۔ سلطنت میں اقتدار اعلیٰ سب سے بلند شے ہے اور مقتدر اعلیٰ سب سے برتر ہستی۔

اسلام کے قانونِ حکومت میں خداوند عالم کی مطلق حاکمیت، قدرت اور ہمہ گیر غلبہ اقتدار اعلیٰ ہے اور خداوند برتر کی ہستی "صاحبِ اقتدار اعلیٰ"

قرآن عظیم اور اقتدار اعلیٰ اقتدار اعلیٰ کے لفظ کا جو مفہوم ہے قرآن اُس کو ملکوت قرار دیتا ہے۔ قرآن نے جس طرح حکومت، خلافت اور امامت کے الفاظ سے اپنے رجحان حکومت، کو ظاہر کیا ہے وہاں ملکوت کا لفظ بھی اس رجحان کے غلبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ اسلامی حکومت کا مقتدر اعلیٰ اللہ ہے اور وہ اپنی خدائی کے عرش سے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرتا ہے اس لیے قرآن میں ملکوت کا لفظ خداوند تعالیٰ کے نام سے خاص طور پر مربوط رہتا ہے۔

نظائر (۱) مَنۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ (۲۳ ۱۳) قرآن حکیم

---

[1] اللہ حکمرانی کرتا ہے، کوئی اُس کے حکم کو ہٹانے والا نہیں ہے۔

(ب) فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ (۳۶ : ۸۳)

(ج) كَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الانعام)

قرآن ایک موثر سوال کرتا ہے، پھر ایک موثر جواب دیتا ہے۔ اس طرح حکومت کے اس رجحان کو ظاہر کرتا ہے جس کا تعلق اسلامی مملکت کے اقتدار اعلیٰ سے ہے۔

سوال :۔ وہ کون ہے جس کے تصرف میں ہر شے کا اقتدار ہے؟

جواب :۔ وہ پاکیزہ ذات، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا اقتدار ہے۔

تیسری آیت میں مقتدرِ اعلیٰ خود اعلان فرماتا ہے کہ ہم نے اسی طرح ابراہیم کو آسمان و زمین کے اقتدار اعلیٰ کے عجائبات کا نظارہ دکھایا۔

ہمارے علماءِ قانون، ملکوت کا ترجمہ سلطان کرتے ہیں۔ اُردو زبان کی اصطلاح پر نہ جائیے، قرآن کی اصطلاح میں سلطان کا صحیح مفہوم غلبہ اور صحیح تر مفہوم اقتدار اعلیٰ ہے۔ قرآن کی سیاسی اصطلاحوں کے سب سے بڑے عالم امام راغب اصفہانی اپنی کتاب میں حکومت، فرمانروا، اور اقتدار اعلیٰ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

حکومت :۔ جمہور کی سوسائٹی میں امر و نہی (مثبت اور منفی) احکام دینے کے لیے حاکمانہ تصرف[1]۔

فرمانروا :۔ وہ ہستی جو سیاست کی مشین کو چلائے[2]۔

اقتدار اعلیٰ :۔ وہ اقتدار جو صرف فرمانروا کا امتیاز ہو[3]۔

علامہ ابن کثیر[4] دمشقی ملکوت کو سلطان[5] (اقتدار) قرار دیتے ہیں۔ اور علامہ آلوسی

---

[1] ہو التصریف بالامر والنہی فی الجمھور۔ مفردات القرآن امام راغب اصفہانی ص ۱۲۵۔
[2] اسم لکل من یملک السیاست ۔ ایضاً ص ۱۲۶، مطبوعہ خیریہ قاہرہ۔ [3] والملکوت مختص بملک۔
[4] حافظ عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی متوفی (۷۷۴ھ) [5] (برصفحہ ۲۶۸)

بغدادی کی علمی نظر میں ملکوت میں مبالغہ یعنی زیادہ سے زیادہ غلبہ مدنظر ہے۔ ملکوت کیا ہے۔ سلطان قاہر، صرف اقتدار نہیں بلکہ اقتدار اعلیٰ۔ پھر یہ اقتدار بھی حکومت کے بلند مرتبہ فرمانروا کا خاصہ لازمہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ملکت اور اقتدار اعلیٰ[۲۶] کا مالک ہے اس لیے ملکوتی اقتدار اسی کا حق خاص ہے۔ اسی کے ساتھ خاص ہے اور اسی کے غلبہ اور قدرت کا نشانِ امتیاز ہے۔

قانونی تشریحات

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات | اقتدار اعلیٰ کیا ہے؟ اس کا نشان کیا ہے، اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ وہ خصوصیات جن سے ہم اس کو پہچان سکیں ــــــ ؟

قرآنِ عظیم کے ضابطہ اجتماعی میں اقتدار اعلیٰ کی پہچان کے لیے جو خصوصیات درج کی گئی ہیں اُن کو اس زمانہ کے سیاسی میلان نے بھی قبول کرلیا ہے[۱] لیکن ایک تباہ کن فرق کے ساتھ اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اور اُس کی خصوصیات کو تسلیم کرلیا گیا اور مقتدر اعلیٰ سے انکار کردیا گیا ہے۔

قرآن کی رو سے اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات یہ ہیں۔ وحدتِ اقتدار، قدرت علی الاطلاق، بالادستی کے ساتھ ہر عمل اور ہر قول کی آزادی، جلالت (اعلیٰ منزلت عامہ) یعنی سب سے زیادہ بلند ہونا، لازوال زندگی۔

اسلامی نظام حکومت میں یہ تمام خصوصیات شہنشاہ کائنات خداوند عالم کے

(حاشیہ صفحہ ۲۶۷) [۲۶] اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض (قرآن المائدہ) تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۰۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱] روح المعانی ج ۷ ص ۱۷۱ [۲] ایضاً ج ۵ ص ۱۴۷، منیریہ مصر۔ [۳] اس خیال کی تائید کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں دیکھیے۔ معاہدہ عمرانی روسو کتاب ۲ باب ۲ ص ۴۴ نظریہ سلطنت بلنچلی باب ۱ س ۵۰۱

وجود کا خاصۂ لازمہ ہیں۔

ا۔ وحدتِ اقتدار | اسلامی حکومت کا اقتدار اعلیٰ اپنے اقتدار میں قطعی وحدت کا مالک ہے چونکہ صاحب اقتدار ہر حیثیت سے یگانہ و یکتا ہے اور ذاتی وحدت کا مالک ہے اس لیے اس کے اقتدار کی وحدت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تسلیم کرنا لازمی ہے۔

علامہ ابی البقاء لکھتے ہیں کہ وحدت ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ وحدت کے معنی یہ ہیں کہ کثرت نہ ہو۔ خداوند برتر حقیقی اور ذاتی وحدت کا مالک ہے۔ اس کی وحدت اقتدار و کمال کے لحاظ سے موثر ہے۔ اور عام انتظام کے دائرہ میں بغیر کسی شرکت کے کارفرما ہوتی ہے۔[1]

قرآن عظیم[2] نے حکومت کی وحدت کو دو جملوں میں پیش کیا ہے، خدا کی سلطنت ایک ایسی وحدت ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ (لم یکن لہ شریک فی الملک ۲/۱۸) حکومت صرف خدائے واحد کے لیے خاص ہے۔ (ان الحکم الا للہ ۴/۱۲)

ب۔ قدرت عامہ | اقتدار اور قدرت ایک شئے ہیں۔ اختیار اعلیٰ اور اقتدار اعلیٰ ایک چیز ہیں اور ہم اس کو خدائے برتر کے حاکمانہ اقتدار کی ایک خصوصیت تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن عظیم دعویٰ کرتا ہے "زمین و آسمان کے درمیان (ہر جگہ) خدا کا حکم اترتا ہے تاکہ تم اس حقیقت کو پہچان لو کہ اللہ کو ہر شئے پر قدرتِ عامہ حاصل[3] ہے۔

علامہ راغب اصفہانی یہ تصریح کرتے ہیں[4] کہ قدرت علی الاطلاق ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی مکمل نسبت خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ وہی ہے جس کی

---

[1] کلیات العلوم ابو البقاء حنفی (وحد) ص ۶۷۳-۶۷۴- طبع آستانہ

[2] قرآن عظیم کے نظریہ وحدت کے لیے دیکھو۔ مفردات القرآن امام راغب (شرک) ص ۲۱۸ (وحد) ص ۲۰۸

[3] قرآن عظیم ۱۲/۲۸ تائیدی نظائر ۲/۲، ۹/۱۰، ۴۷/۱۶، ۴۵/۴۴ دیکھو مفہوم قرآنی

[4] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی (قدر) ص ۴۷-۲۷۶-

اعلیٰ ہستی اعلیٰ درجہ کا اقتدار اور قدرت رکھتی ہے۔ وہ ایک قادر اور مقتدر ہستی کی حیثیت سے اپنے حکم اور حکومت کے کام میں قابل تعریف تشخص کا مالک ہے۔

ج۔ بالادستی | اقتدار اعلیٰ سلطنت کے اندر ماتحت[۱] طاقت نہیں ہے۔ بلکہ بالادستی اس کی روح ہے جو ہر شئے کی طرح سلطنت سے بھی اوپر ہے۔ بالادستی اسلام کے اقتدار اعلیٰ کی حقیقت ہے۔ قرآن خدا کی حاکمیت اور بالادستی کے متعلق اپنا قانونی نظریہ پیش کرتا ہے۔

فتعالی اللہ الملک الحق۔ اللہ بادشاہ برحق! بلند و بالادست[۲] ہے۔ علامہ ابن اثیر جزری اس قانونی نظریہ کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"خداوند عالم بلند و بالادست ہے" اس بالادستی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے مرتبہ اور حکومت میں اتنا اونچا ہے کہ اس سے کوئی اونچا نہیں[۳]" اس تصریح کے مطابق اگر کسی گوشہ سے بالادستی کا دعویٰ ہوگا تو یہ اسلام کے عالمگیر اقتدار اعلیٰ کے لیے ایک چیلنج ہوگا جس کا مقابلہ اسلام کا نظام حکومت پوری طرح کریگا۔

۱۔ "اللہ بلند و بالادست اور باعظمت ہے" (انہ ھو العلی الکبیر)

۲۔ "اللہ کا نعرہ ہی تمام نعروں سے بلند ہے" (کلمۃ اللہ ھی العلیا)

قرآن نے ان دونوں اصولی دفعات کو پیش کیا ہے۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ بلند اور بڑا ہونا خداوند عالم کی خصوصیت ہے۔ ہم کہہ سکتے

---

[۱] یہ عصر حاضر کی رائے ہے جس کو بلنچلی نے اپنی تعلیقات میں روسو کے نظریات کے ساتھ ان الفاظ میں درج کیا ہے "اقتدار اعلیٰ قانون عامہ کے اندر داخل ہے اس سے بالاتر نہیں۔ نظریہ سلطنت مقالہ، ص ۵۰۴

[۲] ایضاح الادلہ قضاء قاضی ص ۲۷۸-۲۷۹۔ حضرت شیخ الہند مرحوم نے اسی حیثیت سے بالادست کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

[۳] النہایۃ ابن الاثیر ج ۳ فصل (ع) "علا" ص ۱۴۱۔ الدر النثیر علامہ سیوطی ج ۳ ص ۱۴۱۔

ہیں کہ بنی اسرائیل کے دور میں فرعون کا یہ نعرہ کہ میں "بالادست فرمانروا ہوں" ایک چیلنج تھا جس میں شیطان کی رہنمائی کو دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اسلام کے اقتدار اعلیٰ کو فتح مبین حاصل ہو گئی۔[۱]

اسلامی اجتماعیات کے ماہرین نے اپنی تصریحات میں اسلام کے اقتدار اعلیٰ کے متعلق ایک قطعی راہ اختیار کی ہے۔ ان کی تمام کوششیں اس حقیقت کے اندر گم ہو جاتی ہیں کہ خدا کی حکومت کا اقتدار اعلیٰ بجائے خود خداوند برتر کا اقتدار اعلیٰ ہے۔

امام محمد غزالی اپنی ایک سیاسی تصنیف میں اسلامی حکومت کے مقتدر اعلیٰ کی قدرت عامہ اور بالادستی کے متعلق لکھتے ہیں:-

"دنیا کی ہر چیز اس کے تحت سلطنت کے ماتحت ہے اور تخت اس کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ اس کا اقتدار، قدرتِ عامہ اور حکومت کمال کے ایسے منتہا پر ہے کہ اس سے اوپر کوئی اقتدار نہیں۔ ہر کمی سے محفوظ اور ہر نقصان سے خالی اس کے غلبے اور تسخیر کی قوتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ حکومت اس کی چیز ہے اور سلطنت اس کی ملک"[۲]

اس بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام حکومت کا ایک تصور رکھتا ہے۔ یہ حکومت ایک اقتدار اعلیٰ سے مقتدر ہے اور اقتدار اعلیٰ کو اپنے عرش پر بالادستی حاصل ہے۔

۵۔ آزادی: ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کو حکم اور اجرائے حکم کی آزادی حاصل ہونی چاہیے کیونکہ یہ چیز بالادستی کی حقیقت ہے۔ بلنچلی نئے نظریہ کے مطابق کہتا ہے کہ "اقتدار کی آزادی اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں داخل ہے"[۳]

---

[۱] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی (علیٰ)، دیکھو (العلو ضد السفل) بالادستی زیردستی کے برعکس ہے۔ (انا ربکم الاعلیٰ) نعرۂ فرعون۔ [۲] التبر المسبوک فی نصائح الملوک امام محمد بن محمد غزالی (۵۰۵ھ) جمالیہ مصر طبع ۱۳۰۶ھ اصل دوم ص ۶-۷۔ [۳] نظریہ سلطنت بلنچلی ج۲ ص ۵۰۳

قرآنِ عظیم نے صدیوں پہلے تصریح کی ہے کہ اسلامی حکومت کا مقتدر اعلیٰ اپنے حکم میں آزاد ہے جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور اس کی آزادی کو کوئی پابندی اور کسی قسم کی مجبوری لاحق نہیں ہوسکتی[1]۔

سلطنت کے قانون میں آزادی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو اور حکومت کا تمام نظام اس کے سامنے مسئول ہو۔ خداوند عالم اپنے تصرفات میں نہ کسی کے سامنے جوابدہ ہے اور نہ کسی کا پابند (لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُم یُسْئَلُون) البتہ ہماری زندگی کا تمام اجتماعی نظام اس کے سامنے جوابدہ ہے[2]۔

جلالت عامہ | اقتدار اعلیٰ کی حاکمیت کے لیے جلالت ایک ضروری عنصر ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ جلالت (عام عظمت) ایک خاص وصف ہے جو خداوند برتر کے لیے خاص ہے[3]۔

زندگی و دوام | لازوال زندگی اقتدار اعلیٰ کی خصوصیت ہے زندگی اور ہمیشگی وہ اہم اوصاف ہیں جن کا سرچشمہ خدائے تعالیٰ کی ذات ہے[4]۔ ایک زندہ اجتماعی نظام کے لیے زندہ اقتدار کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی تکمیل اسلامی نظام حکومت کا اقتدار اعلیٰ کرتا ہے۔

قرآنِ عظیم نے اپنے قانون مدنی میں یہ اصول پیش کیا ہے "قتل انسانیت عامہ کا قتل ہے اور زندگی انسانیت عامہ کی زندگی ہے" قاتل جب ایک انسان کو قتل کرتا ہے تو وہ انسانیت عامہ کو قتل کر دیتا ہے، اور جو شخص انسانی زندگی کا احترام کرتا ہے تو وہ انسانیت عامہ کی زندگی کی بقاء کا احترام کرتا ہے۔ اس قانون میں جو زندگی نظر آتی ہے اس کا اصل

---

[1] قرآن عظیم س ۱۴۔ آیت ۲۷۔ س ۳۵۔ آیت ۴۴۔ س ۱۳۔ آیت ۴۱۔

[2] دستور اساسی امامت اُمت علامہ منصور انصاری۔ مادہ (۲) ص ۲۳ طبع ۱۳۵۰ھ

[3] مفردات القرآن (جل الجلالۃ)

[4] کلیات ابوالبقاء (حیاۃ) ص ۳۰۱

مرکز بلند و برتر خدا کی ذات ہے[1]۔ ہمیں کہنا چاہیے کہ اسلامی اقتدار اعلیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اسلامی حکومت اس کے ماتحت زندہ ہے اور اگر جد و جہد کا تسلسل باقی رہ تو یہ حکومت بھی دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہ سکیگی۔

نظائر قرآنِ عظیم میں حکومت و سلطنت کے ذکر کے ساتھ خداوندِ حکومت کے دائرہ میں خدا کے پیغمبروں کو جو اقتدار حاصل ہوتا ہے وہ بھی خدا کے اقتدار کا عطیہ ہوتا ہے[2]۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے علما، اجتماعیات امامت و خلافت (حکومت و سلطنت) کے ذکر میں دستوری ضابطوں سے پہلے، خدا کے اقتدار اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی مفردات کے شروع میں خداوند تعالیٰ کو قوانین کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں[3]۔

امام ابوالحسن ماوردی اپنی سیاسی تصنیف الاحکام السلطانیہ کو اقتدار اعلیٰ کی جلالت اور منزلت عامہ کے ذکر سے شروع کرتے ہیں[4]۔

امام محمد غزالی نے سیاست و سلطنت کے متعلق اپنے زمانہ میں جو کتاب لکھی ہے اس میں وہ سب سے پہلے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ عالمگیر حکمرانی خداوند برتر کا انعام ہے خدا کے قانون اقتدار کو تسلیم کرنا اسلامی حکومت کا پہلا قانون ہے[5]۔

امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب السیاسۃ الشرعیہ کی ابتداء خداوند بلند و برتر کے اقتدار اور غلبہ عام کے ذکر سے کی ہے[6]۔

حکیم ابونصر فارابی نے متمدن شہریت پر جو عالمانہ کتاب آراء اہل المدینۃ الفاضلہ مرتب

---

[1] مفردات القرآن (رحیم)، ص ۲، ۳، ۴- ۳۰۴
[2] مفردات القرآن امام راغب سلط ص ۱۹۷
[3] مفردات القرآن (راغب) ص ۲
[4] الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲
[5] التبر المسبوک فی نصائح الملوک ص ۲-۸
[6] السیاسۃ الشرعیہ (ابن تیمیہ) ص ۲

کی ہے اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ عظمت عامہ، جلالتِ مرتبہ کے علاوہ ان تمام اوصاف کا ذکر کیا ہے جو اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات ہیں اور جن کو یورپ کے دماغوں نے غلطی سے دنیاوی اقتدار اعلیٰ کے لیے خاص کر دیا ہے۔

حکیم فارابی کا بیان ہے کہ تمام دنیا سے پہلے ایک پہلا وجود ہے جو مکمل ہے سب سے اوپر اور سب سے پہلے ہے اور تمام پابندیوں سے آزاد۔ اس کی مثال لانا ناممکن ہے اس کے برابر کسی کا درجہ ہونا ناقابل قبول ہے۔ یہ وجود اقتدار کی وحدت کا مالک ہے، زندہ ہے اور بطور خود زندگی ہے۔ اپنے وجود کے لحاظ سے اتم ہے۔ زندگی کا منبع ہے عظمت عامہ اور جلالت کا مالک ہے۔

جدید نظریہ اور اس کی تنقید

جدید نظریہ، اقتدار اعلیٰ کی ان تمام خصوصیات کو تسلیم کرتا ہے جن کو صدہا سال قبل اسلام کے علما، اجتماعیات نے پیش کیا ہے۔ جدید نظریہ قدیم نظریہ کی حرف بحرف پیروی ہے مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ عصر جدید کے علماء نے "صاحب اقتدار اعلیٰ" کی ہستی کو بدل دیا ہے۔

وہ یہ تو مانتے ہیں کہ خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ "خدا نے انسانی فطرت کو بنایا اور حکومت عالم میں اس کی مرضی شریک ہے لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ جدید علم السیاست خدا کے طریقوں پر گامزن نہیں[2] ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید نظریہ خدا کی بنائی ہوئی فطرت سے انکار کر کے اپنے عقلی رجحان پر اعتماد کرتا ہے۔ عقل کی مجبوری مسلمہ شے ہے عقل کی ٹھوکریں بھی مشہور ہیں۔ یہ

[1] آرا، اہل المدینۃ الفاضلہ (فارابی) لیڈن میں اہل فرنگ کی سعی جمیل سے طبع ہوئی ہے۔ مستشرقین نے اس سے استفادہ کرنے میں پہل کی ہے۔

[2] نظریہ سلطنت (بلنچلی) دور جدید کی سلطنت م ۱ باب ۶ ص ۶۳۔

بنیادی الجھن ہے جس نے جدید علماء کی رائوں کی قطعیت کو بہت سے اجزاء میں منتشر کر دیا ہے۔

علم السلطنت کے جدید ماہر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ کے لیے آزادی اعلیٰ منزلت عامہ جسے اہل روما جلالت (Majestas) کہتے تھے۔ اختیارات عامہ کا عام اور وسیع ہونا سلطنت کے دائرہ میں سب سے بلند شے ہونا اور اپنے اقتدار میں وحدت کا مالک ہونا ضروری ہے[1]۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مقتدر اعلیٰ کے تعین میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ سلطنت کی دائمی اور علی الاطلاق طاقت اقتدار اعلیٰ ہے۔ یہ بودین کا نظریہ ہے، اس کا اردان الفاظ میں کیا گیا کہ کسی مجموعی سلطنت کو اقتدار مطلق حاصل نہیں کیونکہ وہ خارجی طور پر دوسری سلطنتوں کی پابند ہے۔"

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ سلطنت کا حکمراں (بادشاہ) اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے لوئس چہاردہم (۱۷۹۳ء) خود کو مقتدر اعلیٰ سمجھتا تھا۔ ہنوور کے اعلان ۱۸۱۴ء میں مرقوم ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کا بادشاہ اپنے اقتدار شاہانہ کا مالک ہے[2]۔

انگلستان کے قانون میں تاج (بادشاہ کی ذات) مقتدر اعلیٰ ہے اگرچہ بادشاہ کے اقتدار کو مذہب سے تصدیق حاصل کرنی پڑتی ہے لیکن انگلستان کا شاہی اقتدار ایک ناقابل فہم شے ہے۔ بادشاہ اپنے اقتدار اعلیٰ میں ازلی اور ابدی ہے۔ بادشاہ کبھی نہیں مرتا بادشاہ عزت کا سرچشمہ، مذہب اور حکومت کا مالک ہے۔ ان خدائی اختیارات کی رو سے اصولاً بادشاہ کے حقوق تو بہت ہیں مگر وہ عملی طور پر تسلیم نہیں کیے جاتے۔ صدیوں سے

---

[1] نظریۂ سلطنت بلنچلی م ۷ ص ۵۰۳۔

[2] ایضاً مقالہ ۷ اقتدار اعلیٰ ص ۵۰۲-۵۰۳۔

معطل چلے آتے ہیں[1]۔

انگلستان کی حکومت کا تمام نظام فی نفسہ پیچیدگیوں کا مجموعہ ہے جس پر سلجھے ہوئے انسانی دماغوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس کے اقتدار اعلیٰ کو سوائے ایک حق کے جملہ خدائی حقوق حاصل ہیں جن کو اسلام کی قانونی فطرت عجوبہ زا سمجھتی ہے۔

(۳) تیسرا نظریہ یہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے لیکن علماء سیاست کے نزدیک یہ نظریہ زیادہ حقیقی نہیں ہے[2]۔ سنہ ۱۳۰۶ء میں لوئس نے ایک فرمان کی رو سے ووٹروں کو اقتدار اعلیٰ عطا کر دیا تھا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ عوام اور اُن کے منتخب ارکان ووٹروں کے محکوم ہیں۔ اس عجیب سی بات کو تسلیم کرنا بھی آسان کام نہیں ہے[3]۔

(۴) روسو کا نظریہ یہ ہے کہ مرضی عامہ یعنی قوم کی عام خوشی اقتدار[4] اعلیٰ ہے روسو نے غلطی سے مرضی اعلیٰ کو اقتدار اعلیٰ بنا دیا، مرضی کا اقتدار اعلیٰ ہونا مشکل ہے کیونکہ وہ فی نفسہ قانون بھی نہیں بلکہ قانون کا موجب ہے[5]۔

مندرجہ بالا نظریوں کی تنقید کے جواب میں جدید دنیا سے خطاب کر کے حضرت یوسفؑ کے الفاظ میں صرف یہ کہنا کافی ہے " دنیا کے قید خانے کے غلامو انسانیت عامہ کے لیے ایک اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لینا موجب صلاح ہے یا قسم قسم کے بہت سے اعلیٰ اقتدارات کی الجھنوں میں گرفتار ہو جانا[6]"۔

[1] گورنمنٹ انگریزی کے اصول و طریق حکومت (Theory and Practice British Government) باب ۱-۲-۳ ص ۱-۲۷ (پی-آر-بی-ایس لاہور)
[2] مبادی سیاسیات شروانی باب ۶۔ اقتدار اعلیٰ۔ طبع دوم [3] نظریہ سلطنت م، ص ۲۰۵ حاشیہ
[4] معاہدہ عمرانی روسو اقتدار اعلیٰ کتاب ۲ ص ۱، ۹-۷ [5] نظریہ سلطنت م، ص ۲۰۴۔ تعلیقات
[6] قرآن عظیم سورۂ یوسف (یہاں آیت کا صحیح مفہوم پیش کیا گیا۔

ایک بلند و برتر یگانہ مقتدر ذوالجلال، مالک الملک اور عرش عظیم کے فرمانروا کو زندگی کی تمام سرگرمیوں کا۔ جملہ تصورات اور جملہ عقائد کا۔ تمام ذہنی ترقیات اور اجتماعی سربلندیوں کا مرکز تسلیم کر کے دنیا میں امن و سلامتی کی حکومت قائم کرنا بہتر ہے یا لاتعداد حکومتوں اور اقتداروں کو تسلیم کر کے انسانوں کو جماعت در جماعت تقسیم کر کے جنگ و جدال کے جہنم میں جھونک دینا! آج دنیا جہنم کا نمونہ پیش کر رہی ہے صرف اس لئے کہ انسان نے حقیقی اقتدار اعلیٰ سے بغاوت کر کے اقتدار کے شیطانی مرکزوں کو قیام کا موقع دیا۔ قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ جب اقتدار کی حقیقی وحدت کو تقسیم کیا جائے گا تو روئے زمین پر فساد کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گا۔

حکومت کو ایک مرکزی نظم کی ضرورت ہے اور مرکزی نظم کو مرکزی وحدت کی۔ اقتدار اعلیٰ کی وحدت کے معنی ہیں حکومت کی تمام تنظیمات کی وحدت اور اس کو نظر انداز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اپنی شیرازہ بندی سے محروم ہو رہی ہے[۵]۔

---

۵ العروۃ الوثقیٰ۔ سید جمال الدین افغانی۔ اسباب حفظ الملک ص ۲۲۹۔ انحطاط المسلمین ص ۹۲

دفعہ (۹) ریاست عامہ

نیابتی حکومت

الخلافۃ نیابۃ فی حفظ الدین وسیاسۃ الدنیا" ابن خلدون"

الامامۃ ریاسۃ عامۃ فی امور الدین والدنیا" شرح مواقف"

اسلامی حکومت اپنے تنظیمی دائرہ میں ریاست عامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ حکومت دنیا میں حکومتِ بالادست کے ماتحت ہے اور انسانی تنظیم کی حیثیت سے نیابتی حکومت (خلافت عظمیٰ) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا تعلق عام بندگانِ خدا سے ہے، عوام کے دینی مفاد اور دنیاوی مصلحتوں کو اچھے طرز پر پورا کرنا، عوام کی حکومت کو بہتر سے بہتر طریقہ پر چلانا اور اس کام میں حکومتِ بالادست کی بالادستی کا خیال رکھنا اس حکومت کا فرض ہے[۱]۔

اسلامی حکومت، ریاست عامہ کی حیثیت سے امامت کبریٰ بھی ہے چونکہ اس کے ضبط و نظم میں عوام کی بہتری کو دخل ہے اس لیے وہ ریاست[۲] عامہ ہے۔ اور چونکہ وہ مطلق العنان نہیں ہے بلکہ عوام کی رہنما ہے اس لیے اس کو امامت کبریٰ (عظیم الشان لیڈرشپ کا نام دیا گیا ہے۔

(یادداشت:- چونکہ اسلامی حکومت کی حقیقت کا اظہار امامتِ کبریٰ، ریاستِ عامہ اور خلافت عظمیٰ (نیابتی حکومت) کے اصطلاحی الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے اس لیے آئندہ صفحات پر مناسب موقعہ انہی ناموں کو اختیار کیا گیا ہے)

---

[۱] البحر المحیط ج ۱ ص ۱۴۰ (ابو حیان اندلسی) مقدمہ ابن خلدون ف ۲۶ ص ۱۳۴ - مفردات امام راغب

[۲] کلیات العلوم ابوالبقا حنفی ص ۱۳۳ - شرح المواقف ج ۸ ص ۳۴۵، ردالمختار ج ۱ ص ۵۱۱

دفعہ ۱ - اسلامی حکومت کا قانون

اسلامی حکومت اپنی حکمت علمی کے قلمرو میں ایک مکمل، بلند و برتر تحریری مجموعۂ قانون (قرآن حکیم اور کتاب مسطور) کی پابند ہے - یہ قانون کائنات کے خالق (فرمانروائے اعلیٰ) کی طرف سے بصورت محکم نازل ہوا ہے اور الہام کی قوت سے فیضیاب ہے - یہی وہ اساسی قانون ہے جو حکومت کی روح اور حاکمیت کے پسندیدہ ضابطوں کی جان ہے، انسانیت عامہ کی صحیح رہنمائی، انصاف کا قیام، معاشرہ کی قانونی شیرازہ بندی کرنا اور اختلافات کو مٹانا اس کا کام ہے -

انسانی حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا اور ریاست و سلطنت کے ربانی مطمح نظر کو نافذ کرنا اس کی ذمہ داری ہے -

یہ قانون صحت و صداقت اور تواتر کے ساتھ تغیر و تبدل کے بغیر بے کم و کاست پہنچا ہے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا ہے جو ریاست عامہ کے قیام پر مامور ہیں اس میں زندگی کے ہر اجتماعی رجحان کے لیے ایک قابل عمل ضابطہ موجود ہے - یہ قانون خاص طور پر انسانی حیات کے اس میلان کو بے حد قوت پہنچاتا ہے جس کا تعلق انسانیت عامہ کی جولانگاہ میں خدا کی بالادست حکومت سے ہے - یہی وہ مجموعۂ قانون ہے جو انسان کی برتری کو ایک مستقل اصول کی صورت دیتا ہے اور دنیا میں انسانی اقتدار کو صحیح اور سچی حکومت کے ماتحت دیکھنا چاہتا ہے -

اسلام کا قانون وحدانی قوت کا مالک ہے - وہ ایک مرکز وحید اور ذاتِ واحد کی طرف سے عائد ہوتا ہے - اسلامی حکومت کے دائرہ میں قانونِ سُنت، قانون صحابہ، قانون

شوریٰ، قانونِ امامت (قائدِ حکومت کے جاری کردہ قانون) اجماعِ اُمت اور سوادِ اعظم کے آئینی فیصلوں کو بھی قانون کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس سے اسلامی قانون (قرآن) کے وحدانی حق پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑتا کیونکہ مندرجہ سب صورتوں میں قانون اور اس کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہ سب اصل قانون کی تشریح، تعبیر اور تفسیر کا درجہ رکھتے ہیں اساسی قانون شریعت ہے۔ اس کے علاوہ ثانوی احکام ہیں جو قانونِ شریعت سے وجہ جواز حاصل کرتے ہیں[1]۔

قانونی تشریحات وہ اصول اور ضابطہ، وہ مطمحِ نظر اور عظیم الشان تصور جس کا نام اسلامی حکومت ہے ہمیشہ قانون کے ماتحت اپنی صحیح تصویر دُنیا کو دکھاتا ہے۔ ہماری تاریخ اور اُس کا منظم ارتقا، ہم سے پہلے اور ہمارے زمانہ میں نفوسِ انسانی کی تنظیم و تشکیل، حکومت و سلطنت کے اُس عمل دراز کا نتیجہ ہے جس کی رہنمائی قانون کرتا ہے اور جس کو ایک فطری قانون جو ازلی بھی ہے اور ابدی بھی اپنے عمل توحّد سے ایک عالمگیر تنظیم کی صورت دینا چاہتا ہے۔

قانون اپنے عام مفہوم میں کارفرما ضابطہ کا نام ہے۔ خواہ اس کا تعلق اس روایت سے ہو جس سے فرامین کا ظہور ہوتا ہے یا اُس حکمتِ عملی سے جو حکومت کے کام چلاتی ہے اگر قانون کے اصطلاحی معنی کا لحاظ کیا جائے تو وہ ایک فرمان، منشور اور حکم ہے جو مقننِ اعلیٰ کی طرف سے صادر ہوتا ہے اور انسانی زندگی کے اجتماعی ضبط و نظم پر زور دیتا ہے

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے سب سے پہلے جو بات قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ مقننِ اعلیٰ نے (جس کی ہستی انسان کی محدود نظر اور عامیانہ تصورات سے بہت بلند ہے)

---

[1] ردالمحتار لابن عابدین ج ۱ ص ۱۰۔ تشریح مزید کے لیے دیکھو کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ۔ مقدمہ طبع ثانی ص ۹-۵۶۔ طبع مصر ۱۳۴۹ھ

[2] قرآن حکیم سورہ ۴۰۔ آیت ۷، سورہ ۳۶ آیت ۱۹۲۔

قانون کے ضابطہ کلی کی تمام اساسی دفعات کو طے کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اسلامی قانون کے صدور کا مرکز وحدانی ہے۔ البتہ جب قانون خدا کے نمائندوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے تو وہ انسانی دائرہ عمل میں ایک فعل کی صورت اختیار کر لیتا ہے ہمیں کہنا چاہیے قانون نام ہے خدا کے حکم کا یا اُس عمل اور حکمت عملی کا جس کے ساتھ خدا کا حکم ہو حکومت کے بالادست مرکز سے خدا کا حکم نافذ ہوتا ہے اور انسانوں کا رجحان اس کو اجتماعی فعل کی صورت دے دیتا ہے۔ گویا قانون کا صدور خدا سے ہوتا ہے اور ظہور خلق خدا سے۔ خدا حکم دیتا ہے انسانی قوت ان احکام کو کتاب اللہ کی امداد سے قبول کر لیتی ہے اور زمین و آسمان کے دائرہ میں اپنے تصرفات سے باخبر ہو جاتی ہے[1]۔

اسلامی سوسائٹی اس پر متفق ہے کہ اسلامی حکومت کی قانون سازی کا پہلا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ یہ کتاب کروڑوں مسلمانوں کی زندگی کا واحد ضابطہ ہے۔ خدا کی طرف سے رہتی دنیا تک اس کے اصول و احکام کی حفاظت کی ضمانت موجود ہے[2]۔ قرآن کا پہلا حکم ۱۷۔ رمضان المبارک ۴۱؁ میلاد نبوی میں نازل ہوا اور آخری حکم جس میں قانون کی تکمیل کا اعلان تھا ۹۔ ذی الحجہ کو حج اکبر کے دن ۶۳؁ [3] میں نافذ ہوا۔ اس طرح قانون الٰہی کے پہلے حکم سے آخری حکم تک کل مدت ۲۲۔ سال دو ماہ اور ۲۲۔ دن ہوتی ہے۔

قرآن عظیم کی قانونی حیثیت صاف اور شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ ہمیں اس کے صفحات پر نقش اعلیٰ کے جو فرامین ملتے ہیں ان سے اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب روحانیت و اخلاق کی طرح تہذیب و تمدن کا ضابطہ اور حکومت و سلطنت کا قانون کلی ہے۔

---

[1] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی ج ۱ ص ۴۔ ج ۳ ص ۲۹۶

[2] قرآن (۹/۱۵)

[3] یہی بدر کی عظیم الشان اور فیصلہ کن جنگ کا دن۔

اس کے متعلق کہا گیا ہے (کتٰبٌ مسطورٌ فی رقٍ منشورٍ) ایک قلمبند مجموعہ قانون جو دستاویزی منشور کی شکل میں ہے"۔ (امرًا من عندنا) "وہ ہمارا حکم ہے" (حکمًا عربیًا) عربی زبان کا قانون ہے۔ (روحًا من امرنا) وہ ہمارے حکم کی جان ہے۔ چونکہ قانون کو حکومت پر تفوق حاصل ہے اس لیے قرآن کی عظمت اور برتری کا اظہار بار بار کیا گیا ہے اور اس کے ناموں کے اظہار میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہے۔

قرآن العظیم، القرآن المجید، الکتاب المبین، ام الکتاب یہ وہ نام ہیں جن سے قانون قرآن کی عظمت، شان، افادیت، بلندی و برتری کا اظہار ہوتا ہے۔

انسان جس قدر غور کرتا ہے اس پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن حکومت و سلطنت کا ایک مستقل ضابطہ ہے۔ خداوند عالم نے پیغمبر اعظم کو بطور خود اس حقیقت سے اطلاع دی ہے (انآ انزلنآ الیک الکتٰب بالحق لتحکم بین الناس بمآ ارٰک اللہ) ہم نے تم کو قانون کا مجموعہ برحق اس لیے عطا کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان حکومت کا کام اللہ کے احکام کے مطابق انجام دو۔

آنحضرت نے اس فرمان کو قبول کیا اور اس پر عمل کر کے دنیا کے سامنے نظیر پیش کی اور مسلمانوں کو یہ یقین دلا دیا کہ قرآن ہی وہ قانون ہے جو دنیا میں عالمگیر حکومت قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ آپ نے اہم ترین مواقع پر قرآن کی قوت اور حاکمانہ طاقت کو اپنے صحابہ کے سامنے پیش کیا۔ اور اس طرح وہ دولت ان کے ہاتھوں میں دے دی جس نے دنیا کی تمام دولتوں کو اپنے دامن سیاست میں لے لیا۔

---

[1] دیکھو سورۂ طور ۵۲ پ ۲۷۔ الدخان ۴۴، پ ۲۵، یٰس ۳۶ پ ۲۲، الزخرف پ ۲۵ [2] نساء پ ۵

[3] تیسیر الوصول حدیث الرسول (ترکت فیکم کتاب اللہ تعالیٰ الخ کتاب الاعتصام بالکتاب ج ۱ ص ۲۵

عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ آنحضرت نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہم سے فرمایا (علیکم بالقرآن) "قرآن کے احکام پر عمل پیرا ہونا تمہارا فرض ہے"۔ ہم نے عہد کیا کہ ہم اس کے پابند رہینگے۔ ایک مرتبہ مجلس اصحاب سے خطاب ہوا "جلد ہی وہ وقت آئیگا جب سیاہ رات کی طرح فتنہ و فساد چھا جائیگا۔ مجلس میں سے کسی نے کہا، یا رسول اللہ! اس فساد سے نجات پانے کی کیا سبیل ہے۔ فرمایا کتاب[1] اللہ تعالیٰ فیہ نبأ من قبلکم و خبر ما بعدکم و حکم بینکم و ھو فصل لیس بالھزل) کتاب اللہ! اللہ کا قانون، اس میں گزشتہ قوموں کی تاریخ ہے۔ آنے والی نسلوں کے حالات و واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں اور زمانہ حال کے متعلق حکومت کے احکام ہیں، وہ فیصلہ کن قانون ہے بے معنی نہیں ہے"۔ اس کے بعد ارشاد ہوا (من عمل بہ اجر و من حکم بہ عدل و من عصم بہ فقد ھدی الی صراط المستقیم جو اس قانون پر عمل کریگا اسے اس کا ثمرہ ملیگا۔ جو اس کے مطابق حکومت کریگا، انصاف سے ہمکنار ہوگا۔ اور جو اس کی پناہ طلب کریگا سیدھے اور سچے راستے پر آجائے[2] گا۔

آنحضرت نے مرض وفات میں آخری[3] خطبہ میں یہ ہدایت کی کہ قانون الٰہی (کتاب اللہ) کو ضابطۂ عمل کے طور پر برقرار رکھا جائے کیونکہ اس صورت میں آنکھیں حقائق دیکھنے سے محروم نہ ہونگی۔ دل اندھوں کی طرح کام نہیں کرینگے۔ قدم محاذ عمل پر ڈگمگا نہ سکیں گے اور دست و بازو قوتِ عمل سے عاری نہ ہونگے۔ اسی کے ساتھ یہاں تک حکم ہوا (فاعملوا بمحکمہ وامنوا بمتشابہ) "اس کے قانون محکم پر عمل کرو اور متشابہ آیات پر ایمان لاؤ"

ایک موقع پر فرمان ہوا "اگر ایک سیاہ فام حبشی کتاب اللہ کے مطابق تمہاری حکومت کی قیادت کرے تو اس کے حکم کو سنو اور اس کی حکومت کی اطاعت کرو[4]" یعنی اسلامی نظم اور

---

[1] عن الحارث الاعور (الترمذی) [2] البحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ ص ۱۲ [3] ایضاً

[4] حدیث زید بن ابی انیسہ صحیح مسلم۔ دیکھو تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۰۹۔

ڈسپلن پر قائم رہو اور اس کے فرمانبردار بنے رہو"

قرآن کو پہلے پارہ میں کتاب کا نام دیا گیا۔ کتاب حکم کو بھی کہتے ہیں[1]۔ اور حکم قانون کی روح بلکہ خود قانون ہوتا ہے۔ علامہ منصور انصاری اسی رائے کے ماتحت حکومت کی حقیقت کا اظہار قانون کے لفظ سے کرتے ہیں اور حکم و قانون کو ہم معنی قرار دیتے ہیں[2]۔

قرآن کی قانونی طاقت کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیا کے مفاد کے مطابق ہے (۲/۱۸۵) (ھدًی للناس) ہے یعنی انسانیت عامہ کا رہنما۔ اس کے ظہور سے حق اور باطل کے احکام کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے۔ اس کی ہر قانونی دفعہ صاف اور انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اور حکمبردار انسانوں (مسلمانوں) کے لیے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دلوں میں خوشی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ ہماری تاریک دنیا میں روشنی کا قانون ہے۔ ہمیں تاریک ماحول سے روشنی[3] میں لا کر کھڑا کرتا ہے۔ اس کی یہ خصوصیات صرف اس لیے ہیں کہ مقنن حقیقی کی طرف سے بصورت منشور بلند مرکز سے ہماری دنیا میں اترا ہے[4] یہ عالم اعلیٰ کا دستور ہے جو عالم ادنیٰ کے عام فائدے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پابندی ضروری ہے اور اس کی ہر دفعہ واجب التعمیل۔ حافظ ابن کثیر اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہتے ہیں کہ "خدا کی اطاعت کا مقصد خدا کے قانون کی اطاعت[5] ہے۔ قرآن خدا کے حکم کی روح[6] ہے۔ اس سے خدا کی بادشاہی کا اظہار اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کی اطاعت کی جائے۔

---

[1] النہایۃ فی غریب الحدیث ابن اثیر (باب الکاف والتا) جلد ۴ ص طبع خیریہ۔

[2] حکومت الٰہی (لفظ قانون) طبع بجنور۔ [3] قرآن عظیم۔ بحوالہ تفصیل البیان سید ممتاز علی ج ۳ ص ۱۱-۳۳

[4] کلیات ابو البقاء حنفی (لفظ قرآن) ص ۵۲۱۔

[5] تفسیر قرآن عظیم ج ۳ "اطیعوا اللہ" (اتبعوا کتابہٗ) [6] قرآن عظیم (روحا من امرنا)

اسلامی تاریخ میں غزوہ تبوک کو بیحد اہمیت حاصل ہے۔ رجب کا مہینہ ہے اور سنہ ۹ ہجری مسلمان، روم (یونان) کی جابر شہنشاہیت کی بربادی کے متعلق حضرت رسالتماب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے پیشین گوئی سُن چکے ہیں اور آج اس مقصد کے لیے محاذِ جنگ تیار ہو رہا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ عوام افلاس سے مجبور ہیں، گرمی کی شدت ہے زمینیں خشک پڑی ہیں جو کھیتیاں موجود ہیں وہ پک چکی ہیں اور کسان لوگ اپنے کھیتوں پر قیام کرکے موسم کا پھل جمع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالت یہ ہے مگر پیغمبرِ اعظم سپہ سالار کی حیثیت سے صحابہ کو یہ فوجی حکم دیتے ہیں سب تیار ہو جائیں رومی شہنشاہیت کے خلاف محاذِ جنگ پر جانا ہے۔

اس حکم کے مطابق اسلامی افواج تیار ہو کر محاذ پر پہنچ گئیں۔ مجاہدین کے اس اہم اجتماع میں حضورؐ نے انسانیت عامہ کے افراد کو خطاب کیا۔ اس مفصل خطبہ کے چند جملے یہ ہیں:- (ایھا الناس، فان اصدق الحدیث کتاب اللہ ـــــ وخیر الملل ملۃ ابراھیم وخیر السنن سنۃ محمدؐ) اے افرادِ نسل انسانی یقین کرو، خدا کا قانون (قرآن) تمام قوانین کے مقابلہ میں زیادہ صادق ہے۔ ملۃ ابراہیم تمام اقوام وملل میں بہترین قوم ہے محمدؐ کا قانونِ سنت، قوانین دنیا کے مقابلہ میں پسندیدہ ترین قانون ہے"۔

اس خطبہ میں سب سے پہلا جملہ قرآن کی قانونی حیثیت کے متعلق ہے دوسرا جملہ اسلام کے ملی نظم اور اجتماعی تنظیم کی حقیقت کبریٰ پر گواہ ہے اور تیسرے جملہ میں قانون سُنت کی قطعی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔

لہ تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۱۳ طبع السعادہ مصر۔

پیغمبر اعظم نے آخری لمحات میں جو حکم جاری کیا اُس میں بھی قرآن کا ذکر پوری اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔ آنحضرت نویں ذی الحجہ ۱۰ھ کو وادی نمرہ میں وارد ہوتے ہیں سپیدۂ صبح آفتاب کے لیے مطلع صاف کرچکا ہے، پھر سرشام میدان عرفات میں نزول اجلال ہوتا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ کا مجمع آخری پیغمبرؐ سے آخری حکم سُننے کا منتظر ہے، ارشاد ہوتا ہے (قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ، ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ) میں تم کو آخری پیغام دیتا ہوں، میں تم میں ایک قانون چھوڑ چلا ہوں اگر تم نے قوت سے اس کو پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یہ قانون اللہ کی کتاب[1] ہے۔

ہماری عجیب وغریب مذہبی فراست نے (جس نے زمانہ دراز سے قرآن سے بے تعلقی اختیار کرلی ہے) ہم کو یہ یقین دلادیا ہے کہ قرآن صرف ان مذہبی احکام کا مجموعہ ہے جن کو ہماری روایات نے ایک خاص شکل دے دی ہے۔ یہ یقین ایک وہم ہے۔ قرآن جن مذہبی عبادات پر زور دیتا ہے اُنھوں نے ہماری اجتماعی شان کو اونچا کرنے میں اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا کہ خدا کے عرفان سے فیضیاب کرنے میں۔

اسلامی تاریخ میں آنحضرت کی وفات ایک بڑا ہوش رُبا حادثہ تھا عین اس وقت جب اسلامی تدبر نے حکومت کے لیے امیر کا انتخاب کیا، فاروق اعظمؓ نے مسجد نبوی کے ایوان میں برسر منبر جو لفظ کہے وہ یہ تھے۔

میں نے غلطی سے چند خیالات قائم کرلیے تھے جو خدا اور رسول کے قوانین کے مطابق نہ تھے، میرا خیال تھا کہ آنحضرت تمام عمر ہماری حکومت کا نظام چلائینگے۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے اللہ کا قانون (کتاب) ہمارے پاس باقی رہیگا۔ اللہ کے رسول نے اسی سے رہنمائی

[1] صحیح بخاری، حجۃ الوداع۔

حاصل کی تھی (ان اعتصمتم بہ ھداکم اللہ) اگر تم اس کے احکام کی پختگی سے پابندی کروگے تو اللہ تمہاری رہنمائی کریگا۔[1]"

ان الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن جس طرح مذہبی احکام کا مجموعہ ہے اسی طرح حکومت کا قانون اور ضابطہ بھی ہے۔

اسلامی نظریہ یہ ہے کہ قانون کا وجود دین کے اندر موجود ہے۔ جب ہم دین کا لفظ بولتے ہیں تو اُس سے دنیا کے قانون کی آواز بھی ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ دین کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں (الدین اسمٌ واقعٌ علی الایمان والاسلام والشرائع کلھا) "دین نام ہے، ایمان کا اسلام کا اور جملہ قوانین کا" ملا علی قاری اپنی تصریحات میں فرماتے ہیں کہ دین یہ ہے کہ زبان پر اسلام کا کلمہ ہو، دل یقین وتصدیق سے عہدہ برآ ہو۔ اور ضمیر خدائی قوانین واحکام کو قبول کرنے پر آمادہ ہو[2]!

ابن خلدون اسلامی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ تصریح کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت (امامت) کا قیام ایک قانونی ذمہ داری ہے۔ ایک دنیاوی حکومت خالص سیاسی قانون پر مبنی ہوتی ہے۔ اس حکومت کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ رائے عام اس کے قانون کی اطاعت کرے لیکن ایک دینی حکومت کی تعمیر وتاسیس کی بنیاد وہ قوانین بنتے ہیں جن میں سے ہر ایک قانون خدائی فرض کی شکل میں عائد ہوتا ہے یہ قوانین ایک ماہر اور شارح قانون (شارع) کے ذریعہ سے قانونی صورت اختیار کرتے ہیں اور دین و دنیا کے مفاد کی بہتری کا ذریعہ بنتے ہیں اور دین کی ذمہ داریوں میں یہ بھی مستقل ذمہ داری ہے کہ ہمارا اجتماعی نظام قانون شریعت کا پابند ہو[3]۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۴۸ - [2] الفقہ الاکبر وشرحہ للامام ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) ص ۸۰ طبع مصر

[3] کتاب العبر - ابن خلدون فصل ۲۵ ص ۱۳۳

امام شاہ ولی اللہ دہلی کی تصریح ہے قرآن میں محض حرام و حلال کے مسائل ہی نہیں ہیں بلکہ معاملات، معاشیات اور سیاست و تمدن کے احکام بھی موجود ہیں جن کا مقصد تمام نفوس اقوام اور طبقات عالم کو متمدن بنانا ہے اور جن کا تعلق تمام نسل انسانی سے ہے[1]۔ ہر حکومت اپنے اقتدار اور خود شناسی کے دائرہ میں ایک اعلیٰ اور مکمل قانون کا مطالبہ کرتی ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومت اپنی موثر تنظیمات میں ایک ایسے قانون سے محروم ہو جو اسلامی سوسائٹی کی مرکزی وحدت کے لیے خدا کے بعد سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ خدا کا عرفان انسانیت کا حقیقی مطمح نظر ہے مگر اس کے لیے بھی خدا کے قانون کو تسلیم کرنا بیحد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شاہ ولی اللہ الدہلوی اپنی دوسری مستند کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں پرزور الفاظ میں کہتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی ایک قوم کی حیثیت سے دنیا پر اس وقت تک عمل نہیں کر سکتی جب تک اس کے پاس قوانین شرعیت نہ ہوں[2]۔

یہ امر قطعی ہے کہ اسلامی قانون اپنی ہستی کے دائرہ میں وحدانیت کا مالک ہے اس کی وحدانی حیثیت مقنن اعلیٰ کی وحدانیت کے تابع ہے۔ قرآن قانون کلی ہے، اور اپنے قانونی اوصاف میں اس طرح یگانہ ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے قانون کی ضرورت نہیں۔ جلیل القدر اصحاب نبوت کا یہ عقیدہ کہ "خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے (حسبنا کتاب اللہ) حرف بحرف صحیح ہے۔ اس سے حدیث اور قانون نبوت، قانونِ صحابہ، قانون ائمہ، حکومت، قانون اجماع اُمت، قانون سواد اعظم کے خلاف کوئی بات پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی قانونِ قرآن کی ضد نہیں ہے۔ یہ سب قرآن سے پیدا ہوتے ہیں اور قانون قرآن کے اندر داخل ہیں۔ یہ سمندر کی زندہ اور

[1] الفوز الکبیر ص ۴-۳۴ طبع قدیم ۱۲۹۵ھ مصر [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۹۲۔

متحرک موجیں ہیں جو سمندر کے دل سے پیدا ہوتی ہیں یا وہ موتی ہیں جن کو سمندر نے اپنے اختیار سے ساحل کے ہاتھ میں دیا ہے تاکہ انسانی فراست کا خزانہ ان کی قیمت ادا کرے اور انسانیت عامہ ان سے فائدہ اٹھائے۔ انسان ان کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا انکار قرآن کے قانونی احکامات اور ہدایات کا انکار ہو گا۔

اسلامی حکمت عملی کی رو سے قرآن خدا کا حکم ہے۔ حکم حکومت کا فرمان ہوتا ہے اور قانون کا نام پاتا ہے۔ اس کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ خدا کا قانون صالح صلاحیت مند، سچے اور پکے رہنماؤں اور نائبوں کے ذریعہ سے منظر عام[1] پر آتا ہے اور انسانوں کا رجحان اس کے ماتحت اجتماعی فعل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ گویا قانون خدا سے صادر ہوتا ہے اور عمل خلق خدا سے۔

قانون سنت | قانون سنت نام ہے قانون نبوت[2] کا۔ قرآن میں قانونِ سُنت کے لیے قانونی سند موجود ہے۔ حضرت پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون ادھر اُدھر کی بات نہ تھی بلکہ وہ الہام کی قوت سے فیضیاب تھا (وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ) علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے حکم اور قانون کو قبول کرو اور اس کے رسول کے قانون اور حکم کو بھی قبول کرو۔

آنحضرت خود فرماتے ہیں (علیکم بسنتی) "تم پر میرے قانون کی اطاعت واجب ہے[3]"

---

[1] یہ اشخاص ایک اعلیٰ اور مثالی قانون (سنۃ راشدہ) کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کی ہستی نفوس انسانی کے لیے بہترین مثال اور معیار ہوتی ہے۔ وہ تدبر میں بلند پایہ شخصیت میں پاکیزہ ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کبھی جھوٹ بولا۔ اور کبھی کوئی بُرائی ان سے سرزد نہیں ہوتی حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ دہلوی ج ۱ ص ۸۳ - [2] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۵ - دیکھو فاروق اعظم کا قول۔

[3] تیسیر الوصول الیٰ احادیث الرسول ج ۱ ص ۲۶

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے (الا انی وقد اوتیت القرآن ومثلہ معہٗ) مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی انداز کا ایک اور قانون عطا کیا گیا ہے۔ ابن کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اس قانون سے قانونِ سُنت مراد ہے کیونکہ قانون سُنت غیر تلاوت شدہ الہام پر مبنی ہے[1]۔

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قانون سنت قانون قرآن کا ضمیمہ ہے۔ حضور انور کا ارشاد ہے " ایھا الناس قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدًا امرًا بینًا کتاب اللہ وسنۃ نبیہ[2] اے افراد انسانی میں تمہارے پاس ایک دولت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم نے اس کو محکم طریقہ پر ضبط ونظم کے ساتھ اپنا لیا تو تم کسی زمانہ میں گمراہ نہ ہوگے۔ وہ ہے اللہ کا قانون کتاب اللہ اور اس کے نبی کا قانون سنت"

صحابہ ان فرامین کے منشا سے اس حد تک باخبر تھے کہ وہ نظم وانتظام کے ہر اہم مرحلہ پر قرآن اور قانون سنت سے نظائر تلاش کرتے تھے۔ اور یہ بخوبی جانتے تھے کہ قرآن کے مجمل احکام کی تعبیر وتشریح کرنا قانونِ سنت کا کام ہے۔ چنانچہ جب معاذ بن جبل یمن میں تمدنی اور انتظامی خدمات کے لیے بھیجے گئے تو ان سے حضور اکرمؐ نے بنفس نفیس دریافت کیا (فبم تحکم؟) کس قانون کے مطابق حکومت کروگے انہوں نے جواب دیا (بکتاب اللہ) اللہ کے قانون کے مطابق۔ اس کے بعد دریافت کیا گیا اگر کتاب اللہ میں کوئی نظیر نہ ملی تو کیا صورت اختیار کروگے معاذ نے جواب میں عرض کیا (بسنۃ رسول اللہ) قانون سُنت پر عمل پیرا ہونے کو ترجیح دونگا[3]۔

---

[1] تفسیر قرآن العظیم ابن کثیر (۷۷۴ھ) ج ۱ ص ۳

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۶۵۱

[3] وھذا الحدیث فی المسند والسنن باسناد جید۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳

حضور اکرم کو پیغمبرانہ بصیرت حاصل تھی۔ اور یہ معلوم تھا کہ اُمت میں ایسے اصحاب ہونگے جو حکمرانی کے منصب پر قبضہ کرینگے اور قانونِ نبوت کی خلاف ورزی کرینگے اس لیے فرمایا۔

یکون بعدی ائمۃٌ لا یہتدون بھدای ولا یستنون بسنتی الخ — میرے بعد ایسے قائدین حکومت ہونگے جو میری ہدایات کے خلاف کام کرینگے اور میرے قانون کی خلاف ورزی کی جرأت کرینگے۔ (مسلم و ابو داؤد)

حسب ذیل قانونی اثر بھی اسی سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔

(۱) من اطاعنی فقد اطاع اللہ الخ[1] — جس نے میری اطاعت کی اُس نے خدا کی اطاعت کی۔

(۲) ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا (قرآن) — رسول جن باتوں کا حکم دے اُس کو قبول کرلو اور جس معاملہ میں امتناعی حکم دے اُس سے رُک جاؤ

علامہ منصور قانون قرآن اور قانون سنت کی باہمی نسبت کے متعلق لکھتے ہیں کہ خدا کے احکام کا نفاذ دو صورتوں سے ہوتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ حکم براہِ راست ہوتا ہے اور الفاظ و معانی کا تعلق مقنن اعلیٰ سے ہوتا ہے۔ علماء اجتماعیات نے اس کو کتاب، قرآن اور فرمان قرار دیا ہے۔ یہ کتاب اپنے تواتر ذریعہ اجراء اور تحریر کے اعتبار سے قطعی الثبوت ہے دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے الفاظ الہامی نہیں ہوتے بلکہ مضمون حکم کے منبع سے آتا ہے اور پیغمبرؐ اس کو قانونی الفاظ میں پیش کردیتے ہیں[2]۔ علماء کی نظر میں یہی قانونِ سُنّت

---

[1] رواہ الشیخان والنسائی۔ بحوالہ التاج (استاذ ناصف) ج ۳ ص ۴۵

[2] حکومت الٰہی (دستور اساسی امامت اُمت) فارسی مادہ (۳)، حاشیہ ص ۲۳ تا ص ۲۶ طبع ۱۳۵۰ھ بجنور

ہے۔ پیغمبر کا قول۔ زبانی قانون سمجھا جاتا ہے اور عمل۔ قانونِ حکمت عملی۔ قانونِ سنت کا ذمہ دارانہ کام۔ قانون قرآن کے عام مفہوم کو اصولی اور جزئی صورت میں پیش کرتا ہے اس دوسری صورت میں قانونی روایت کا مدار اصل قانون کی تطبیق پر ہے یا اس کی صحت، خوبی اور تواتر پر۔

درحقیقت شریعت کو قانون سازی سے جو علاقہ ہے اُس کا اظہار ملۃ ابراہیمی کے ان اجتماعی نظائر سے ہوتا ہے جس کی زمام آنحضرت کے ہاتھ میں رہی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ صاحب نے بجا طور پر یہ تصریح کی ہے، اس نظام کا مدار قانونِ سنت کی مقررہ حیثیت پر ہے کیونکہ اس کے اصول مسلّمہ ہیں۔ اگر قانون سنت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ملی زوال کا اس سے بڑا سبب اور کوئی نہ ہوگا۔[1]

اس رائے کو قانون سُنت سے براہ راست امداد ملتی ہے۔ حضور کا ارشاد ہے کہ وہ زمانہ آئیگا جب قانون سنت کی خلاف ورزی کی جائے گی۔ اس زمانہ میں مردِ مومن وہ سمجھا جائیگا جو خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں ہاتھ سے، زبان سے اور کم سے کم اپنے دل سے جہاد کریگا۔

قانون صحابہ | اسلامی حکومت میں صحابہ کا قول وفعل بھی قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح قانونِ سُنت کا مآخذ (قانون قرآن) ہے اسی طرح قانون صحابہ کا سرچشمہ ترتیب وار دونوں ہیں۔ صحابہ کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ وہ اسلام کے اولین قانونی زمانہ میں موجود تھے ان کو سب سے پہلے اور کسی درمیانی واسطہ کے بغیر کتاب اور سنت کے قوانین کو سمجھنے اور اسلامی نظام میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔[2] وہ ہم سے زیادہ قانون کی تعبیر و

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۴، ۱۶۹ [2] رد المحتار ابن عابدین ج ۱ ص ۱۲ مجمع الانہر شیخ زادہ ج ۱ ص

تشریح کا حق رکھتے ہیں[۱]۔ ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مستند قرار دیا گیا ہے اور پیغمبر خدا نے ان کے قول و فعل کو اسلامی حکمت عملی کے ارتقاء اور ضمنی احکام کے لیے ضروری قرار دیا ہے قرآن ان کو ایک ایسی جماعت کا نام دیتا ہے جس کی شیرازہ بندی انسانیت عامہ کے فائدے کے لیے ہوئی ہے۔ آنحضرت نے بار بار اپنے اصحاب کے درجۂ قانونی کا اظہار فرمایا ہے (اصحابی کالنجوم الخ) میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں اور ہادی و رہنما ہیں (ان اللہ اختار اصحابی علیٰ جمیع العالمین الخ) اللہ نے میرے اصحاب کو تمام عالم سے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابو اسحاق شاطبی (غرناطی) اس درجہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ قانون صحابہ، ایک قابل عمل قانون ہے اور قانونِ سنت کی طرح واجب الاطاعت[۲] ہے۔

ابن قیم لکھتے ہیں کہ صحابہ اپنے تشخص میں اجتماعی ہیئت کے سردار، امام اور قائد ہیں۔ ان کے تین طبقے ہیں پہلے طبقے میں سات اصحاب ہیں جن کے قانونی احکام زیادہ ہیں۔ عمر بن الخطابؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ۔ ام المومنین عائشہؓ، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرؓ۔ دوسرے طبقہ میں تیرہ اصحاب ہیں جن کے احکام نہ زیادہ نہ کم۔ ان میں صدیق اکبر، عثمان بن عفان، ابوہریرہ اور سلمان فارسی بہت نمایاں ہیں۔ تیسرے طبقہ میں کم و بیش ایک سو ستائیس اصحاب ہیں۔ جن میں باقی تمام ممتاز صحابہ اور صحابیات شامل ہیں۔ ان کے احکام بہت کم ہیں[۳]۔

---

[۱] (الصحابۃ کلھم عدول) تمام صحابہ عدول ہیں۔ اس جملہ پر امت کا اتفاق ہے۔ دیکھو فقہ الاکبر شرح ملا علی قاری۔ [۲] الموافقات (شاطبی)، سنۃ الصحابہ کسنۃ الرسول)، ج ۴ مسئلہ ۹ ص ۴، ۷۶ تا ۸

[۳] اعلام الموقعین ابن قیم (م ۷۵۱ھ) ج ۱ ص ۹-۱۰-۱۱، رد المحتار ج ۱ ص ۴۶

بعد کے دور میں جو قانونی آثار ظاہر ہوئے اور مکہ معظمہ سے لے کر مدینہ منورہ، مصر و شام، دار السلام بغداد اور کوفہ میں جو سیاسی تشکیلات منظر عام پر آئیں ان میں قانون صحابہ کا بڑا دخل تھا

یادداشت | قانونِ صحابہ مستقل قانون نہیں ہے بلکہ قانونی تفصیلات پر مبنی ہے، صحابہ کے دل نور نبوت سے منور تھے۔ قانون اساسی کو بخوبی سمجھتے تھے۔ علم صحیح اور عمل صالح سے بہرہ مند تھے۔ ان میں خلفاء راشدین بھی تھے اور عہد نبوی کے گورنر اور سپہ سالاران افواج بھی اس لیے ہم سے زیادہ انہیں قانون کی تشریح کا حق ہے۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی کہ جس کی شان نزول سے ہم باخبر نہ ہوں۔ ہم دس آیات کو پڑھتے تھے مگر اس سے زیادہ حاصل کرنے سے پہلے اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے ایک اثر میں وارد ہوا ہے کہ ہم قانون کا علم اور قانون پر عمل ایک ساتھ کرتے تھے۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳)

قانون اجماع | اسلامی حکومت کے اصحاب علم و تدبر کی رائے عامہ کا کسی قانونی معاملہ میں متحد ہو جانا اجماع ہے۔ اس کی نمایاں علامت یہ ہے کہ اس اتحاد کے بعد اسلامی معاشرہ کی پوری رائے عامہ اس فیصلہ پر جمع ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اُمت کے صالح مدبرین اور ارجمند عوام کسی فیصلہ پر جمع ہو جاتے ہیں تو وہ قانون کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ علامہ ابو البقاء حنفی لکھتے ہیں۔

اُمت محمدیہ کے ارباب اجتہاد (درجہ اول کے مفکرین و مدبرین) کا قانونی حکم پر جمع ہو جانا، اجماع ہے۔ اور اس کو قانونی طور پر حجت سمجھا جاتا ہے۔ قانونی قیاس اور قانونی تقلید بھی اسی سلسلہ کے ماتحت ہیں۔ قانونِ اجماع کے جو نظائر تواتر اور تسلسل کے

ساتھ باقی رہیں ان کو قطعی قانون کا درجہ حاصل ہے۔ قانون اجماع کی خلاف ورزی ناجائز ہے[1]۔

اُمت کی اکثریت بھی اجماع[2] کا فائدہ دیتی ہے۔ اکثریت کا فیصلہ سواد اعظم کا فیصلہ ہے اس لیے اس کو قانون میں مناسب اہمیت[3] حاصل ہے۔

یادداشت | حجۃ الاسلام علامہ ابوبکر جصاص حنفی (متوفی ۳۷۰ھ) اپنی فیصلہ کن رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ خداوند عالم نے اُمت اسلامیہ کو امت وسطیٰ (بہترین قوم) کا خطاب دیا ہے اور اس کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے حجۃ قرار دیا ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس اُمت کا اجماع اصولاً صحیح اور قابل قبول ہے۔ چونکہ اس اُمت کے افراد بہترین کردار کے مالک ہیں اس لیے ان کا اجماع کسی غلط عقیدہ اور غلط مقصد پر نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی خداداد ذمہ داری پر جو فیصلہ کرینگے اس میں عدل اور عام بہتری کا ضروری لحاظ ہوگا۔ عہد نبوت سے لے کر قیامت تک صالح مسلمانوں کی رائے عامہ کا اجماع قابل تقلید ہے اجماع کا ہر ایک فیصلہ اُس زمانہ کے مسلمانوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے واجب التعمیل ہے۔ البتہ اجماع کے لیے شرط یہ ہے کہ صحیح طرز پر بروئے کار آئے۔ مسلمان جس فیصلہ پر جمع ہوں وہ قانونِ الٰہی کے خلاف نہ ہو۔ جمع ہونے والے اپنے زمانہ

---

[1] کلیات العلوم، ابوالبقاء حنفی ص ۲۴-۲۵۔ طبع آستانہ، تعریفات سید شریف ۴-۵ (اضافہ) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵۱ رد المحتار ج ۱ ص ۳۴۔ اجماع کا لفظ دیکھیے۔

[2] قانون اجماع کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اساسی قانون کے مطابق ہو۔ بسا اوقات اجماع کو اجماع کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ یہ اجماع یا تو اساسی قانون کے خلاف ہوتا ہے یا اس سے مکمل مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ دیکھو فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۴۰۶

[3] فاروق اعظم نے سات اصحاب کی شورائی کونسل میں حضرت ابن عمر کو اکثریت کے فیصلہ کو قبول کرنے کی ہدایت کی تھی۔

میں بہترین انسان ہوں۔ اور ان کو یقین ہو کہ وہ انسانی بہتری کے لیے بے غرضی کے ساتھ اپنا فیصلہ دے رہے ہیں۔ فاسق اور بدکار اشخاص مسلمانوں کی شکل میں مجتمع ہو کر اگر کسی رائے پر جمع ہو جائیں اور وہ رائے اصول دین کے خلاف ہو تو اُس کو قانون اجماع کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔[1]

قانون شوریٰ شوریٰ کے فیصلوں کو قانون اجماع کے ماتحت آئینی مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ شوریٰ کے فیصلے قانون اساسی کے مطابق ارتقائی حالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اُمت کے عام افراد اپنی رائے عامہ سے ان کو صورتِ وجود عطا کرتے ہیں۔ اور اسلامی نظام اس پر کاربند ہو کر اپنے ارتقائی مدارج کو پورا کرتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھو شوریٰ)

قانون امامت امام نظم اجتماعی کا مرکز ہے وہ خدا اور خلق خدا کے عطا کردہ اختیار کے ماتحت اسلامی قانون کے اجرا کے لیے جو احکام دیتا ہے اُن کو "قوانین امامت" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ قوانین اپنے مزاج کے اعتبار سے قانون اساسی کی مطابقت پر پورا زور دیتے ہیں انسانی سوسائٹی کے حالات، ضروریات اور تحریکات بدلتی رہتی ہیں۔ اسلامی حکومت کے قائد کا فرض ہے کہ وہ برمحل اُمت کی رہنمائی کا حکم صادر کرے یہ حکم قانون کا مرتبہ رکھتا ہے اور قانون امامت کی حیثیت سے اس کی تعمیل واجب ہے۔

قانونی اجتہاد قانون امامت اُس قانونی اجتہاد اور ضمنی قانون سازی پر مبنی ہے جس کی اجازت قانون شریعت دے چکا ہے۔ اس قانون کو حق ہے کہ لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے لیکن لوگوں کو اس سے پہلے یہ جان لینے کا حق ہے کہ اس کو قانون اساسی کی سرپرستی حاصل ہے۔ اسلامی حکومت کے امام کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ قانون قرآن اور قانون

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو احکام القرآن جصاص ج ۱، ص ۱۰۲-۱۰۳ [2] تاریخ ابن کثیر ج ، ص ۱۰۷

سنت کا عالم اور محقق ہو تاکہ قانونِ امامت اپنے دائرہ سے باہر نہ جائے[1]۔

اسلام کے نزدیک قانون کی بنیاد قانونی مصالح ہیں اجتہاد کا مقصد قانون شریعت کے مقاصد کو سمجھنا اور درست طور پر سمجھے ہوئے قانون کو قائم کرنا ہے[2]۔ اجتہاد کبھی ایسی پوزیشن اختیار نہیں کر سکتا جس سے اصول شریعت اور ضمنی دفعات کی مطابقت میں فرق آجائے[3]۔ امام پیغمبر کے قائم مقام کی حیثیت سے حکم دیتا ہے[4]۔ یہ اس کے کام کا دائرہ ہے اور اس سے تجاوز کرنا خلافِ قانون ہے۔

فاروق اعظم نے قاضی شریح کو جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں اسلامی قانون کی نوعیتوں کو ترتیب وار پیش کیا گیا ہے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اسلامی حکومت کے امام کی حیثیت سے لکھتے ہیں۔ جب کسی قانونی فیصلہ کا وقت آئے تو کتاب اللہ کے قانون پر عمل کرو۔ اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے قاصر رہو تو قانون نبوت کو اختیار کرو۔ اگر قانون سنت میں اس کے متعلق ضمنی دفعہ نہ ہو تو قانون اجماع کو ہاتھ میں لو یہ بھی نہ ہو سکے تو قانونی اجتہاد تمہارا حق ہے[5]۔

قانون فقہ فقہ اور قانون دونوں کے درمیان ایک خاص ربط ہے۔ فقہ نام ہے قانون کے علم کا امام غزالی لکھتے ہیں (الفقہ ھو معرفت القانون) فقہ قانون کی معرفت کو کہتے ہیں اس کا تعلق معاملات میں قانون الٰہی اور امور سیاسی دونوں سے ہے[6]۔ ابن عابدین نے بھی قریب قریب یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ بحر الرائق کے مصنف کی تصریح یہ ہے کہ فقہ قوانین و احکام کے اس ادراک کا نام ہے جس کے ساتھ دلائل ہوں[7]۔

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۰ (دیکھو قانون امامت کے شرائط) [2] الموافقات شاطبی ج ۴ کتاب الاجتہاد ص ۱۰۵-۱۰۶۔ [3] ایضاً ص ۱۰۸ [4] ایضاً ص ۲۴۴ [5] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵۴۵۔
[6] احیاء العلوم غزالی ج ۳ (حقیقۃ الدنیا) [7] رد المحتار (ابن عابدین) ج ۱ ص ۳۴ [8] مجمع الانہر ج ۱ ص ۵

نقہ کا منبع قانون اساسی کو ہونا چاہیے جب ایسا ہوگا فقہ کے احکام قطعیت کے ساتھ قبول کیے جائیں گے[1]۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ نبوت نے قانون فقہ کو دین کی عمارت کا ستون قرار دیا ہے[2]۔

فقہائے قانون | چونکہ فقہا علمِ قانون کے ماہرین ہیں اس لیے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے (الفقہا۔ العالمون باحکام اللہ تعالیٰ) فقہا، خدائی قوانین کے ماہرین ہیں[3]۔

یادداشت | قرآن اسلامی حکومت کا اٹل قانون ہے اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے منجانب اللہ ایک حکم موجود ہے۔ اور یہ حکم قطعی ہے۔ واجب التعمیل ہے اور غیر تغیر پذیر۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس قانون کے مزاج میں جمود کو دخل ہے۔ اور وہ زمانہ کے حالات، تغیرات اور وقائع سے مطابقت پیدا نہیں کرسکتا۔

اس قانون کے اٹل ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں انسانیت اور فطرت کے وہ تمام مسلمہ ضابطے موجود ہیں جن میں ازل سے ابد تک کوئی تبدیلی ممکن نہیں حکومت بطرزِ احسن، سیاست بشکل حکمت، امن وصلح، عدل وانصاف، انسانی اصلاح اور تعمیرو ترقی، ملی اور معاشی حقوق کی مساوات، مظلوم کی حمایت، ظلم کی بیخ کنی، خدا کی اطاعت اور خداترسی یہ اور اسی قسم کے دوسرے امور جو قوانین قدرت کی حیثیت سے اٹل ہیں، اس قانون میں داخل ہیں نظام عالم ہمارے سامنے ہے اس نظام میں بھی اٹل اصولوں کا دخل ہے۔ زمین آبادی کے لیے ہے۔ مہر و ماہ روشنی کے لیے۔ دن کام کے لیے

---

[1] دیکھو الموافقات شاطبی جلد ۱ ص ۲۹

[2] ردالمحتار ج ۱ ص ۳۸

[3] ایضاً ج ۱ ص ۴۴۔ ۴۶۔

رات آرام کے لیے ۔طلوع مہر اور نمود ماہ ایک قانون ہے ۔ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کا وقت مقرر جس طرح نظامِ عالم کے یہ عناصر ہمیشہ سے ایک حالت پر ہیں اسی طرح انسانیت اور فطرتِ انسانی کے قوانین مقرر ہیں ۔اور قرآن انہی کا مجموعہ ہے ۔

زمانہ کی تبدیلیاں موسم کی ہواؤں کی طرح ہیں وہ اصول کے تغیر پر مبنی نہیں بلکہ جزئیات کے تغیر پر مبنی ہے ۔ان تغیرات کے لیے قوم کا اقتدار اعلیٰ اور امامت کا اختیار کافی ہے ۔وہ زمانہ کی ترقی اور تنزل کے مطابق قانون الہٰی کی رہنمائی میں فیصلہ دینے کا مجاز ہے قانون سُنت ،قانون اجماع ،قانون شوریٰ ،قانون اجتہاد وقیاس اور صدر حکومت کے قانونی فرامین اسی لیے ہیں تاکہ زمانہ کے حالات پر غلبہ اور اقتدار حاصل کیا جا سکے اور ہنگامی تبدیلیوں کا ساتھ دیا جا سکے[1]

ارتقاپذیر قانون | قانون امامت سرتاسر ارتقا پذیر ہے اور حالات کی ترقی کے ساتھ اس کے احکام ترقی کرتے رہتے ہیں ۔حکومت کے روزمرہ کے معاملات اور تنظیمات میں قانونِ امامت ہی موثر ہے ۔اور وہ کوئی جامد چیز نہیں ہے ۔اس کا مدار اس کلیہ پر ہے کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ احکام بدل جاتے ہیں اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ قانون جائز طریقہ پر لابدی ترقی کرتا ہے ۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حکومت کا ماخذ الہامی قانون ہے اور حکومت کے ارتقا میں انسان کی ارتقا پذیر فطرت کا دخل ہے جو قدرت کے منشائے اعلیٰ کے مطابق ہو ۔فاستبقوا الخیرات "بھلائیوں کی طرف ترقی کرو" یہ قرآن کا حکم ہے اور اسلامی حکومت کا قانون اس کا زبردست داعی ہے ۔

---

[1] دیکھو احکام القرآن جصاص ج ۳ ص ۲۳۴ ۔

دفعہ ۱۱۱۔ اسلامی حکومت اور سیاست

اسلامی سیاست ایک فن ہے جس کے ذریعہ سے اسلامی حکومت کا نظام چلتا ہے اور ایک طریقہ ہے جس کی رو سے ریاست عامہ کے افراد اپنی بہتری کا کام انجام دیتے ہیں۔

اسلامی سیاست عدل اور اعتدال کے ساتھ اسلام کے قوانین کے مطابق حرکت کرتی ہے اور ان اغراض کے لیے منظر عام پر آتی ہے جن کا تعلق اُمت کے افراد اور عام انسانی بہتری سے ہے۔ انسانی سوسائٹی کو قانونِ الٰہی کا پابند بنانا اور ایک شیرازہ بند مملکت کے اندر جمع کرنا اسلامی سیاست کا منشا ہے۔

تشریحات اور نظائر

حکمت اور سیاست | قرآن عظیم میں سیاست کے ہم معنی "حکمت" ایک ایسا لفظ ہے جس کا اطلاق سیاسی حکمت عملی پر بھی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ حکمت کا لفظ سیاست کے مفہوم کو بھی پیش کرتا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے وسیع مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے قرآن میں ملک و مملکت اور قانون کے ساتھ بار بار حکمت کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک فرمان میں کہا گیا ہے کہ خداوند عالم جس کو "حکمت" سے بہرہ مند کرتا ہے۔ وہی زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرتا ہے۔ اور خیر کثیر کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ امر اس کا واضح ثبوت ہے کہ حکمت کا تعلق سلطنت کی حکمت عملی سے بھی ہے۔

امام راغب اصفہانی حکمت کی تعریف یہ پیش کرتے ہیں۔ علم اور عقل کی قوت سے

ایک درست نتیجہ پیدا کرنا حکمت ہے"۔ احکام کی غرض و غایت کے ماتحت کسی نتیجہ تک پہنچنا اور اس کو عالم ایجاد میں لانا "موجودہ امور کا علم اور اچھے کارناموں کا سرانجام دینا" حکمت ہے۔ یہی وہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن میں [1] ہے۔

علامہ ابوحیان نے البحر میں حکمت کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے "متعلقہ فرائض کو اس طرح انجام دینا کہ اپنی جگہ درست شکل میں نظر آئیں"

دونوں مندرجہ مفہوم سیاست کے مفہوم کو پورا کرتے ہیں حکومت و سلطنت کے دائرہ میں سیاست کا کام یہی ہے کہ حکومت کے نتائج اچھے ظاہر ہوں۔ اچھے کارنامے منظر عام پر آئیں۔ اور حکومت کے امور اپنی جگہ صحیح طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ یہی اس حکمت کا منشا ہے جس کا تعلق حکومت الٰہی اور خلافت سے ہے۔

قانون اسلام کے ماہرین نے حکمت کے متعلق جو تصریحات پیش کی ہیں ان کی رو سے تسلیم کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ حکمت کا تعلق حکمت عقلی سے بھی ہے اور حکمت عملی سے بھی۔ ابن قتیبہ کے نزدیک حکومت الٰہی کے معاملہ میں انسانی عقل کی کارگزاری کا نام حکمت ہے۔ ابن قاسم کہتے ہیں کہ حکومتِ الٰہی کے معاملات میں غور و فکر کرنا اور نتائج فکر کو حکمتِ عملی کی صورت دینا حکمت ہے۔

علمائے اسلام نے واضح طور پر اس امر کو ظاہر کیا ہے کہ حکمت کا تعلق حکومت، احکامِ حکومت۔ محاکم حکومت (عدلیہ و قضا) دین کی فلاح اور دنیا کی علام اصلاح سے ہے۔ قرآن اور قانون سنت کے احکام کا اجرا بھی حکمت ہی سے متعلق ہے کیونکہ یہی دونوں چیزیں ریاستِ عامہ کی سیاست [2] کا ماخذ ہیں۔

---

[1] مفردات القرآن امام راغب۔ الحکم ص ۲۷۶ (ج ۱) طبع خیریہ مصر [2] تفصیل کے لیے دیکھو البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۱ ص ۳۹۳ ج ۲ ص ۲۶۹ تا ۳۴۱

علماء اسلام کی آراء اسلامی دنیا نے مدتوں اسلامی زندگی کے پرجوش اور صداقت انگیز نظارے دیکھے ہیں۔ اسلامی دور حکومت میں سیاسی آثار کا اتنا غلبہ رہا ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں کا دور بھی ان سے فائدہ اُٹھاتا رہا۔ اسلامی سیاست نے علماء سیاست پیدا کیے جنہوں نے چار سو سال تک یوروپ کے سیاسی ماحول پر اثر ڈالا۔ ہمارے نظام نے سیاسی خیالات اور سیاسی رجحانات پیدا کیے جن کی قوت سے سیاسی کتابیں قلمبند کی گئیں۔ ان کتابوں کے نظریات نے مغرب کو نظریات دیے۔ جن کی موجودہ آواز ماضی سے ہم آہنگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ آج سے صدہا سال قبل علماء اسلام سیاست کی تعریف و تنقیح میں حصہ لے چکے ہیں اور سیاست کے متعلق وہ سب کچھ کہہ چکے ہیں جن کو عصر حاضر کے علماء نے آج اپنی زبان و قلم سے ادا کیا ہے۔

علامہ ابن خلدون سیاست کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

سیاست اُس ذمہ داری کا نام ہے جس کی رو سے عام انسانی نگہداشت (کفالت) کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جس کے ذریعہ خدا کی نیابتی حکومت بندگانِ خدا میں خدا کے قوانین کو نافذ کرتی ہے اور احکام کا اجراء عمل میں لاتی ہے۔ اس کام میں انسانی بہتری اور مفاد عامہ کا لحاظ رکھتی ہے، اور قانون (شرائع) کو فیصلہ کن قوت تسلیم کرتی ہے[1]۔"

سیاست کی اس تعریف کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے سیاست کا تعلق حکومت و سلطنت کے اُس کاروبار سے ہے جس سے مصالح عامہ کی تکمیل ہو اور عام بندگان خدا کی حالت میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔

علامہ ابو البقاء حنفی سیاست کی تعریف یہ کرتے ہیں وہ کام جس کا مقصد انسان

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ج۲ ص ۱۰۱ طبع البہیہ مصر۔

کی بہتری کے لیے ایک ایسا راستہ پیدا کرنا ہے جو حال اور مستقبل کی رہنمائی کے لیے ضمانت کرسکے۔ سیاست انبیاء کی ذمہ داری ہے جو اپنے عام اور خاص۔ ظاہری اور باطنی دائرہ میں اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح حکمراں صرف ظاہری حلقۂ اثر میں اس ذمہ داری کے مالک ہوتے ہیں۔ علامہ محترم سیاست معاشی سیاست بدنی کی اصطلاح خاص کرتے ہیں[1]۔ اور سیاست اجتماعی کو سیاست خلافت قرار دیتے ہیں۔ (دیکھو خلافۃ)

ہمارے علماء نے سیاست اور حکومت کے آئینی ربط پر بھی واضح خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں انسانی سرگرمیوں کا مدار تین حقیقتوں پر ہے۔ اول (عمارت الارض) روئے زمین پر عمرانی تمدن کے بروئے کار لانے پر۔ دوسرے (خلافت) اسلامی طرز کی نیابتی حکومت پر جو سیاست کے اعتبار سے خدا کے اقتدار اعلیٰ کی مکمل اطاعت کرے۔ تیسرے (مکارم شریعت) اسلامی قانون کے اعلیٰ اوصاف پر[2] مزید تصریح کرتے ہیں (ان الخلافت تستحق بالسیاستہ) نیابتی حکومت (خلافت) کا استحقاق سیاست کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔

امام کے نظریہ کی رو سے سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ فرد کی سیاست اور جامعہ (سوسائٹی) کی سیاست۔ جامعہ سے پہلے فرد کو سیاسی کردار میں کامل ہونا چاہیے۔ جو فرد اپنی جگہ بہتر سیاست پر قادر نہیں ہے وہ حکومت کی سیاست کے جہاز کو نہیں چلا سکتا۔ حکومت سے پہلے قانون کا علم ضروری ہے اور قانون کے ساتھ سیاست عامہ کا جاننا لازمی فرض ہے (انکم لا تصلحون للسیادۃ قبل معرفۃ الفقہ والسیاستہ العامہ)[3]

---

[1] کلیات ابوالبقاء ص ۴، ۳ ۔ ایضاً ص ۳۱۶

[2] الذریعہ الی مکارم الشریعہ ب ص ۱۸ ۔

[3] ایضاً ب ۹ ص ۱۹ ۔

شارح قانون اسلام علامہ ابوالحسن ماوردی ۴۵۰ھ نے زیادہ صاف پیرایہ بیان اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں الامامۃ موضوعۃ فی حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا[۱] اسلامی حکومت ایک قسم کی قیادت ہے جو دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست پر مبنی ہے گویا دین کی حفاظت کے بعد دنیا کے کاموں میں اس کا حصہ لینا سیاست پر موقوف ہے اسلامی حکومت کے قائد کے لیے۔ سیاست ایک خدائی آلہ کار ہے جس کا کام اجتماعی نظام کا اتحاد ہے[۲]۔ علامہ ماوردی اس رائے پر بھی زور دیتے ہیں کہ قانون (شریعت) کا تعلق ذمہ داریوں سے ہے، اور سیاست کا دنیا کی تعمیر سے[۳]۔

امام غزالی کے نزدیک دنیا ایک ارضی نظام ہے جس سے انسان خاص تعلق رکھتا ہے انسان ایک وحدت ہے مگر یہ وحدت اجتماعیت میں گم ہوجاتی ہے۔ اسلامی زندگی کا تعلق اسلام کے قوانین سے ہے اور یہ قوانین معاملات دنیا کے دائرہ میں سیاست کے کارنامے ہیں[۴]۔

آخری دور کے علماء میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلامی زندگی کے سیاسی محرکات کو حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ تصریح کرتے ہیں کہ اسلام کے نظام اجتماعی کا تعلق سیاست سے ہے اور سیاست کی اساس معتدل واجبات پر ہے۔ انبیاء کی جدوجہد کا مدار بھی درحقیقت دو چیزوں پر رہا ہے۔ صحیح انسانی تہذیب پر اور امت کی سیاست پر[۵]۔

امام ابوالحسن (ماوردی) دوسرے مقام پر لکھتے ہیں (منصب الخلافت فھو من

---

[۱] الاحکام السلطانیہ۔ ب ۱ ص ۳ [۲] ایضاً ب ۲ ص ۴ [۳] ایضاً ص ۸۰
[۴] احیاء العلوم غزالی ج ۳ حقیقۃ الدنیا۔ ص ۱۹۶۔
[۵] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ حقیقۃ النبوۃ ص ۹۵۔

تفصیل کے لیے دیکھو اعلام الموقعین ج ۴ ص ۳۰۵ (لا سیاسۃ الا ما وافق الشرع بحیث یکون الناس معہ اقرب الی الصلاح و ابعد عن الفساد)

حقوق السیاسۃ[1]) نیابتی حکومت (خلافت)، ایک منصب کی حیثیت سے سیاسی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے۔ امام ابن تیمیہ کے نزدیک حکومت ایک امانت ہے جس کا کام سیاست عدل کو برقرار رکھنا ہے[2]۔

اِن تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاست وہ فن ہے جو حکومت کے واجبات اور سلطنت کے نظم و نسق سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے مدتوں سیاست و حکمت کا فانوس روشن رکھا اور ہمیں یقین ہے کہ دنیا کے موجودہ سیاسی شعور میں جو عمومیت اور حکومت کے قالب میں اختیارات کی جو قوت نظر آتی ہے اس میں اسلام کے سیاسی دور کا بڑا دخل ہے۔

سیاست اسلامی عہد میں | اسلامی عہد میں ارقم بن ارقم کے مکان میں خفیہ اجتماع سے اُمت کی تنظیم کا نتیجہ خیز کام شروع ہوا تھا جس کی تکمیل اُس وقت ہوئی جب مدینہ نبوت اور خلافت کا پایۂ تخت بن گیا۔ مکہ میں ملت ابراہیم کی شیرازہ بندی، بین الاقوامی تعلقات کے لیے اصول ہجرت کا اجرا اور اسلامی معاشرہ کے استحکام کے لیے اصول بیعت (اجتماعی حلف) کا نفاذ، مدینہ میں انصار و مہاجرین کے بھائی چارہ کی تشکیل بدر کی جنگ حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح، فتح کے بعد انسانی مساوات، امن، آزادی اور اخوت کا اعلانِ عام، سلاطین عالم کے درباروں میں سفراء کی روانگی، بیرونی سفراء کی مدینہ میں باریابی۔ صوبائی تنظیم، حکام کا تقرر، فرامین کا اجرا، سقیفہ کی شوروی مجلس میں رائے عامہ منصب حکومت کا فیصلہ۔ ایسے کارنامے ہیں جن کا تعلق سرتاسر اسلامی سیاست سے تھا۔

یادداشت | اسلام کی تاریخ حکمرانی پر سیاسی نقطۂ نظر سے غور کیجیے۔ سیرۃ ابن ہشام، تاریخ

---

[1] الاحکام السلطانیہ ص ۳-۱۳ [2] السیاسۃ الشرعیہ ص ۳

طبری اور تاریخ ابن کثیر، تاریخ فتوحات الاسلامیہ دحلان میں جابجا اسلامی سیاست کے آثار ملتے ہیں، زمانۂ حال کے فاضل مورخ اور عالم اجتماعیات محمد کرد علی نے اپنی (الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۲) میں السیاسۃ فی الاسلام کے عنوان سے اسلامی سیاست کے ہر دور کے واقعات پیش کیے ہیں۔ دیکھو ص ۳۳۱ و ۲۷۹۔

یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ یورپین سیاست و تمدن نے اسلام کے نظریات حکمت و سیاست سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔

مسٹر جولیو کسٹلاٹ (Joliv Castelat) اپنی کتاب قانون تاریخ میں کھلے دل سے ان عظیم ترقیات کا اعتراف کرتے ہیں جس کا اظہار خلافت راشدہ کے بعد کے دور میں ہوا وہ لکھتے ہیں

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا دائرہ اسلام میں آنے کے لیے تیار تھی آنحضرتؐ کے بعد اسلامی تمدن آناً فاناً بر روئے کار آیا۔ دسویں صدی سے چودھویں صدی تک تو ایسا زمانہ گزرا ہے جب یورپ میں اس تمدن کے علاوہ اور کوئی تمدن نہ تھا۔

کاؤنٹ ہنری دی کاسٹری لکھتے ہیں :-

"ابھی سو سال نہ ہوئے تھے کہ اسلام کی حکومت سب جگہ چھا گئی اور دنیا کی کوئی طاقت اُس کو اُبھرنے، اوپر اُٹھنے اور ساری کائنات تک اپنی روشنی پہنچانے میں مانع نہ ہو سکی۔[2]

مستند فرانسیسی عالم موسیو ریمان ڈینہ (Dinet) نے نپولین کی تاریخی یادداشتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ نپولین کے سیاسی تصورات میں اسلام کا تصور حکومت کام کر رہا

---

[1] Histoir . . . . J. بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ ث ۲ ص ۵۴۳ ج ۱ ص ۵۵ کرد علی
[2] . الاسلام . کاسٹری ص ۳ ۔

تھا[۱]۔ ۲۸۔ اگست ۱۷۹۸ء کی یادداشت یہ ظاہر کرتی ہے کہ نپولین انسانی بہتری کے لیے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ قرآن کی سیاست پر نظام حکومت کی بنا رکھی جائے۔

یہ بیانات اس امر کا قطعی ثبوت ہیں کہ اسلام کے نظریات، یورپ میں سیاست و تمدن کی تخلیق کا باعث ہوئے۔ اسلام کے ظہور سے مغربی کرۂ ارض میں صدیوں کی جہالت کے بعد حکومت و سلطنت کا قانون روشن ہوا۔

عہد نبوی میں سیاست کے بنیادی اصول متعین صورت میں بروئے کار آئے اور خلافت راشدہ میں سیاسی حکمت عملی کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ کر مشرق و مغرب کے سر پر طلوع ہوا۔ خلافت راشدہ کے بعد امامت و خلافت کے تصورات نے سلطنت و شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لی لیکن صدیوں تک اسلامی سیاست کے اثرات موجود رہے جن کا مظاہرہ کبھی کبھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں پہلی سیاسی تاریخ کتاب الملوک حکومت کی نگرانی میں لکھی گئی[۲]۔ اس سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے علم السیاست پر توجہ شروع ہو گئی تھی۔

تیسری صدی ہجری میں ابن قتیبہ الدینوری (المتوفی ۲۷۶ھ / ۸۸۹ء) نے عیون الاخبار میں سلطنت[۳] پر ایک مستقل کتاب تحریر کی اور اس میں سیاسی معاملات قانون مشاورت، عمال سلطنت اور حکام ولایات کے متعلق مباحث درج کیے۔

---

[۱] حاضر العالم الاسلامی تعلیقات امیر شکیب ارسلان ج ۱ ص ۲۴-۲۵ (الفتح العربی)

[۲] کتاب الفہرست ابن ندیم ص ۱۳۲ (کتاب الملوک عبید بن شریہ یمنی۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد کے زیر انتظام طبع ہو چکی ہے)

[۳] عیون الاخبار کی چار کتابیں جن میں کتاب السلطان اور کتاب الحرب السیاسی اہمیت رکھتی ہیں جرمن پروفیسر کارل برکلمن نے ۱۹۰۰ء اور ۱۹۳۰ء برلن اور اسٹراسبرگ میں طبع کر کے یورپ کے استفادہ کے لیے پیش کیں۔

چوتھی صدی کے آغاز میں علامہ ابونصر فارابی (م ۳۳۹ھ ۹۵۰ء) نے متمدن شہریت اور مبادی سیاست و اجتماع پر اپنی بلند پایہ کتاب مبادی آرا اہل المدینۃ الفاضلہ[1] دنیائے سیاست کے لیے پیش کی۔ ہماری متمدن دنیا کا شہری سیاسی نظام آج تک فارابی کی مقررہ ترتیب سے سرمو آگے نہ جا سکا۔ محلہ کے نظام سے مملکت کے سیاسی نظام تک فارابی نے شہریت کے تمام درجات کو پیش کیا ہے اور ہماری میونسپلٹیاں تک اس کی ممنون احسان ہیں۔ یورپ کے علماء نے اس کتاب سے صدیوں تک جس شغف کا اظہار کیا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ اس کتاب نے تمام دنیا کے سیاسی مزاج پر اپنا اثر ڈالا ہے۔

چوتھی صدی کے وسط میں رسائل اخوان الصفا[2] قلمبند ہوئے۔ اخوان الصفا نے سیاست کو ایک مستقل فن قرار دیا اور سیاست کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا

سیاست نبوی، وہ سیاست جو مقدس قوانین اور پاکیزہ نوامیس پر مبنی ہوتی ہے اور ضمیر انسانی کو فاسد آراء اور نظریات سے محفوظ رکھتی ہے۔

سیاست ملوکیہ۔ وہ سیاست جو قانون شرع کی حفاظت کے اصول سے آگاہ ہو اور قوم پر اس کو عائد کرے، ملت میں قانون کو زندہ کرے اچھے احکام نافذ کرے اور برائیوں کا قلع قمع کرے۔ (شخصی مسلم حکومت)

سیاست عامیہ۔ وہ سیاست جو ایک ایسے سردار حکومت کے عمل سے صادر ہوتی ہے جو ایک قوم پر شہروں کے مجموعہ پر اور افواج پر حکومت کرتا ہے اور عوام کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھو آراء اہل المدینہ الفاضلہ ابونصر فارابی طبع لیدن ص ۵۳۔
[2] اخوان الصفاء کا ذکر تاریخ سیاست کے ضمن میں کیا گیا۔ یہاں اس جماعت کے عقائد و خیالات سے بحث نہیں کی گئی وہ اپنی جگہ قابل بحث ہیں ۱۲۔

سیاست[۴] خصوصی، معاشی اور شخصی سیاست۔

سیاست[۵] ذاتی۔ انسانی زندگی کی انفرادی سیاست، جس کا تعلق نفس اور اخلاق سے ہے۔

الاہوازی۔ چوتھی صدی میں سیاست کے آسمان پر سب سے زیادہ روشن ستارہ طلوع ہوا۔ امام ابوالحسن علی بن الاہوازی حنفی سیاست کے میدان میں ایک موجد فن مجدد کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ انہوں نے علم السیاسیہ کو سب سے پہلے علم السیاست کی حیثیت دی اور دور جدید کی رہنمائی کے لیے قانون سیاست کو مدون کیا۔ انہوں نے فن سیاست وسلطنت پر اپنی نادر روزگار کتاب ترتیب دی اور اس کا نام "التبر المنسبک فی تدبیر الملک[۱]" تجویز کیا (طبع تمدن (متوفی ۱۳۱۸ھ سنہ ۱۹۰۰ء) ص ۵۲)

اس کتاب میں ریاست کے تمدن اور ریاست کی ترتیب پر بحث کی گئی ہے (ص ۸۴)

پادری بستانی نے اپنی کتاب دائرۃ المعارف[۲] میں سیاست کی تعریف بیان کرتے ہوئے امام ابوالحسن الاہوازی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تہذیب السیاسیہ فی الحکم السیاسی کے مصنف ہیں اور واضع سیاست! (البستانی ج ۱۱ ص ۴، ۲۷)

یادداشت | دیکھو امام کے حالات، تاریخ خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) ج ۱۱ ص ۲۲۹ ۶۱۵۵

پانچویں صدی عیسوی میں علامہ ابوالحسن الماوردی نے الاحکام السلطانیہ[۳] کے نام سے سیاست وامامت کے قوانین پر پہلی کتاب لکھی۔

پانچویں صدی کے آخر میں امام راغب[۴] اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے اپنی بلند پایہ کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعہ میں سیاست وسلطنت کا ذکر کیا اور اسلام کے شوروی رجحان پر

---

[۱] دیکھو رسائل اخوان الصفا ج ۲ ص ۲۰۸-۲۰۹ [۲] دیکھو معجم المطبوعات العربیہ ج ۱ ص ۴۲

[۳] الاحکام السلطانیہ (ماوردی متوفی ۴۵۰ھ) طبع سنہ ۱۳۲۱ھ مصر (معجم المطبوعات العربیہ ج ۱ ص ۶۱۱)

[۴] دیکھو معجم المطبوعات العربیہ ج ۵ ص ۹۲۲۔

بحث کی

(ابن خلدون ۷۳۲ھ تا ۸۰۴ھ/ ۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء)۔ علامہ ابن خلدون موجودہ عصر سیاست کے اولیں معلم کی حیثیت سے بساط علم و سیاست پر نمودار ہوئے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے نئے طرز پر سیاست، سلطنت اور حکومت کو دنیا سے روشناس کرایا۔ سیاست کے متعلق ان کا قول یہ ہے۔ انہا القانون۔ الموضوع لرعایت الآداب وانتظام الاصول"
(سیاست وہ قانونی حکمت عملی ہے جس کی قوت سے اجتماعی کردار اور مصالح عامہ کا تحفظ کیا جاتا ہے اور حکومت کا نظم چلایا جاتا ہے۔

وان کریمر ایک سیاسی وقائع نگار کی حیثیت سے لکھتا ہے کہ "ابن خلدون اطالوی سیاستداں میکیاویلی (   ) اور نیکو کے مدرسۂ علم و سیاست کا امام اور پیشرو ہے افریقہ کا یہی وہ سیاستداں عالم ہے جس کی آواز ہمارے موجودہ افکار کی دنیا میں سنی جا رہی ہے[۵]۔"

پروفیسر کلازیو نے زیادہ فیصلہ کن الفاظ میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ابن خلدون عصر حاضر کے علماء سیاست کا پیشوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عظیم و جلیل بربری مورخ (ابن خلدون) نے قرون وسطی میں اس وقت فن اجتماعیات اقتصادیات اور سیاست کے مبادیات کو پیش کیا جب فرانسیسی اشتراکی کنسیڈرن۔ اشتراکیت کے بانی کارل مارکس۔ روسی ماہر سیاست بیکونن ان نظریات کے پیش کرنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ تھے[۶]۔ ابن خلدون کے نظریات پر یہ کہنا

---

[۵] مقدمہ ابن خلدون ص   [۶] Von Wesendonk : Ibn Khaldun

[۷] کنسیڈرن (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۳ء) مشہور فرانسیسی سوشلسٹ اور اشتراکی مصنف۔ کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) جرمنی کا عظیم و جلیل سیاسی عالم، بانی اشتراکیت، اور مشہور اشتراکی کتاب "راس المال" کا مصنف اعظم۔
بیکونن (۱۸۱۴ء تا ۱۸۷۶ء) روسی عالم اقتصاد و سیاست اور موسس لاحکومیہ

پڑتا ہے کہ وہ عصر جدید کے علماء سیاست و اقتصاد کے لیے مقدمۃ الجیش کی حیثیت رکھتا ہے۔[۱]

امریکن پروفیسر این اسمتھ (کارنل یونیورسٹی) نے اپنی کتاب "ابن خلدون سوشلسٹ فلسفی" میں علامہ ابن خلدون کو فلسفۂ اجتماعی کا استاذ تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کو پہلی صدی عیسوی کے علماء تصنیف (دیوڈورس، نقولاس، ٹرڈجس) اور اٹھارہویں صدی کے مؤلفین پر معنوی تفوق حاصل ہے۔ وہ علم الاجتماع (سیاست) کا بانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم کانٹ سے مدتوں پہلے موجود تھا۔"

یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ فلورنس کا مشہور سیاستداں میکیاولی ابن خلدون کے اسلامی فکر کا ذہنی مقلد ہے۔ اس کی مشہور تصنیف امیر (Principe) کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے وہ سیاست و سلطنت کے موضوع پر تیسری صدی ہجری کے علماء اسلام کا خوشہ چیں ہے، کیونکہ وہی لوگ تھے جنہوں نے سیاست کی حقیقت کو متعین کیا اور اس کے بعد دنیا کے سامنے اس کی قسمیں پیش کیں۔[۲]

سیاست حاضرہ اور علماء امروز اس تفصیل سے اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا سیاسی نظام چند تبدیلیوں کے بعد خلافت راشدہ کے سیاسی عہد سے پیدا ہوا ہے اسی طرح یورپ کی سیاست کی تخلیق مسلمانوں کے سیاسی عواطف سے ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے علماء سیاست نے سیاست کی تعریف میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جو ہم کو بارہ سو سال پہلے سے معلوم تھا۔ عصر حاضر کا ماہر سیاست بلنچلی سیاست کی تعریف میں کہتا ہے "سیاست وہ علم ہے جس کا

---

[۱] S. Colosio: Contribution a l'étude d'Ibn Khaldoun (Revue du monde musulman;

[۲] سطور بالا میں مستشرقین کے جو حوالے دیے گئے ہیں ان کا ماخذ ایک عربی تالیف ہے۔ دیکھو ابن خلدون۔ محمد عبداللہ عنان وکیل مصر طبع ۱۳۵۱ھ دار الکتب قاہرہ۔

مبحث سلطنت ہے[1]۔ ایڈورڈ جمیس کا خیال ہے سیاست کا مطلب کاروبارِ حکومت یعنی ان لوگوں کو ضبط و نظم میں رکھنا جو سوسائٹی کی شکل میں جمع ہوں[2]۔ انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق میں ہے کہ سیاست سے مُراد نظم و نسق حکومت ہے[3]۔ سیاست کی یہ وہ تعریف ہے جس کو صدیوں پہلے علماءِ اُمت پیش کر چکے تھے۔ یہ تعریف بالکل اُس تعریف کا چربہ ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں علّامہ ابن خلدون نا مستند الفاظ میں پیش کر چکے ہیں۔

یادداشت

مسلمانوں کے سیاسی آثار۔ یورپ میں مسلمانوں کے سیاسی آثار ان اسلامی تصنیفات کے ذریعہ سے پہنچے ہیں جو پہلی صدی سے دسویں صدی تک لکھی گئی ہیں۔ ہم مسلمان علماءِ یورپ کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ان مخطوطات کو حاصل کیا، ان کو محفوظ رکھا۔ زیورِ طبع سے مزین کیا۔ ان سے خود بھی استفادہ کیا اور ہمارے لیے بھی یہ موقع بہم پہنچایا کہ ان سے استفادہ کر سکیں۔

ذیل میں چند اور کتابیں درج کی جاتی ہیں یہ کتابیں بھی مسلمانوں کے سیاسی آثار میں داخل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس تمام عہد میں خلافتِ راشدہ کے صحیح نظام سیاسی پر کوئی مکمل دستور مدون نہیں ہوا اور یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی آج تک تلافی نہیں ہو سکی لیکن مندرجہ ذیل کتابیں اسلامی عہد کے آثار سے بالکل بیگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین نے اسلامی تصورات کو پیش کرنے میں مناسب حصہ لیا ہے

۱۔ سلوک المالک فی تدبیر الممالک۔ ابن ابی ربیع۔ طبع مطبع خاصہ جمعیۃ المعارف ۱۲۸۶ھ۔ مطبع فرج اللہ کردی ۱۳۰۹ھ۔ اس کتاب کے ۱۱۲ صفحے ہیں۔ چار فصلیں۔ (۱) مقدمہ (۲) اخلاقی احکام (۳) عقلی کردار اور اُس کا نظم (۴) سیاست کے اقسام اور اس کے احکام۔ یہ کتاب المعتصم باللہ عباسی کے لیے لکھی ہے۔

۲۔ کتاب الاموال۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام ہروی (۱۹۷۔۲۲۳ھ)۔ یہ کتاب اسلامی مالیات کے موضوع پر دوسری صدی ہجری کی یادگار ہے۔ سیاسیات کے مالی شعبہ پر سب سے قدیم تصنیف ہے۔ (دیکھو ترجمہ مصنف معجم ج ۱ ص ۱۲۱ (ابن سلام)

یادداشت۔ علامہ محترم کی کتاب امثال کا لاطینی ترجمہ پروفیسر برٹوگونٹہ کی توجہ سے ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا ہے۔

(۳) الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ۔ فخرالدین ابن الطقطقی (۷۰۹ھ) یہ نہایت ہی

---

[1] نظریہ سلطنت (طبع عثمانیہ) جے کے بلنچلی الالمانی (ب ۱ ص ۱)، [2] مبادی سیاسیات جمیس
[3] انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق ج ۸ ص ۹۸۔

اہم سیاسی کتاب ہے جس میں اسلامی تاریخ کے سیاسی عوامل زیادہ نمایاں ہیں۔ یورپ کے فاضل پروفیسروں نے اس کی طباعت پر کافی توجہ کی ہے۔ پروفیسر الورٹ نے اس پر جرمن زبان میں اپنے ملحوظات لکھے اور ۱۸۶۰ء میں اس کی طباعت میں حصہ لیا، پیرس میں ۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی۔ پروفیسر امیل نے دوبارہ پیرس میں ۱۳۱۷ھ میں طبع کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یورپ اس کتاب کے سیاسی اثر سے محروم نہیں رہا (دیکھو معجم۔ ج ۱ ص ۶۲۔ ابن طقطقی)

یادداشت:- یہ کتاب اس تصنیف کا ایک مأخذ ہے

(۴) انشاء الدوائر (التدبیرات الالٰہیہ فی اصلاح المملکۃ الانسانیہ) ابن العربی۔ ۵۶۰-۶۳۸ھ) شیخ اکبر نے اس کتاب میں انسانی سلطنت کے تصور پر سیاسی بحث کی ہے پروفیسر نیبرگ کی سعی سے جرمن زبان میں ترجمہ ہوا ہے اور ۱۹۱۹ء میں لیڈن میں طبع ہوئی۔ دیکھو معجم ج ۱ ص ۱۷۷۔

(۵) واسطۃ السلوک فی سیاسۃ الملوک سلطان ابو حمو موسیٰ بن زیان العبد الوادی شاہ تلمسان ۷۸۸-۷۵۳ھ (طبع الدولۃ تونس ص ۱۷۵) معجم ص ۱۱۳

(۶) عین الادب والسیاسہ وزین الحسب والریاست ابو الحسن علی بن ہذیل اندلسی (ن۔ن۔ھ) اس کتاب میں حکومت وسیادت کے متعلق ایک مستقل باب ہے۔ طبع الاعتماد ۱۳۰۱ھ ص ۲۷۸ (معجم ۲۷۳)

(۷) الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ (ابن قیم الجوزی) طبع آداب ۱۳۱۷ھ (معجم ج ۲ ص ۲۲۴)

(۸) قوانین الدواوین (ابن مماتی ۶۰۶ھ) یہ کتاب عہد صلاح الدین ایوبی کی حکومت کے نظم و نسق پر مبنی ہے ۱۲۹۹ھ میں مطبع وطن مصر میں طبع ہوئی ہے (معجم ج ۲ ص ۲۵۴)

اسلام کا طرز حکومت اور اس کی خصوصیات

اسلامی طرز حکومت تکوین حکومت کی ایک مستقل اور متعین تاریخی مثال ہے جس کی مثال نہیں لائی جاسکتی۔ اسلامی طرز حکومت ایک اتم اور اکمل مملکت کا نمونہ ہے جس کو صاف طور سے اس کے اصلی دور میں دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ طرز حکومت چاند سورج کی طرح اپنا روشن وجود رکھتا ہے اور اس وجود کے ساتھ اس کی وہ تمام خصوصیات وابستہ ہیں جن کی بنا پر دنیا کے نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں اس کا امتیاز

معلوم ہوتا ہے۔ اس طرز کو دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے کسی نظریہ حکومت سے مکمل مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ ارسطو کے زمانہ سے اس وقت تک حکومت کے بہت سے نظریےٓ[1] دنیا کے سامنے آ چکے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں وہ تمام باتیں موجود نہیں ہیں جن کا اسلام کے طرز حکومت میں یکجا ہونا ضروری ہے۔

اسلامی طرز حکومت میں ہر حکومت کا اچھا پہلو نظر آتا ہے اور ہر فاسد پہلو اس کے دائرۂ تصور سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کو کسی ایک نظریہ کے مطابق ظاہر کرنے سے زیادہ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ایک مثالی اور معتدل طرز حکومت ہے جس میں تمام نظریوں کا اعتدال موجود ہے۔

یہ طرز حکومت چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ جن کو تسلیم کرنے کے بعد اُسے ترقی پذیر طرزِ حکومت کہنا عیناً صحیح ہوگا کیونکہ وہ اپنی بنیادوں پر قائم ہونے کے بعد ہر زمانہ کے ترقی یافتہ حالات اور ضروریات سے مطابقت پیدا کرلیتی ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن کو ذہن نشین رکھنے سے دوسرے نظریہائے حکومت سے اس کا جزئی اور کلی امتیاز ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس میں بادشاہت کی مرکزی شان اور اقتدار، اعیانی حکومت کی یکجہتی، جمہوریت کی ہمہ گیر حقوق پسندی اور فرض شناسی اشتراکیت کا ہمہ گیر جذبۂ مساوات اور احساس دردمندی۔ ڈکٹیٹرشپ (آمریت) کی مرکزیت اور طاقت، کمالِ اعتدال کے ساتھ جمع ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دوسرے نظریے اپنی خوبیوں کے گرانبار دامنوں کو حکمت عملی کے میدان میں نہیں سنبھال سکے۔ اسلامی حکومت نہ صرف یہ کہ ان تمام خوبیوں کی امین ہے بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

---

[1] نظریہ ہائے حکومت۔ نظریۂ ارسطو۔ شاہی۔ اعیانی۔ جمہوری (اچھی اور بڑی دونوں قسم کی حکومتیں)

۱۔ شہنشاہیت (Imperialistic.) ۲۔ آئینی شہنشاہیت (Parlimentary)

۳۔ جمہوریت (Ripublic) ۴۔ وفاقی جمہوریت (Federal Ripublic

۵۔ بین الاقوامی اشتراکی جمہوریت Soviet Socialistic Ripublic

۶۔ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) Dictatorship.

وہ بنیادی اصول جن سے اسلامی حکومت کبھی علیحدہ نہیں ہوسکتی درج ذیل ہیں۔

(ا) **حکومت الٰہی**۔ اسلامی حکومت کا سب سے پہلا قطعی اور بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ اپنی حکمت عملی کے سیاسی دائرہ میں مکمل طور پر ایک خدائی تنظیم ہے۔ اس کے حلقہ کار میں ساری حکومت اور ساری ماتحتی کا مدار کائنات کے ایک خدا کی بالادستی پر ہے[1]۔ دنیا ایک عظیم الشان کارخانہ کی مانند ہے جس کے تمام پرزے اپنے موجد کے حکم کے ماتحت صحیح طور سے حرکت کرنے پر مامور ہیں[2]۔

ب۔ **خلافت** (سیاسی نیابت) حکومت خدا کی چیز ہے۔ انسان خدا کی طرف سے کارخانۂ حکومت کا نمائندہ، نائب اور ذمہ دار ہے[3]۔ یہ دوسرا اصول ہے جس نے اسلامی حکومت کو تمام حکومتوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ تمام اچھے انسان بھائی بھائی ہیں حقوق میں برابر ہیں، آزادی میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، حکومت کے وارث ہیں۔ امین شوریٰ کے رکن ہیں۔ یہ ہیں وہ نظریات جن کا اظہار نظریۂ خلافت کے ماتحت ہوتا ہے۔

ج۔ **امامت**۔ اسلامی حکومت اعلیٰ طرز کی امامت (لیڈرشپ) ہے۔ امامت ایک قطعی اصول ہے جس سے اسلامی طرزِ حکومت دوسری حکومتوں سے ممتاز نظر آتا ہے[4]۔

---

[1] لہ الحکم، ان الحکم الا للہ، لا یشرك فی حکمہ احدا، فتعالی اللہ ملك الحق فالحکم للہ العلی الکبیر، امر اللہ۔ قرآن حکیم۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۳۔

[2] "سلطنت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے" اشتال "حکومت خدا کی معین کردہ تنظیم ہے" بی بور "حکومت کے ساتھ خدا کا اعتقاد لازمی ہے" پلوٹارک "حکومت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے" اڈگس برگ۔ نظریۂ سلطنت بلنچلی ص ۲۹، ۳۰، ۳۰۔ مندرجہ بالا مقولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی حکومت کا تصور دوسری مذہبی اقوام میں بھی موجود ہے۔ یہ صحیح ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام نے سدا کے نام پر دنیا میں سیاسی جرائم پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے حکومت الٰہی کے نظریہ کو ایک معین شکل میں ڈھالا اور اس کا ایک ایسا کامیاب نمونہ پیش کر کے دکھایا جس کی مثال نہیں لائی جا سکتی۔

[3] انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ بحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ (آیت متعلقہ) روح المعانی (طبع منیری ج ۱ ص ۱۸۳، ۱۸۵) (خلافت کے فرائض۔ نیابت خداوندی، روئے زمین کی آبادکاری، انسانیت کی سیاسی رہنمائی، حکومت کے قوانین کا نفاذ) تفسیر مظہری ج ۱ ص ۴۹

[4] لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (قرآن حکیم، پ ۳۰، والتین)

د۔ **انسانیت**:۔ اسلامی حکومت انسانیتِ عامہ کی حکومت ہے۔ اسلام دنیا کی یگانہ طاقت ہے جس نے سب سے پہلے انسانیت کو سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اُس نے سب سے پہلے انسان کے متعلق دو واضح اعلان کیے ہیں۔

(۱) **معیارِ تخلیق**۔ انسان خدا کی ایجاد ہے اور اس کو اعلیٰ ترین معیار پر ایجاد کیا گیا ہے[۱]۔

(۲) **قانونِ عظمت**۔ انسان خداداد قانونی عظمت کا مالک ہے اور اس کو دنیا کی موجودات پر برتری حاصل ہے[۲]۔

قرآنِ حکیم نے اِن دونوں اعلانوں کے ضمن میں انسانیت کے جملہ لوازم (انسانی ضمیر، فطرت، علم، عقل، سعی، محنت، کردار اور تعامل) کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کا تعلق مذہب کے زیرِ سایہ سب سے پہلے انسانیت کے ساتھ ہے۔

یادداشت

۱۔ نفس انسانی۔ نفسِ انسانی ایک متوازن شے ہے[۳]۔ انسان اپنے نفس کا نگراں ہے[۴]۔

۲۔ فطرتِ انسانی۔ یہ خدا کی فطرت ہے جس پر انسانی فطرت عالمِ تکوین میں آئی ہے۔ ہر انسان کا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے[۶]۔

۳۔ علمِ انسانی۔ انسان کو قدرتِ حق ہی نے ان تمام موجودات کا علم دیا ہے جن سے انسان لاعلم تھا[۷]۔

۴۔ عقلِ انسانی۔ اجتماعی زندگی کے احکام و قوانین کا شرعی مطالبہ یہ ہے کہ انسانی عقل ان کی طرف توجہ کرے[۸]۔

۵۔ سعیِ انسانی۔ انسانی آرزوؤں کا قطعی تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ لازماً پوری ہوں[۹]۔ انسان اپنی کوشش ہی کا ثمرہ پاتا ہے[۱۰]۔ ہر انسان جو جد و جہد کرتا ہے اپنے لیے کرتا ہے[۱۱]۔

۶۔ محنتِ انسانی۔ جو شخص حاصل کرتا ہے اپنے لیے حاصل کرتا ہے[۱۲]۔

---

[۱] لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (قرآن حکیم۔ والتین) [۲] لقد کرمنا بنی آدم پ ۱۵۔ بنی اسرائیل احکام القرآن جصاص ج ۳ ص ۲۵۴
[۳] نفس وما سوّٰھا۔ قرآن حکیم پ ۳۰ شمس [۴] علیٰ نفسہ بصیرۃ پ ۲۹ قیامہ [۵] فطرۃ اللّٰہ التی پ ۸ الانعام
[۶] کل مولود یولد علی الفطرۃ۔ صحیح البخاری [۷] علم الانسان مالم یعلم پ ۳۰ علق [۸] بینا لکم الآیات ان کنتم تعقلون۔ پ ۲۷ حدید [۹] ام للانسان ما تمنیٰ۔ پ ۲۷ نجم [۱۰] لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ پ ۲۷ نجم [۱۱] من جاھد فانما یجاھد لنفسہ پ ۲۱ عنکبوت [۱۲] فانما یکسب علیٰ نفسہ پ ۵ نساء

۷۔ کردار انسانی۔ جو انسان اچھا کردار اختیار کرتا ہے اپنے ہی نفس کے لیے کرتا ہے[1]۔

۸۔ تعامل انسانی۔ جو انسان راہ مستقیم پر گامزن ہوتا ہے اُس کا یہ تعامل خود اُس کے نفس کے لیے ہے[2]

اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا ہے اس لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ قرآن کو جب پہلی مرتبہ دنیا کو احکام سنانے کا موقع ملا تو اُس نے کسی قبیلہ، کسی قوم، کسی ایک ملک اور کسی ایک طبقہ کو خطاب نہیں کیا بلکہ اپنا مخاطب یٰاَیُّھَا النَّاس کے الفاظ میں تمام انسانوں کو قرار دیا۔ یہ اس امر کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اس کے سیاسی اور اجتماعی تصورات کا تعلق کسی محدود آبادی سے نہیں ہے بلکہ انسانیتِ عامہ کے تمام افراد سے ہے

اسلام کے قانون میں موجودات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کا تعلق علی الاعلان انسانیت اور انسانیتِ عامہ کے فائدے سے نہ ہو۔ یہ بات اس دعوے کا آخری ثبوت ہے کہ اسلامی حکومت کا بنیادی اور لابدی اصول انسانیت ہے۔

یادداشت:۔ قرآن اسلام کا قانون ہے۔ اس نے دُنیا میں نازل ہو کر یہ بتایا کہ خدا انسانیت کا فرمانروا اور صاحبِ اقتدارِ اعلیٰ ہے (رب الناس۔ الناس) (ملیک مقتدر۔ قمر) محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے رحمت اور تمام انسانوں کے لیے پیغمبر ہیں۔ (رحمۃ للعالمین۔ کافۃ للناس۔ السباء) اسلام ایک دین اور نظام ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تمام انسان اس کے حلقۂ سلامتی میں داخل ہو جائیں (

) مسلمان قوم دنیا کی سب سے اچھی قوم ہے جو سارے انسانوں کے فائدے کے لیے ظاہر ہوئی ہے اور اُن کے بُرے بھلے کاموں پر گواہ ہے (کنتم خیر اُمۃ اُخرجت للناس۔ آل عمران) شہداء علی الناس۔ بحر المحیط ج ۱ ص ۴۲۲) حرم مکہ پہلا ایوان ہے جو تمام انسانوں کے لیے تعمیر کیا گیا۔ (وضع للناس۔ آل عمران) اور دنیا کے جملہ انسانوں کے لیے یکساں بنایا گیا ہے۔ (الناس سواء۔ حج) زمین ذریعہ پیداوار ہے، اور اُس کی پیداوار میں دنیا بھر کے انسان کا مساوی حق ہے (سواء للسائلین۔ حم) (کلوا مما فی الارض۔ بقرہ) زندگی تمام انسانوں کا حق ہے۔ انسان کا قاتل، انسانیت عامہ کا قاتل ہے (فکانما قتل الناس جمیعًا) اور انسانی زندگی کا محافظ انسانیت عامہ کی زندگی کا محافظ ہے۔ (فکانما احیا الناس جمیعًا۔ بحر المحیط ج ۳ ص ۴۶۸)

[1] من عمل صالحًا فلنفسہ۔ پ ۲۵ حم (جاثیہ) [2] فمن اھتدیٰ فلنفسہ پ ۲۴ زمر)

انسانی امن آزادی اور مساوات کے متعلق

تین تاریخی اعلان

فتح مکہ کا واقعہ اسلامی حکومت کی تاسیس کی حقیقی تاریخ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ دن دشمنوں سے انتقام لینے کا تھا لیکن ایسے دن میں اسلامی تعامل نے یہ ثابت کر دیا کہ انتقام پر انسانیت غالب ہے اس روز آنحضرت نے کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر تین تاریخی اعلان کئے[1] جن کا آوازہ ۱۸۵۲ء میں فرانس کے یوم انقلاب کے موقع پر سُنا گیا۔

۱۔ اعلانِ امن۔ "انسانو! مکہ ہمیشہ سے دارالامان ہے کسی باخدا انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ آج کے بعد اس سرزمین میں خون بہائے اور اس کی سرسبزی کو نقصان پہنچائے[2]

۲۔ اعلانِ آزادی۔ جاؤ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاؤ۔ اب تم سب کے سب آزاد ہو[3]

۳۔ اعلان مساوات انسانی۔ آج جاہلیت کے خاندانی اور نسلی غرور کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ تمام انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی کی پیداوار ہیں[4]۔

آپ نے فرمایا جو شخص نسلی برتری پر غرور کریگا اور دوسرے انسانوں کے مساوی درجہ کو تسلیم کرنے سے انکار کریگا وہ ہمارے اجتماعی نظام کا فرد نہیں سمجھا جائیگا[5]۔ کوئی انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اونچے طبقہ کا نہیں ہے عظمت کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے دین اسلام کے نظام

---

[1] دیکھو سیرۃ ابن ہشام (روض الانف ج ۲) ص ۲۷۴ - ۲۷۵ -
[2] (یاایھا الناس ان اللہ حرم مکۃ ـــ فلا یحل لامرء ان یسفک فیہ دماً الخ)
[3] (اذھبوا انتم الطلقاء) [4] ان اللہ اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ و تعظیمھا بالاٰباء الناس من اٰدم و اٰدم من تراب) [5] (لیس منا من دعا الی العصبیۃ) رواہ ابوداؤد انسابکم ھذہ لیست بمسبۃ البیھقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ حوالہ بالا)

کی اطاعت اور خدا ترسی

(۵) عالمگیر متحدہ وحدانی حکومت (یونیورسل یونیٹری کامن ویلتھ

Universal - Unitory Comman wealth) اسلامی حکومت خلافت ارضی ہی جو روئے زمین کو انسانیت کا وطن اکبر قرار دے کر اپنے عالمگیر اثر کو ظاہر کرتی ہی پیغمبر اسلام نے ابتدا ہی میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ان کے پیغام اور حکمت عملی کا تعلق تمام معمورۂ ارض سے ہی[1]۔ آپ نے نہایت ہی اہمیت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ "زمین[2] کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دی گئی ہیں" "اللہ نے تمام روئے زمین کو میرے قبضہ میں دے دیا ہی میری نگاہیں مشرق اور مغرب کے منطقوں پر پڑ چکی ہیں اور میری اُمت کی مملکت ان پر قائم ہوگی[3] میں تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہوں[4]۔ اور میں سرخ اور سیاہ تمام نسلوں کے لیے ظاہر ہوا ہوں[5]۔

آنحضرت کے ان فرامین کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس حکومت میں عالمگیر رجحان کا فقدان ہو اس کو حقیقی معنی میں اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حکومت کا عالمگیر وحدت پر قائم ہونا ایک بنیادی اصول ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ اسلامی مملکت ناقابل تقسیم وحدانی حکومت ہی اس کو ملکوں، نسلوں اور قوموں کے درمیان تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ تمام مسلمان ایک وحدت ہیں اور علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کرنے کے مجاز نہیں ہیں (دیکھو نظائر[6])

---

[1] بحر المحیط ج ص حضرت عباس بیان کرتے ہیں "یہ خدا کا اعلان ہی کہ اُمت محمد صلعم روئے زمین پر وارث وحکمراں ہوگی۔ تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۳۱۰ وعد اللہ الذین اٰمنوا۔

[2] اوتیت بمفاتیح خزائن الارض الخ عن ابی ہریرہ متفق علیہ

[3] زوی لی الارض الخ عن ثوبان رواہ مسلم (مشکوٰۃ فضائل سید المرسلین ص ۵۱۲)

[4] بعثت الی الناس کافۃ الاحمر و الاسود الخ مجمع الزوائد عموم بعثتہ صلی اللہ علیہ وسلم ج ۸ ص ۲۵۸۔ جامع صغیر ج ص ۴۲۶ (لبعثت) شمارہ ۳۱۴۷

[5] (نظائر الف مسیلمہ کذاب نے سنہ ہجری میں معاہدہ صلح کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسلامی قلمرو کو نصف نصف تقسیم کر لیا جائے۔ اس تجویز کو پیغمبر اعظم نے نامنظور کر دیا تھا۔ تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۱۵۔ (باقی بر صفحہ ۳۲۰)

(د) عمومیت۔ اسلامی حکومت عمومیت اپنا اصول مانتی ہے شہنشاہیت کے خلاف ہے۔ اسلامی قانون میں بادشاہ، تاج و تخت، قصر شاہی، دربار شاہی، ولیعہدی شہزادگی اور شخصی وراثت کا کوئی وجود نہیں۔ یہ تمام چیزیں شاہی طرز حکومت کے لوازمات میں سے ہیں اور اسلام کے دائرہ قانون سے خارج ہیں[۱]۔

یادداشت:۔ اسلام خدا کی بادشاہی کا داعی ہے اس لیے اس کا ضابطۂ احکام انسانیت کی ساختہ پرداختہ جعلی حکومت سے خالی ہے۔ اسلام کی حکومت، دنیاوی تنظیم کے اعتبار سے خلافت ہے، امامت ہے، شوریٰ ہے (یعنی نیابتی اور شوروی لیڈرشپ ہے) اگر شاہی طرز کو تسلیم کر لیا جائے تو اسلامی حکومت اپنی اصل عمومیت سے محروم ہو جائیگی[۲]۔ اس صورت میں خدا کے اقتدار اعلیٰ اور جمہور امت کی مساوات کا قانون باطل ہو جائیگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۹) ب۔ ۱۱ھ میں سقیفہ کے شوریٰ میں انصار نے تجویز پیش کی تھی کہ حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے ایک پر انصاری امیر ہو دوسرے حصہ پر مہاجر لیکن شوریٰ نے اس کے خلاف فیصلہ دیا اور اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۱)

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [۱] بعض احادیث اور آثار میں لفظ سلطان کا ذکر آتا ہے اس قسم کی حدیثیں زیادہ تر ضعیف ہیں (جامع صغیر سیوطی ج ۲ ص ۴۰) بعض روایتوں میں کسی راوی نے امام کی جگہ سلطان کا لفظ بول دیا ہے۔ (فتح الباری۔ کتاب الاحکام ج ۱۳ ص ۲۱۴) بعض روایتوں میں سلطان کو جبر و ظلم اور فتنوں کا مرکز قرار دیا ہے جس سے اُس کا نقص ہونا ثابت ہوتا ہے (سلطان جائر۔ السلطان افتتن۔ الترمذی، مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ) صرف ایک حدیث "السلطان ظل اللہ" کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات فراموش کی جائے کہ احادیث کے تمام دفتر خلیفہ، امیر، امام کے خطابات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان سے اسلامی حکومت کی جو اصل ثابت ہوتی ہے اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس حدیث کو صحیح ماننے کے معنی صرف یہ ہیں کہ سلطان کا لفظ اس غلبہ کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جو خدا کی نیابت کے طور پر امام کو حاصل ہوتا ہے محض اتنی سی بات پر شاہی طرز حکومت کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ امام خود سلطان نہیں ہوتا بلکہ صدیق اکبرؓ کے قول کے مطابق سلطان اللہ فی الارض روئے زمین پر اللہ کا غلبہ ہوتا ہے (صحیح ترمذی ج ۲ ص ۴۹۔ ابواب الفتن) اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث کے سلطان اور شاہی طرز حکومت کے سلطان میں تضاد کی نسبت ہے۔ اور اس کی بنا پر قرآن، حدیث اور خلافت راشدہ کے قوانین کا دفتر مسترد نہیں ہو سکتا۔ ورنہ حدیث کے سلطان سے گناہگار دنیا کے مجرم سلاطین مراد لیے جا سکتے ہیں

[۲] پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ (۱) حکومت بطرز نبوت (۲) حکومت بطرز خلافت (۳) حکومت بطرز ملوکیت (۴) حکومت بطرز جبر مطلق۔ طرز اول آپ کے ساتھ خاص ہے، طرز دوم اسلامی حکومت کی اصل ہے، باقی دونوں طرز غیر مستند ہیں۔

قانونی روایات :- شہنشاہ خدا کا اسم اعظم ہے اس کو اختیار کرنا خدا سے برابر کا مقابلہ ہوگا۔ اسی لیے پیغمبر اعظم نے یہ تصریح کی ہے کہ "انسان کے لیے شہنشاہ کا لقب اختیار کرنا ایک بدترین حرکت ہے[1]۔ ایک دن وہ آئے گا جب خدائے تعالیٰ دنیا کے بادشاہوں کو آواز دیگا "آج میری بادشاہی ہے، بادشاہی کا دعویٰ کرنے والے کہاں ہیں[2]؟

قانونی تعامل :- اسلام کی رو سے پیغمبر اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین کی پیروی واجب ہے۔ ان حضرات میں سے کسی نے شاہی طرز حکومت سے واسطہ نہیں رکھا۔ یہ اس امر کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اگر مسلمانوں نے اس طرز حکومت کو جائز رکھا تو وہ اسلامی قانون کے حلقۂ اطاعت سے خارج ہو جائینگے

قرآن میں دور ماضی کے قدیم ترین واقعات میں "مَلِک" (بادشاہ) کا لفظ آیا ہے۔ اس مرحلہ پر یہ یاد رکھیے کہ اُمتِ اسلامیہ خیرالامم ہے۔ اس کے لیے قدیم تاریخ کا تعامل حجت نہیں ہے بلکہ اس کے لیے پہلی منزل پر پیغمبر اعظمؐ اور خلفاء راشدینؓ کا اجتماعی تعامل ہی واجب التعمیل ہے۔ قرآن میں سورۂ یوسف میں شاہ مصر کا ذکر ہے یہ حکم نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ کا بیان ہے۔ دوسری جگہ طالوت کے واقعہ میں عوام کی زبان پر ایک بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ آتا ہے لیکن یہ واقعہ بجائے خود خاندانی اور شخصی شہنشاہیت کی تردید ہے قرآن میں اس قسم کے تذکروں سے ان بادشاہوں کا جواز نہیں نکلتا جو عجمی، تاتاری اور مغربی عہد جاہلیت کی پیداوار ہیں۔

آنحضرت کے ظہور کے وقت تمام دنیا جمہور کے اختیار سے محروم تھی اور شاہی طرز حکومت پر قانع، عرب میں قبائلی طرز کی ملوکیت تھی۔ فارس میں پیشدادیوں، کیانیوں اور اشغانیوں کے جانشین ساسانیوں کی شہنشاہیت قائم تھی روم پر بیزنطی امپیریلزم حکمران تھا پیغمبر اعظم نے ظاہر ہوکر ان سب کا خاتمہ کر دیا اور نئے نظام کی بنیاد جمہور کی عام مرضی اور مشورہ پر قائم کی دنیا کے بعض

---

[1] بخاری (اخنی الاسماء ملک الاملاک شہنشاہ) فتح الباری کتاب الادب ج ۱۰ ص ۵۸۵-۵۸۶۔

[2] بخاری (ملک الناس) عن ابی ہریرہ و ابن عمر عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۵۲۱۔ انا الملک این ملوک الارض

سازشی دماغوں نے یہ سمجھا کہ اسلام ایک جدید شہنشاہیت کے قیام کی تحریک ہے لیکن اسلامی تعامل نے فوراً اس کی تردید کر دی۔ عرب کے امراء غریب مسلمانوں کو طعنہ دیتے تھے (ھؤلاء ملوک الارض)[۱] "یہ ہیں روئے زمین کے بادشاہ" مسلمان اس کو سنتے اور جواب کو خدا پر چھوڑ دیتے تھے۔ عربوں نے اپنے خیال کے مطابق یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ کی اسکیم شخصی شہنشاہیت پر مبنی ہے تو ہم آپ کی بادشاہی کے لیے تیار ہیں مگر آنحضرت صلعم نے جواب دیا تم میرا مقصد نہیں سمجھے میں شہنشاہیت قائم کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں[۲]۔

فتح مکہ سے پہلے ابو سفیان نے اسلام کی فولاد پوش فوج کو دیکھ کر بے ساختہ کہا تھا۔ "کتنی زبردست سلطنت ہے" حضرت عباس نے اس کا بغیر تاخیر یہ جواب دیا تھا[۳]۔ "ابو سفیان! یہ سلطنت نہیں نبوت ہے" یعنی حکومت ہے بطرز نبوت[۴] ایک مرتبہ ایک شخص پیغمبر اعظم کو دور سے دیکھ کر لرز گیا۔ آپ نے فوراً اس کی غلط فہمی یہ کہہ کر دور کر دی (ھوّن علیك فانی لست بملك)[۵] "ڈرو نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں"۔

روم و فارس کو اپنی شہنشاہیت کا بڑا غرور تھا لیکن اسلام نے اس غرور کی چٹان کو توڑ کر رکھ دیا۔ ان کے حکمرانوں کے شاہانہ خطاب کو پامال کر دیا گیا۔ ان کو عظیم الروم اور عظیم فارس[۶] کا لقب دینا کافی سمجھا گیا۔ ان کو امن و سلامتی کے نظام کی طرف بلایا گیا اور جب انہوں نے انکار کر دیا تو آپ نے اعلان فرمایا۔ قیصر و کسریٰ کے خاتمہ کے بعد نہ کوئی قیصر ہوگا نہ کسریٰ۔ یہ اعلان درحقیقت دنیا سے شاہی طرز حکومت کے خاتمہ پر اسلام کے سچے رجحان کا اعلان تھا

---

۱ تاریخ الکامل ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶ (ذکر المستہزئین) ۲ سیرۃ ابن ہشام روض الانف ج ۱ ص ۱۸۶

۳ سیرۃ ابن ہشام (روض فتح مکہ ج ۲ ص ۲۹۶) ۴ صحیح بخاری

۵ صحیح البخاری (فتح الباری) ج ۱ ص ۳۲ (بدء الوحی)

۶ تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۸۱۔

جو آج تک مسلمانوں کو اُن کی اصل ذمہ داری کو یاد دلا رہا ہے۔ اسلام کا یہی وہ رجحان تھا جس کے بعد عرب، فلسطین، شام، عراق، مصر، روم اور فارس کے مقبوضات میں شاہی طرز حکومت کی جگہ جمہور اُمت کی شورویٔ عمومیت کا قیام عمل میں آیا۔

صدیق اکبر نے اپنے پہلے خطبہ ہی میں یہ الفاظ ادا کیے آج روئے زمین کے شہنشاہ کہاں ہیں۔ وہ لاشئے محض ہو چکے ہیں آج ہم خلافت کے مالک ہیں۔ اگر ہم ان کے طرز پر چلے تو اُن کی طرح ختم ہو جائینگے[۱]۔

عہد فاروقی کا یہ مشہور واقعہ کس نے نہیں سُنا ہوگا کہ جب روم کا سفیر مدینہ پہنچا اور اُس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے تو اس کو صحابہ کی طرف سے یہ جواب ملا تھا (مالنا ملك بل لنا امیرٌ) "ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔ البتہ ہمارا امیر ضرور ہے۔

موروثی وابستگی | شاہی حکومت میں شخصی اختیار اور خاندانی وراثت دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اسلامی حکومت میں دونوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک وراثت کا تعلق ہے قرآن نے اس کا اعتبار نہیں کیا[۲]۔

پیغمبر اعظم نے خاندانی وراثت کے اصول کی ذرا رعایت نہیں کی[۴]۔ صدیق اکبر کے متعلق حضرت علی کا قول ہے کہ "اگر خلافت کے لیے قوت اور استعداد کی جگہ محبت کا اعتبار ہوتا تو وہ اپنے لڑکے کو حکومت[۵] پر فائز کرتے۔ یہ تجویز پیش بھی ہوئی مگر اُنھوں نے نامنظور کر دیا۔

---

[۱] تاریخ طبری ج ۳ (سنہ ۱۱ھ) ص ۲۱۱

[۲] شخصی حکومت شوریٰ کے اثر سے باطل ہو جاتی ہے۔ دیکھو "شوریٰ"

[۳] احکام القرآن حجۃ الاسلام امام ابوبکر الجصاص حنفی۔ دیکھو قصہ طالوت وجالوت (ان الامامۃ لیست وراثۃ لانکار اللہ تعالیٰ ذلك بالعلم والقوۃ لا بالنسب الخ)

[۴] سیرۃ ابن ہشام (روض الانف ج ۲) ص ۳۰۱

[۵] اسد الغابہ ابن اثیر (لاثر بھا ولدہ) ج ۴ ص ۶۸ (خلافت عمرؓ)

فاروق اعظمؓ نے اپنے جانشین کے انتخاب میں اپنے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق خود یہ ہدایت فرمائی کہ ان کو منصب حکومت حاصل کرنے کا حق نہ ہوگا۔[1] اس تعامل کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلامی حکومت معیار نبوت کے مطابق شخصی اور موروثی شاہی نہیں ہے۔ اگر آج اس کو شخصی اور خاندانی میراث کی صورت میں شاہی حکومت کے معیار پر لایا گیا تو وہ اسلامی حکومت نہ رہیگی

فاروق اعظمؓ کے عہد میں اسلامی حکومت شہنشاہیت کا غرور توڑ چکی تھی۔ عرب ہر قسم کی شاہی کے شکنجہ سے باہر آچکا تھا اسلامی فوجیں کاکیشیا کی سرحد تک فارس کی شہنشاہی حکومت کا خاتمہ کر چکی تھیں مشرق میں روم کے شاہی استبداد کا چراغ گل ہو چکا تھا اور یہ سب سے بڑی دلیل تھی اس امر کی کہ مسلمان شاہی طرز حکومت کے خاتمہ کے بعد پھر کبھی اس کو اختیار نہیں کرینگے۔

یہ صحیح ہے کہ یزید کے عہد سے موروثی شہنشاہیت کا قیام عمل میں آیا جو بزرگ اس نظیر سے شاہی حکومت کے لیے وجہ جواز پیدا کرتے ہیں۔ ان کے جواب میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کے سامنے پیغمبر اعظمؐ اور ان کے خلفاءؓ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ جو مسلمان اس کو صحیح سمجھتے ہیں وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں اور جو اس کے خلاف چلنا چاہتے ہیں وہ یزید کے قدم بقدم چلتے رہیں۔[2]

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۵، (لیس لہ من الامر شیٔ الخ)

[2] البتہ ایک معتبر راوی حدیث کے یہ الفاظ بنی اُمیہ کے سلاطین کے متعلق یاد رکھیے: "بنی اُمیہ کا طرز حکومت بطرز خلافت نہ تھا، وہ شہنشاہوں میں بدترین شہنشاہ تھے" سعید بن جمہان۔ دیکھو مشکوٰۃ باب "ما جاء فی الخلفاء" ج ۲ ص ۴۰ یہ ذکر یورپین شہنشاہیتوں کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ اسلامی عہد کے مقابلہ میں کیا گیا ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عہد بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا کہ حضرت معاویہؓ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یزید اس طرز پر حکومت کریگا۔ اگر وہ زندہ رہتے اور یزید کے طرز کو دیکھتے تو وہ خود اُس کو معزول کر دیتے۔

خلافتِ راشدہ میں شہنشاہیت اور خلافت کے صاف طور پر دو معنی تھے اور صحابہ ان سے آشنا تھے اور اس فرق کا جائزہ لیتے رہتے تھے ایک مرتبہ فاروق اعظمؓ نے حضرت سلمانؓ سے دریافت کیا (املكٌ انا ام خليفة) فرمائیے میں شہنشاہ ہوں یا خلیفہ؟ سلمانؓ نے آزاد ضمیر کی قوت سے کام لے کر جواب دیا۔ اگر آپ عام مسلمانوں سے محاصل وصول کرتے ہیں۔ قانونی مقدار سے کم یا زیادہ، اور اس کو ناجائز طریقہ پر خرچ کرتے ہیں تو آپ خلیفہ نہیں ہیں بلکہ شہنشاہ ہیں

فاروق اعظم ایک موقع پر عوام سے دریافت کرتے ہیں۔" خدا کی قسم میں یہ نہیں جانتا کہ میں خلافت سے روگردانی کر کے شاہی تو نہیں کر رہا ہوں، مجھے بتائیے کیونکہ اگر میں ایک بادشاہ کا رنگ اختیار کر چکا ہوں تو یہ بڑی شدید بات ہے۔ مجمع میں سے فوراً ایک شخص برجستہ بولا۔ امیر المومنین خلافت اور شہنشاہیت میں فرق ہے۔ دریافت کیا گیا۔ کیا ہے وہ فرق؟۔ جواب ملا۔ خلیفہ جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے، وہ ہر انسان کا حق صرف حقدار کو دیتا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں۔ شہنشاہ انسانوں کے حق میں ظلم و جبر کرتا ہے۔ ایک طرف سے لوٹتا ہے، دوسری جگہ خرچ کرتا ہے[1]۔

یہ تھا وہ احساس جس کی فضا میں خلیفۂ وقت اور عام شہری شہنشاہیت کو پامال کرنے میں آزاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جزیرۃ العرب خلفاء راشدین کے عہد میں نیم آزاد ملوک کے شکنجہ سے باہر ہو چکا تھا۔ رومی شہنشاہیت اپنے ایشیائی اور افریقی مقبوضات میں اور فارس کی ملوکیت خود اپنے مرکز میں فنا ہو چکی تھی۔ اور یہ تھی وہ صورت واقعہ جس کا صاف

---

[1] طبقات ابن سعد روایت اولی (اخبرنا محمد بن عمر ــــ عن سلیمان) روایت دوم (اخبرنا محمد بن عمر ــــ عن سفیان ابن ابی العوجاء) دیکھو حسن المحاضرہ۔ علامہ سیوطی ج ۲ ص ۸۲۔ الفرق بین الخلافۃ والملک والسلطنۃ من حیث الشرع۔

مفہوم یہ تھا، ایک شہنشاہیت شکن اُمت پھر کبھی شہنشاہیت قائم نہیں کرےگی۔

خلافتِ راشدہ کے اٹھ جانے کے بعد مسلمانوں کی فراموشکاری تاریخ عالم کا سب سے بڑا سانحہ ہے جس کی جوابدہی ان تمام انسانوں پر عائد ہوتی ہے جو اُس وقت سے لے کر آج تک اس دنیا میں ذمہ داری کے مقام پر فائز رہے ہیں۔

اسلام نے عرب کے ملوک، روم کے قیصر، فارس کے کسریٰ کے گناہوں کے تاج کو اُتار کر زمین میں دفن کیا تھا مسلمانوں نے اس کو نکال کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ انہوں نے شہنشاہیت کی عمارت پر اسلام کا گنبد رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ ایک بدعت تھی ایک گناہ تھا، ایک جرم تھا جس نے ساری قوم کو معراج بلندی سے پستی کے دامن میں پھینک دیا۔ اب اسلامی حکومت کا صحیح اور سچا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان عرش الٰہی کے سایہ میں پھر اس بلندی کا رُخ کریں جس کی طرف مسجد نبوی کے مینار اشارہ کر رہے ہیں۔ انہیں بغداد، دمشق اور قرطبہ کو نہیں بلکہ اسلام کے وطن مرکزی (مکہ) کو اور اسلامی حکومت کے دارالخلافہ (مدینہ) کو دیکھنا چاہیے۔ اور دیکھ کر اوپر اُبھرنا چاہیے۔

(دفعہ ۱۲) اسلامی حکومت کی غایت الغایات

خدا کے حکم سے حکمبردار انسانوں کی اجتماعی تنظیم جس کی قوت سے انسانیت عامہ کی بہتری کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔ اسلامی حکومت کی غایت ہے یا غایت الغایات:

اس غایت کے ماتحت بہترین فرد بہترین افراد کو ایک مرکزی وحدت پر جمع کرتا ہے بہترین افراد، بہترین اجتماع کو عالم وجود میں لاتے ہیں اور بہترین اجتماع بہترین حکومت کو یہ حکومت ریاست عامہ کی حیثیت سے مرحلہ اول ہی پر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ دنیا کے ماحول میں اس کی غایت ان تمام طریقوں کو اختیار کرنا ہے جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی بہتری بروئے کار آسکے۔ خدائے واحد کے اقتدار اعلیٰ کا عرفان عالمگیر قوم کی تشکیل۔ تمام آفاق میں امن و امان کی بحالی اچھے احکام کا نفاذ، بُرے احکام کا انسداد، اسلامی حکمت عملی کے وہ اجزا ہیں جن پر اسلامی غایت کا مدار ہے۔

نظائر اور قانونی تشریحات

اسلامی حکومت بذات خود ایک غایت ہے جو ایک عظیم الشان[1] غایت کے لیے دنیا کے سامنے آتی ہے وہ اوّل درجہ پر ایک بڑے مقصد کے تابع ہے اور دوسرے درجہ پر خود ایک مقصد واجب ہے۔

اس سلسلہ میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی دنیا کو دین کے سایہ میں لے آئیے اس کے

---

[1] یہ عظیم الشان غایت خداوند عالم کے اقتدار اعلیٰ کی حکمبرداری کا عرفان اور خدائے واحد کے نام پر دنیا کی توحید ہے۔

بعد و بنیادی نقطۂ نگاہ سے اسلامی حکومت کی غایت پر غور کیجیے ۔ خدا کے بہترین بندوں نے اپنی آرزوؤں میں ایک بڑی آرزو حکومت کو قرار دیا۔ انھوں نے خدا سے حکومت کو ہاتھ پھیلا کر مانگا ۔ خدا نے ان کے دامن کو حکومت کی بہار سے گلزار کر دیا ۔ ہماری تباہ حال دنیا میں خدا کے خوشحال انسانوں کی طلب صادق کی غایت کیا ہو سکتی ہے ؟ دنیا کی رائے ایک ہو کر مانتی ہے کہ انسانیت عامہ کے یہ محسن انسانوں میں ظاہر ہوئے ۔ انسانوں میں عمر بھر رہے ۔ اُنھوں نے جب خدا کا حکم پایا تو انسانوں کو پکارا اور انسانیت کی بہتری پر زور دیا ، وہ ہمیشہ بہتر سے بہتر زندگی کے حامی اور حامل رہے ۔ ان کی غایت انسانوں کی عام بہتری کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ۔ بس یہی بہتری اسلامی حکومت کی غایت ہے ۔ دنیا کی بہتری مقصود ہے ، تاکہ دنیا کے بعد کی زندگی بہتر ہو ۔ ابن خلدون کہتے ہیں " یہ ایک عظیم الشان[1] منصب ہے جس کی غایت عظیم الشان سیاست ہے "۔ تمام انسانوں کو شریعت الٰہی کی قانونی ذمہ داریوں کے لیے ایک میدان میں کھڑا کر دینا ۔ دینی مصالح کی تکمیل اور دنیا کے فائدوں کی تکمیل جو بالآخر دنیا کے بعد کی زندگی سے اپنا ربط پیدا کر لیتے ہیں ۔ خدا کی نیابتی ریاست کا ہر کام اس طرح سرانجام دینا جس سے دین اور دنیا کی سیاست صحیح شکل میں برقرار رہے ، دین کی پوری پوری حفاظت اور دنیا کی سیاسی ذمہ داریوں کی مکمل رعایت ہو تاکہ انسان کی عمرانی مصلحتیں ، اور امت کا مفاد عامہ پورا ہو سکے[2] ۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حکومت ایک ادارہ ہے اور سیاست اُس کا ذریعۂ کار ہے ۔

---

[1] یہ عبارت ابن خلدون کے نظریات سے صحیح طور پر اخذ کی گئی ہے ۔

[2] مقدمہ ابن خلدون ف ۲۵ تا ف ۴۴ ص ۱۳۳ - ۱۶۱ ۔

علامہ ابوالبقاء حنفی نے سیاست کی تعریف یہ کی ہے[1] "وہ حکمت عملی جس کا مطالبہ یہ ہے کہ انسانی مخلوق کے حال و مستقبل کی اصلاح و بہتری کے لیے رہنمائی کا فرض انجام دیا جائے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام انسانی سوسائٹی کے رہنما کی حیثیت سے اپنے فائدہ کے لیے تصرفات عمومی کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کے سیاسی اختیار کا مقصد انسان کا فائدہ اور اس کی بہتری ہے جو آج کی زندگی میں اور آنے والی زندگی میں صحیح راستہ پر پہنچا سکے اور منزل مقصود تک جانے میں معاون ہو۔ صرف دنیا کی بہتری نہیں بلکہ انجام اور آخرت کی بہتری[2] دونوں موجود ہیں۔ اور دونوں کے لیے انسانی طلب اور سچی عزیمت درکار ہے "ومن یرد ثواب الدنیا نؤته منها ومن یرد ثواب الآخرة نؤته منها وسنجزی الشاکرین۔ فآتاهم الله ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرة والله یحب المحسنین[3]۔ الذین آمنوا وکانوا یتقون لهم البشری فی الحیوة الدنیا (یونس)

قرآن حکیم نے دنیا کی بہتری کے لیے ثواب دنیا کا لفظ استعمال کیا ہے ثواب وہ اولین اور حقیقی حالت ہے جس پر انسان پیدا ہوا تھا اور جس پر انسان کو ہونا چاہیے[4]۔ انسان بہتر صورت میں اور بہتر حالت میں تھا۔ بعد کی بغاوت سے اس میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اب اس کو پھر اپنی بہتری کے لیے ریاست عامہ کے نظام پر جمع ہونا ہے۔

اسلامی حکومت اپنی غایت، اپنی سادگی اور اپنی عمومیت کے اعتبار سے ایک مستقل اور جداگانہ شے ہے۔ ابن الطقطقی نے بالکل صحیح کہا، وہ ایک حکومت ہے عام دنیاوی حکومتوں سے بالکل الگ اور پیغمبرانہ اوصاف سے مستفید[5] "انها دولة لم تکن من طرز دول الدنیا وهی بالامور النبویة والاحوال الاخرویة اشبه الخ"

---

[1] کلیات العلوم ص ۳۷۴ [2] تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر ج ۱ ص ۵۶۴ [3] حوالہ بالا ص ۴۰۹

[4] مفردات امام راغب (ثوب) ص ۱۸۶۔ [5] الفخری ابن الطقطقی ت ۲ ص ۶۲

چونکہ اسلامی حکومت کی غایت دنیا کی بہتری ہے اس لیے علامہ ابوالحسن الماوردی لکھتے ہیں کہ دنیا کی بہتری دو صورتوں سے اپنا اعتبار قائم کرتی ہے

(اول) دنیا کی منظم اجتماعی شیرازہ بندی اور مجموعی انتظامی تشکیل سے۔

(دوم) دنیا کے ہر ہر فرد کی انفرادی بہتری سے (صلاح الدنیا معتبر من وجھین اولھما ما ینتظم بہ امور جملتھا والثانی ما یصلح بہ حال کل واحد من اھلھا)

علامہ محترم اسلامی نظریہ کے مطابق فرد کی بہتری پر بیحد زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی حالت متعدی ہے۔ اگر فرد کی حالت بہتر نہیں ہے تو وہ پورے اجتماعی نظام پر خراب اثر ضرور ڈالے گا۔ فرد کی حالت بھی بہتر ہونی چاہیے اور انسانیت عامہ کی مجموعی حالت بھی بہتر ہونی چاہیے۔ اگر فرد کی حالت خراب ہے اور مجموعی نظام کی حالت بہتر ہے تو فرد کے لیے اِس نظام میں کوئی دلچسپی نہیں اور اگر فرد کی حالت اچھی ہے اور اجتماعی نظام خراب ہے تو یہ قطعی ممکن ہے کہ کل تک فرد کی بہتری کی موجودہ صورت بھی ختم ہو جائے انسانی بہتری کی دو صورتیں ہیں۔ دونوں ہی کو نمایاں ہونا چاہیے۔ یہ اس لیے کہ

(۱) دنیا کی بہتری۔ تمام دنیا کے انسانوں کی بہتری ہے۔

(۲) دنیا کی خرابی تمام دنیا کے انسانوں کی خرابی ہے (فصلاح الدنیا مصلح لسائر اھلھا وفساد الدنیا مفسد لسائر اھلھا)[1]

اسلامی حکومت کی غایت کو متعین کرنا بہت آسان ہو جائیگا اگر پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ اسلام قوم کو اور قوم[2] کے افراد کو کس حال میں دیکھنا چاہتا ہے اور سوسائٹی کی تشکیل کو کس طرز پر مکمل کرتا ہے۔

---

[1] ادب الدین والدنیا (ماوردی) ص ۹۔ [2] قوم بمعنی اُمت

قرآن نے جس مقصد پر زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ہر رکن صالح ہو، علامہ سید شریف اپنی کتاب میں تصریح کرتے ہیں کہ صالح وہ ہے جو ہر قسم کی خرابی اور فساد سے پاک ہو۔ صالح وہ ہے جس میں صلاح ہو[1]۔ امام راغب اصفہانی کی تشریح کے مطابق صلاح فساد کی ضد ہے[2]۔ اس کے معنی ہیں وہ بہتر حالت جس میں کوئی خرابی نہ ہو قرآن ایسے ہی انسانوں کو حکومت کی زمام دیتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ حکومت ایسے ہی انسانوں کی میراث ہے جو صالح ہوں نیک کردار ہوں اور صلاحیت مند ہوں۔ خدا کا وعدہ بھی یہی ہے کہ روئے زمین کی خلافت (نیابتی حکومت) ان لوگوں کو عطا کی جائیگی جو عمل اور حکمت عملی کے اعتبار سے بہتر معیار کے ساتھ میدان میں آئیں۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر متعلقہ آیت کے ضمن میں اسی مفہوم کے مؤید ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"صالح[3] سوسائٹی کے نکوکار افراد روئے زمین پر خدا کے نائب ہیں۔ انسانیت کے رہنما اور لیڈر ہیں۔ انسانوں کے والی اور نگراں ہیں اور وہی دنیا کے منطقوں میں بہتر نظام قائم کرنے پر مامور ہیں۔"

ہم کو قرآن عظیم کے صفحات پر خیر الحاکمین[4] (بہتر سے بہتر حکمراں) خیر اُمت (بہتر سے بہتر قوم) خیر البریہ (بہتر سے بہتر مخلوق اور انسان)، کا تذکرہ دستیاب ہوتا ہے۔ اسلام کے قانون میں اس قسم کی آیات اور الفاظ کا ملنا اس بات کی سب سے بڑی قانونی سند ہے کہ اسلام کے اجتماعی تصورات کا رُخ برملا انسانوں کی عام بہتری کی طرف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے انسانی بھلائی کے عنوانوں کا ذکر کرنے میں اپنی ہمہ گیر قوت ایجا

---

[1] تعریفات سید شریف باب الصاد ص ۸۸ طبع احمد کامل استنبول ۱۳۲۷ھ [2] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی باب الصاد ص ۲۷۶ خیر [3] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۰۰ [4] پ ۳۔ البینہ

سے کام لیتا ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان خدا سے زیادہ انسانوں کی بہی خواہی کا دعوی نہیں کر سکتا۔

قرآن جب تمام انسانوں کو عمل صالح اور اچھے کردار کا مشورہ دیتا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ انسان خود بہتر ہو، ایک بہتر معاشرہ پیدا کرے۔ اس معاشرہ کے ارکان مل کر بہترین حکمت عملی اختیار کریں ۔ اور ایک ایسی حکومت قائم کریں جو معمورۂ عالم کو اچھے کاموں سے مل کر گلزار کر دے ۔ یہ بات قطعی ہے کہ جہاں قرآن کے حکم کے مطابق سوسائٹی کے تمام افراد اپنی بہتری کے لیے بہترین کام کرینگے اور جملہ برائیوں سے باز رہینگے وہاں بہترین حکومت ضرور قائم ہو کر رہیگی اور جہاں اس قسم کی حکومت وجود میں آئیگی وہاں تمام انسانوں کی بہتری کا مقصد لازماً پہلا اور آخری مقصد ہوگا۔

قرآن کے اس نظریہ کی بنا صاف ضابطوں پر قائم ہے (من یعمل من الصلحت و هو مؤمن) جس کا عمل بہتر ہے وہی مومن ہے اور اس کی جد و جہد کامیاب ہے۔ (ومن یعمل مثقال ذرة خیرا یره ٭ ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره (الزلزال پ۳۰) جو انسان ذرہ برابر اچھا کام کریگا وہ اس کا اچھا ثمرہ پائیگا اور جو ذرہ بھر برائی کریگا وہ اس کا برا نتیجہ ضرور دیکھیگا۔

یہاں اس پر ضرور غور کیجیے کہ جس دینی نظام کی بنیاد اس طرح کے پسندیدہ ضابطوں پر قائم ہے اس کی غایت عالمگیر بہتری کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرن اول میں جو اصحاب اس اجتماع کے رکن بنے ان کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ان کے لیے خدا کا حکم تھا کہ دنیا میں ہمیشہ ایک ایسی امت رہنی چاہیے جو بہتری کی طرف بلاتی رہے اور اس طرح حکومت کرے کہ تمام اچھی باتیں حکومت کے مزاج میں داخل ہو جائیں اور تمام

قرآن عظیم ۔ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۹۴

بُری باتیں ناقابلِ عمل قرار پائیں[1]۔ ان کے لیے (فاستبقوا الخیرات) کا فرمان جاری ہو چکا تھا جس کے معنے یہ تھے کہ زندگی کی دوڑ میں اپنی بہتری کے لیے تیز دوڑ لگاؤ۔ اور راہِ ارتقا پر گامزن ہو
یہی وجہ ہے کہ جب پیغمبر کائنات نے انسانیت عامہ کو توحید کی طرف دعوت دی تو ابتدا کے دو تین جلسوں ہی میں یہ فرما دیا "میں خدا کا نمائندہ اور پیغمبر ہوں میں صرف عرب ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہوں[2]" تم سب میرا ساتھ دو۔ لا اله الا الله کا نعرہ بلند کرو۔ صرف اس لیے کہ اس میں تمہاری بہتری کا پروگرام ہے۔ میں عرب میں کسی ایسے جوانمرد سے واقف نہیں ہوں جو اپنی قوم کے پاس وہ دولت لایا ہو جو میں لایا ہوں (قد جئتکم بخیر الدنیا والآخرۃ[3]) دنیا کی بہتری اور دنیا کے بعد آخرت و انجام کی بہتری!

آنحضرت کا یہ فرمان اجتماعیات سے براہ راست متعلق تھا۔ یہ کسی فرد سے خطاب نہ تھا بلکہ ایک سوسائٹی اور قبیلہ کی ہیئت اجتماعی کو خطاب تھا۔ یہ حقیقت تبوک کے محاذ پر اس وقت اور اُجاگر ہو گئی جب آپ نے یہ اعلان فرمایا (خیر الملل ملۃ ابراهیم[4]) اقوام و امم میں بہترین قوم ملت ابراہیمی ہے۔ آپ نے ایک اور محاذ پر علمبردارانِ اسلام کی طرف اشارہ کر کے یہ اعلان کیا تھا (انتم خیر اهل الارض) تم ہو روئے زمین پر بہترین انسان۔

تبوک کے موقع پر زبان مبارک سے یہ پاکیزہ کلمات بھی سُنے گئے (خیر الامور عوازمها ــ خیر الاعمال ما نفع ــ خیر الهدی ما اتبع ــ خیر الزاد التقوی ــ وخیر ما وقر فی القلوب الیقین) بہترین امور عزائم ہیں اور عزیمتیں۔ بہترین حکمت عملی

---

[1] قرآن عظیم ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر۔ احکام القرآن جصاص ج ۲ ص ۳۶
[2] انی رسول الله الیکم خاصۃ والی الناس عامۃ (ابن اثیر) [3] قولوا معی لا اله الا الله وان تفلحوا (ابن کثیر) [4] تاریخ الکامل ابن اثیر الجزری ج ۲ ص ۲۲، تاریخ البدایۃ والنهایۃ ابن کثیر
[5] البدایۃ والنهایۃ ابن کثیر ج ۵ ص ۱۳ [6] (بخاری ومسلم) یوم الحدیبیه۔ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۷۱

وہ ہے جس کا فائدہ عام ہو۔ بہترین رہنمائی اور لیڈرشپ وہ ہے جس کی پیروی کی جائے۔ بہترین زاد راہ نکوکاری ہے، اور بہترین شے جس کا دل مسکن ہیں یقین ہے"۔

انسانی نظم کی بہتری کے لیے صدر حکومت کی اطاعت فرض ہے لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے (انما الطاعۃ فی المعروف) وہی حکم قابل اطاعت ہے جو بہتر اصول پر مبنی ہو۔

آخر کی چند صدیوں کے مجہول تعامل کی بنا پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ طلب صادق کا کوئی ولولہ دنیا کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تاریخ اس تصور کو باطل قرار دیتی ہے۔ دنیا میں باطل زندگی کی تلاش باطل ہے لیکن بہتر معیار زندگی کوئی بری بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اعظم کے سفراء جب دوسرے شاہی درباروں میں اسلام کا اجتماعی پیغام لے جاتے تھے تو وہ اس بات کو صاف کر دیتے تھے کہ اسلام ایک ایسے دینی نظام پر مشتمل ہے جس میں دین و دنیا دونوں کی بہتری یکساں رونما ہوتی ہے۔ چنانچہ جب علاء بن الحضرمی منذر بن ساوی کے دربار میں حاضر ہوئے اور منذر نے مجوسی نظام زندگی کو خیرباد کہا تو علاء نے ان الفاظ میں خطاب کیا۔ "مجھے کوئی امر اس میں مانع نہیں ہے کہ میں ایک ایسے دین کو قبول کر لوں جس میں دنیاوی زندگی کی آسائش اور موت کا سکون دونوں موجود ہیں۔ عمرو بن العاص جلندی کے یہاں باریاب ہوئے۔ انہوں نے حضور کے متعلق تعارفی جملے یہ ادا کیے (ھذا النبی الذی جاء بالدنیا والآخرۃ) یہ وہ پیغمبر ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کو لے کر ظاہر ہوئے ہیں۔ جلندی نے ان الفاظ کو سن کر جو جواب دیا وہ بھی یادگار ہے۔ "تم نے ایک پیغمبر کی طرف مجھے بلایا ہے قسم بخدا جو بہتری اس پیغمبر کے پروگرام میں داخل ہے میں پہلے سے اس کا قائل ہوں اور جس خرابی سے وہ منع کرتے ہیں میں اس سے قبل اسے چھوڑ چکا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ پیغمبر ہیں"۔

۱؎ فتح الباری و صحیح البخاری باب اجر من قضی بالحکمۃ فالسمع والطاعۃ، ج ۱۳، ص ۱۰۴۔۱۰۶۔ ۲؎ روض الانف سہیلی ج ۲ ص ۳۵۶۔۳۵۱

۹ سنہ ہجری میں اسلامی حکومت کے صیغہ خارجہ کی دستاویزی معلومات اور مندرجہ بالا تشریحات قطعی الثبوت ہیں اور انسان کی فکر درخشاں کے لیے ایک عظیم ہدیہ ہیں۔ ہم ان کی امداد سے بخوبی اسلامی حکومت کی حقیقی غایت کو متعین کر سکتے ہیں۔[1]

اسلامی حکومت کے نام

دفعہ (۱) امامت کبریٰ

امامت۔ ایک ایسی ریاست عامہ[2] (Leadership of Democratic Government) کا نام ہے جو پیغمبر اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قانونی نمائندگی سے حاکمانہ بالادستی حاصل کرتی ہے اور دنیا و دین کی اجتماعی سرگرمیوں میں اپنی عظمت و طاقت کا اس طرح اظہار کرتی ہے کہ اس میں اعلیٰ رہنمائی کے اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔

محراب و منبر کی امامت (نماز کی اقامت) فرض عین ہونے کے باوجود امامت صغریٰ ہے اور حکومت و سلطنت کی یہ امامت، امامت کبریٰ ہے۔

امامت کبریٰ اسلامی حکومت کا وہ اعلیٰ ترین نام ہے جس سے اس طرز حکومت کی خوبی، بڑائی اور اس کے مستقل امتیازی وجود کا اعلان ہوتا ہے۔ اس سے ابراہیمی تنظیم کے پاکیزہ

---

[1] تفسیر قرآن عظیم ابن کثیر ج ۲ ص ۵۰۸ حافظ عماد الدین نے حوالہ بالا میں ان احادیث کو پیش کیا ہے جن میں دنیاوی زندگی کی بہتری بجائے خود ایک مستقل مقصد کا درجہ رکھتی ہے۔ اور صالح انسانوں کے لیے غایت قرار پا سکتی ہے۔

[2] المواقف (المرصد الرابع فی الامامۃ) ج ۸ ص ۳۴۴۔

اوصاف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی امامت ( ) کا حق صالح اور صلاحیت مند مسلمانوں کے ہاتھ میں آتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وفادار انسانوں کو اقتدار اعلیٰ کی اطاعت کا ثمرہ حکومت کی شکل میں حاصل ہوتا ہے۔

قانونی تشریحات

امامت کے طرزِ حکومت کو حقیقت سمجھ کر یہ تصور کیجیے کہ ہماری دنیا عالمگیر برادری کا شاندار اجتماعی نظام ہے۔ یہ عالمگیر برادری خدا کی قائم کردہ سچی انسانیت کے اصول پر حکومت کے نظام کو چلانے کے لیے اپنا ایک فرض سمجھ کر امام[1] چنتی ہے یہ امام ساری برادری میں اپنی نظیر آپ، خدا ترسی کے قانون کا پابند۔ خدائی آئین کا پیروکار، علم[2] و عقل میں فرد، نیکی میں یگانہ عظمت میں دلوں کا سردار، سب میں بڑا، سب کا بڑا حکومت کی قابلیت[3] میں یکتا جمہور کی نظر میں دانائے روزگار، اور ساری سوسائٹی[4] میں اصلح[5] ہے۔ قوم اپنے اختیار سے امام کے ہاتھ میں حکومت اور سیاسی ہیئت کی لیڈر شپ (Leadership) دے دیتی ہے یہی لیڈر شپ[6]، رہنمائی اور رہنمائی کا فعل امامت ہے۔

یہ سمجھیے کہ روئے زمین کی مملکت ایک عظیم الشان کارپوریشن (Corporation) ہے اور امام اس کا میئر (Mayor) یعنی —— امیر ہے

لیڈر شپ کا اعلیٰ اعلیٰ تصور کیجیے، میئر شپ کا بہتر سے بہتر مفہوم دماغ میں لائیے۔

---

[1] بدائع الصنائع۔ فی ترتیب الشرائع۔ امام مسعود الکاشانی حنفی۔ کتاب آداب القاضی ج ۷ ص ۲

[2] احکام القرآن جصاص ( ) ج ۱ ص ۵۳۶ [3] مختصر علامہ خلیل مالکی تعلیق احمد نصر۔ مطبوعہ ۱۳۵۵ھ مصر۔ [4] الوجیز (فقہ شافعی) دیکھو امام غزالی کی رائے ج ۲ ص ۱۴۳

[5] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۲ ص ۶۰۲ لفظ امام۔

سیاسی اور اجتماعی رہنمائی اور حکومت کا بلند سے بلند انسانی نظریہ قائم کیجیے اس پر بے تکلف امامت کا اطلاق ہوگا۔

نقل اثر (و) وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا[1]

(ب) وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا

تشریح (الف) ابراہیم کے پروردگار نے جب اُس کو کئی باتوں میں آزمایا اور اُس نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو فرمان ہوا میں تجھ کو انسانوں کا امام (رہنما و پیشوا) بناؤں گا۔

(ب) خدائے برتر فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے نمائندوں ہیغیروں او پیغمبروں، اسحٰق، یعقوب اور ان کے علاوہ تمام رسولوں کو صالح اور صلاحیت مند بنایا ان کو امام و پیشوا قرار دیا وہ ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں اور ہمارے حق حکومت اور اختیار کے ماتحت راہ دکھاتے ہیں۔

علامہ ابوبکر جصاص حنفی امامت کے متعلق تین اصطلاحی باتیں فرماتے ہیں۔

(۱) امام وہ شخص ہے جو مذہبی قانون کی بنا پر اپنے پیرووں کی رہنمائی کرے۔

(۲) یہ رہنمائی نبوت (خدائی نمائندگی) کی سند پر کی جائے۔

(۳) تمام انبیاء امام ہیں اور حکومت کے منصب پر امامت کے عہدیدار۔[1]

مندرجہ بالا اصطلاحی امامت عظمیٰ ہی کا وہ منصب ہے جو اسلامی دور کی حکومت کا مطمح نظر رہا ہے اور جس کا ذکر ہمارا مقصود اصلی ہے۔

ہمارے علماء اجتماعیات نے اسلام کے طرز حکومت کو شاندار ظاہر کرنے کے لیے امامت کو امامت عظمیٰ، امامت کبریٰ اور امامت عامہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

---

[1] احکام القرآن جصاص ج ۱ ص ۸۰، ابو بکر جصاص الرازی الحنفی متوفی ۳۷۰ھ۔

علامہ ابن خلدون خلافت و امامت کے نظریہ کو پیش کر کے فرماتے ہیں۔ حکومت کا وہ منصب جو دین کی نگہبانی اور دنیا کے سیاسی فرائض کو پورا کرتا ہے خلافت و امامت ہے اسی کو امامت کبریٰ اور خلافت عامہ کہا جاتا ہے[1]۔

علامہ شیخ محمد امین ابن عابدین اپنی قانونی تصنیف میں یہ تصریح کرتے ہیں کہ جب انسان متحد ہو کر اپنی رہنمائی کا کام کسی کو اس طرح سپرد کریں کہ وہ صف اول کا پہلا شخص ہو اور سب سے آگے ہو اور انسانی جماعت کے سب ارکان اس کے پیچھے ہوں تو اسلامی قانون میں لازماً اس کی دو صورتیں نظر آئینگی۔

(۱) اگر انسان جمع ہو کر نماز کی رہنمائی کسی کو سپرد کرتے ہیں تو یہ امامت صغریٰ ہے

(۲) اور اگر انسان اجتماعی احکام و قوانین میں کسی ہستی کو آگے کر کے اس کی رہنمائی قبول کرتے ہیں تو یہ امامت کبریٰ ہے۔

امامت کبریٰ ایک خاص قسم کا فرض ہے، محراب و منبر اور نماز کی امامت درجۂ اول پر ہونے کے باوجود امامت کبریٰ کے ماتحت ہے[2]۔ کیونکہ اسلامی حکومت نہ ہو تو نماز کے واجبات صحیح طریقہ پر ادا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر سلطنت نہیں ہے تو نماز کی حاکمیت بھی باقی نہ رہیگی۔

اس حکیمانہ نظریہ کے بعد فاضل فقیہ امامت کبریٰ کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں

"خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا کے باشندوں پر وہ عام تصرف جو ایک ریاست عامہ کی تشکیل کا موجب ہوتا ہے اور جس کو پیغمبر کی نمائندگی کا فخر حاصل ہو[3]"

---

[1] مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون (امامت و خلافت) ص ۱۳۴

[2] احکام القرآن ابو بکر الجصاص حنفی رحمۃ اللہ علیہ (دیکھو تائیدی نظیر کے لیے)

[3] رد المختار بر در المختار۔ باب الامامۃ ج ۱ ص ۵۱۱

یہ کہنا چاہیے کہ امامت اپنی اصل کے اعتبار سے عام قیادت (لیڈرشپ) ہے اور پیغمبر اعظم کی نسبت سے خلافت، نیابتی صومت، کی خود شناس ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے اور اسلام کے اجتماعی نظام کو زعیم بن کر چلاتی ہے مگر نیابت[1] کے طور پر فلسفۂ اجتماعیات کے مسلمان ماہرین میں سے ابن رشد[2] اسلامی طرزِ حکومت کو امامت کبریٰ کا نام دیتا ہے۔ امام ابن مسعود[3] کاشانی حنفی امامت عظمیٰ کے لفظ سے موسوم کرتے ہیں شیخ خلیل[4] مصری مالکی امامت عظمیٰ کے نام کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام غزالی[5] نے امامت کے لفظ پر اکتفا کیا ہے۔ علامہ[6] قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے امامت عامہ کو ترجیح دی ہے۔ اسلام کے قانون مدنی کی مشہور کتاب شرح المواقف[7] میں اسلام کے طرز حکومت کو ریاست عامہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور امام ابوالبقاء[8] حنفی نے بھی اسی لفظ کو حق ترجیح دیا ہے۔

ریاست عامہ

دفعہ (۱۲) خلافتِ عظمیٰ

(الخلافۃ نیابۃ فی حفظ الدین وسیاسۃ الدنیا) "ابن خلدون"

نمائندہ اور نیابتی حکومت جو دین و دنیا کے دائرہ میں ذمہ داریوں کے بارگراں کو فرمانروائے اعلیٰ (خداوند عرش) کے اقتدار کے ماتحت امانت کے طور پر قبول کرتی ہے

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۲ ص ۶۱۲ (اعلم) [2] بدایۃ المجتہد ابن رشد قرطبی (۵۲۰ھ – ۵۹۵ھ) کتاب الاقضیہ ج ۲ ص ۳۹۵ طبع مصر ۱۳۳۹ھ [3] بدائع۔ امام علاء الدین ابوبکر ابن مسعود کاسانی حنفی آداب القاضی ج ۷ ص ۲ [4] مختصر علامہ خلیل بن اسحٰق مالکی۔ طبع مصر ۱۳۵۵ھ
[5] الوجیز (فقہ امام شافعی)، غزالی ج ۲ ص ۱۴۳ [6] تفسیر مظہری۔ الم۔ بقرہ ج ۲ ص ۱۲۴
[7] المواقف۔ ج ۸ ص ۳۴۵
[8] کلیات العلوم ابوالبقاء حنفی۔ الامام۔ ص ۱۳۲۔

خلافت[1] ہے ۔ یہ حکومت انسانی زندگی کی تنظیم کے دائرہ میں خداوند تعالیٰ اور اس کے قانونی نمائندوں کے سونپے ہوئے حاکمانہ واجبات کو پورا کرتی ہے اور منجانب اللہ ان تمام اختیارات کی مالک ہوتی ہے جو نیابت کے طور پر اس کو حاصل ہوتے ہیں۔

خلافت عظمیٰ[2] چونکہ اس حکومت کا غالب رجحان ایک خدا کے لیے دنیا کو فتح کر کے عالمگیر عظمت[3] حاصل کرنے کی طرف ہوتا ہے اس لیے اس کو خلافت عظمیٰ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

خلافت عامہ[4] چونکہ خلافت کے نیابتی واجبات کی تکمیل میں جنگ و جہاد، جد و جہد اور نصب العین کی عمومیت کو دخل ہوتا ہے اس لیے اس کو خلافت عامہ بھی کہتے ہیں[5]۔

خلافتِ راشدہ خلافت جب نیابتی حکومت کی حیثیت سے ابراہیمی اوصاف پیدا کر لیتی ہے، پیغمبر اعظم کی اصل رہنمائی سے متاثر ہو کر خدا ترسی کے قانون کو اپنا اصول بنا لیتی ہے اور تمام اجتماعی بھلائیوں کو قبول کر کے تمام برائیوں سے انکار کر دیتی ہے تو اس کو خلافتِ راشدہ کا لقب حاصل ہو جاتا ہے۔

قانونی تشریحات | حکومت کا وہ نظریہ جس کا نام خلافت ہے، صدیوں تک ایشیا، یورپ اور افریقہ پر حکمرانی کر چکا ہے۔ اس نظریہ کے مناظر کبھی اصلی اور پرجوش ہوتے تھے، کبھی اصل سے کچھ ہٹے ہوئے اور کبھی حقیقت کے بالکل خلاف۔ بہر حال خلافت راشدہ

خلافت بنی اُمیہ خلافت عباسیہ خلافتِ فاطمیہ

اور خلافت عثمانیہ کی تاریخ نظریۂ خلافت کی تاریخ ہے۔

[1] دیکھو بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ کتاب آداب القاضی ج ۷ ص ۲ طبع جمالیہ مصر
[2] تفسیر القرآن العظیم ج ۳ ص ۳۰۰، السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ امام ابن تیمیہ۔
[3] دیکھو مقدمہ ابن خلدون (اختلاف الامہ) ص ۱۳۴ [5] حجۃ اللہ البالغہ۔ مبحث جہاد ج ۲ ص ۱۷۲

خلافت نام ہے نیابتی حکومت کا، یہ ایک قسم کی نیابت، نمایندگی اور وائسرائلٹی ہے جو دینی سفارت کے ذریعہ دنیا کے ان تاریخی مصلحین اور انقلابی رہنماؤں کو حاصل ہوئی ہے۔ جنہوں نے خدا کے الہام اور احکام کی سند پر انسانیت کی خرابیوں کو چیلنج کیا اور ایک عام انقلاب بپا کر کے انسانیت کی تعمیر و ترقی کے پروگرام کو آگے بڑھایا۔ اور دنیا کی روحانی معاشی۔ تمدنی اور دولتی تاریخ کے اُس ارتقائی پہلو کو ظاہر کیا جس کا تعلق مذہبی اور فطری دور سے ہے

یہ دور آدم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور اصلاح کے آخری داعی سرور دین اور سردار دنیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور خلافت پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دور خلافت الٰہی کا دور ہے۔ آپ کے بعد خلافت راشدہ کے چار دور (جن میں دو دور زیادہ ممتاز اور مکمل ہیں) خلافت مہدی کے دور ہیں۔ بعد کے دور خلافت کے نام پر دنیاوی حکومت کا نمونہ تھے۔

ابو حیان خلیفہ کی اصطلاحی تعریف میں کہتے ہیں[1] "وہ ہستی جس کے ہاتھ میں روئے زمین کے باشندوں کی سیاسی تنظیم و تدبیر کا کام ہو جو انسانوں کے مفاد عامہ کا نگراں ہو۔ اور جو حکومت کا حق دوسری قوت کی طرف سے حاصل کرے۔ خلافت خلیفہ کے کاموں اور کارناموں کی صورت اور ان سے جو منصب حکومت پیدا ہوتا ہے اس کا نام ہے۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں "خلیفہ وہ ہستی ہے جو کسی دوسرے کی نمائندہ اور نائب[2] ہو۔

علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:۔

"آدم اور وہ تمام پیغمبر، خلیفۃ اللہ کا عہدہ رکھتے ہیں روئے زمین پر عمرانی، سیاسی، اجتماعی

---

[1] بحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ ص ۱۴۰ [2] کشاف زمخشری ج ۱ ص ۶۱

اور حکومتی سرگرمیوں میں خدا کی نیابت کرتے ہیں۔"[1]

تیسری آیت میں عصرِ محمدی کی خلافت کا اعلان ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحقیق یہ ہے کہ اس آیت میں بدر کے محاذِ جنگ کے سپاہیوں سے خطاب ہے۔ اور ان سے وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو خلافت کا منصب، شوکت و سطوت اور غلبہ و اقتدار عطا کیا جائے گا۔[2] اس تخصیص سے اصل نتیجہ پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑتا کیونکہ محاذ بدر کے مسلمانوں نے جس سیرت، کردار اور قوت ایمانی کا مظاہرہ کیا وہی اسلامی حکومت کی بنیاد متصور ہوتی ہے۔ معرکۂ بدر کی کامیابی، مکہ، یرموک، قادسیہ کی فتح کا پیش خیمہ تھی۔ بدر کے سپاہی اسلامی حکومت کا ہراول دستہ تھے اس لیے خاص ان کے لیے جو اعلان کیا گیا ہے اس کا مقصد اگر عام قرار دیا جائے تو صداقت کے خلاف نہ ہوگا۔

نظائرِ بالا سے نظریۂ خلافت کے دو پہلو ثابت ہوتے ہیں:-

(۱) خلافت پہلے درجہ پر وہ حکومت ہے جو خدا کی نیابت کے طور پر خدا کے نمائندوں کو حاصل ہوتی ہے۔

(۲) خلافت دوسرے درجہ پر وہ حکومت ہے جو آخری انقلاب کے داعی، انسانیت عامہ کے پیغمبر محمد مصطفیٰ (صلعم) کی نیابت کی حیثیت سے حاصل ہوئی ہے[3] اور بسلسلہ نیابتی حکومت کی حیثیت سے دنیا میں فتوحات حاصل کرتی ہے یہی وہ پہلو ہے جو ہمارا موضوع مقصود ہے۔

امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اپنی کتاب حجۃ اللہ[4] میں جنگ و جہاد کے اسلامی تصور

---

[1] روح المعانی ج ۱ ص ۲۰۲ [2] ازالۃ الخفاء (خلافت الخلفاء) شاہ ولی اللہ ج ۱ ف ۱ ص ۲۸۔

[3] دیکھو روایت ابو حصین، ابوبکر صدیق کے متعلق "لقد قام مقام نبی من الانبیاء" ابوبکر پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کے قائم مقام اور نائب تھے۔ فتوحات الاسلامیہ دحلان ج ۱ ص ۴

[4] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ حوالۂ بالا۔

کو پیش کرتے ہوئے پہلے پہلو کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یہ بات ایک حقیقت کے طور پر جان لینی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کا منصب دے کر بھیجے گئے ہیں۔ دنیا میں ان کے دینی نظام کا غلبہ دو باتوں پر موقوف ہے۔ (۱) جنگ و جہاد (۲) اسلحۂ جنگ کی تیاری"

حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی اپنی تفسیر قرآن العظیم میں دوسرے پہلو کی حسب ذیل تشریح کرتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے بعد ان کی اُمت کے ارکان کو روئے زمین کی خلافت و حکومت دی جائیگی جو دنیا میں صحیح تمدن کو پھیلائینگے۔ بد امنی دور ہو کر امن قائم ہوگا۔ بندگان خدا ان کی حکومت کی اطاعت کرینگے۔ یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے[1]"

علامہ آلوسی بغدادی کہتے ہیں کہ "خلافت ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ اور اس کا شکر و سپاس عدل ہے۔ سلطنت کے آئین میں خلیفہ اس وقت نائب السلطنت کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ جب اس کو حکومت اعلیٰ سے حکومت کرنے کا نیابتی فرمان[2] مل جاتا ہے"

دفعہ (   ) خلافت راشدہ[3]

بہتر سے بہتر طرز حکومت جس میں ہر اچھے طرز حکومت کی جملہ خوبیاں (اخلاقی ہوں یا عمرانی سیاسی ہوں یا تمدنی، قانونی ہوں یا اقتصادی) پائی جائیں اور جسکو مسلمانوں

---

[1] دیکھو تفسیر قرآن العظیم (بحوالہ بالا)   [2] روح المعانی آلوسی۔ ج ۲۳ ص ۱۶۹

[3] خلافت راشدہ کو اسلام کے نظام حکومت میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس لیے اس کو ایک مستقل دفعہ کے ماتحت درج کیا گیا ہے۔ فاروقی

کے قلب اور قالب میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں سب اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہوں ایسے طرز حکومت کا نام حکومتِ راشدہ ہے۔ جب اس مثالی اور اصولی حکومت میں پیغمبر اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت اور نمائندگی کی صورت پیدا ہو جائے تو وہ "خلافت راشدہ" بن جاتی ہے۔

قانونی تشریحات | امامت کا طرز حکومت اور حکومت کا رُشد (یعنی اعلیٰ معیار) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتماعی اور ملی تنظیم کے سرچشمہ سے محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبوں تک پہنچا ہے۔ امامت اور رُشد دونوں ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے نظریات ہیں اور دونوں کا تعلق اسلام کے قانونی آثار سے ہے مختصر الفاظ میں یہ سمجھیے۔

ا۔ انسانیت عامہ کے صحیح طور پر منظر عام پر آنے کا نام اسلام ہے۔

ب۔ اسلام اپنے طرز پر جب بے مثال حکومت قائم کرتا ہے اس کا نام امامت ہے۔

ج۔ امامت کا مکمل سے مکمل مظاہرہ اور اسلامی حکومت کا اعلیٰ سے اعلیٰ ظہور جب ہو اور جہاں رونما ہو اس کا نام رشد ہے[1]۔

قرآن میں متعدد آیتیں نظریہ رُشد کی صحت کے لیے قوی دلائل کی صورت میں موجود ہیں[2] جن میں رُشد کی عام حقیقت کو پسندیدہ رہنمائی، ہدایت، نیکی کی طرف اقدام کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جب ہم حضرت ابراہیم کی حکومت کے ساتھ رُشد کا ذکر پاتے ہیں تو ایسے مرحلہ پر ہمیں اس کے وہ اصطلاحی معنی مراد لینے ہونگے جو حکومت کی سیاسی ہیئت اور امامت کے مطمح نظر کے مطابق ہوں۔

---

[1] قرآن عظیم س ۲۱۔ آیت ۵۱، س ۲، آیت ۲، س ۲۔ آیت ۱۹

[2] دیکھو ترجمہ تیخ المندب بقرہ ۲ ص ۲۵۔ اسلام کے نقطۂ نظر میں حکومت اور عکبرداری کا رجحان۔

امام راغب کے نزدیک رشد ہدایت ہے۔ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو گمراہی ہے وہ رُشد نہیں ہے جو رشد ہے وہ گمراہی نہیں ہے۔ رُشد دنیا کے کارناموں میں بھی ہوتا ہے اور عاقبت کے کاموں میں بھی۔ اصحاب نبوت کو اسی لیے راشدوں کا خطاب حاصل ہے[1] خلافت راشدہ، خلیفۂ راشد۔ خلفاء راشدین میں رُشد کا مفہوم بھی یہی ہے۔ چونکہ امامت کا کام حکومت کا کام ہے اس لیے یہاں رشد کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے کام کو نیک سے نیک بہتر سے بہتر اعلیٰ سے اعلیٰ طریقہ پر انجام دیا جائے۔

جب ہم ایک ایسے شخص کو رشید کہتے ہیں جو ہماری سیاسی تنظیم کا سردار اور رہنما ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اُمت کی رہنمائی اس طرح کریگا کہ وہ دنیا کے لیے ایک مثال ہوگی۔ ابن الاثیر کہتے ہیں[2] کہ رشید وہ ہے جو عوام خلق کی رہنمائی ان کے عام مصالح، مقاصد اور ان کی عمومی فلاح کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرے۔ ان کو صحیح طریقہ پر رکھے اور ان میں صحیح طریقہ پر حکومت کے کام کو کرے۔ یعنی وہ شخصیت جو اپنی تدابیر کو ایک محکم اور مضبوط قانون کے مطابق چلائے۔ ان کے منتہا تک پہنچائے۔ اس کی رائے، تدبیر اور سیاست اس درجہ محکم، صحیح، قطعی، اور فیصلہ کن ہو کہ وہ ہر کام کو کسی مشیر اور کسی موید کے بغیر بے تکلف انجام دے سکے۔

"آنحضرت کا قول ہے تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کے قانون کی اطاعت واجب ہے" اس قول کے مطابق صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی حیدرؓ مراد ہیں اور اسلام کے نظامِ حکومت کے وہ سردار اور امام جو ان چاروں خلفاء کے طرز پر حکومت کا کام کریں۔ خواہ ان کا تعلق عصر ماضی سے ہو، یا وہ حال کی سطح سے پیدا ہوں، یا آئندہ اس طرز

---

[1] مفردات القرآن امام راغب اصفہانی لفظ الرشید ج ۲ ص ۔ [2] النہایہ فی غریب الحدیث۔ ابن الاثیر ج ۲ ص

کی حکومت قائم کریں

اس تفصیل سے نظریۂ رُشد کی وہ خاص اصطلاحی تعریف متعین ہو جاتی ہے جس کو اس عصر کے اہل علم نے فراموش کر رکھا ہے۔ اس ضمن میں علامہ آلوسی نے پہلی نظیر کی تائید میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی مقصد کو عظیم تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "رُشد سے مُراد ہے رہنمائی کا اعلیٰ اور کامل نمونہ (لیڈرشپ کا کمال) ہم کہہ چکے ہیں کہ امامت ایک قسم کی سیاسی رہنمائی اور لیڈرشپ (Leader Ship) ہے۔ اس رائے سے یہ ثابت ہوا کہ رُشد اس لیڈرشپ کا کمال ہے جو نظریہ رُشد کا مقصد ہے ——— اور آخری منشاء۔[1]

آلوسی صراحت سے کہتے ہیں " رُشد ایسی کامل رہنمائی ہے جو دین ہی نہیں دنیا کے معاملات سے بھی تعلق رکھتی ہے یعنی وہ رہنمائی جو نوامیس الٓہیہ خدائی قوانین کے مطابق ہو"۔

علامہ ابن کثیر دمشقی نے حضرت ابراہیم کی امامت، خدائی حکومت، حکمرداری، صحیح رہنمائی، دنیا کے مقاصد کی سربراہی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی نظریہ رُشد کی تائید ہوتی ہے۔[2]

آخری نظیر کے طور پر "حدیث شوریٰ" کو دیکھنا ضروری ہے۔ قرآن میں آنحضرت کے لیے ایک قانونی آیت کا مستقل دفعہ کی صورت میں اضافہ ہوتا ہے "صحابہ سے حکومت اور جنگ کے کام میں مشورہ کرو"۔ آنحضرت خدا کے اس قانون کو سُن کر فرماتے ہیں[3]۔

" اللہ اور اس کے رسول کو شوریٰ کی ضرورت نہیں لیکن اللہ نے قانون شوریٰ کو اُمت کے لیے رحمت بنا کر جاری کیا ہے/ جو اس قانون پر چلے وہ رُشد کو ہاتھ سے نہ دیگا۔ اور جو اس کی خلاف ورزی کریگا وہ گمراہی کے راستہ سے گم نہ ہوگا۔[4]

---

[1] روح المعانی آلوسی ج ۱۷ ص ۵۴ (پ ۱۷۔ سورۂ انبیاء) مطبوعہ قاہرہ۔ [2] تفسیر قرآن العظیم ابن کثیر دمشقی ج ۲ ص ۵۹۱۔ [3] عن ابن عباس بیہقی نے شعب الایمان میں سند حسن سے اس حدیث کو پیش کیا ہے۔
[4] روح المعانی آلوسی ج ۴ ص ۹۴ (شاورهم فی الامر)

چوتھی صدی ہجری کے بلند پایہ عالم اور حنفی قانون کے ماہر علامہ ابوبکر جصاص نے لکھا ہے کہ خدا سے براہِ راست الہام کی قوت سے فیضان ہونے والے نمائندوں کے بعد خلفاء راشدین امامت و حکومت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں[1] یہی وجہ ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے یہ تصریح کی ہے کہ خلفاء راشدین کی حکومت دین کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے قرآن مجید کے احکام مجمل ہیں ان کی تشریح خلافتِ راشدہ کے دور کے واقعات سے ہوتی ہے پہلی صدی کے اصحاب نبوت اور اسلامی جماعت کے ارکان نے حضور اکرم کا منشا پاکر خلافتِ راشدہ کے ہر دور کو تسلیم کیا اور کسی نے اس طرزِ حکومت کے خلاف جدوجہد نہیں کی۔

دفعہ (۱۴) امارتِ امت

اسلامی حکومت کو حکومت بالادست سے عوام کی شیرازہ بندی کا قانونی اختیار حاصل ہے۔ جب یہ حکومت امورِ عامہ کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور اُمت کے افراد کو ان کی رضاکارانہ خوشنودی کے مطابق ہر اچھا کام کرنے کا حکم دیتی ہے اور بُرے کام کے متعلق امتناعی حکم صادر کرتی ہے تو وہ "امارت اُمت" اور "امارت مومنین" کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

قانونی تشریحات | نظریہ امارت کی ساری عمارت لفظِ امر پر قائم ہوتی ہے۔ امر کے معنی ہیں حکم اور حکم حکومت کا فعل ہے۔ اسلام کے قانون میں چار لفظ ایسے پائے جاتے ہیں جن سے امارت کا تصور ہوتا ہے۔

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۹۷۔

(یادداشت) علامہ سید ابن عابدین نے بھی اسلامی دورِ حکومت کے امراء کے لیے خلفاء راشدین کا لفظ اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ دیکھو ردالمحتار ج ۱ ص ۵۱۱ باب الامامۃ۔

۱۔ امرُ اللہ[1]، ۲۔ امرُ النبی[2]، ۳۔ اولوا الامر، ۴۔ امرُ المسلمین[3]

امر اللہ کا لفظ خدا کی حکومت قائم کرتا ہے۔ امر النبی کا لفظ خدا کی حکومت کی ذمہ داریوں کو پیغمبر کے اختیار میں دیتا ہے۔ اولوا الامر کے لفظ سے خدا کے ان صالح اور رشید بندوں کی مجلس حکومت قائم ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں حکومت کا اختیار پیغمبر خدا کے قانونی جانشینوں کی حیثیت سے آتا ہے اور امیر المومنین اُس شخص واحد کا سرکاری خطاب بنتا ہے جس کو امیر المومنین امیر بناتے ہیں۔

علماء قرآن اور فضلائے قانون امارت اور حکومت کو بدیہی طور پر ایک سمجھتے ہیں سید شریف اپنی اصطلاحات کی کتاب میں امر کی اصطلاحی تعریف یہ کرتے ہیں[4]۔

قائل کا یہ قول "ایسا کرو" امر ہے۔ اگرچہ ان الفاظ میں اصلاً حکومت کا تصور موجود ہے لیکن یہ فقہی تعریف ہمارے قانون کلی سے اس وقت زیادہ مطابق ہو سکتی ہے جبکہ ہم اس میں حکومت کے تصور کو صاف الفاظ میں پیش کریں، اور یہ کہیں۔

"فرمانروا کا حکومت کے دائرہ میں عوام سے یہ کہنا ایسا کرو امر ہے" ابوالبقا نے اپنی تشریح میں اسی تصور کو قبول کیا ہے۔ ان کے الفاظ مختصر ہیں۔ امارت ولایت[5] ہے یعنی حکومت، کلیات العلوم میں امارت اور حکومت کے ربط پر جو نظریں پیش کی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ امارت میں۔ اطاعت اور تسلط دونوں باتیں موجود ہیں[6]۔ ظاہر ہے کہ

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۱ ص ۲۱-۲۲۔ احکام القرآن الجصاص ج ص ۸۰ (یرد، حنوخ)
[2] فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰۴-۵۰۷ (کما اُمرت)، الطرق الحکمیہ فی سیاسۃ الشرعیہ ص ۷-۱۰
[3] المجمع الزوائد و المنبع الفوائد (الہیثمی) ج ۵ ص ۲۱۳ (باب حق الرعیہ) [4] تعریفات سید شریف ص ۲۴ مطبوعہ استنبول ۱۳۲۷ھ [5] کلیات ابوالبقا حنفی مطبوعہ استنبول لفظ امارت ص ۳۴،
[6] دیکھو کلیات ابوالبقا، لفظ ولایت۔

یہی حکومت کی اصل ہیں۔ علامہ آلوسی بھی نظریۂ امارت کے مؤید ہیں[۱]۔

حکومت کے جسم میں قانون روح کی طرح کام کرتا ہے۔ اس لیے امر کا تعلق قانون سے بھی براہ راست ہے۔ علامہ زمخشری (ظھر امراللہ) کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ اللہ کا قانون فائق اور بلند ہوگا[۲]۔

علامہ زمخشری ایک دوسرے مقام پر امارت اور حکومت کے تعلق کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔ فرعون کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ قوم نے قدس کے جابر لوگوں سے خوف زدہ ہو کر داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ زمخشری کہتے ہیں "یہ رجعت امر الٰہی کی مخالفت تھی[۳]۔ کیونکہ اللہ حکومت عطا کر رہا ہے اور وہ رجعت پسندی اور خوف کی وجہ سے تردد کر رہے تھے۔

زمخشری (جبارین) کے متعلق بھی یہ لکھتے ہیں۔ جبار سے مراد وہ لوگ ہیں جو جبر کے ساتھ امارت کرتے تھے[۴]۔

حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فرمانروا ہر کام پر قادر ہو۔ ادھر حکم ہو اور اُدھر ہو جائے۔ قرآن اس خصوصیت کو نظریہ امارت کے ضمن میں ذکر کرتا ہے۔

"جب اللہ ایک کام کا امر کرتا ہے تو وہ فرمان دیتا ہے ہو جا۔ وہ فوراً ہو جاتا ہے[۵]"

ابوحیان اندلسی کہتے ہیں یہاں امر سے مراد فعل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فوراً ہو جاتا ہے۔ یہ تصریح درست ہے مگر یہاں خدا کی قدرت

---

۱ روح المعانی لفظ الطیعون۔ "فیما امرکم بہ وانہا کم بامراللہ تعالیٰ۔ ج ۳ ص ۱۵۲

۲ کشاف زمخشری ج ۱ ص ۱۵۵ ۳ ایضاً ج ص ۳۳۱ "بمخالفت امرد بکو"

۴ کشاف جلد ا ص ۳۳۱ - جبار من جبرہ علی الامر

۵ اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون (قرآن کریم)

کے ساتھ اس کے اختیار کا جو سرچشمہ موجود ہے اس کو بند لگا کر روکا نہیں جا سکتا۔ . . . .
. . . . چنانچہ وہ خود اس بات تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ ازل سے آمر ہے
فرمانروا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے مقام پر امارت اور حکومت کے ربط پر اسلام کے
علماءِ قانون کی رائے پیش کی ہے اتٰی امر اللہ (خدا کی حکومت آرہی ہے) یہ ایک آیت کا
ٹکڑا ہے۔ نظریات کے اختلاف سے قطع نظر۔ اس موقع پر امر کا مفہوم حکومت بھی ہے حضرت
عباس کا قول ہے کہ امر اللہ کی آمد کا اعلان کرکے یہ بتانا ہے کہ خدا کی طرف سے کمک آرہی
ہے۔ فتح پہنچنے والی ہے اور آنحضرت کا غلبہ ہونے والا ہے۔ ابن جریج کی رائے بھی یہی ہے
کہ اس سے فتح و غلبہ کا اعلان کرنا مقصود ہے۔ ضحاک کے نزدیک امر اللہ سے مراد اللہ کی
ذمہ داریاں اور اس کے احکام ہیں[1]۔ ہم کہتے ہیں کہ امارت امت انہی احکام کے نفاذ کا نام
ہے۔ اسلامی حکومت امارت کی حیثیت سے امر الٰہی کے واجبات کو پورا کرتی ہے اور
اُس کے طے کردہ مقاصد کو اعتماد اور اجتہاد کے ساتھ زیرِ عمل لاتی ہے[2]۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن
میں اللہ اور رسول کی حکمبرداری کے ساتھ اولوالامر (صاحب امر، امیر) کی اطاعت بھی
قانون محکم کا درجہ رکھتی ہے[3]۔

دفعہ (۱۴) ولایت عامہ

اسلامی حکومت کا وہ تصور جس کا اظہار ولایت کے لفظ سے ہوتا ہے ایک بلند
مقام سے دنیا کے سیاسی فکر پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اس کا رجحان انتظامی سرپرستی، حمایت

---

[1] بحر المحیط ابوحیان ج ا ص ۳۶۲ [2] ایضاً ج ۵ ص ۲۷۲۔ امر اور حکومت کے ربط کی مزید تفصیل کے
لیے دیکھو روح المعانی (اذا حکمتم بین الناس) ج ۵ ص ۵۸ ج ۵ ص ۶۵۔
[3] دیکھو نظریۂ امارت کی تائید کے لیے، السیاستہ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ (ص ۲-۱۰)

اور انسانی معاشرہ کی امداد کی طرف ہے۔ جب ایک بالادست طاقت یا منتخب ہستی فرمانبردار عوام کی منظم زندگی کی حمایت اور نگہبانی کرتی ہے اور عام اختیار کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے تو اس کو ولایت عامہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نظریہ ولایت کے مطابق بالادست حکومت ایک چیز ہے اور ریاست عامہ دوسری شئے، دونوں پر ولایت کا لفظ صادق آتا ہے البتہ ولایت عامہ کی اصطلاح اسلامی حکومت کے دنیاوی نظم سے متعلق ہے اور خاص اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

قانونی تشریحات | نظریہ ولایت کے ماتحت فرمانروائی کا جو تصور پیدا ہوتا ہے اس کی رو سے فرمانروا کے لیے ولی کا لفظ خاص ہے۔ قرآن میں جابجا ولی کا لفظ اسی مفہوم کو پیش کرتا ہے۔ ولایت ولی کا فعل ہے، جو حکومت کے ہم معنی ہے۔

قرآنی اصطلاحات کے ماہر علامہ راغب لکھتے ہیں۔ ولایت کیا ہے؟ والی امر ہونا۔ حکومت کا مالک ہونا اور ولایت کی حقیقت کیا ہے؟ حکومت کی سربراہی! تائید میں علامہ راغب نے بھی ان آیات کو پیش کیا ہے جن کا انتخاب متن قرآن سے نظائر کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔[1]

علامہ ابوالبقا حنفی اپنی کتاب کلیات میں اس سے بھی زیادہ بہتر الفاظ میں نظریہ ولایت اور حکومت کے ربط کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "ولایت کی مراد امداد اور حمایت ہے اور ولایت کا مفہوم سلطنت اور مملکت ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص انسانی ہیئت کا والی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ منصب ولایت (حکومت) پر متمکن ہے۔"[2]

---

[1] مفردات القرآن۔ امام راغب اصفہانی لفظ ولی
[2] کلیات العلوم۔ ابوالبقاء حنفی۔ لفظ ولایت ص ۶۸۱

علامہ آلوسی خدا کی ولایت اور (مولاھم الحق) فرمانروائے برحق کے متعلق لکھتے ہیں
"(اللہ) ان کا بادشاہ، مالک ہے جو ان کے کاموں کا فرمانروا اور ذمہ دار ہے"[1]
ان کے نزدیک "ولایت امر" حکومت کی ایک ذمہ داری ہے۔ قرآن کی ایک آیت یہ ہے (ھنالک الولایۃ للہ الحق) حضرت شیخ الہند دیوبندیؒ اس آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں "یہاں سب اختیار اللہ (برحق) کا ہے۔
مندرجہ بالا نظائر سے ثابت ہوا کہ ولایت کی حقیقت حکومت ہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولایت عامہ کا سرچشمہ ایک بالادست ولایت ہے اور اس کو اسلامی حکومت کے لیے بولا جاتا ہے۔
ہمارے علمار قانون خلافت عظمیٰ اور امامت کبریٰ کی طرح ولایت اور ولایت عامہ کا لفظ بھی اسلامی حکومت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔[2]
ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ولایت کا مقصد "امارت مومنین" ہے۔[3] علامہ ماوردی نے اپنی کتاب میں ولایت دینیہ (حکومت مذہبی) اور ولایت عامہ کا لفظ حکومت کے لیے اختیار کیا ہے۔[4]
امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ولایت (ایک حکومت کی حیثیت سے) ایک امانت ہے جس کے واجبات کو پورا کرنا ضروری ہے۔[5] ہمارے زمانہ کے مشہور مصری محدث استاذ الازہر علامہ شیخ منصور علی ناصف اپنی کتاب میں عصر قدیم کے علمار کی تائید کرتے ہوئے یہ

---

[1] روح المعانی (ای مالکھم الذی یلی امورھم) ج ۷، ص ۱۵۳
[2] مزید تفصیل کے لیے دیکھو تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر دمشقی (م ۷۷۴ھ) ج ۲ ص ۱۳۶-۱۳۷۔
[3] المجمع الزوائد والمنبع الفوائد ج ۵ ص ۲۱۳۔ حدیث عن انس ابن مالک روایت الطبرانی فی الصغیر
[4] الاحکام السلطانیہ ص ۲-۳-۱۷ [5] السیاسۃ الشرعیہ، امام ابن تیمیہ ص ۵-۶۔

تصریح کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت اپنے مخصوص مفہوم میں ولایت عامہ[1] ہے۔

دفعہ (۱۵) مملکت اور مملکت دارالاسلام

دارالاسلام | اسلامی حکومت اپنے رقبہ مملکت کے اعتبار سے ارضی مملکت ہے۔ وہ ایک ایسی ریاست عامہ ہے جس کے دونوں بازو روئے زمین کے تمام منطقوں پر حاوی ہیں۔ چونکہ وہ ایک مملکت ہے اس لیے اس کو (ملک[2]) کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے اور چونکہ اس کا رقبہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی تمام سرزمین ہے۔ اس لیے اس کا نام ارض ہے۔

قانونی تشریحات | قرآن عظیم نے اسلامی مملکت کے لیے جا بجا ارض اور ملک کے الفاظ ذکر کیے ہیں:-

۱۔ (اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) میں آدم کو روئے زمین پر نائب حکومت بنانے والا ہوں۔

۲۔ (وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ ۷) ہم نے تم کو روئے زمین میں تمکین اور استقرار حکومت عطا کیا اور تمہارے لیے اس میں سامان معیشت رکھا۔

ارض | ان آیات میں ارض کا لفظ جس طرح آیا اس سے مٹی کا کرہ اور خاک کا وہ فرش مراد نہیں ہے جس کو ہم اپنی زبان میں زمین کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے ارض اللہ کے لیے ہے[3]۔ اس کا

---

[1] التاج الجامع للاصول ج ۳ ص ۴۰ حاشیہ (۱) [2] وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا ۔ ہم نے آل ابراہیم کو مملکت عظمیٰ عطا کی قرآن عظیم پ النساء ۸ [3] اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ ارض میرے صالح بندوں کی میراث ہے۔ [4] قرآن ۱۲۸/۷

بلکہ یہ مفہوم ہے کہ زمین اللہ کی حکمرانی اور قبضۂ قدرت میں ہے۔ اللہ نے آدم اور اولادِ آدم کو نیابت کے طور پر ارضی مملکت کا انتظام سپرد کیا ہے۔ اگر ارض کے معنی زمین کے لفظ سے لیے جائیں اور زمین سے اُس کا وہ عام مفہوم لیا جائے جو ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے تو قرآن کا مقصود دور جا پڑیگا۔ ان آیات کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے اللہ تعالیٰ آدم اور اولادِ آدم کو زمین کے مربعے دے کر زمینداری کے سسٹم کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اور ارض سے ارضی نظام اور مملکت مُراد نہیں ہے۔

علامہ سید محمد آلوسی بغدادی آخری آیت پر اجتماعی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خلیفہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نائب حکومت ! ہر پیغمبر انسانِ کامل[1] کی حیثیت سے انسانوں پر خلیفہ ہے خلیفہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں ___ ؟ عمارات الارض، روئے زمین کی عمرانی تنظیم۔ ! سیاست الناس ؟ انسانوں کی سیاسی رہنمائی تکمیلِ نفوس ؟ نفوس انسانی کو معراجِ کمال پر پہنچانا تنفیذِ امر ___ ؟ خدا کی حکومت کے قوانین و احکام کا اجراء[2]"

علامہ آلوسی ایک اور مقام پر خلافت ارضی کے متعلق قرآن کی ایک آیت کی تفسیر اِن الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق مسلمانوں کو خلافت ارضی (روئے زمین پر سیاسی نیابت اور حکومت عطا کریگا۔ خلفاء کو ارض پر اسی طرح تصرف حاصل ہوگا جس طرح ملوک کو اپنی مملکتوں[3] میں ہوتا ہے" یعنی جس طرح ایک بادشاہ کی بادشاہی کا دائرہ مملکت پر

---

[1] انسانِ کامل وہ ہے جو اپنے عقائد اور اعمال کو خدائی قوانین اور فطرت کے ضوابط کے ماتحت بروئے کار لائے۔ اس تعریف کے مطابق ہر پیغمبر انسانِ کامل ہے، اور خلافت (نیابتی حکومت) ان کا اور ان کے خلفاء کا حق ہے۔ روح المعانی علامہ آلوسی ج ۱ ص ۲۰۲۔ [2] روح المعانی ج ۱ ص ۲۰۰۔۲۰۲۔ مزید تشریح کے لیے دیکھو کشاف علامہ زمخشری ج ۱ ص ۶۱۔ ذکر م خلافت آدم خلافۃ انبیاء خلافت ارضی۔ [3] روح المعانی ج ۱۸ ص ۱۸۲-۱۸۳۔

حاوی ہوتا ہے اسی طرح خلافت کا دائرہ مملکتِ ارض ہے۔

اس نظریہ کی تائید اس حدیث صحیح سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت نے فرمایا: میرے سامنے ارض یعنی (تمام روئے زمین) کو پیش کیا گیا مجھے مشرق اور مغرب کے گوشے دکھائے گئے۔ عنقریب میری اُمت کی سلطنت ان علاقوں پر چھا جائیگی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔[1]

حدیث میں صاف طور پر ارض سے قلمرو ارضی مراد ہے۔ حدیث میں ملک کا لفظ ارض کے مفہوم کو متعین کرنے میں خاص طور پر کارآمد نظر آرہا ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسی[2] کے بیان سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"علماء[3] کی رائے عامہ ارض سے سطح ارض مراد لیتی ہے۔ سطح ارض بھی — اپنے تمام حدود کے ساتھ" خلیفہ کے لیے ارض وہی حیثیت رکھتی ہے جو قیصر کے لیے مملکت روم۔ کسریٰ کے لیے مملکت فارس اور تبع کے لیے مملکت یمن

مندرجہ بالا تمام قانونی نظائر اس صداقت کا ثبوت ہیں کہ قرآن نے حکومت و خلافت کے ساتھ جہاں ارض کا لفظ ذکر کیا ہے۔ وہاں بیشتر عالمگیر مملکت[4] ہی مراد ہے۔

ملک (بحیثیت مملکت) قرآن نے مملکت کے لیے ملک کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ آج کل ملک ایک خاص حصۂ زمین کو کہتے ہیں اور مملکت وہ ہیئت سیاسی کہلاتی ہے جو کسی خاص حصۂ زمین میں ہیئت حاکمہ اختیار کر لیتی ہے۔ قرآن کے نزدیک ملک مملکت پر حاوی ہے

---

[1] زویت لی الارض فاریت مشارقہا ومغاربہا وسیبلغ ملک امتی ما زوی لی منہا (بحوالہ بالا ص ۱۸۳)
[2] اثیر الدین ابی عبداللہ محمد بن حیان اندلسی غرناطی (۶۵۴ھ – ۷۴۵ھ)
[3] بحر المحیط ابو حیان ج ۱ ص ۱۴۰۔ ذکر خلافت آدم۔ طبع اول ۱۳۲۸ھ۔ السعادہ مصر۔
[4] روح المعانی ج ۱ ص ۲۰۲۔

خواہ وہ خاص حصہ زمین[1] ہو یا روئے زمین ہو۔ قرآن مُلک ہی کا لفظ اختیار کرتا ہے اور مقصد اس کا مملکت سے ہوتا ہے۔ ملک کو اُس معنیٰ میں ملک سمجھنا جیسا کہ آج کل کی اصطلاح ہے۔ قرآن اور قانون قرآن کے ماہرین کے منشا اور نظریہ کے قطعًا خلاف ہے۔

اللہ ایک شخص اور ایک قوم کو مملکت دیتا ہے اور دے کر سلب بھی کر لیتا ہے۔

ہندستانی مسلمانوں کے مشہور عالم، سیاستداں رہنما اور شارح قرآن سیدنا مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ اپنے ترجمۂ قرآن میں ملک کا ترجمہ سلطنت[3] کے لفظ سے کرتے ہیں اور ہندوستان کے علماء سیاست کی نظر میں سلطنت اور مملکت دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں[2]

شیخ الہندؒ کے ترجمے کی چند مثالیں[3] یہاں درج کی جاتی ہیں۔

علامہ ابو حیان ملک کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں "ملک وہ ہے جس میں اقتدار اعلیٰ (فرمانروا) کو ہر طرح کے تصرف کا حق ہو"

اللہ ملک (مملکت) کا فرمانروا ہے اسی لیے اُس کو تصرف کا پورا حق حاصل[4] ہے

علامہ زمخشری بھی ملک کو تمام دنیا کی مملکت خیال کرتے ہیں[5]۔ اور مملکت کے دو حصے کرتے

---

[1] دیکھو رب قد اتیتنی من الملک (پروردگار تونے دیا ہے مجھ کو کچھ ملک) یہاں حصہ زمین مراد ہے۔ من کے لفظ نے مملکت کی عمومیت کو ایک خاص حصۂ زمین میں محدود کر دیا۔ ورنہ ملک کا مفہوم مملکت عامہ ہے۔ سورہ یوسف[12]

[2] بنچلی کی کتاب نظریہ سلطنت کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی لکھتے ہیں "کتاب کے نام کے متعلق میرا خیال تھا کہ نظریہ مملکت ہو اس لیے کہ مجلس وضع اصطلاحات نے (State) اسٹیٹ کے لیے مملکت کا لفظ تجویز کیا تھا لیکن قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ "سلطنت" کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ دیباچہ نظریہ سلطنت ح صدیقی۔ ص ۷۔ [3] قرآن حکیم مترجمہ حضرت شیخ الہند مطبوعہ مدینہ پریس بجنور متوسط سائز (۱) الم البقرہ ص ۲۱، (۲) سیقول البقرہ ص ۵۲، (۳) سیقول البقرہ ص ۵۴۔ [4] بحر المحیط۔ ابن حیان (داراللہ یونی ملکہ) جلد ۲ ص ۲۵۸-۲۵۹ [5] حوالہ کے لیے دیکھو رب قد اتیتنی من الملک، کشاف زمخشری ج ۲ ص ۲۷۶

ہیں۔ مملکت دنیا جس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائیگا اور مملکت آخرۃ جو دائم قائم رہیگی[1]۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نبوت ایک قوت ہے جو مملکت کے تابع نہیں بلکہ اس کے علاوہ ہے[2]۔ ملک یعنی مملکت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے عام قبضہ اور اقتدار ہو۔ جن انبیاء کو ملک و مملکت عطا کی گئی اُن کو نبوت کے ساتھ عام اقتدار بھی حاصل رہا ہے[3]۔

ان نظائر کے علاوہ قرآن میں بیشتر مواقع پر جہاں ملک کا لفظ آیا ہے۔ اُس کا اطلاق مملکت کے مفہوم پر ہوتا ہے۔ اسلام کے دور اول کے علماء اجتماعیات کی تشریحات اس نظریہ فکر کی تائید کرتی ہیں۔

علامہ زمخشری[4] یہ بھی وضاحت پیش کرتے ہیں کہ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ مالک الملک ہے تو ملک کا تصور ہمہ گیر اور عام ہوتا ہے یعنی مملکت عامہ مُراد ہوتی ہے۔ ملک کے لیے عام استیلاء اور غلبہ ضروری ہے اور خدا کا غلبہ محدود نہیں ہو سکتا البتہ قرآن نے جہاں یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت لے لیتا ہے۔ وہاں شانِ نزول کے اعتبار سے ملک سے مراد مخصوص مملکتیں ہیں۔ خندق کی جنگ میں جب جنگی لائن قائم کی جا رہی تھی چند چٹانیں محاذ قائم کرنے میں خارج تھیں حضرت سلمان نے آنحضرت کو اطلاع دی۔ آنحضرت نے زمین کھودنے کا آلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا چٹان پر ایک ضرب رسید کی۔ مسلمانوں نے اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنی آنکھ سے حیرہ کے محلات کو روشن طریقہ پر دیکھ رہا ہوں۔ دوسری ضرب رسید کی فرمایا کہ ارض روم کے سرخ محلات کو روز روشن میں دیکھ رہا ہوں تیسری ضرب رسید کی پھر فرمایا مجھے

---

[1] کشاف (انت ولی) ج ۲ ص ۲۷۶ طبع اول ۱۳۵۴ھ مصطفیٰ محمد۔ مصر [2] کشاف (جعل فیکم انبیا) ج ۱ ص ۳۳۰ [3] کشاف (جعلکم ملوکا) ج ۱ ص ۳۳۰

[4] زمخشری المتوفی ۵۲۸ھ

صنعا یمن کے محلات روشن صورت میں دکھلائے گئے ہیں۔ درحقیقت یہ جملے روحانی پیش بینی کے طور پر مسلمانوں کو قبل از وقت فتح کی خبر دے رہے تھے۔ منکر اور منافق لوگ یہ سن کر اپنی حقیر سمجھ کے مطابق کہنے لگے۔ یہ لوگ جن سے خندق تک کھودی نہیں جاتی روم و فارس کے محلات کو فتح کرینگے۔ اس طعن و طنز کے جواب میں قرآن نے اعلان کیا۔

"ملک اللہ کا ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔"

اس جگہ ملک کا مفہوم خاص اور محدود ہے۔ منافقوں کو جواب دینا مقصود ہے اور ملک سے مراد مملکت فارس اور مملکت روم ہے۔ اعلان یہ کرنا ہے کہ یہ مملکتیں اہلِ فارس اور اہلِ روم سے لے لی جائینگی اور مسلمانوں کو عطا کی جائینگی۔

ایک جلیل القدر مفسر قرآن کا ملک کے لفظ کو مملکت کے لیے استعمال کرنا زیر نظر مقصد کے لیے کافی و وافی ثبوت ہے۔

دفعہ (۱۶)۔ امام (قائد الحکومت) (LEADER OF THE STATE)

امامت کبریٰ کی ذمہ داریوں کے لیے ایک ایسی ہستی درکار ہوتی ہے جو ریاست عامہ کے قائد اعلیٰ (امیر امام) کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ یہ ہستی اسلام کے قانون اساسی کی محافظ؛ اُمت کے اختیار کی نمائندہ اور شوریٰ کی طرف سے حکومت کی قیادت اعلیٰ پر فائز ہوتی ہے۔

قانونِ مملکت میں اس ہستی کو متعدد خطاب دیے گئے ہیں جن میں سے امام، اولوالامر

---

[1] کشاف زمخشری ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۳۔

خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کو اول درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔

رہنمائے حکومت کے خطابات

۱۔ امام اعظم۔ امامت کبریٰ کا صدر یہ نام اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ امام حکومت کا لیڈر (LEADER OF THE STATE) مجلس حکومت (اہل حل و عقد) اور شوریٰ کا قائد ہے

۲۔ اولوالامر۔ وہ ہستی جو صاحب امر ہو۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ پوری طرح حکومت کا ذمہ دار ہو۔ اولوالامر کا اصل اطلاق مجلس حکومت (امیر اور اہل حل و عقد) پر ہوتا ہے[1]۔

۳۔ خلیفۃ المسلمین۔ دنیا کے اجتماعی دائرہ میں خداوند عالم اور پیغمبر اعظم کا نائب جو نیابتی اور شوروی حکومت کا نائب الحکومت ہوتا ہے۔ اور اجتماعی نظم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ امیر المومنین۔ اسلامی حکومت کا امیر، مسلمانوں کے اجتماعی کارپوریشن کا میئر۔

زعیم الامۃ[2]۔ حکومت اور اُمت کا رہنما۔ اجتماعی ہیئت کا رہبر۔

رئیس عام۔ ریاست عامہ کا رئیس[3] اور اجتماعی نظم کا صدر

والی عام۔ ولایت[4] عامہ کے منصب جلیل کا ذمہ بردار، سوسائٹی کا محافظ و نگہبان

یادداشت | اسلامی حکومت کے صدر کو ان ناموں کے علاوہ کسی دوسرے نام سے یاد کرنا قانونی جواز کے خلاف ہے۔ اُمت کے لیے اس امر کا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ اس زمانہ میں تاجداروں اور سلاطین کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اسلامی روح کے خلاف ہیں۔ اعلیٰحضرت، جلالۃ الملک، خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، سلطان المعظم یہ وہ خطابات ہیں جن کو

---

[1] اولوالامر کے لیے علم اور دین کی پابندی لابدی ہے کلیات العلوم ابوالبقاء ص ۱۲۹، حکومت الٰہی مولانا منصور (اولوالامر)

[2] ادب الدین والدنیا الماوردی ۳۶۴ھ ص ۸۱ (وجب اقامۃ الامام ... یکون زعیم الامۃ)

[3] دیکھو شرح المواقف ج ۰ ص ۳۴۵ (الرئیس) [4] دیکھو ولایت عامہ۔

عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے تعامل اور روایات کی تائید حاصل نہیں ہے۔ ان کا رجحان ریاست عامہ کی طرف نہیں بلکہ شخصی سلطنت کی طرف ہے۔

قانونی تشریحات و نظائر

مندرجۂ بالا نام اسلامی حکومت کے امیر کے لیے خاص ہیں۔ الوالامر اور امام اعظم کا لقب اس کی قانونی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ خلیفۃ المسلمین منصب خلافت کی عظمت پر گواہ ہے۔ امیر المومنین کا شاندار لفظ ایک عام اصطلاح کے طور پر قبول عام حاصل کر چکا ہے اور ایک ایسے معاشرہ کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں تمام حکمبردار اور ایماندار انسان برابر کے حصہ دار ہیں۔

باقی نام یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت میں جبر و تشدد کی ضرورت نہیں بلکہ خدا ترسی اعلیٰ رہنمائی۔ اور مفاد عامہ کی حفاظت کی ضرورت ہے۔

امام علامہ ابن عابدین حنفی امام کی حیثیت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "جو شخص انسانوں کی ہیئت اجتماعی میں اُن کے آگے ہو اور انسان اس کی ہدایات کے پیچھے پیچھے چلیں اس کو امام کہتے ہیں[1]"۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں قانونی حوالے کے ماتحت لکھا ہے کہ امام وہ ہستی ہے جو سب کے آگے ہو اور سب کی رہنما۔ امام قافلہ کا وہ رکن ہے جو آگے آگے چلتا ہو۔ امام زعیم امت ہے اور اسلامی نظام کا رئیس اور صدر[2] ہے۔

[1] رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۵۱۱ باب الامامۃ۔ طبع ۱۳۲۴ھ درسعادت استنبول۔

[2] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۳ ص ۶۱۲۔

ابن رشد نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد[1] میں سلطان العلماء امام علاء الدین کاسانی نے بدائع[2] میں اور علامہ احمد نصر مالکی نے المختصر[3] کی تعلیقات میں اسلامی حکومت کے رئیس عام کو امام اعظم کے خطاب سے یاد کیا ہے۔

چونکہ اسلامی حکومت کے افسر اعلیٰ کا رئیس عام اور امام اعظم ہونا عہدہ کی عمومیت ہمہ گیر ذمہ داری اور عظمت پر دلالت کرتا ہے اس لیے علماء اجتماعیات نے امام کے اعظم اور عام ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے[4]۔

اولوالامر | علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں (ھذا خطاب لمن یملک تنفیذ الاحکام) یہ اس شخص کا خطاب ہے جو اجرائے احکام کا منصب رکھتا ہے۔ یعنی وہ ذمہ دار ہستیاں جو حکومت پر فائز ہوتی ہیں[5]۔

علامہ ابوحیان تصریح کرتے ہیں کہ اولوالامر وہی ذمہ دار ہستی ہو سکتی ہے جو امر بالمعروف کی پابند ہو اور نظام امت کو اچھے اصولوں پر چلائے۔ ہمارے زمانہ کے وہ سلاطین اس میں داخل نہیں ہیں جن کا طرز حکومت گناہوں اور برائیوں پر مبنی ہے[6]۔

خلیفۃ المسلمین | اسلامی قانون کے مطابق نیابتی حکومت کے فرائض کو انجام دینے والی ہستی۔ خلیفہ کے معنی ہیں روئے زمین کا نائب السلطنت تمام انبیاء خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز تھے۔ صدیق اکبر خلیفۂ رسول اللہ[7] تھے۔ خلفاء راشدین دنیا کی بہترین حکومت

---

[1] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۹۵۔ کتاب الاقضیہ طبع ۱۳۳۹ھ مصر۔ ابن رشد (۵۲۰-۵۹۵ھ)

[2] بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲ طبع جمالیہ مصر [3] مختصر علامہ خلیل مالکی طبع ۱۳۵۵ھ مصر [4] روح المعانی ج ۱۳ ص ۱۰۴ (امارت عامہ) (الامام الاعظم) [5] احکام القرآن جصاص حنفی (۳۷۰ھ) ج ص ۲۵۶۔

[6] البحر المحیط ج ۳ ص ۲۷۸ [7] (انا خلیفۃ رسول اللہ وانا راض بہ) اور میں اس خطاب پر خوش ہوں۔ مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۹۸۔

کے بہتر رہنما تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اسلامی حکومت کے امیر تھے۔ اگر آج شہنشاہیت سے علیحدہ ہو کر کسی شخص کو اسلامی حکومت کا امیر بنایا جائے تو وہ اس خطاب کا مستحق ہوگا۔[1]

امیر المومنین ۔ یہ خطاب جمہور اُمت کی طرف سے فاروق اعظم کو دیا گیا تھا اس کے بعد ریاست عامہ کے صدر کے لیے ایک مستقل چیز بن گیا۔ خلافت راشدہ کے تعامل نے اس کو اول درجہ کی اہمیت عطا کی ہے۔

زعیم الامۃ (اسلامی حکومت کا رہنما بحیثیت قائد اعظم) اسلامی حکومت میں قطعاً جبر واستبداد نہیں ہے۔ اس کا استحکام اور ترقی اعلیٰ درجہ کی قیادت پر منحصر ہے۔ اس لیے رئیس الحکومت قائد اعظم[2] اور زعیم الامۃ ہوتا ہے۔

دفعہ (۱۷) صدر حکومت کا انتخاب

اسلامی حکومت میں ریاست عامہ کے رئیس عام (امیر وامام) کا تقرر کسی ایک قانونی اصول اور سیاسی حکم کا پابند نہیں ہے۔ رئیس اپنی فرض شناسیوں کے دائرہ میں حکومت کے عام کاموں اور عوام کے فائدوں کی باتوں پر مامور ہے[3] اس کا تقرر ایک عام انتخابی مہم ہے جس کے لیے چند قانونی اصول اور ایک سے زیادہ صورتیں اور شرطیں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو کشاف زمخشری ج ۱ ص ۶۱ احکام القرآن جصاص ج ۱ ص ۷۹، البحر المحیط ج ۱ ص ۱۴۰ (اسم لمن انتقل تدبیر اہل الارض) وہ شخص جو کسی ہستی کی طرف سے مملکت ارضی کا ذمہ دار ہو۔

[2] اسد الغابہ ابن اثیر ج ۴ ص ۷۰۔ [3] حدیث ام حصین۔ اگر ایک غلام عامل حکومت کتاب اللہ کے مطابق قیادت کرے تو اس کے حکم کو سنو اور اطاعت کرو۔ روح المعانی ج ۱۲ ص ۱۰۴، ادب الدین والدنیا ص ۸۱۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۱۔

متعین ہیں جن میں سے ہر اصول، ہر شرط، ہر صورت اور ہر قانون وضابطہ، دین کے تحفظ کے کے بعد مرضی عامہ، رائے عامہ اور اجماع امت کے تابع ہے جس میں شخصیت، خاندانی وراثت اور شہنشاہیت کو کوئی دخل نہیں۔ یہ اصول اور صورتیں خدا کے ارادۂ اعلیٰ کے ماتحت اور ریاست عامہ کے نشوونما منظم ارتقار، ماحول کے تقاضوں اور وقت کے مطالبوں کی بنا پر اپنا چہرہ دکھاتی ہیں۔ معاشرہ کے مقصد کو بھی پورا کرتی ہیں اور اسلامی حکومت کے قیام پر حقیقی صورت میں زور بھی دیتی ہیں

قانونی تشریحات اور نظائر

پیغمبر اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چار مرتبہ ریاست عامہ کے رئیس عام اور امامت کبریٰ کے امام کا انتخاب عمل میں آیا۔ سب سے پہلے (سنہ ۱۱ھ سنہ ۶۳۲ء) میں انتخاب ہوا اور حضرت صدیق اکبر ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسول اللہ اور رئیس عام مقرر ہوئے۔ دوسری بار (سنہ ۱۳ھ سنہ ۶۳۴ء) میں رئیس عام کا انتخابی تقرر ہوا اور حضرت عمر فاروق اعظمؓ مسند امارت پر جلوہ فرما ہوئے۔ تیسرا انتخاب (سنہ ۲۴ھ سنہ ۶۴۴ء) میں ہوا اور حضرت عثمان غنیؓ کو اسلامی حکومت کا رئیس بنایا گیا۔ انتخاب چہارم (سنہ ۳۵ھ سنہ ۶۵۵ء) میں ہوا اور امت نے حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو اس منصب کے لیے منتخب کیا۔[1]

چونکہ یہ چاروں انتخاب ترتیب وار اہمیت رکھتے ہیں اس لیے یہاں وہ چاروں طریقے

---

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۲۰-۱۲۳ و ۱۵۴-۱۶۳ ج ۳ ص ۳۰ و ۳۵ و ۴۲۔ دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا عربی) بستانی ج ۷، ص ۲۹۴ (خلافۃ) طبع بیروت۔

یادداشت:- ہجری اور عیسوی تاریخوں کی تطبیق کے لیے دیکھو تقویم ہجری وعیسوی (خالدی) طبع انجمن ترقی اردو۔

درج کیے جاتے ہیں جن پر یہ انتخابات مبنی ہیں۔

انتخاب اول (بذریعہ شوریٰ اور بواسطہ رائے عامہ) اس صورت میں امام کا انتخاب براہِ راست شوریٰ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ریاست عامہ کے معتمد نمائندوں اور مسلمہ اشخاص کی رہنمائی میں امت کی مرضی اور اختیار کام کرتا ہے۔ جمہور امت شوریٰ کے کھلے اجلاس میں جمع ہو کر صاف اور تیز رفتار بحث کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ایک شخص پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اُمت کی مرضی۔ اجماع کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اُمت کا فیصلہ افراد کے ارادوں اور جماعتوں کے رجحانات پر غالب آجاتا ہے۔ ایک شخص ہیئت اجتماعی کا قائد و امام تسلیم کر لیا جاتا ہے اس کے نام پر بعیت کر لی جاتی ہے۔ بالآخر سب اس کی اطاعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے شوریٰ میں صدیق اکبرؓ کا انتخاب اسی اصول کے مطابق ہوا[1]۔

انتخاب دوم بذریعہ تجویز نامزدگی و شوریٰ اہل حل وعقد — مرضی عامہ۔ اس صورت میں خلیفۂ وقت اپنے جانشین کا نام تجویز کرتا ہے۔ مجوزہ نام اہل حل وعقد کے شوریٰ میں آتا ہے اس کے بعد مرضی عامہ حاصل کرنے کے لیے پیش ہوتا ہے اور جب یہ تینوں مرحلے گذر جاتے ہیں تو مجوزہ شخص اپنے عہدہ پر آجاتا ہے۔

انتخاب سوم اس صورت میں خلیفۂ وقت، مدبرین حکومت کی مجلس شوریٰ مقرر کرتا ہے اور منصب امامت کے لیے چند ناموں کو متعین کر دیتا ہے۔ مجلس شوریٰ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اُمت کے بلند پایہ اصحاب کی آراء حاصل کر کے کسی ایسے نام کو تجویز کرے جو مفاد عامہ اور مرضی عامہ کا لحاظ رکھے۔ مجلس شوریٰ ایک فیصلہ کرتی ہے، اس کے بعد استصواب رائے عامہ ہوتا ہے رائے عامہ کے مطابق بیعت عامہ ہو جاتی ہے۔

---

[1] اسد الغابہ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۲۲۔

حضرت عثمان کا انتخاب اسی طرح پر ہوا۔ اس موقع پر جو قانونی کارروائیاں عمل میں آئیں اُن کی ترتیب یہ ہے۔

(۱) سات ارکان کی مجلس شوریٰ کا قیام۔ یہ ارکان علی، عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف سعد، زبیر بن العوام اور طلحہ بن عبیداللہؓ تھے۔ چونکہ یہ اصحاب تمام امت کی نظر میں ہر طرح اس منصب کے اہل تھے اس لیے امیر المومنین نے انتخاب کو ان میں محدود کر دیا، اور تجویز کیا کہ یہ سات اصحاب شوریٰ کے بعد اپنے میں سے کسی ایک کا نام تجویز کریں۔ عبداللہ بن عمر بھی اس مجلس کے رکن ہونگے۔ وہ مشورہ دینگے۔ ان کا نام حکومت کے لیے تجویز نہیں کیا جائیگا۔ اگر رائے برابر ہوگی تو ان کا ووٹ فیصلہ کن ہوگا۔ اگر ارکان اس کو تسلیم نہ کریں تو عبدالرحمٰن بن عوف اس عام اعتماد اور عظمت کی بنا پر جو ان کو حاصل ہے اپنے ووٹ سے فیصلہ کر دینگے۔

(۲) مدینہ کے باشندوں میں پچاس ارکان کا انتخاب، یہ ارکان شورائے مجلس کے مشیر قرار دیے گئے تاکہ جمہور کی رائے اپنی پوری عمومیت کے ساتھ سامنے آجائے۔

(۳) طریق کار۔ مجوزہ شوریٰ نے سرگرم بحث کے بعد مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا۔ سب سے پہلے عبدالرحمٰن بن عوف نے اُمت کے مرکزی استحکام کے لیے اپنا نام واپس لے لیا۔ کچھ لوگ حضرت علی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ اور کچھ حضرت عثمان کے نام پر۔ آخر میں سب نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اختیار دیا کہ وہ ان دونوں حضرات میں سے کسی ایک کا نام انتخاب کرنے میں اُمت کی رہنمائی کریں۔

(۴) استصواب رائے عامہ۔ حضرت عبدالرحمٰن نے قرآن کے حکم کے مطابق عام شوریٰ

---

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۳ ص ۵ ۲ قصۃ الشوریٰ۔

کو فیصلہ کی بنیاد قرار دیا۔ اور عام شوریٰ کے لیے استصواب رائے عامہ (
کی صورت تجویز کی۔ سب سے پہلے حضرت عثمان اور حضرت علی کی جداگانہ رائے لی گئی اس کے
بعد تین دن تک استصواب رائے عامہ ہوا۔ عورتوں، بچوں اور باہر سے آنے والے مسافروں
اور راہ چلتے ہوئے لوگوں کی رائیں حاصل کی گئیں[1]۔ جب زیادہ سے زیادہ ممکن طریقہ سے ایک
نام تجویز ہو گیا تو ایک رائے کے اختلاف سے اس کا اعلان کر دیا گیا[2]۔

انتخاب چہارم تمام جماعت ایک فوری فیصلہ کے مطابق ایک شخص کو اپنا امام منتخب کر لیتی ہے
اور رائے عامہ کی بنا پر بیعت عامہ وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔ انتخاب چہارم میں امیر المومنین
کی شہادت کے بعد عین عالم انتشار میں جمہور امت نے قیام امن نظم کی ذمہ داری کو محسوس کیا،
اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر اطاعت کا حلف اٹھایا[2]۔

رئیس عام کے انتخاب کی یہ چاروں صورتیں قانونی نظائر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کو اسلامی
حکومت کے نظام میں قانونی روایات کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہ صورتیں سیاسی کارروائیوں کا
سرچشمہ ہیں۔ ان سے بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں اور اسلامی سوسائٹی کے ضبط و نظم کے لیے
رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

اصل دفعہ میں جن قانونی اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا مآخذ خلفاء راشدین کا
انتخاب اور تقرر ہے۔ ان کے انتخاب کے وقت جو صورتیں پیش آئیں قدرتاً انھوں نے قابلِ
تقلید روایات کا درجہ حاصل کر لیا۔ زمانہ ماضی میں جتنے تقرر ہو چکے ہیں، حال میں جو تقرر ہمارے سامنے
ہیں اور مستقبل میں جو تقرر ہو سکتے ہیں اُن کو جائز سمجھنے اور صحیح صورت میں بر روئے کار لانے کے
لیے خلافت راشدہ کی اچھی روایات کی پابندی کرنی ضروری ہے۔

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۸۱ [2] ایضاً ج ۴ ص ۳۱

خلافت راشدہ کے یہ چاروں انتخاب یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ صدرِ حکومت کے انتخاب میں اول درجہ کا اساسی اصول یہ ہے کہ عوام الناس شوریٰ کے اجلاس میں جمع ہو کر براہِ راست اپنے امیر و امام کا انتخاب کریں۔ اس طرزِ حکومت میں شاہی اور سلطانی کی کوئی گنجائش نہیں، چونکہ اس کا مزاج شہنشاہیت پر مبنی ہے اس لیے ولیعہدی اس کے نظامِ عمل سے خارج ہے اور وہ مطلق نامزدگی بھی جو صدرِ حکومت یا کسی ایک شخص کی طرف سے عمل میں آئے اور اس میں رائے عامہ اور اُمت کے اختیار کا مطلق دخل نہ ہو۔

ولیعہدی اور نامزدگی

اسلامی نظامِ حکومت میں اس زمانہ کی ولیعہدی کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔ مطلق العنانی کے ساتھ نامزدگی کی جو مقید شکل قرنِ اول میں ثابت ہے اس نامزدگی کو ولیعہدی سے کوئی نسبت نہیں[۱]۔

دورِ اول میں قانونِ صحابہ نے جس چیز کی حمایت کی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت کا رئیسِ عام ہر حال میں نہیں بلکہ کسی ضروری مرحلہ پر بہترین افراد میں سے بہترین فرد یا چند افراد کا نام تجویز کرے اور اس کو دلائل کے ساتھ اُمت کی منظوری کے لیے پیش کرے۔ یہ تجویز درحقیقت نامزدگی نہیں ہوتی بلکہ سیاسی معاشرہ کی بے غرضانہ امداد ہوتی ہے۔

اسلام میں پہلی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہے۔ آپ نے اُمت کے اختیار کو باقی رکھا اور اپنے اختیار سے نامزدگی نہیں فرمائی۔ یہ نظیر اُمت کے لیے پہلی شے ہے۔ اس کو ہر حال میں باقی رکھنے پر زور دینا قانونِ سُنت کا اولین منشاء ہے۔

دوسری نظیر صدیق اکبر کا تعامل ہے۔ انہوں نے عمر فاروق کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کو ولایت

---

[۱] علامہ ماوردی (۴۵۰ھ) نے احکام السلطانیہ (ص ۷) میں شخصی ولیعہدی کا ذکر کیا ہے اور علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اس کا سلسلہ یزید کی ولیعہدی سے ملا دیا ہے۔ یہ بات تاریخی مناسبت پیدا کر سکتی ہے مگر قانونی واقعیت سے کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ ابن خلدون ف ۳ ص ۱۴۷۔

عہد یا ولی عہدی قرار دینا ایک غیر قانونی جسارت ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک نام کی جگہ چند نام تجویز کیے لیکن یہ دونوں تجویزیں شخصی اختیار سے زیادہ امت کے اختیار پر مبنی تھیں۔ مطلق ولیعہدی سے ہم آہنگ نہ تھیں۔

اس قسم کی تجویز ثانوی درجہ میں قانونی اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ اہمیت چند لازمی شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ جو شخص نامزد کیا جائے وہ پیشرو امام کی پشتینی اولاد نہ ہو، خلافت راشدہ کے چاروں دور اس پر گواہ ہیں۔ صدیق اکبرؓ کے سامنے ان کے صاحبزادہ کا نام تھا، مگر تجویز نہیں کیا گیا۔ فاروق اعظمؓ نے جب شوریٰ کا حکم دیا تو ایک گوشہ سے عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش ہوا مگر انہوں نے تصریح کردی کہ حکومت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔ بعد کے دو انتخاب بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے اثر، قوت اور تدبیر سے یزید کی ولیعہدی کو منظور کرایا۔

ابن خلدون کا یہ بیان قابل قبول ہے کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کے نظم کا مخلصانہ جذبہ کارفرما تھا جس کا نتیجہ اچھا برآمد نہیں ہوا یزید ہمیشہ سے ایسا نہ تھا جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا اگر حضرت معاویہ کے زمانہ میں یزید ایسا رنگ اختیار کرتا تو وہ خود اس کو معزول کرنے پر تیار ہوجاتے۔[۵] اس انتخاب کے خون آشام نتائج خود یہ کہتے ہیں کہ یہ تقرر اُمت کے لیے دلیل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت معاویہ یورپین شہنشاہیتوں کے پڑوس میں مسلمانوں کا اقتدار قائم کر رہے تھے۔ ان کا یہ قول بھی دماغ میں رہنا چاہیے "ہم نے شہنشاہیت اور سلطنت پر قناعت کرلی ہے"۔ اس قول کے بعد راہ صاف ہوجاتی ہے۔ ایک ایسی عالمگیر قوم جو انسانیت کو نبوت، قانون رحمت اور خلافت راشدہ کے طرز

[۵] مقدمہ ابن خلدون ف فی ولایت عہد (۳۰) ص ۱۴۸۔

پر نظم کرنا چاہتی ہے شہنشاہیت پر قناعت نہیں کر سکتی۔ بعد کے زمانہ میں بنی امیہ اور بنی عباس کے اقتدار میں اسلام کے جیسے جو پرجوش کارنامے انجام پائے اُس سے انکار کیے بغیر ولیعہدی کے رواج کو جائز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ نامزدگی کی دوسری شرط یہ ہے کہ نامزد کرنے والا اور نامزد ہونے والا دونوں بہترین سوسائٹی کے بہترین فرد ہوں۔ قرن اول میں اُمت کے اختیار کو متاثر کرنے والے صدیق اکبر، فاروق اعظم اور عثمان غنی تھے۔ اگر اُمت ایسے افراد پھر پیدا کر سکتی ہے تو نامزدگی کی صورت درجۂ قبول حاصل کر سکیگی۔ نامزد ہونے کے لیے بھی خیر اُمت ہونے کی شرط ہے اور نامزد کرنے کے لیے بھی۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ نامزدگی قطعی حکم کی صورت میں نہ ہو بلکہ مشورہ اور تجویز کی صورت میں ہو، اُس کو ریاست عامہ کے شیرازہ بند نظام کے تحفظ کے لیے عوام کے سامنے پیش کیا جائے اور رائے عامہ اُس پر جم جائے۔ اگر نامزدگی میں یہ عمومیت نہیں ہے تو اس کو قانونی جواز حاصل نہ ہوگا، چنانچہ صدیق اکبر نے فاروق اعظم کا نام تجویز کرتے ہوئے صحابہ کے مجمع میں کہا کہ تجویز عام بہتری کے لیے ہے مجھے ڈر تھا کہ اُمت داخلی انقلاب میں گرفتار نہ ہو جائے[1]۔ فاروق اعظم نے جب چند افراد کو تجویز کیا تو یہ ظاہر کر دیا کہ ان سے زیادہ اُمت کے لیے اور کوئی مفید نہیں ہے[2]۔

اِن نامزدگیوں میں عمومیت کا عنصر بخوبی کارفرما تھا۔ صدیق اکبر نے اس معاملہ میں تجویز سے پہلے عام صحابہ کے سامنے تقریر کی اور کہا اگر میں کسی کا نام تجویز کروں تو آپ سب منظور کرینگے؟ صحابہ نے جواب دیا (رضینا یا خلیفۃ رسول اللہ) ہاں ہم دلی طور

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۶۹ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۸۱

پر قبول کریں گے۔ اس کے بعد تحریری دستاویز میں حضرت عمرؓ کا نام تجویز ہوا۔ حضرت عثمانؓ اس کو لے کر عوام کے اجلاس میں لے گئے اور انہوں نے کہا کیا آپ اس نام پر بیعت کے لیے رائے دیتے ہیں۔ سب نے متفقہ رائے سے کہا۔ بیشک، ہم سب اس کی منظوری دیتے ہیں اور ہمارے دل اس تجویز سے ہم آہنگ ہیں[1]۔

حضرت عمرؓ کے تجویز کردہ سات نام بھی شخصی رائے کا نتیجہ نہ تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو شوریٰ کیوں ہوتا۔ انصار کے پچاس نمایندے شوریٰ کے لیے مشیر کیوں مقرر کیے جاتے ہیں اور استصواب رائے عامہ کیوں ظہور میں آتا۔

درحقیقت صدیقی اور فاروقی عہد کی نامزدگی کو ولیعہدی کے اصول سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نامزدگی ایک طرح کی وصیت ہے جو عام نصب العین کے ماتحت اپنی خاص شکل میں ظاہر ہوتی ہے ولیعہدی ایک گھر اور ایک خاندان کے کنویں کا مینڈک ہے جسے انسانی مصلحتوں کے سمندر سے کوئی واسطہ و تعلق نہیں۔ اسلام کا تعلق انسانیت عامہ سے ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی ایک عام گھرانے کو سلطنت کے لیے خاص کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں اگر ولی عہد اچھا ہو تو اچھی سلطنت وجود میں آسکتی ہے لیکن صدیوں کا تجربہ اس کے خلاف ہے اس لیے انسانی سوسائٹی کے اجتماعی اختیار کو شخصیت کی صلیب پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کے سردارؐ نے خدا کے بندوں کو صدیوں پہلے آگاہ کیا تھا (خیر الملل ملۃ ابراہیمؑ[2]) دنیا کی ملتوں میں بہترین ملت ملت ابراہیم ہے۔ یہ وہ جملے ہیں جو آنحضرتؐ نے ابھرتے ہوئے سورج اور صحابہ کی اٹھی ہوئی

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۶۹-۷۰۔ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۱۳ (خطبۂ رسالتمآب)

پیشانیوں کے سامنے تبوک کے موقع پر انسانیت عامہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے بخاری میں جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے محاذ پر چودہ سو سپاہیوں کے سامنے مسلم قوم کی حقیقت کے متعلق فرمایا (انتم خیر اھل الارض) تم روئے زمین کے باشندوں میں بہترین انسان ہو۔

اب سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی جو دنیا میں بہترین افراد پر مشتمل ہے اس کو کس طرح مطلق العنانی کے سپرد کیا جا سکتا ہے صدہا واقعات میں ایک واقعہ بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ دنیا کی بہترین قوم بدترین طرز حکومت پر قانع ہو جائے ایک بہترین قوم کے لیے بہترین طرز حکومت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان تمام انسانوں کی گردن پر مسلط ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ قانون نبوت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کی جائے اور دنیا کے بہترین انسان مل کر انسانی بہتری کے لیے کام کریں۔

انتخاب کے بنیادی اصول

(۱) اصولِ اصلح۔ اسلامی ریاست عامہ کے رئیس عام (امام) کے انتخاب کا پہلا بنیادی اصول۔ اصول اصلح ہے۔ اُمت کا فرض یہ ہے کہ وہ تمام اغراض سے بلند ہو کر ایسے شخص کا انتخاب کرے جو تمام اسلامی سوسائٹی میں اصلح یعنی سب سے بہتر ہو اجتماعی نظام میں اس اصول کی حفاظت اتنی ہی ضروری ہے جس قدر کہ فرد کی زندگی میں روح کی نگہداشت:

قرآن نے زبور کے منشور کی تجدید کرتے ہوئے صاف طور پر یہ بات بیان کر دی ہے کہ روئے زمین کی حکومت کے وارث صالح نکوکار اور صلاحیت مند لوگ

ہیں۔[1] اصلح ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انسانی زندگی کے لیے (منجانب اللہ) جو اچھے قوانین مقرر ہیں فرد اُس کا پابند ہو۔ اور صلاحیت مند وہ شخص ہے جو تمام بُرائیوں کو چھوڑ چکا ہے اور تمام اچھائیوں کو قبول کر چکا ہے۔ جو شخص ایسا ہے وہی مومن (اسلامی معاشرہ کا ایماندار رکن) ہے (وَمَنْ یَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِن ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ[2]) خواہ مرد ہو یا عورت۔

ریاست عامہ کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کرنا ہی اصول اصلح کی پابندی ہے اس اصول کی پابندی امام کے انتخاب ہی تک محدود نہیں بلکہ اعلیٰ اور ادنیٰ حکام کے انتخاب پر بھی حاوی ہے۔[3]

اگر عام عہدیداروں کے لیے اس اصول کی پابندی ضروری ہے تو امامت کے زبردست منصب کے لیے اور بھی زیادہ ضروری سمجھی جائیگی۔[4] اُمت نے عہد نبوی میں برابر اس اصول کو مدنظر رکھا۔[5] خلافت راشدہ کا تعامل بھی اسی اصول پر مبنی رہا۔ اُمت نے پہلی مرتبہ صدیق اکبر کا انتخاب کیا مگر اس یقین کے بعد کہ آپ پیغمبر کے بعد مسلمانوں میں بہترین ہستی ہیں۔[6] صدیق اکبرؓ نے فاروق اعظمؓ کے متعلق وصیت کی، رائے عامہ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں اس تقرر کے متعلق خدا کے سامنے یہ جوابدہی کر سکتا ہوں (استخلفت

[1] فتح القدیر امام شوکانی (۱۲۵۰ھ) ج ۳ ص ۲۱۶ [2] تفسیر قرآن العظیم ابن کثیر ج ۱ ص ۵۵۶-۵۵۷ (والذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت) فضل الاسلام مع العمل الصالح۔ [3] السیاسۃ الشرعیہ ابن تیمیہ ص ۳ [4] ہمارے فقہا کہتے ہیں کہ اگر امام اسلامی صلاحیت کا ثبوت نہ دے اور فاسق ہو تو یہ ایک مکروہ بات ہے ایسے امام کو صلاحیت پر لانا چاہیے۔ نہ آئے تو مناسب موقع دیکھ کر معزول کر دینا چاہیے۔ معزولی اس طرح عمل میں آئے کہ فتنہ نہ پیدا ہو۔ رد المحتار ج ۱ ص ۵۱۲۔

[5] عن ابن عمر کنا نقول فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یکون اولی الناس بھذا الامر الخ۔ مجمع الزوائد (الحدیث) ج ۵۔ کتاب الخلافۃ ص ۱۷۷-۱۷۹۔

[6] (خیر ھذہ الامۃ بعد نبیھا ابوبکر) اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۱۵۔

علی اهلک خیر اهلک[1]) میں نے تیرے شہریوں میں سے بہترین شہری کو جانشین بنایا ہے۔

حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زخمی ہونے کے بعد امت کے بہترین نمائندوں کو اس کام پر متعین کیا تاکہ وہ امت کے بہترین فرد کو اسلامی حکومت کا قائد منتخب کریں، اور یہ فرمایا "خدا کو قدرت ہے کہ تم اب بھی بہترین ہستی کے نام پر جمع ہو جاؤ جس طرح آنحضرتؐ کے بعد تم بہترین انسان کے نام پر جمع ہو چکے ہو[2]"

حضرت علیؓ کے انتخاب کے وقت بھی اسی اصول پر عمل کیا گیا۔ مدینہ میں جو جلیل القدر اصحاب موجود تھے وہ سب اس خیال پر متفق تھے (لا یصلح لھا الا علی[3]) حضرت علیؓ کے علاوہ اب کوئی دوسرا شخص اس منصب کے لیے بہتر اور صالحیت مند نہیں ہے۔

اسلام کے علماء اجتماعیات اس اصول کو قطعی صورت میں مؤثر قرار دیتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی نے الذریعہ (ص ۲۰۱) میں ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر (ص ۶۰) میں ابن قیم الجوزی نے طرق الحکمۃ (ص ۱۳) میں، امام ماوردی نے الاحکام السلطانیہ (ص ۴[4]) میں اور امام ابن تیمیہ نے السیاسۃ الشرعیہ (ص ۳) میں اس اصول کو سیاسی اہمیت دی ہے۔

نظائر | (۱) علامہ ابوالحسن (الماوردی) لکھتے ہیں کہ ریاست عامہ کے ارباب اختیار کے لیے قوت فیصلہ اور سیاسی بصیرت ضروری ہے تاکہ وہ امامت کے لیے اصلح ہستی کا اور مصالح کے لحاظ سے ایک زبردست مدبر کا انتخاب کر سکیں۔ (دکیو من ھولاء امامۃ اصلح وتدابیر المصالح اقوم (الاحکام السلطانیہ۔ ص ۴۔ ب)

۲۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے قائد (ولی) کا فرض ہے کہ وہ اول

---

[1] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶۲۔ [2] البدایۃ والنہایۃ حافظ عماد الدین کثیر ج ، ص ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ [3] ایضاً ص ۲۲۶۔

[4] فقدموا للبیعۃ منھم اکثرھم فضلاً واکملھم شرطاً۔ الاحکام ص ۵۔

درجہ کے عہدوں پر اصلح اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں کو مقرر کرے کیونکہ اس کی خلاف ورزی قانونِ سنّت کی خلاف ورزی ہوگی۔ حکومت ایک امامت ہے۔ اس میں خیانت بھی لازم آئیگی (فیجب علی ولی الامر ان یولی علی کل من اعمال المسلمین اصلح من یجدہ لذلک العمل (السیاسۃ الشرعیہ) ص۳

(۳) امام راغب اصفہانی اسلامی نظریہ کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں (لا یصلح لسیاسۃ غیرہ من لا یصلح لسیاسۃ نفسہ) جو شخص بذاتِ خود سیاسی صلاحیت سے محروم ہے وہ دوسروں کی سیاسی بہتری کے لیے اپنی صلاحیت ظاہر نہیں کرسکتا (الذریعہ ص۹۱)

(ب) اصول رائے عامہ | امام کا انتخاب رائے عامہ اور اُمت کے اختیار سے ہوتا ہے۔ مرضی عامہ ہی وہ چیز ہے جو اس اصول کی بنیاد ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب سے لے کر حضرت علی حیدر (کرم اللہ وجہہ) کے انتخاب تک مفادِ عامہ اور رائے عامّہ کا یکساں عمل دخل رہا ہے۔ اگرچہ چاروں انتخابوں میں جداگانہ اصول کارفرما نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک رائے عامّہ کا تعلق ہے وہ ہر انتخاب میں ایک موثر عنصر کی صورت میں موجود ہے۔[1]

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ خلافت راشدہ کا پہلا انتخاب عام رائے سے ہوا۔ دوسرے انتخاب میں رائے عامہ حاصل کرنے کی خاص شکل اختیار کی گئی۔ اور صدیق اکبر ایسی بزرگ ہستی کی تجویز بھی اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہوا جب تک اُنہوں نے اپنی رائے کو تجویز کی شکل میں رائے عامہ کے سامنے پیش نہیں کردیا۔ جب عوام نے منظور کرلیا تو نامزدگی کی تجویز انتخاب کے درجہ میں آگئی۔ تیسرے

[1] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۳ ص ۱۹۹-۲۰۳۔ تاریخ البدایہ النہایہ ابن کثیر ج ۵، ص۲۵۱، تاریخ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۴۷

انتخاب میں پہلے محدود شوریٰ ہوا اس شوریٰ کا ہر رکن عوام کا اعتماد حاصل کر چکا تھا مگر اس کے فیصلہ کو بھی رائے عامہ سے استصواب کے بغیر نافذ نہیں کیا گیا۔ چوتھے انتخاب میں عوام نے خود اپنا امیر منتخب کیا۔

حضرت عثمانؓ کے شہید ہو جانے کے بعد خلافت کا نظام شدید امتحان میں تھا جو مسلمان اس وقت موجود تھے اُنھوں نے وقت کے فرض کو محسوس کیا۔ انتخاب کے وقت حالات کچھ بھی ہوں مگر انتخاب میں پوری عمومیت موجود تھی اور پہلے تین انتخابات کی طرح چوتھا انتخاب بھی عمومیت پر مبنی تھا نہ کہ شہنشاہیت اور شخصی طرز پر۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے بلند پایہ صحابہ نے بیعت میں حصہ نہیں لیا۔ ان حضرات نے اپنی رائے کو غیر جانبدار رکھا۔ اس وقت حالات کی جو نزاکت تھی اور جو نتائج پیدا ہونے والے تھے اُن کے لحاظ سے یہ ان کا حق تھا کہ اپنی رائے کو محفوظ رکھیں حضرت علی خود صاحب معاملہ ہیں ان اصحاب کے متعلق کہتے ہیں کہ "یہ اصحاب نہ حق کے لیے کھڑے ہوئے اور نہ اُنھوں نے باطل کا ساتھ دیا"۔ غیر جانبداری ایک قانونی حق ہے۔ اس کا استعمال کرنا کسی عام انتخاب کی عمومیت کو باطل نہیں کر سکتا، کہا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہ نے شام میں بیعت نہیں کی۔ یہ درست ہے، شام اور کوفہ کے اختلاف کی تاریخ صدیوں پرانی ہے اس پر بحث کرنا قانون سے زیادہ تاریخ کا کام ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس اختلاف کی پیچیدگیوں سے گذر کر تاریخ کے سمندر سے قانونی روایات کے موتی کو باہر لانا ہی اُمت کے مفاد کے لیے بہترین کام ہے۔

انتخاب چہارم کے اس اختلاف میں دو باتیں زیادہ نمایاں اور کارآمد ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت علی نے دو سفارتیں روانہ کیں اور دوسری بات یہ ہے کہ حضرت

معاویہؓ نے جوابی سفارت روانہ کی حضرت علی چاہتے تھے کہ دمشق مسلمانوں کے مرکزی فیصلہ کو منظور کرلے اس کے بعد دوسرے مسائل کا فیصلہ بہتر فضا میں کیا جائے اور حضرت معاویہ کی رائے تھی کہ پہلے خلیفۂ سوم کے قاتلوں کو سزا دے دی جائے، اس کے بعد یہ فیصلہ منظور کرلیا جائے گا۔ قانونی روایات کی رو سے امامت، امام کی موت اور قصاص پر مقدم ہے۔ پہلے تینوں انتخابوں میں پیشرو امیر کی زندگی میں یا دفن سے پہلے منصب امامت کا فیصلہ دارالخلافہ میں ہوا اور اس کو امت نے منظور کرلیا۔

حضرت معاویہؓ کے اصرار کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن دونوں اصحاب اپنی اپنی جگہ حق بات پر اصرار کر رہے تھے چونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک محاذ مخالفت پر دو فریق برسر جنگ ہوتے ہیں اور دونوں اپنی رائے میں حق کی روشنی دیکھتے ہیں اس لیے تاریخ کے اس محاذ کو بدعقیدگی کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس سارے واقعہ میں جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ دونوں اصحاب امت کے عام اختیار کو تسلیم کرتے ہیں۔ سفارتی گفت و شنید اس امر کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ امت کے اختیار پر فریقین متفق تھے تحکیم اور پنچایت جنگ سے پہلے صلح کی آخری کوشش تھی۔ اس موقع پر حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ انتخاب دوبارہ ہو اور فیصلہ امت کی رائے سے ہو تاکہ زیادہ عمومیت کے ساتھ نتیجہ کو ہاتھ میں لیا جائے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری جو خلیفہ چہارم کے نمائندے تھے انہوں نے اس کو منظور کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اختلاف کے وقت بھی جمہور کی قوت پر اتفاق تھا۔

اصولِ شوریٰ امت نے آنحضرت کی وفات کے بعد شوریٰ کے اصول پر عمل کیا۔ صدیق اکبر کے انتخاب میں جو آزادانہ شورائی بحثیں ہوئیں، اور بعد میں امت کی قوت نے فیصلہ جس

شان سے فیصلہ کیا اس سے پہلے دنیا کی کسی پارلیمنٹ نے ایسی مثال پیش نہیں کی۔
صدیق اکبر نے فاروق اعظم کی نامزدگی سے پہلے اصول شوریٰ پر عمل کر کے اصحاب سے مشورہ کیا تھا۔ فاروق اعظم کے مقرر کردہ مدبرین حکومت کی ہر دو شورائی مجلسیں بھی اس اصول کا مظہر تھیں[1]۔

اصول تقرر مجلس | رئیس حکومت کے انتخاب کے لیے مدبرین حکومت اور نمایندگان عوام کی مجلس تقرر کا اصول قانون صحابہ کی رو سے جاری ہوا۔ فاروق اعظم نے زخمی ہونے کے بعد ایسی مجلس مقرر کی قانوناً یہ شورائی مجلس تھی[2]۔

اصول منظوری اہل حل و عقد | رئیس حکومت کے انتخاب میں اہل حل و عقد (مدبرین حکومت اور امرا افواج) کی مرضی حکمت عملی کی جان ہے۔ یہ اصول خلافت راشدہ کے ہر دور میں صاف نظر آتا ہے[3]۔

انتخاب کی شرطیں

۱- اسلام - امام کے لیے مسلمان ہونا پہلی قطعی اور ناقابلِ انکار شرط ہے۔ کوئی شخص جو خدا کا حکمبردار (مسلم) نہیں ہے مسلمانوں کی حکومت کا قائد نہیں ہو سکتا[4]۔ یہ شرط کسی مذہبی تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد انسانی سوسائٹی ہی کی بہتری ہے اگر تمام انسان خدائے واحد کی اطاعت پر جمع ہو جائیں تو دنیا سے تمام فتنوں اور خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور خراب حال دنیا متحدہ انسانیت کا متحدہ وطن بن جائے۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۹۹ [2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ، ص ۱۴۴، تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶
[3] حجۃ اللہ البالغہ (امام ولی اللہ دہلوی)، ج ۲ ص ۱۴۹ (سیاست مدن)
[4] قرآن حکیم (اولوا الامر منکم) ، رد المختار ج ۱ ص ۵۱۲۔

ب۔ اخلاق اور کردار۔ فطری طور پر جن اعلیٰ اخلاق اور کردار کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ تمام کے تمام امام کے لیے ضروری ہیں۔ اُمت مسلمہ ایک نیک نفس امت ہے اس کے لیے پاک فطرت اور پاکدامن رئیس الحکومت درکار ہے[1]۔

ج۔ اجتہاد (سیاسی تدبر) امام کے لیے سیاسی تدبر سے آراستہ ہونا لازمی ہے۔ سیاسی اجتہاد حکومت کے کاموں کا قابل اعتماد سہارا ہے، اس لیے اسلامی حکومت کا صدر وہی ہو سکتا ہے جو سیاستداں ہو اور جماعت میں زبردست مدبر تسلیم کیا جا چکا ہو۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ سیاسی دائرہ میں اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کا استعمال اس طرح کیا جائے جس سے خدا کی اطاعت کا نصب العین پورا ہو سکے۔ گویا حکومت کے لیے سیاسی تدبر اور اخلاق حسنہ دونوں ضروری ہیں[2]۔ ان شرائط کے مطابق جو شخص نکو کار سیاستداں نہیں ہے وہ منصب حکومت پر فائز ہونے کا اہل نہیں کیونکہ جو انسان خود بدنفس ہے اور اپنے قول و فعل میں اچھے اخلاق اچھی سیاست سے محروم ہے وہ کبھی اچھی مثال نہیں قائم کر سکتا۔ "لا یصلح لخلافۃ اللہ تعالیٰ الا من کان طاھر النفس ـــــ ومن لم یکن طاھر النفس لم یکن طاھر القول والفعل[3]"

علماء قانون نے اسی شرط کو علم، عقل اور اجتہاد تینوں لفظوں سے تعبیر کیا ہے سید شریف المواقف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رئیس الحکومت پر عظیم ذمہ داریاں عائد

---

[1] ابن خلدون (الامامۃ تستدعی الکمال فی الاوصاف) مقدمہ ج۲ ص ۱۳۶۔ امام راغب۔ ہو الاقتدار الباری علی قدر طاقت البشر فی السیاست باستعمال المکارم الشرعیۃ الخ ب ۹،۸ ص ۱۸۔۱۹ (الذریعہ)

[2] وہو الاقتداء الباری علی طاقۃ البشر باستعمال المکارم الشرعیہ) الذریعہ الی مکارم الشرعیہ ب ۹،۸ ص ۱۸۔۱۹

[3] الذریعہ ب تا ۱۱۔

ہوتی ہیں ان کے لیے اجتہاد اور تدبر لازمی شرط ہے۔ امام راغب آخر میں زیادہ صاف الفاظ میں تصریح کرتے ہیں[۵]:

"حکومت سے پہلے قانون کا علم ضروری ہے۔ یہ اس لیے کہ قانونی فراست اور سیاست عامہ کی استعداد کے بغیر حکومت کرنا ناممکن ہے (لا تصلحون للسیادۃ قبل معرفۃ الفقۃ والسیاسۃ العامۃ)[۱]

آزادی رئیس الحکومت شخصی طور پر اور اجتماعی طور پر آزاد ہونا چاہیے۔ کیونکہ غلام انسان کسی دوسرے کا زیر دست ہوتا ہے اور ایک آزاد امت کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتا[۳]۔

مرد ہونا یہ ضروری ہے کہ امت عظمیٰ حکومت کی صدارت کے لیے مرد کا انتخاب کرے[۴]۔ عورت گھر کی حکومت میں با اختیار رہے۔ صدہا سال کا تعامل جس میں تازہ ترین روایات بھی شامل ہیں۔ حکمت عملی کے میدان میں اس اصول کی حامی ہیں۔ اگر کبھی کسی ترقی یافتہ ملک میں کسی عورت نے مسند حکومت پر اقتدار حاصل کیا ہے تو اس کا تمام کام مرد کو کرنا پڑا۔ لاریب اسلام نے عورت کا درجہ بہت بلند کیا ہے مگر اس میں انسانی فطرت کی واجب التعمیل صداقت کا لحاظ رکھا ہے جس کی تائید سویٹ روس تک کے طرز عمل سے ہوتی ہے۔

بالغ ہونا نابالغ بچہ کو منصب امامت پر فائز نہ ہونا چاہیے۔ لاتعداد باشعور انسانوں کی موجودگی میں کسی بچہ کا قائد حکومت ہونا ایک بے حقیقت اور بے ضرورت بات ہے۔ اس کی خلاف ورزی سے مفاد عامہ کے لیے بڑے بڑے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں کسی بچہ کے لیے عوام کے

---

[۱] المواقف، قاضی عبدالرحمٰن۔ شرح سید شریف جرجانی (۸۱۶ھ) ج ۸ ص ۳۴۹ [۲] الذریعہ باب ص ۱۹
[۳] رد المختار (در مختار) ج ۱ ص ۵۱۲۔ [۴] حوالۂ بالا۔

مفاد کو خطرہ میں ڈال مرضی عامہ کو نظر انداز کرنا ہوگا جس کو قانون اچھا قرار نہیں دے سکتا۔

شجاعت اور طاقت اسلامی حکومت کے رئیس کا شجاع اور طاقتور ہونا ایک ناگزیر شرط ہے[1]۔ قوت اور قدرت حکومت کے لیے ضروری ہے اور رئیس حکومت کے لئے اور بھی زیادہ لابدی ہے۔ امام کو اتنی طاقت حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اسلامی نظام کی حفاظت کرسکے اور اپنے احکام کو جاری کرسکے۔ یہ شرط سیاسی قیادت کی جان ہے۔ اُمت اسلامیہ کے امیر کا اس شرط پر پورا اُترنا اصل عہدہ کے لیے غیر معمولی[2] اہمیت رکھتا ہے۔

قرشی ہونا مندرجہ بالا شرائط کے علاوہ چند شرائط اور بھی ہیں جن کے متعلق رائے کا اختلاف ہے۔ ان میں اہم یہ ہے کہ امام کو نسب کے اعتبار سے "قرشی ہونا چاہیے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قریش کو سب سے پہلے اسلام لانے کا شرف حاصل ہے، قریش نے اسلام کی خدمت اور اپنی یادگار زمانہ قربانیوں سے جو عزت حاصل کی ہے اس کو علمائے اسلام ہم آہنگ ہو کر تسلیم کرتے ہیں[3] لیکن اس کے باوجود تحقیق یہ ہے کہ اسلام کا اساسی قانون اس شرط کا تحمل نہیں کرتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شمار قانون کی طرف سے اس شرط سے اختلاف[4] ظاہر کیا گیا ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ آخر میں اُمت نے قانون اجماع کے ذریعہ سے خلافت عثمانیہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ عثمانی ترک قرشی نہ تھے مگر مصر کے آخری قرشی خلیفہ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگرچہ قرشی ہونے کی شرط خلافت عباسیہ (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) تک قائم رہی لیکن اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس شرط کا حقیقی ظہور خلافت راشدہ پر ختم ہو گیا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں آنحضرت کے دو قانونی منشور

---

[1] المواقف ج ۸ ص ۳۴۹ (شرح سید شریف) [2] السیاسۃ الشرعیہ ابن تیمیہ ص ۷۔
[3] مقدمہ ابن خلدون ف ۲۰ ص ۱۳۷۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ج ۷ ص ۴۸۶ - ۴۸۷ (کتاب المناقب)
[4] المواقف قاضی عبدالرحمن الایجی و شرح سید شریف (فی اشتراطہا خلاف) ج ۸ ص ۳۵۰۔

موجود ہیں[۱]۔ (۱) الائمۃ من قریش (امام قریش میں سے ہوں گے)۔ (۲) ان ھذا الامر فی قریش "یقینی ہے کہ حکومت قریش میں ہو گی" لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی قطعی ہے کہ اسلام حکومت کی عمومیت کا حامی ہے اس نے انسانی حقوق کی مساوات کا اعلان کیا ہے اور غیر مشروط طریقہ پر ہر امام کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ قرآن کی رو سے تمام دنیا میں انسان کی عظمت کا قانون جاری ہے۔ نسل آدم کے تمام افراد حکومت و اقتدار کے دائرہ میں بلند مرتبہ ہیں[۲]۔ اسلامی زندگی کی سطح پر سربلند ہونے کی صرف ایک شرط ہے۔ انسان اسلام کا علمبردار اور مرد مومن ہو۔ اس کے بعد نہ عربی کی شرط ہے نہ عجمی کی۔ نہ قریشی ہونا فرض ہے نہ کسی خاص خاندان کا رکن ہونا ضروری۔ اسلام کی حکومت میں جو سب سے اچھا ہے وہی سب سے بلند مرتبہ ہے اور سب کا قائد و امام۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے، قانون سنت کا حکم ہے عصر صحابہ کی نظیر ہے، اور اسلامی دور کا عمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جمہور علماء اس شرط کو تسلیم کرتے ہیں مگر محض اس لیے کہ آنحضرت کی خاندانی قرابت ایک برکت ہے اور اس کو حاصل کرنے سے پہلوتہی نہ کرنی چاہیے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ برکت کے لیے ہاشمی اور سید ہونے کی شرطیں زیادہ موجب برکت ہیں حالانکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ شرطیں معتبر نہیں ہیں[۳]۔ اگر برکت شرط ہے تو زیادہ برکت کیوں شرط نہیں؟

اس مسئلہ کی قانونی تنقیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے قائد کا قرشی ہونا ایک اختلافی بات ہے۔ علامہ سید انور شاہؒ نے اپنے علمی[۴] افادات میں مواہب الرحمٰن

---

[۱] عمدۃ القاری شرح بخاری ج ص ۳۷۴-۳۷۵ [۲] ایضاً ج ص ۹ ولقد کرمنا بنی آدم؛

[۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۴۹۔ الخلافۃ

[۴] فیض الباری علی صحیح البخاری کتاب الاحکام ج ۴ ص ۴۹۸۔

کے جلیل القدر مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے (انہا لیست بشرط عند امامنا) قرشی ہونا ہمارے امام (ابو حنیفہؒ) کی رائے میں کوئی شرط نہیں ہے"۔ اس سے حنفی مسلک کا رُخ ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض فقہا نے اس شرط کا ذکر کیا ہے لیکن جب ہم خود فقہ اکبر اور ملا علی قاری کی شرح کو اصل الاصول کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے تاریخی دور میں قرشی ہونے کو شرط نہیں سمجھا گیا۔ ریاست عامہ کے رئیس عام کا چار مرتبہ انتخاب ہوا اور ہر مرتبہ دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا (۱) امامت کی صلاحیت کا (۲) اور اُمت کے اختیار[1] (ووٹ) کا۔ اگر حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب میں قرشی ہونے کا دخل ہوتا تو مُلا علی قاری دوسری تفصیلات کے ساتھ ضرور اس کا ذکر کرتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے اُن فرامین کا کیا مفہوم ہے جو قریش کے متعلق ہیں۔ اس مفہوم کو معلوم کرنے سے پہلے اس اصول کو مان لیجیے۔ امیر حکومت کا انتخاب دین کی خدمت اور اس کے بعد انسانوں کی مرضی عامہ، مفاد عامہ اور مصالح[2] عامہ پر مبنی ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنے زمانہ میں قریش کے متعلق جو کچھ فرمایا اس کا مقصد نسلی برتری کا اصول پیش کرنا نہیں تھا بلکہ دین کی تقویت اور اسلامی نظام کی عمومیت کا استحکام تھا۔ قریش ایک قبیلہ ہی نہ تھا بلکہ وہ اسلامی نظام کا جوہر تھا۔ قریش کے لوگ سب سے پہلے اسلام لائے، سب سے زیادہ پیغمبر برحقؐ کی صحبت میں رہے۔ اسلام کے کلی اور جزئی قوانین کی رُوح کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی کو ڈھالنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے پہلی صدی ہجری میں قریش کو دین کا محافظ مصالح

---

[1] فقہ الاکبر (امام اعظمؒ) و شرح (للامام مُلا علی قاری سنہ ۱۰۱۴ھ) ص ۵۹-۶۲

[2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ سیاست مدن ص ۱۴۹-۱۵۰۔

عامہ کا نگہبان اور اسلامی عمومیت کا مرکز اور مسلم عوام کا سردار بنا دیا تھا، اس زمانہ میں اسلامی عمومیت کا صادق مطالبہ ہی یہ تھا کہ قریش کو ریاست کی ذمہ داری دی جائے خلفاء اربعہ کا قریشی ہونا اسلامی جمہوریت اور انسانی عمومیت کے موافق تھا نہ کہ مخالف اگلے مورخین میں ابن خلدون نے اس حقیقت کو پیش کیا ہے اور حال کے علماء میں امام ولی اللہ دہلوی نے اس طرف اشارہ کیا ہے[1]۔

ابن خلدون کہتے ہیں "قریشی ہونے کی قانونی وجہ یہ ہے کہ قریش اپنی اکثریت اور دوسرے اوصاف کی وجہ سے رائے عامہ کے نزدیک محترم تھے اور اُن کو قوت کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ملی نظام کی ابتری کے خطرہ کو دور کرنے اجتماعی نظم کے قیام۔ وحدتِ ملی کے بقا، داخلی انتشار کے انسداد اور عام مطمح نظر کے لیے قریش کی ضرورت تھی۔ عوام قریش کے علاوہ کسی قبیلہ پر جمع نہیں ہو سکتے تھے اسی لیے شارع نے اس کا لحاظ رکھا۔" اس تصریح کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ فرمان نبوی کا منشا نسلی تفوق نہیں بلکہ اسلامی سوسائٹی کی بہتری پر مبنی تھا[2]۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت کا فرمان حکم اور امر کی صورت میں نہیں بلکہ خبر کی صورت میں ہے۔ خبر کی صداقت خلافت اربعہ سے ثابت ہے۔ اگر امر کی صورت ہی تسلیم کی جائے تو حضرت معاویہ کی روایت میں (ما اقاموا الدین[3]) کا لفظ کافی ہے۔ آنحضرت فرماتے ہیں حکومت قریش میں رہیگی جب تک کہ وہ دین کے استحکام کے اہل ثابت ہونگے۔ معلوم ہوا ایک خاص وقت تک قریشی امیر ہونگے اور قریشی ہونے کی حقیقت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ سیاست مدن ص ۱۴۹، ۱۵۰۔

[2] مقدمہ ابن خلدون ف ۲۶۔ اختلاف امۃ ص ۱۲۷

[3] عمدۃ القاری شرح بخاری ج ص ۴۸۶ (طبع العامرہ)

نسل نہیں بلکہ قیام دین ہے۔ اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت وہ تقریر ہے جو صدیق اکبرؓ نے سقیفہ کی مجلس شوریٰ میں کی۔ اُنہوں نے صاف کہا کہ ہم نے دین کے معاملہ میں خطرناک زمانہ میں جان لڑا کر خدمت کا استحقاق حاصل کیا ہے۔ جب انصار نے اپنا امیر الگ بنانا چاہا تو اس وقت حضرت عمرؓ کی یہ دلیل کارآمد ثابت ہوئی کہ انصار پر عرب کی رائے عامہ متفق نہ ہوگی[1]

اگر امارت کے لیے ایسی ہستی میسر آجائے جو تمام شرائط کے ساتھ قرشی بھی ہو تو اس کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

قانونِ بیعت (معاہدۂ اجتماعی)

اصول معاہدۂ اجتماعی	بیعت، ایک آئینی عہد[2] ہے۔

جس کا تعلق عوام اور امام سے ہے۔ اور جس کے بغیر ریاست عامہ کے رئیس عام کا انتخاب قانونی تقرر کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ بیعت علمی سیاست کے دائرہ میں وہ قطعی سند ہے جس کی رو سے عوام امام کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور امام عوام کے سامنے اچھے طرز پر نظام حکومت چلانے کا وعدہ کرتا ہے۔

بیعت کے دو آئینی درجے ہیں پہلے درجہ پر اسلامی ریاست کے اول درجہ کے قابل اعتماد اصحاب (اہل حل وعقد) بیعت کرتے ہیں۔ یہ محدود بیعت ہے مگر قانون میں بیحد موثر سمجھی جاتی[3] ہے دوسرے درجہ پر بیعت عامّہ بر سر عمل آتی ہے۔ اس صورت میں عوام عہد

---

[1] تاریخ الکامل ج ۲ ص ۱۲۵ [2] مآخذ کے لیے دیکھو مقدمہ ابن خلدون فصل ۲۹ (معنی البیعۃ) ص ۱۴۷، مفردات القرآن۔ امام راغب ص ۴۴۱۔ الاحکام السلطانیہ۔ باب ۱ ص ۴-۵

[3] المسائرہ۔ بحوالہ ردالمحتار ابن عابدین ج ۱ باب الامامۃ ص ۵۱۲۔

میں پیشقدمی کرتے ہیں۔ آخر میں امام عوام کی موجودگی میں اس عہد کو مکمل کر دیتا ہو اور اس طرح یہ عہد ایک معاہدۂ اجتماعی کی صورت اختیار کر لیتا ہے[1]۔ یہ معاہدہ وجودی شئے ہے، معاہدۂ عمرانی کی طرح فرضی نہیں ہے[2]۔

قانونی یادداشت | ریاست عامہ کے نظام میں حکومت کا قیام باہمی معاہدہ پر مبنی ہے۔ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو ملکیتوں (مملوکہ اور مقبوضہ چیزوں) سے شروع ہوتا ہے اور ملکیتوں پر ختم ہو جاتا ہے مملوکہ شئے کو بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں باہمی معاہدہ کرتے ہیں[3]۔ مملکت کا فرمانروا اور مملکت کے عوام بھی ایک خاص قانونی معاہدے کے مطابق سلطنت کے اجتماعی نظام کو قائم کرتے ہیں عوام کامل وفاداری اور مکمل اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور حکومت کا حکمراں یا امام ان کی امداد اور اُن کے لیے کام کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

بہت سی ملکیتوں کی تنظیم سے ملک بنتا ہے اور بہت سے ملکوں کی سیاسی شیرازہ بندی سے مملکت (اسلامی ریاست عامہ) وجود میں آتی ہے چونکہ قرآن نے حکومت کے معاملہ میں معاہدہ کے اس نظریہ کو پیش کیا ہے اور اسی کے ماتحت دنیا میں اجتماعی نظم قائم ہوتا ہے اس لیے ہم اس کو معاہدۂ اجتماعی کا نام دیتے ہیں۔

معاہدۂ بیعت درحقیقت ایک ازلی عہد کے تابع ہے۔ ازل میں انسان نے خدا کی حکومت بالادست کی اطاعت کا عہد کیا۔ خداوند عالم نے اس عہد کو قبول کر کے یہ وعدہ کیا کہ جو لوگ قانون فطرت کی پیروی کرینگے اور اچھا تعامل اختیار کرینگے اُن کو روئے زمین کی سلطنت دی جائیگی۔ جس طرح حکومتِ الٰہی کا تعلق عہد ازل سے ہے اسی طرح امامت کبریٰ کا واسطہ عہد بیعت سے ہی۔ صرف فرق یہ ہے کہ پہلی صورت خالق و مخلوق

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۲ (بیعت صدیقؓ) [2] روسو کا معاہدہ عمرانی معاہدہ بیعت کے مقابلہ میں فرضی چیز ہی۔

[3] عقد البیعۃ۔ من البیع والمبایعۃ المعاقدۃ والمعاھدۃ الخ (النہایہ ابن اثیر ـــ الدر النثیر، علامہ سیوطی۔ ج ۱ (الباء) ص۱۲۷ مقدمہ ابن خلدون (فاشبہ ذلک فعل البائع والمشتری)، ص ۱۴۷، ص۲۹

سے علاقہ رکھتی ہے اور دوسری صورت امیر اور عوام سے

قرآن نے جا بجا میثاق خاص کا ذکر کیا ہے۔ پے بہ پے ربانی وعدہ کا تکرار کیا ہے[1] اور حکومت کو براہ راست عہد کا نام دیا ہے۔ اسلامی دور میں اور اس کے بعد مسلمان حکومتوں کے دور میں صدیوں تک آئین بیعت پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے[2]۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلامی حکومت اصول معاہدہ سے تعلق رکھتی ہے

ضمنی دفعات

ا۔ بیعت[3] کا طریقہ۔ اسلامی معاشرہ کے ارکان مل کر اپنے قائد و امام کے سامنے آتے ہیں اور حسب ذیل الفاظ میں احکام کی تعمیل اور اطاعت کا عہد کرتے ہیں۔

ہم بیعت کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ اسلام کے اساسی قانون کو قانون نبوت کو اور حکومت راشدہ کے قانون کو واجب التعمیل تصور کرینگے۔ اسلام کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھینگے[4]

ہم اپنے قائد اور ریاست عامہ کے امام کی ہدایات کو توجہ سے سُنینگے اور ہر قسم کے حالات میں ان کی اطاعت کرینگے۔ خوش آئند زمانہ میں بھی اور سخت سے سخت مشکلات کے دور میں بھی۔ ہم کسی ہدایت کی تعمیل میں کسی قسم کا اختلاف اور بحث نہیں کرینگے۔ ہم جب زبان سے کوئی بات کہیں گے تو حق کہیں گے اور جب عمل کے میدان میں قدم باہر

---

[1] البحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ ص ۱۷۵-۱۷۷ (عہد اللہ) (اوف بعھدی اوف بعھدکم) احکام القرآن (جصاص حنفی) ج ۱ ص ۷۹ (لاینال عھدی) تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۰۰ (وعد اللہ)
[2] فتح الباری ج ۱۳ کتاب الاحکام ص ۱۶۴-۱۶۵۔ [3] صحیح البخاری (فتح الباری) ج ۱۳۔ باب کیف یبایع الامام الناس ص ۱۶۴، کتاب الاحکام [4] ایضاً (بیعت عثمانؓ) ص ۱۶۸ (بیعت اعراب) ص ۱۷۰۔

نکالینگے تو حق کے لیے نکالینگے۔ خواہ ہم کسی جگہ ہوں کسی حال میں ہوں اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے شخص کی ملامت کی پرواہ نہیں کرینگے[1]

ہم اپنی قوت کی آخری حد تک اس عہد کی پابندی کرینگے اور ہر مسلم کی بہتری اور خیر خواہی کو اپنا اصول سمجھینگے[2]

ب۔ امام کا عہد یا وعدہ۔ بیعت عامہ کے بعد امام۔ عوام کے سامنے منبر پر آتا ہے اور عوام سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اچھے طرز پر اسلامی نظام کو قائم رکھیگا۔ سچائی اور امانت کے ساتھ فرائض کو ادا کریگا۔ جھوٹ اور خیانت سے دور رہیگا۔ وہ یہ بھی واضح کرتا ہے:

"اگر میں اچھے اصولوں پر قائم رہوں تو میری امداد پر کمر بستہ رہو اور اگر برا طرز اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ جسے اپنی قوت کا گھمنڈ ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے اور جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقت والا ہے۔ میں طاقتور سے کمزور کا حق لے کر ہی مطمئن ہو سکتا ہوں۔ جہاد و جنگ سے غفلت قومی ذلت کا سبب ہے، اور بدکاریوں کے پیچھے جانا، بربادی اور خدا کی مار کا موجب ہے۔ اگر میں اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کروں تو تم میری اطاعت کرو اور اگر میں ایسا نہ کرسکوں تو تم میری ہدایات کی تعمیل سے انکار کر دو۔ ایسی حالت میں میرے حکم کی پابندی تمہارا فرض نہیں ہے۔ صف بستہ نماز کی پیروی کرو خدا کی رحمت تمہارے لیے ہے[3]"

یادداشت | عوام اور امام کا یہ باہمی معاہدہ اگرچہ ازلی معاہدہ کے تابع ہے مگر محض ذہنی اور تخیلی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ریاست عامہ کے عمل اور حکمت عملی سے ہے وہ ایک اہم

---

[1] صحیح البخاری رفتح الباری) ج ۱۳۔ عن عبادۃ بن الصامت بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ ص ۱۶۴۔ کتاب الاحکام۔ [2] ایضاً عن عبداللہ بن عمر ص ۱۶۴۔ عن جریر بن عبداللہ ص ۱۶۵۔
[3] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۶ ص ۳۰۱۔ دیکھو صدیق اکبر کا خطبہ بیعت عامہ کے بعد۔

واقعہ کی طرح واقع ہوتا ہے۔ اور فوراً اپنا اثر اجتماعی نظام پر ڈالتا ہے۔

ج۔ جہاد اور موت کی بیعت ۔ جب اسلامی نظام بیرونی خطرات اور خارجی دباؤ کے مقابلہ میں اپنا اقدام شروع کرتا ہے اور اسلامی حکومت اپنے عالمگیر رجحان کو میدان جنگ میں ظاہر کرتی ہے اس وقت عوام جہاد کی بیعت کرتے ہیں۔ یہ عام بیعت سے جُدا خاص بیعت ہوتی ہے۔ ہر مسلمان موت کا عہد کرتا ہے اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کی جان خدا کے لیے وقف ہے اور اب امیر کے اختیار میں ہے۔

یادداشت | جنگ خندق کے وقت انصار اور مہاجرین کو مدینہ کے باہر دفاعی لائن تیار کرنے کا حکم دیا۔ اصحاب کرامؓ تعمیل میں مصروف ہو گئے۔ آنحضرتؐ معائنہ کے لیے تشریف لائے تو سب کے لیے دعا کی۔ اُس وقت صحابہ نے جہاد کی بیعت کی۔ عہد کے الفاظ یہ تھے۔ نحن الذی بایعوا محمدًا علی الجهاد ما بقینا ابدًا ہم وہ ہیں کہ ہم نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی بیعت کی ہے۔ یہ بیعت زندگی کے آخری سانس تک کے لیے معتبر ہے۔

جنگ حدیبیہ کے وقت موت کی بیعت کی گئی تھی۔ حضرت سلمہؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ لوگوں نے حدیبیہ کے موقع پر کیسی بیعت کی تھی تو اُنھوں نے کہا (علی الموت) موت پر[1]

(د) دین کے نظم اجتماعی کے لیے بیعت ۔ دینی نظام کی شیرازہ بندی کے لیے بیعت لینا قانون میں ایک لازمی شے ہے۔ نظام اجتماعی کی کمزوریوں کو دور کرنے اور نئے ماحول میں نئی بنیادیں پیدا کرنے کے لیے اسلامی معاشرہ کے رضامند افراد امام کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں پہلے عہد بیعت ہوتا ہے بعد میں ضبط و نظم کے لیے جدوجہد شروع ہوتی ہے۔ بیعت میں بچے اور عورتیں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔

---

[1] بخاری (فتح الباری) ج ۱۳۔ کتاب الاحکام عن انس ص ۱۶۴، عن یزید ص ۱۶۵۔

آنحضرت نے مکہ کی زندگی میں ہجرت مدینہ سے پہلے اس قسم کی بیعت کئی بار لی ہے[1]

۵۔ دنیا داری کے لیے بیعت۔ دنیا کے ادنیٰ فائدوں کے لیے محض خود غرضی کے طور پر بیعت کرنا ناجائز ہے۔ اگر ایک شخص خالص دنیا سازی کے طور پر عہدوں کے لیے کسی مجلس کی ممبری حاصل کرنے کے لیے اور دولت کمانے کے لیے بیعت کریگا تو قانوناً اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ ایسا شخص جرم ثابت ہونے پر متعلقہ فائدوں سے محروم کیا جائے گا۔ اس قسم کے عہد کی علامت یہ ہے کہ اگر بیعت کرنے والے شخص کی اغراض پوری ہو جاتی ہیں تو وہ عہد کی پابندی کرتا ہے اور نہیں ہوتیں تو پابندی سے انکار کر دیتا ہے[2]

۶۔ بیعت شکنی۔ جب ایک مسلمان ایک بار بیعت کے آئینی عہد میں داخل ہو جاتا ہے تو اُس کے بعد اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جملہ ہدایات کی تعمیل کرے۔ اس کو رائے عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ حکومت کے معاملات میں قائد حکومت کے روبرو ایوان عام میں یا خاص ملاقات میں اپنی رائے پیش کرے لیکن عہد بیعت کے بعد تعمیل حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔

بیعت کے بعد بیعت شکنی ناجائز ہے یہ ایک ایسا قلعہ ہے جس میں داخل ہونے کے بعد کوئی فرد تنہا باہر نہیں آسکتا۔ جو شخص اس قلعہ میں سب کے ساتھ متحد رہیگا وہ مساوی حقوق کا حقدار ہوگا اور جو ایک بار بیعت کرنے کے بعد اس کو توڑیگا وہ اپنے حقوق اور اپنی ذات کو نقصان پہنچائیگا[3]۔

---

[1] بیعۃ عقبہ اولیٰ وعقبۂ ثانیہ، تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۳۵ و ۳۷ - فتح الباری ج ۳ ص ۱۷۱ - ۱۷۳۔

[2] بخاری (ایضاً) بیعت دنیا۔ عن ابی ہریرہ ص ۱۷۱

[3] فتح الباری کتاب الاحکام ج ۱۳ - باب من نکث بیعۃ ص ۱۷۴۔

دفعہ (۱۸) رئیس الحکومت کے فرائض و اختیارات

ریاست عامہ کے رئیس الحکومۃ (امام) کو وہ اختیارات حاصل ہیں جو امت نے اپنی مرضی سے اس کو سپرد کئے ہیں۔ امت کی رائے عامہ خدا کے اقتدار اعلیٰ کی نمائندہ ہے اور امام امت کے قدرت و اختیار کا مرکز و محور ہے۔

اسلامی قانون میں اس کے فرائض و اختیارات حسب ذیل ہیں۔

نظم حکومت۔ تنفیذ امر[1] حکومت کے قوانین و احکام کا اجراء، حق اور انصاف کی حکومت کو بصورت محکم باقی رکھنا۔ امت کو اچھے کاموں کا حکم دینا اور بُرے کاموں سے باز رکھنا۔ (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) امن عامہ کا قیام اور فساد کا انسداد۔

حکومت باشوریٰ۔ امام کا فرض ہے کہ شوریٰ کے مطابق حکومت کرے۔ وہ جمہور امت اہل حل وعقد اور ہر ہر فرد سے مشورہ لینے کا مجاز ہے۔ اس کو اپنی تجویزوں کو شوریٰ کے سامنے پیش کرے اور ان کو بشرط منظوری نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ کیونکہ شوری حکومت کے لیے ایک اہم عنصر ہے[2]۔

حفاظت مذہب۔ امام مذہب کا محافظ ہے اور مذہب کے حقوق اور ضابطوں کی حفاظت اس کا پہلا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی اس طرح ہونی چاہیے کہ مذہب کی قوت کمزور نہ ہو اور امت زوال اور پستی کی طرف نہ جانے پائے[3]۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ امام بہترین اجماع کے لیے بہترین افراد تیار کرے۔ اور ایسے انسانوں کو تربیت دے جو معراج کمال

---

[1] قرآن حکیم۔ پ، آل عمران ۔ احکام القرآن جصاص ج ۲ ص ۳۴ - ۵۹۱ - روح المعانی ج ۱ ص ۲۰۲
[2] نظائر کے لیے دیکھیے دفعہ متعلقہ شوریٰ۔
[3] الاحکام السلطانیہ، ماوردی ص ۱۲ - ۱۳۔

پر پہنچ سکیں

یادداشت | امام راغب اصفہانی اس ذمہ داری کو تکمیل نفوس کے نام سے یاد کرتے ہیں[۱]۔

سیاسی انتظام (سیاسۃ الناس) سیاسی انتظام کرنا اور امت کے اجتماعی نظم کو قائم رکھنا، امام کا حق اور فرض ہے۔ ریاست عامہ کا ہر فرد اس نظم کے ماتحت اپنی خوشی سے رہتا ہے۔ اور اپنی قوت کو امام کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تاکہ سیاسی نظم اپنی پوری طاقت اور غلبہ کے ساتھ باقی رہے[۲]۔ حقوق عامہ کی نگہداشت، سوسائٹی کے اختلافات کی اصلاح، ظلم اور زیادتی کا مداوا امام کی سیاسی ذمہ داریوں میں داخل ہیں[۳]۔

علمائے قانون نے اسلامی حکومت کی تعریف یہ کی ہے "امامت ایک نیابتی عہدہ ہے جس کا فرض منصبی مذہب کی حفاظت اور دنیا کی سیاست کو بروئے کار لانا ہے[۳]"۔ اس تعریف سے امام کی مندرجہ بالا دونوں ذمہ داریاں سامنے آجاتی ہیں

عمرانی فرائض۔ (عمارۃ الأرض) روئے زمین پر تعمیر و تمدن کے واجبات کو پورا کرنا[۴] زراعت کی توسیع، شاداب درختوں، باغوں اور چمنزاروں کی آبیاری۔ شہروں کا قیام۔ آبادیوں اور مکانوں کی تشکیل، نہروں کا اجراء۔ خوشحال زندگی کی تکوین۔ معاشی اصلاح اور اقتصادی توازن کا بحال رکھنا۔

امور عامہ۔ اسلامی معاشرہ کے افراد کا تعلق جن امور سے ہے اُن سب پر امام کا اختیار کار فرما ہے

---

[۱] الذریعہ (امام راغب) ص ۲۰ [۲] روح المعانی ج ۱ ص ۲۰۲
فتح الباری ج ۱۳ ص ۱۰۲ (ب اجر من قضیٰ بالحکمہ) احکام القرآن جصاص ج ۲ ص ۴۳۳۔ ۵۹۱۔
[۳] مقدمہ ابن خلدون ف ۲۶ ص ۱۳۴ (حفظ الدین وسیاست الدنیا) الاحکام السلطانیہ (ماوردی) بابِ ص ۳
حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۴۸ سیاست مدن۔
[۴] الذریعہ الی المکارم الشریعہ امام راغب اصفہانی (   ) باب ۱ ص ۱۹ — احکام القرآن امام جصاص حنفی ج ۳ ص ۲۰۳ (استعمرکم فیہا) بحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ ص ۱۴۰ روح المعانی آلوسی ج ۸ ص ۱۸۲۔ ۱۸۳۔

ریاست عامہ کی حدود میں ہر شے اس کی صحیح رہنمائی کے ماتحت ہے۔ صوبوں کی تشکیل۔ حکام صوبہ کا تقرر، عدالت انصاف کے اعلیٰ حکام کی نامزدگی، مالیات اور اقتصادیات کی نگرانی۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے چھاؤنیوں کا قیام۔ افواج کی تنظیم نئی افواج کی ترتیب، عوام کے مساوی حقوق کی نگہداشت، کمزوروں اور طاقتوروں کے توازن کی دیکھ بھال، خطرات کے وقت لشکر کشی کا حکم دینا اور آگے بڑھ کر فوجوں کو بڑھانا۔ اسلامی حکومت کے قائد اور ریاست عامہ کے اختیار میں ہے جن میں سے ہر اختیار کو فرض سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے[1]۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں سے براہ راست متعلق رہے۔ اسے ہر وقت اپنی اس صاف اور پاک حیثیت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ وہ منجانب اللہ عوام کی خدمت پر مامور ہے۔

طریق کار اس کو ایک عام انسان کی طرح عام انسانوں سے ملنا چاہیے۔ اس کو کھیتوں میں کسانوں سے بازاروں میں عام تاجروں اور خریداروں سے عدالتوں میں انصاف طلب کرنے والوں سے بستی میں مظلوموں، کمزوروں، فقیروں، محتاجوں سے اور جیل خانوں میں قیدیوں سے خود ملاقات کرنی چاہیے۔ ان سے براہ راست گفتگو کرنی چاہیے اور ان کی ضرورتوں سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے۔ عوام کی ضروریات کی تفتیش۔ امام کی ذمہ داری ہے جس کے لیے متعینہ مدت میں چند دن خاص ہونے چاہئیں[2]۔

---

[1] الاحکام السلطانیہ (الماوردی ۴۵۰ھ) باب ۱ ص ۱۷۔ ذخیرۃ الملوک (سید علی ہمدانی ۷۸۶ھ) (نسخہ قلمی) باب ۵ (در تنقید احکام سعی نماید) المواقف ج ۸ ص ۳۴۹، رد المحتار ج ۱ باب الامامت ص ۵۱۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص ۱۴۸ - ۱۵ (سیاست مدن)، رد المحتار ج ص ۵۱۱۔ ادب الدین والدنیا (ماوردی ۴۵۰ھ)

[2] منتخب تحفۃ الکونین قلمی ۱۰۹۳ھ (وہ مجموعہ قوانین و تعزیرات۔ جس کو دسویں صدی کے علماء کی جماعت نے مرتب کیا) برج اول منزل ۱۔۲۔۳ برج دوم۔ م ۱۱۵۔

(دفعہ ۱۹) اُمت (بحیثیت تنظیم اجتماعی)

اسلامی حکومت کے دائرہ میں۔ اُمت نفوس اقوام کی وہ ناقابل تقسیم وحدت ہے، جس کی شیرازہ بندی دین قیم کرتا ہے، یہ وحدت عقیدۂ توحید پر مبنی ہے اور خدائے واحد کے حکم کے مطابق اسلامی معاشرہ کی مجموعی تصویر پیش کرتی ہے۔ انسانیت عامہ کے مجموعی شیرازہ کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ اجتماعی معاشرہ کے حکم بردار افراد کو خدا کے اقتدار اعلیٰ کا نمائندہ قرار دیتی ہے اور بیرونی طاقتوں کو اپنے اندر شامل کرنے کے لیے طاقتور استعداد کا اظہار کرتی ہے۔ تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دیتی ہے۔ قوموں نسلوں اور طبقوں کے امتیازات کو ختم کر کے جملہ انسانوں کو بڑی برادری کی شکل میں منظم کر دیتی ہے۔ یہاں تک دنیا اس کو جسم واحد کی مانند دیکھتی ہے اور مضبوط و محکم بنیاد کی طرح سمجھتی ہے

اسلامی قانون اپنے اس اجتماعی نظم کو حسب ذیل ناموں سے یاد کرتا ہے۔

اُمت واحدہ — اُمت مسلمہ — ملۃ ابراہیم — اُمت وسطیٰ — خیر اُمت —

ان ناموں میں سے ہر نام اسلامی سوسائٹی کی مجموعی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے اس کی خوبیوں کو سمجھنے اور جانچنے میں امداد ملتی ہے۔

قانونی تشریحات اور نظائر

دنیا میں ایک منظم مملکت کا قیام منظم سیاسی معاشرہ پر مبنی ہے۔ ہر سیاسی اجتماع کے لیے وحدت ضروری ہے اس لیے اسلامی حکومت کا انحصار بھی اُس وحدانی نظم پر ہے جو اُمت متحدہ صورت میں قائم کرتی ہے۔

دنیا انسانوں کا سمندر ہے جس کی تمام موجیں وحدت کی تابع ہیں اور یہ وحدت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کائنات میں ہر منتشر کا مرجع وحدت ہے۔ درحقیقت وحدت اصل ہے، وجودی شئے ہے اور منتشر اکثریت عدمی چیز ہے۔ ریاضی میں ایک سے ایک لاکھ تک عام ہندسوں کا مرجع ایک ہے جس میں صرف ایک کا وجود اصلی ہے۔ باقی عدد ایک کا نتیجہ ہیں۔ نظام شمسی میں آفتاب اصل ہے اور وجودی حقیقت کا مالک ہے اور کرنوں کی منتشر اکثریت عارضی ہے۔ کرنیں پیدا ہوتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں، آفتاب ہمیشہ اپنی وحدت کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ سمندر کی موجوں اور بلبلوں کا سرچشمہ بھی ایک ہے اور وہ ہے خود سمندر۔ اسی طرح نسل انسانی کے منتشر افراد کا حال ہے۔ ان کا سرچشمہ انسانیت ہے اور انسانیت کا سرچشمہ وحدت ہے۔ دنیا کی ہر موجودہ شے میں مادہ جاری وساری ہے۔ مادہ پر وجود حاوی ہے اور وجود کا سرچشمہ وہ وحدت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔[1]

دنیا اور دنیا میں بسنے والوں کا وجود درحقیقت وجود واحد کا فیض ہے جس کو ہم خدائے واحد کہتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی سیاسی وحدت اسی وجود اعلیٰ کے حکم پر مبنی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان قدرت کے قوانین کے ماتحت متحد ہو کر اپنی بہتری کا کام انجام دیں۔

دنیا کی مملکتیں چند ہزار سے چند کروڑ تک محدود انسانوں کی محدود قومی شیرازہ بندی پر قناعت کرتی ہیں مگر اسلامی تصور عالمگیر نظم کی وحدت پر زور دیتا ہے اور اس کو امت کی اصلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ عصر حاضر میں دنیائے سائنس کے کمالات نے یہ بات ایجاد کی ہے کہ دنیا میں ارجمند انسانوں کا عالمگیر نظم ناممکن ہے۔ اس پر جس قدر تعجب کیا جائے

[1] تقریر دلپذیر شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب ص ۱۲۳ - افادات زبانی مجاہد کبیر حضرت مولانا عبید اللہ سندھی دامت برکاتہم

گم ہے۔ دنیا کے عقلا یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ ہماری دنیا میں ایک سورج ہے اور عقل سے محروم لاتعداد نورانی عناصر اس کے گرد جمع ہیں اور نامعلوم مدت سے اپنے مقصد حیات کو پورا کر رہے ہیں لیکن یہ نہیں مان سکتے کہ دنیا کے ذوارب انسان جو عقل و شعور میں بہرہ مند ہیں۔ خدائے واحد کے حکم پر اپنے بہترین فائدوں کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔

اسلام اس تصور کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح فرد، خاندان، قبیلہ اور قوم کی وحدت کو تسلیم کیا جاتا ہے اس سے زیادہ عالمگیر نظم کی وحدت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ دنیا تقسیم و تفریق کا جہنم بن جائیگی جس کا ایندھن ہر زمانہ میں انسان کو بننا پڑیگا، تمام وحدتوں کو ماننا اور ارضی وحدت کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ انسانی جسم کے اعضاء کو علیحدہ علیحدہ کرکے یہ کہا جائے۔ اب تم کام کرو۔ یہ ایک آپریشن ہے جس نے انسانیت کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ نظامِ شمسی کے نورانی عناصر تڑپتی ہوئی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں اور اُس وقت کے منتظر ہیں جب روئے زمین کے انسان اسلام کے اجتماعی نظام پر ایمان لائینگے اور بڑی تعداد میں خدا کے حکم کے سامنے اپنی انفرادیت کو ختم کرکے انسانیتِ عامہ کے رکن بن جائینگے۔

ہمارے علماء اجتماعیات کے نزدیک اُمت کی منظم ہیئت انسانی فطرت کا تقاضا ہے، ابن مسکویہ (۴۲۱ھ) نے آج سے آٹھ سو سال پہلے، زمانۂ حال کے نظریوں کی رہنمائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انسان طبعاً انسانیت عامہ کی بہتری چاہتا ہے۔ کسی ایک انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ تنہا انسانی تمدن اور تہذیب کے تمام مطالبات کو پورا کرے۔ اس لیے انسانوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ بہت بڑی تعداد میں بیک وقت اپنی مشترکہ بہتری کے

ؔ تہذیب الاخلاق لابن مسکویہ ص ۱۷-۱۸ طبع کردستان العلمیہ۔ جمالیہ مصر ۱۳۲۹ھ

لیے جمع ہو جائیں اور باہمی تعاون اور ہمکاری سے انسانی ترقی کے لیے کام کریں۔ اس اجتماعی نظام میں ہر فرد کی مثال ایسی ہے جیسے انسان کے جسم میں کوئی ایک عضو، جس طرح اعضاء کے مجموعہ سے انسان بنتا ہے اسی طرح افراد کے مجموعہ سے انسانی ترقی کا مطمع نظر اپنے کمال پر پہنچتا ہے

حکیم ابو نصر فارابی نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اسلامی نظریہ کی پیش بندی کی ہے، وہ ابن مسکویہ کی تصریحات پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"انسانی ارتقاء انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور انسانی فطرت کے لیے اجتماع لازمی ہے۔ اجتماعی نظام کی تین صورتیں ہیں۔

اجتماع عظمیٰ (انٹرنیشنل ازم) سوسائٹی کا وہ نظم جو تمام معمورۂ ارضی پر حاوی ہو۔

اجتماع وسطیٰ (نیشنلزم) وہ قومی نظام جو دنیا کے کسی جغرافیائی حصہ میں بروئے کار آئے۔

اجتماع صغریٰ (کارپوریشن) کسی شہر میں شہریوں کا نظام۔

ان میں متمدن اُمت وہ ہے جس کے افراد میں زیادہ سے زیادہ ضبط و نظم اور تعاون ہو[1]

فارابی کے بعد امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک مستقل باب لکھا اور اس میں یہ ثابت کیا کہ انسان کا دنیا سے گہرا تعلق ہے اور دنیا کی اصلاح انسان کی ذمہ داری ہے۔ دنیا کا بڑا عنصر ہماری زمین ہے اور اس زمین کا نمائشی ساز و سامان صرف اس بات کی جانچ کے لیے ہے کہ انسان بہتری کے لیے کیا کام کرتا ہے۔ ہر فرد انسانی اپنی تخلیق کی رو سے تنہا نہیں رہ سکتا بلکہ اجتماعی نظام بنانے پر مجبور ہے۔ یہ نظام فرد سے شروع ہو کر اُمت اور حکومت کے نظم پر ختم ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ شہری نظم، ارضی بندوبست، عدالت، فوج، قانون جیسے سیاسی امور کو تعلق ہے۔[2]

[1] آراء اہل المدینۃ الفاضلہ فارابی (دمشق ۱۳۵۵ھ) ص ۵۳-۵۴ ۔ [2] احیاء العلوم ج ۳ حقیقۃ الدنیا ص ۱۹۲-۱۹۰

غزالی کے دو سال بعد علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ انسان[1] اپنی طبیعت سے تمدن پسند ہے۔ تمدن نام ہے انسانی اجتماع کا۔ یہ اجتماعی شیرازہ بندی ہی ہے جو دنیا کی تعمیر اور خلافت و ریاست کا مدار ہے"۔

یہ تصریحات ظاہر کرتی ہیں کہ اُمت کی تنظیم میں انسان کی اصل فطرت موثر رہی ہے

اُمت اسلامیہ کے اسماء حسنیٰ

قرآن کے نزدیک روئے زمین کے تمام انسانوں کی تخلیق" قانونِ وحدت" کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ تمام انسان نفس واحد سے نکل کر بساط وجود پر آئے ہیں[2]، اور نفس واحد اور جسم واحد کی مانند جہان تخلیق میں پیدا کیے گئے[3]۔ جس طرح انسان اپنے اعضاء اور عناصر کی ترکیب کے بعد ایک جسم واحد بن جاتا ہے اسی طرح تمام انسان متحد ہو کر اجتماعی نظم پیدا کرتے ہیں اور ایک تخلیقی معاشرہ کی تکوین کا موجب بنتے ہیں[4]۔

درحقیقت جس طرح ایک انسان اپنی منفرد ہستی کے اعتبار سے ایک وحدت ہے اسی طرح خاندان ایک وحدت ہے، قوم ایک وحدت ہے، ملک ایک وحدت ہے۔ روئے زمین کا مجموعی وجود ایک وحدت ہے اور روئے زمین کے تمام انسانوں کی ہستی ایک وحدت ہے۔

عالمگیر وحدت اور اجتماع کا یہی وہ قانون ہے جس کی بنیاد پر اُمت کی تنظیم عمل میں آتی ہے۔ قانون قرآن میں اُمت کو متعدد ناموں سے یاد کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک نام اسلامی تنظیم کی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ذیل میں وہ تمام نام درج کیے جاتے ہیں جن کا قرآن

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ــ ف اول۔ کتاب اول ص ۳۰۔۳۱ [2] قرآن عظیم (خلقکم من نفس واحدۃ) (الاعراف) [3] ر ماخلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ) قرآن کی اس آیت سے اشارۃً یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے (دیکھو سورۂ لقمان۔ [4] نظام العالم والامم علامہ جوہری ج ۲ ص ۴، ۳ (رحمانیہ مصر)

کے قانونِ مبین میں ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ اُمت واحدہ۔ قرآن عظیم اسلامی سوسائٹی کے اصلی فطری اور ابتدائی نظم کو "اُمت واحدہ" کا نام دیتا ہے[۱]۔ قرآن اس واحد نظریہ کا واحد موجد اور داعی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اس دنیا کے تمام انسان قوم واحد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن جغرافیائی حدود کی بنا پر قوم کی تشکیل کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور بہت سی قوموں کے علیحدہ علیحدہ وجود کو تسلیم کر کے بین الاقوامی وفاق قائم کرنے کا حامی نہیں ہے بلکہ خدائے واحد کی پیدا کی ہوئی دنیا کو انسانیت کا وطن اکبر قرار دیتا ہے اور تمام انسانوں کو قوم واحد کی صورت میں خدا کے حکم پر متحد دیکھنا چاہتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت اپنے وحدانی اختیار کے لیے تمام دنیا کو ایک قوم دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر انسانیت حق و باطل کے جُدا جُدا محاذوں پر ہزاروں قوموں کی شکل میں نظر آ رہی ہے تو یہ قرآن کے ضابطہ کے خلاف ہے۔ (وما کان الناس الا امۃ واحدۃً فاختلفوا) تمام انسان ایک ہی قوم ہیں بعد میں علیحدہ علیحدہ ہو گئے ہیں[۲]۔ قرآن پیغمبروں کو ہدایت کرتا ہے۔ پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ کام اچھے سے اچھا کرو اس موقع پر خداوند عالم اپنے پیغمبروں سے کہتا ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ تمہارے اجتماعی نظام کے تمام ارکان اُمت واحدہ ہیں اور میں تمہارا پروردگار اور غرانرواہوں .... انسان نے ایک عرصہ کے بعد آپس میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنا کام الگ الگ کر لیا۔ اب ہر فرقہ (ہر پارٹی) اپنے نظریات اور رجحانات میں مگن ہے۔ (اے پیغمبر ان فرقوں (قوموں اور پارٹیوں) کو ان کی غفلت اور بیہوشی میں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دیجیے۔ ایک مقررہ وقت تک[۳]۔

---

[۱] قرآن عظیم ویعتذرون۔ یونس[۱۹]) مترجمہ شیخ الہند ص ۲۷۱ متوسط بجنور۔ [۲] المومنون[۲۲] [۳] (بر صفحہ ۳۹۸

اس کے علاوہ اسلامی حکومت کا نظام قومیتوں کی منتشر تنظیمات کی جگہ الناس کے لفظ سے انسانیت عامہ سے اپنے تعلق کو ظاہر کرتا ہے[۵]۔ اور قوم کی جگہ اُمت کو اور اُمت کی جگہ اُمت واحدہ کو اپنے نظم و تنظیم کا منتہا تصور کرتا ہے۔

(ب) اُمت **مسلمہ**۔ خدائے واحد کی حکمبردار قوم، جس میں دنیا کے ہر خطہ اور ہر نسل کے انسان برابری اور بھائی چارہ کے اصول پر جمع ہوں۔ جو اپنی شیرازہ بندی کے لحاظ سے جسم[۱] واحد کی مانند ہوں اور خدا کے حکم سے انسانیت عامہ کی بہتری کا کام انجام دیں[۲]۔ یہ لوگ اپنی عالمگیر اور خود شناس قومیت کے دائرہ میں نحن لہ مسلمون کا نعرہ بلند کرتے ہیں[۳] جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم ایک خدا کے حکمبردار ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کے حق حکمبرداری کو تسلیم نہیں کرتے۔

اُمت مسلمہ کی تکوین کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی جو صدیوں تک سیپ کے موتی کی طرح ابر نیساں کا انتظار کرتی رہی۔ آخر اسلام کے ظہور کا زمانہ آیا اور اُمت محمدیہ قوموں اور ملتوں کے ہم آہنگ وحدانی نظام کی صورت میں مذہب و حکومت کی بساط پر آموجود ہوئی۔

(ج) ملۃ ابراہیم۔ اُمت مسلمہ اپنی اصل اجتماعی تنظیم کے لحاظ سے ملت[۵] ابراہیم کے نام سے

(حاشیہ صفحہ ۳۹۸) [۲] یہ فرمان الٰہی کا حقیقی مفہوم ہے۔ دیکھو ترجمہ شیخ الہندؒ۔ پ۱۸، المؤمنون[۲۳] ص ۴۸۸ تفصیل کے لیے دیکھو بحر المحیط ابو حیان اندلسی ۷۵۴ھ ج ۵ ص ۵۳۳ و ۲۳۱، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۶۵ و ۵۸۴، ۵۸۵۔

[۱] (یا ایہا الناس) ھو خطاب لجمیع العالم۔ بحر المحیط ج ۵ ص ۱۰۷۔ [۲] بخاری (فتح الباری) ج ۱۰ ص ۳۶۰ (کتاب المبر والقبلہ) عن نعمان بن بشیر۔ المومنین کمثل الجسد الخ [۳] بحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۱ ص ۳۷۲۔ ۴۰۰۔ روح المعانی ج ۱ ص ۳۴۵۔ [۴] حوالۂ بالا ص ۴۰۶، روح المعانی ج ۱ ص ۳۵۴۔ [۵] قرآن عظیم سورۂ بقرہ (بل ملۃ ابراہیم) سورۂ آل عمران (فاتبعوا ملۃ ابراہیم) سورۂ انعام (دیناً قیماً ملۃ ابراہیم) سورۂ نحل (ان اتبع ملۃ ابراہیم) سورۂ حج (ملۃ ابیکم ابراہیم)

موسوم ہے۔ اس کی یہ حیثیت ایک برتر حکم (فاتبعوا ملۃ ابراھیم) کے ماتحت اور اساسی قانون کے تابع ہے۔ اسلامی نظم کا یہی وہ رُخ ہے جس نے ہزارہا سال پہلے اپنے تنظیمی رجحان کو ظاہر کردیا تھا اور یہی وہ مذہبی شیرازہ بندی تھی جس نے بعد کی بے نظیر تنظیمات کی طرف اشارہ کرکے ایک اُمت عظمیٰ کی داغ بیل ڈالی۔[1]

حضرت ابراہیمؑ نے اسلامی معاشرہ کے ہیرو (امام) کی حیثیت سے خداوند عالم سے چار چیزوں کی آرزو کی تھی (۱) شہر امن۔ جو تمام دنیا کے لیے مرکز امن وامان ہو (۲) پُر ثمر زندگی جو تمام شہریوں کے لیے عام ہو (۳) امت مسلمہ ایک قوم جو ہمیشہ خدا کی حکمبردار رہے (۴) ایک رسول معلم قانون وسیاست اور رہنمائے مذہب واخلاق۔ یہ دعائیں بارگاہِ عرش تک پہنچیں اور درجۂ قبول پر فائز ہوکر رہیں۔ جب اُمت مسلمہ کی تشکیل عمل میں آگئی اور قرآن نازل ہوا تو اُس نے یہ آخری اعلان بھی کردیا۔ "ملت ابراہیم میں داخل ہونے سے وہی شخص انکار کرسکتا ہے جو علم و آگاہی سے محروم ہو اور فی نفسہ بیوقوف ہو۔"[2]

اُمتِ وسطیٰ اسلامی حکومت کے دائرہ میں جو لوگ فرمانبردار انسانوں کی حیثیت سے متحد ہوکر اپنی قومی تصویر بناتے ہیں ان کو ایک خاص فرمان کی رو سے اُمت وسطیٰ کا نام دیا گیا ہے[3] اس نام کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اُمت اسلامیہ اپنی صحیح اور سچی حیثیت میں عدل و اعتدال کے اعتبار سے ترازو کے کانٹے کی طرح درمیان میں ہے اور متوازن خوبیوں کی مالک ہے۔

اُمت اسلامیہ کا ظہور مشرق و مغرب کے درمیان ہوا اس کا نام اُمۃ مسلمہ ہے اس لیے

---

[1] روح المعانی آلوسی ج ۱ ص ۲۵۲، ج ۴ ص ۴، بحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۱ ص ۴۰۶، تعریفات سید شریف (باب الدال) ص ۳۷۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۲۵ "ابراہیم"۔

[2] قرآن عظیم پ ۱۔ البقرہ ۲

[3] قرآن عظیم۔ وکذالک جعلنٰکم اُمۃً وسطًا لتکونوا شھداء علی الناس الخ پ ۲ البقرہ ۱۷

وہ ماضی وحال کے درمیان تمام قوموں سے اچھی قوم ہے۔

ایشیا، افریقہ، اور یورپ کے وسط میں ہے۔ دنیا کی قوموں میں اخلاق کاملہ پر فائز ہے۔ یہود کی طرح تجاوز کار نہیں اور انجیل پر ایمان رکھنے والوں کی طرح ایک کے بعد دوسرا چپت کھانے کے لیے تیار نہیں۔

قرآن کے قانون کے مطابق اُمۃً وسطٰی ایک ایسی اچھی اور سچی تنظیم ہے جس کا ہر فرد اس حقیقت پر گواہ ہے کہ خدا نے دنیا کی بہتری کے لیے مذہب کے اعلیٰ اصول اور مملکت کے مفید قوانین انسانیت عامہ کے ہاتھ میں دیے، مگر ان میں سے بہت سے انسانوں نے اپنی بہتری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا[۱]۔

( ) خیر اُمت۔ اسلام کے علمبرداروں کی اجتماعی ہیئت کا ایک نام (جس کو دنیا کے لیے ایک نمونہ ہونے کا فخر حاصل ہے) خیر اُمت ہے۔ اس کے معنی ہیں —
"دنیا کی بہترین قوم"

قرآن نے ایک ایسی قوم کا ذکر کیا ہے جو انسانیت عامہ کے لیے کرۂ ارض پر ظاہر ہوئی ہے۔ اس کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انسانوں کو بہتر سے بہتر کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں کے خلاف امتناعی احکام جاری کرے۔ یہی قوم خیر اُمت کے لقب سے سربلند ہے[۲]۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کے متعلق لکھتے ہیں: "یہ وہ قوم ہے جو دنیا بھر کی قوموں میں بلند و برتر ہے۔ اس کے قوانین مکمل، اصول محکم، اور مذہبی روایات قرین عقل و دانش ہیں[۳]۔"

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو بحر المحیط (ابوالحیان) اندلسی ج ۱ ص ۴۲۱-۴۲۲۔ روح المعانی آلوسی ج ۲ ص ۴ و ۵

[۲] بحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۳ ص ۲۷ و ۲۸

[۳] تفسیر قرآن العظیم ج ۱ ص ۱۹۰۔ طبع مصطفیٰ مصر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اپنی اُمت کے اس وصف خاص کا ذکر فرمایا ہے

۱۔ ایک موقع پر ارشاد ہوا مجھے وہ ذمہ داری سپرد کی گئی ہے جو دوسرے پیغمبروں کو عطا نہیں ہوئی۔ مجھ کو رُعب وداب دیا گیا ہے، مجھ کو زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں..... (وجعلت اُمتی خیر الامم[1]) میری اُمت دنیا کی بہترین اُمت قرار دی گئی ہے۔

۲۔ خطبہ تبوک کے موقع پر مسلمانوں سے خطاب کر کے ارشاد ہوا (انتم خیر اھل الارض) تم روئے زمین پر بہترین قوم قرار دیے گئے ہو۔[2]

۳۔ حدیبیہ کے موقع پر اعلان فرمایا (خیر الملل ملت ابراھیم[3]) ملل دنیا میں بہترین قوم ملت ابراہیمی ہے۔

خیر اُمت وہ لقب ہے جس کی وجہ سے پیروانِ اسلام مسلمانوں پر اخلاق و کردار اور تہذیب و تمدن کی طرف سے زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ اس کا رجحان غرور و پندار کی طرف نہیں ہے بلکہ انسانی تعامل کے پاکیزہ واجبات پر مشتمل ہے۔

اسلام کے قانون میں نظام اجتماعی کا مرتبہ

اسلام کی نظر میں انسان "معیارِ احسن" پر پیدا کیا گیا ہے اور اس کی تخلیق اصل فطرت پر ہوئی ہے۔ ہر انسان کی ایک فطرت ہے اور ہر انسان کا نفس اپنی بصیرت پر کام کرتا ہے جس طرح دوسرے معاملات میں انسان کی فطرت کام کرتی ہے اسی طرح اجتماعیات میں بھی اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اسلام انسانی فطرت کے اس اجتماعی رجحان کو تسلیم کرتا ہے اور اس کو دین کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

دین، ملت اور اُمت درحقیقت ایک ہی حقیقت کے تین نام ہیں، تینوں میں اجتماعی

---

[1] روح المعانی ج ۴ ص ۳۲۵ (اخرجہ الامام احمد بسند حسن عن ابی الحسن)

[2] تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۱۳

[3] ایضاً ج ۴ ص ۱۲۱ (الحدیبیہ بحوالہ بخاری)

نظم کا مفہوم موجود ہے اور تینوں میں اصل کے اعتبار سے یکسانیت سی ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو ان کے یکجا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ فرق صرف اعتباری ہے

اسلام کے اجتماعی نظام کو دین سے کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے دین کی لفظی تحقیق کافی ہے۔

امام راغب اصفہانی صاف طور پر لکھتے ہیں (الدین کالملۃ) دین اور ملت دونوں مماثل ہیں۔ علامہ سید شریف یہ تصریح کرتے ہیں کہ دین اور ملت اصلاً ایک ہیں۔[1] دین میں اطاعت کا مفہوم ہے اور ملت میں اجتماع کا۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی میں بھی اطاعت ہی کا عنصر جوہر کی طرح کام کرتا ہے۔

دین کا تعلق خدا کے پیغمبروں سے ہمیشہ رہا ہے۔ آغاز تخلیق سے لے کر اب تک اس لفظ پر انبیاء کی سرگرمیاں موقوف رہی ہیں اور یہ امر سب جانتے ہیں کہ انبیاء خدا کی قائم کردہ اجتماعی تنظیمات کے قائد اور امام تھے۔

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ہم تمام پیغمبر علاتی بھائیوں کی جماعت کے مانند ہیں، اور ہمارا دین ایک ہے"[2] قرآن اسلام کی ہیئت اجتماعی کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ مشہور و ممتاز پیغمبروں کا جو قانون ہے وہی تمہارے لیے ہے۔ قانون کیا ہے --- ؟ (ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا) یہ کہ دین کو استوار و قائم کرو اور تفریق کو قبول نہ کرو۔ اس کے بعد دوبارہ تاکید ہے (وما تفرقوا) نظام اجتماعی کو پارہ پارہ نہ ہونے دو۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی (۷۷۴ھ) اسی نظریہ کی تائید میں لکھتے ہیں (اوصی اللہ تعالیٰ جمیع الانبیاء

۱؎ مفردات القرآن امام راغب اصفہانی (دان) ج ۲ ص ۲۶، تعریفات سید شریف (الدین والملۃ) ص ۴۲، طبع استنبول۔

۲؎ حدیث۔ نحن معشر الانبیاء اولاد علات دیننا واحد۔ مشکوٰۃ المصابیح (باب ذکر الانبیاء)

بائتلاف والجماعۃ ونہاھم عن الاختلاف والافتراق) خدا کی طرف سے انبیاء کو یہ ہدایت رہی ہے کہ وہ منظم رہیں۔ ایک جماعت کی صورت میں رہیں اور اختلاف و افتراق سے دور رہیں۔ امام ابوبکر جصاص حنفی (م ۳۷۰ھ) تصریح کرتے ہیں کہ اجتماع کے لیے خدا کا حکم ہے اور تفرقہ ممنوع ہے[1]۔

یہی وہ ہدایت ہے جو اسلام کے اجتماعی میلان کے لیے اساس کا درجہ رکھتی ہے انسان عقل کی خود فریبی سے اجتماعی فطرت کو اپنے ذہن غلط کار کی خلاقی سمجھتا ہے حالانکہ یہ خدا اور اس کے پیغمبروں کا عطیہ ہے جو اس دنیا میں حقیقی نظم کو قوت دینے کے لیے عطا ہوا ہے[2]۔ سب سے پہلا حکم جس پر اسلام کی اجتماعی فطرت کا مدار ہے۔ قرآن کی یہ عظیم الشان آیت ہے (واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا[3]) "سب مجتمع ہو کر اللہ کے حکم پر جمع ہو جاؤ اور جماعت کے نظم کو متفرق نہ ہونے دو"۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر اس حکم کے اجتماعی رجحان کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں (امرھم بالجماعۃ ونہاھم عن التفرق[4]) افراد امت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جماعت کی صورت میں منظم رہیں اور غیر منظم ہو کر رہنا گوارا نہ کریں" شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی اس آیت کی بنا پر جماعت کے قیام کو فرض قرار دیتے ہیں[5]۔

سورۂ انعام کے آخر میں خداوند عظیم نے قوت کے ساتھ یہ حکم دیا (ولا تتبعوا السُّبُل

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۳ و ۳۵ (ھو امر باجتماع ونھی عن الفرقۃ ۔۔۔)

[2] مندرجہ بالا مباحث کے لیے دیکھو تفسیر قرآن العظیم ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۹، تائید مزید کے لیے دیکھو۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ قرآن پ ۴ آل عمران ۱۱ موضح القرآن ص ۶۶۔

[3] ...

[4] تفسیر القرآن العظیم ج ۱ ص ۳۸۹۔

[5] موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحب پ ۴ آل عمران ۱۱ ص ۶۶ حمائل طبع بلالی ۱۳۱۶ھ

فتفرق بکم عن سبیلہ) مفررہ سیدھی سچی راہ سے علیحدہ ہو کر مختلف اور متفرق راستے نہ اختیار کرو۔ یہ راستے تم کو پارہ پارہ کر کے اصل راہِ حق سے جُدا کر دینگے۔

قرآن نے اسی مرحلہ پر یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ دین اجتماعی نظم کا طالب ہے اور جو افراد اس نظم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں وہ جماعت کے فرد نہیں رہتے۔ ایسے لوگوں سے مرکز کو کوئی سروکار نہیں[1]۔ قرآن اسی اجتماعی نظم کو دینِ قیم قرار دیتا ہے اسی جگہ خدا کی فرماں روائی کا اعلان کرتا ہے اور روئے زمین کی حکومت کا تذکرہ کرتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دین کو نظام اجتماعی سے اور نظام اجتماعی کو حکومت سے کس درجہ تعلق ہے[2]۔ قرآن حکیم کا یہی وہ تصور ہے جس کے بعد کوئی مسلمان دین کے اجتماعی مفہوم کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا[3]۔

قرآن قانونِ الٰہی ہے، اس کے بعد پیغمبر اعظمؐ کے فرامین کا درجہ ہے جن کو عرفِ عام میں حدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضور اکرمؐ نے قرآن کے حکم کے مطابق اجتماعی نظم کی بنیاد معاشرۂ اخوت پر رکھی انما المومنون اخوۃ کے اصول کو زندہ کیا[4] اور تمام دنیا کو بتایا کہ انسان کسی منطقہ کے رہنے والے ہوں کسی نسل سے ہوں اسلامی نظام کے دائرہ میں بھائی بھائی ہیں۔ بھائی چارہ کا یہ تخیل قدیم تخیل سے جداگانہ اور بلند تھا۔ کیونکہ عمل کے میدان میں دنیا کے مختلف انسانوں نے پہلی مرتبہ برادرانہ تعامل، ہمکاری اور حقوق کی یکسانیت کا منظر دیکھا۔

---

[1] اِنَّ الَّذِینَ فَرَّقُوا دِینَھُمْ وَکَانُوا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِی شَیْءٍ پ الانعام ص ۱۹۳۔ شیخ الہند) مفہوم جو افراد منتشر ہو گئے اپنے دینی نظام سے اور علیحدہ علیحدہ پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں [2] دین اور حکومت کے قانونی تعلق کے لیے آیت ذیل ملاحظہ فرمائیے۔ فما یکذبک بعد بالدین الیس اللہ باحکم الحاکمین (پ ۳۰ سورۃ العلق) [3] قرآن عظیم تفصیل کے لیے سورۃ انعام کے دو آخری رکوع تلاوت کیجیے۔ [4] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۱۰

اُمت کے ایک فرد نے ایک مرتبہ اُمت کے اجتماعی مستقبل کے متعلق سوال کیا۔ آنحضرتؐ نے اس کو حکم دیا حکم کے الفاظ یہ تھے (تلزم جماعۃ المسلمین و امامھم) مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ باہم بستہ و پیوستہ رہنا اور اسلامی حکومت کے قائد و امام سے ربط محکم استوار رکھنا۔ یہ حکم تمام اُمت کے لیے اجتماعی فرمان کا حکم رکھتا ہے اور افراد کے لیے ایک قانون ہے۔

اس حدیث میں مندرجہ تفصیل اہم روایتوں پر مبنی ہے حذیفہ ابن الیمانؓ کا بیان ہے کہ مجلس نبوی میں عام طور پر امن، ایمان، اصلاح حال کے متعلق سوالات کیے جاتے تھے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ اگر اس بہتر دور کے بعد خراب دور آجائے تو کیا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ حکم دیا گیا اگر ایسا دور آئے تو اسلام کے اجتماعی نظام اور اس کے امام کا ساتھ دینا اور اگر وہ موجود نہ ہو، تو مخالفتوں کے ہنگاموں اور پارٹیوں سے علیحدہ رہنا یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جائے۔[۱]

علامہ ابن حجر عسقلانی نے ایک حدیث کے ضمن میں علما و قانون کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کا یہ فرمان اجتماعی زندگی کو لازمہ حیات اور واجب قرار دیتا ہے۔ جماعتی نظم کی پابندی لازمی و لابدی ہے جو اس کے خلاف عمل کریگا وہ جماعت سے کٹ جائیگا۔[۲]

اجتماعی نظم کا یہی وہ احساس ہے جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے جابیہ کے خطاب عام میں یہ الفاظ فرمائے (علیکم بالجماعۃ الخ) تم سب اپنے اجتماعی نظم اور شیرازۂ نظام کے اندر مجتمع رہو، تفرقہ سے علیحدہ رہو۔ شیطان ایک فرد کے ساتھ رہتا ہے اور جماعت سے دور بھاگتا ہے۔ جو شخص جنت کی لطیف ہوا چاہتا ہے اس کو جماعتی نظام کے اندر رہنا چاہیے۔[۳]

---

[۱] باب کیف الامر اذا لم تکن جماعۃ صحیح البخاری (فتح الباری) ج ۱۳ ص ۲۹-۳۰

[۲] (باب قول النبی سترون بعدی اموراً) صحیح البخاری (فتح الباری ابن حجر عسقلانی ج ۳ ص ۵ طبع البہیہ مصر)

[۳] حوالۂ بالا ص ۳۰۔

اجتماعی نظام کی اہمیت کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی ہوتا ہے حضرت عثمان کا قتل تاریخ اسلام کا دردناک حادثہ ہے۔ اس حادثہ کے بعد حضرت ابومسعود سے کسی نے دریافت کیا اب کیا چارہ کار ہے؟ انہوں نے بے تکلف جواب دیا (علیك بالجماعة فان الله لم یکن لیجمع امة محمد علی ضلالة[1]) جماعت کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ امت محمد کسی غلط بات پر جمع نہیں ہو سکتی۔

ہم مسلمانوں میں سے اکثر اس امر کو جانتے ہیں کہ اسلام ایک مذہب ہے، لیکن امت کی اکثریت نے اس بات کو ذہن سے نکال دیا ہے کہ اسلام ایک نظام بھی ہے یہ بات بدقسمتی کا سیاہ پردہ ہے جس کو باخبری کے ہاتھ سے دور کر دینا چاہیے۔ ہمارے لیے صدیق اکبرؓ کا زمانہ زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ بعض تازہ دم مسلمان اسلامی نظام سے علیحدہ ہو گئے۔ صدیق اکبرؓ نے اسلامی فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی حضرت علیؓ ساتھ تھے، انہوں نے سواری کی باگ روک کر امیرالمومنین سے خطاب کیا ہمیں اپنی جان کا صدمہ نہ دیجیے، اور مدینہ واپس چلیے (والله لئن فجعنا بك لا یکون للاسلام نظاماً ابداً[2]) اللہ کی قسم اگر آپ کی جان چلی گئی اور ہمیں یہ صدمہ پہنچا تو اسلام کا نظام کبھی اور کسی طرح قائم نہ ہو سکیگا۔"

حضرت علیؓ کا یہ اضطراب خود ساختہ نہ تھا بلکہ اس یادگار بیچینی کا نمونہ تھا جس کا اظہار بدر کے محاذ پر پیغمبر اعظم کی زبان سے ہو چکا تھا۔ اس وقت جبکہ شدید جنگ جاری تھی آنحضرتؐ ان الفاظ میں خدا سے مخاطب تھے (اللهم ان تهلك هذه العصابة لا تعبد[3]) "خداوندا! اگر یہ جماعت اور نظام برباد ہو گیا تو تیری عبادت اور حکمبرداری کے لیے کوئی نہ رہیگا"

---

[1] فتح الباری کیف الامر اذا لم یکن جماعت ج ۱۳ ص ۳۰۔ ۳۱

[2] تاریخ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۶ ص ۳۱۵ دارقطنی۔ عن ابن عمر۔

[3] اسد الغابہ فی احوال الصحابہ (الصدیق) ج ۱ ص ۲۱۲۔

۱ اسلام کو نظم اجتماعی سے جس درجہ تعلق ہے، اس کا اظہار عبادات تک میں ہوتا ہے۔ کوئی عبادت جو فرض ہے اجتماع کے بغیر صورت تکمیل حاصل نہیں کرتی۔ نماز اسلام کا رکن ہے آنحضرت نے حجۃ الوداع میں اس کے متعلق (الصلوٰۃ جامعۃ)[1] فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ نماز اجتماع کو بروئے کار لانے والی ہے۔ ہر نظام اجتماعی کے لیے دلوں کا جمع ہونا ضروری ہے نماز اس کا ایک ذریعہ ہے۔ اس میں صف بندی ضروری ہے اور مسلمانوں کو یہ حکم ہے صفوں کو برابر کرو کیونکہ صفوں کو برابر کرنے سے دل ایک صف میں آجاتے ہیں[2]۔

عہد فاروقی میں نماز کی اجتماعی قوت سے حکومت کے نظام اجتماعی کو مستحکم کیا گیا۔ اس زمانہ میں اسلامی حکومت فارس کی جابر شہنشاہیت کے مقابلہ میں صف آرا تھی۔ مثنی ابن الحارثہ نے محاذ سے یزگرد کے تخت نشین ہونے کی خبر دی، اس وقت کو فوج کشی کے لیے موزوں سمجھا گیا فاروق اعظمؓ کے حکم سے افواج مدینہ کے باہر پہنچ گئیں کسی کو معلوم نہ تھا کہ مہم کا مرکز کدھر ہے۔ حضرت عثمان نے دریافت کیا۔ امیر المومنین! کیا کوئی خبر کہیں سے وصول ہوئی ہے؟ امیر المومنین نے اس کے جواب میں فرمایا نماز کا اجتماع منعقد کیا جائے تمام مسلمان اپنے امیر کے گرد جمع ہو گئے۔ قائد حکومت نے مجمع عام کو صورت حال سے مطلع کیا۔ شوریٰ کا اجلاس طلب کیا اور شوریٰ کے بعد سپہ سالاروں کی کمان میں فوجی مہم بھیجی گئی[3]۔

عبادتوں میں اسی قسم کے اجتماعی تعامل کا ہونا۔ اسلام کے نظم اجتماعی کی آخری دلیل ہے جس کے بعد کوئی مخالف دلیل قبول نہیں کی جا سکتی

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۰۹ (ابن ماجہ عن ابراء بن عازب)

[2] مسلم عن ابی مسعود الانصاری (استووا ولا تختلفوا الخ) دیکھو مشکوٰۃ باب تسویۃ الصفوف۔

[3] الفخری فی الاداب السلطانیہ ابن الطقطقی ص ۵۶

اُمت اسلامیہ کی تاریخی تشکیل

حکومت کی تشکیل ایک منظم قوم کی تشکیل پر منحصر ہے۔ دنیا میں حکومت قائم کر لینا آسان ہے لیکن ایک قوم کا بنانا مشکل ہے اور ایک بڑی قوم کا بنانا اور بھی دشوار۔

اسلام کے ظہور کے بعد اُمت مسلمہ کا ظہور قدرتی بات تھی لیکن اس مقصد کے پورا ہونے میں جن اہم طریقوں سے کام لیا گیا ہے وہ بھی قدرت کے منشا کے مطابق ہے۔

دنیا میں اُمت اسلامیہ کے ظہور کا فلسفہ ایک قدرتی عمل پر منحصر ہے۔ فرد۔ اُمت حکومت یہ تین عناصر ہیں جو تعلق کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی نظام میں سب سے پہلی شئے فرد ہے پہلے ایک فرد پیدا ہوتا ہے۔ فرد اُمت کو بناتا ہے، اُمت حکومت قائم کرتی ہے جس کا نام ریاست عامہ ہے۔

نظم و تنظیم کا یہ عجیب و غریب سلسلہ ایک دور کی شکل میں باقی رہتا ہے فرد اُمت کو بناتا ہے، اُمت اپنے اندر سے بہترین فرد کو پیدا کرتی ہے۔ پھر فرد بہترین اُمت کو بناتا ہے اور بہترین اُمت بہترین فرد کو پیدا کرتی ہے۔ یہ دور جب تک قانونی روایات کے مطابق جاری رہیگا، اسلام کا نظام اپنی داخلی قوت اور بیرونی دباؤ کو جاری رکھیگا اور جب کسی عنصر میں کوئی کمزوری پیدا ہو جائے گی تو نظام اُسی حد تک کمزور ہو جائیگا۔

آنحضرتؐ فرد تھے آپ نے اُمت کو بنایا، اُمت نے اپنے اندر سے صدیق اکبر کو پیش کیا پھر صدیق اکبر نے اُمت کو بنایا، اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ اُمت مسلمہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ منظر عام پر آ گئی۔ یہاں یہ امر بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اُمت اسلامیہ کا اجتماعی نظم تاریخ عالم کے تمام نظاموں کے

مقابلہ میں جدا گانہ طرز پر ہوا ہے۔ فرد سے قبیلہ کا ظہور اور قبائل کی ترکیب سے ایک قوم کا ظہور ہمیشہ ایک خود کار اجتماعی مصلح کے ماتحت ہوتا ہے لیکن پیغمبر اعظم کا ظہور منجانب اللہ ہوا

تنظیم اُمت کے سیاسی مرحلے | آنحضرت کی عمر مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی۔ نوشیروان عادل کے پوتے کسریٰ پرویز کی حکومت کا بیسواں سال تھا۔ حیرہ میں ایران کا دیسرائے ایاس بن قبیصہ حکمرانی کر رہا تھا۔ رمضان کی ۱۷ تاریخ تھی کہ اُمت اسلامیہ کی تنظیم کا کام شروع ہوا۔ توحید کا عقیدہ وہ پہلا قانون تھا جس پر ربّانی قوم کی تعمیر و تنظیم کا کام شروع ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے تنظیم اُمت کا کام شروع کیا اور اُس کو معراج تکمیل تک پہنچایا۔ اس مقصد کو اپنی کامیابی کے لیے جن سیاسی منزلوں سے گزرنا پڑا وہ حسب ذیل تھیں

۱۔ گھریلو معاشرہ پیغمبر اعظم نے خدا کے حکم سے اپنے گھر کے افراد کو حلقۂ اُمت میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ گھر کے افراد میں سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے اس دعوت کو قبول کیا اور ایک وزیر کی طرح آپ کے لیے قوت بازو بن گئیں[۱]۔ اس طرح گھر کے معاشرہ سے اسلامی معاشرہ کی تشکیل شروع ہوئی۔

خاندانی معاشرہ | آنحضرت نے خاندان کے افراد کو بار بار جمع کیا۔ ایک مرتبہ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے نمائندوں کو دستر خوان پر جمع کیا اور اُن کو بتایا کہ میں دین و دنیا کی بہتری کا نصب العین لے کر آیا ہوں[۲]۔

ایک اور موقع پر بنی عبد المطلب اور عبد مناف کے پینتالیس نمائندوں کا جلسہ طلب کیا جو بے نتیجہ رہا اس کے بعد دوسرا اجتماع منعقد فرمایا جس میں اعلان کیا کہ میں انسانیت عامہ کے لیے خدا کی طرف سے نمائندہ ہوں۔ یہ خاندانی معاشرہ کے لیے اہم سعی تھی جس کے نتیجہ

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۵۸ طبع جمالیہ

میں صدیق اکبرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید، حضرت بلالؓ اسلام لائے۔

۳۔ **شہری معاشرہ** خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر مکہ کے شہریوں کو جمع کیا اور اپنے مقصد کی صداقت سے آگاہ کیا، صورت حال سنگین ہو گئی۔ آخری سہارا بھی کمزور ہو گیا مگر آپ نے فرمایا اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیا جائے میرے لیے اس نصب العین سے دستبردار ہونا ناممکن ہے جس کے لیے میں مامور ہوں" یہ وہ سعی جمیل تھی جس کی قوت نے عثمان بن عفانؓ۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن وقاصؓ ایسے بلند پایہ انسانوں کو اسلامی نظام سے وابستہ کر دیا۔ اب معشر قریش کے مقابلہ میں معشر مسلمین کا قیام عمل میں آگیا۔ رفتہ رفتہ یہی جماعت دہائیوں تک پہنچ گئی[1] جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی (اسلامی تاریخ میں معاشرہ (سوسائٹی) کے لیے معشر کا لفظ آتا ہے)

۴۔ **خفیہ معاشرہ** آنحضرت نے دارالندوہ کے مقابلہ میں دارالارقم کو اسلامی سیاست اور اُمت مسلمہ کا مرکز بنایا۔ یہ مکان ارقم بن ابی ارقم کے نام سے منسوب تھا۔ اب اس کا نام دارالاسلام (ایوان علمبرداری) رکھا گیا۔ دارارقم نے مسلمانوں کے خفیہ دینی نظام کے لیے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاریخ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اُمت کی تکوین کے تین سال خفیہ جدوجہد پر مشتمل[2] تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا اجتماع پہاڑوں کے دامنوں میں ہوتا تھا

۴۔ **عالمگیر سیاسی معاشرہ** پیغمبر اعظم نے مذکورہ منزلوں کو طے کرنے کے بعد خدا کے حکم سے اُمت کے عام سیاسی معاشرہ کے لیے عام مہم شروع کی۔ عکاظ، ذی المجاز، مجنہ کے سالانہ بازار اور نمائشیں اس مہم کا ذریعہ قرار دی گئیں۔ یہاں سادہ مزاج عرب میلوں کا سفر کر کے پہنچتے تھے۔ آنحضرت نے ان کے اجتماع سے مقصد کو پوری طرح قوت دی۔ آپ نے ذی المجاز کے

---

[1] روض الانف سہیلی ج ۱ ص ۱۶۳ - ۱۶۸ [2] تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۶۔ تاریخ ابن کثیر ج ۱۲ ج ۳ ص ۲۶

بھرے اجتماع میں انسانیت عامہ کو ان الفاظ میں خطاب کیا۔

"انسانو! توحید کو قبول کرو، اسی میں عام انسانی بہتری کا پروگرام موجود ہے"[1]

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب خدا کا فرمان آیا اور کھلی ہوئی جد و جہد شروع ہو گئی تو حضور اکرم ہر فرد ہر جماعت۔ ہر قبیلہ، ہر طبقہ، اور ہر مجلس میں تشریف لے گئے اور ہر انسان کو توحید کے مقصد وحید پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ آخر کار ہجرت مدینہ کے بعد اُمت کی شیرازہ بندی کا کام اتنا نمایاں ہو گیا کہ مشرق و مغرب کے رہنے والے اُس سے آشنا ہو گئے آنحضرت نے اس مقصد کے لیے عالمگیر کوشش شروع کی اور اس کا مرکز عرب کو بنایا قبائل کے سرداروں کے پاس نمائندے بھیجے، نقیب مقرر کیے۔ تاجداران عالم کے پاس سفارتیں روانہ کیں۔ خارجی سفارتوں کو مدینہ میں قبول کیا۔ معاہدے طے فرمائے! اور سازشی دشمنوں کے خلاف جہاد کا حکم دیا، فوجیں منظم کیں اور اُن کی رہنمائی مشرق و مغرب کی حدود کی طرف فرمائی اس طرح اجتماعی حکمت عملی کے وہ تمام عناصر سامنے آ گئے جن کی بنا پر اُمت وسطیٰ کی تشکیل و ترقی عمل میں آئی۔ اور منظم حکومت نے دنیا کو اپنا چہرۂ زیبا دکھایا۔

پیغمبر اعظم کا اجتماعی تعامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا سیاسی تعامل تکوین اُمت کی حقیقت پر بہترین گواہ ہے۔ خیر القرون کے فیصلہ کن لمحات اسی مقصد کی تکمیل کے لیے صرف ہوئے۔ آنحضرت کے احکام میں ہر اہم حکم اجتماعی نظام کے قیام دوام اور استحکام پر مبنی تھا۔ قرآن نے جب کوئی حکم دیا آنحضرت نے قول و عمل سے اس کی تصدیق کر دی اور خلفاء راشدین نے حکمت عملی کے میدان میں اُس سے کام لیا۔ یہاں تک کہ وہ سارے دنیا کے لیے نمونہ بن گیا۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۴۰۔ ۴۱۔

آنحضرت کے مجموعۂ قوانین و ہدایات میں جو بنیادی احکام موجود ہیں اُن میں حکومت کے پانچ ستون ذکر کیے گئے ہیں۔ جن میں سب سے پہلی چیز اجتماعی نظم ہے۔ فرمان مبارک کے الفاظ یہ ہیں۔

میں[1] امیر اور آمر کی حیثیت سے اُمت کے افراد کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔

۱۔ الجماعۃ ۔۔ اجتماعی نظم کے قیام کا۔

۲۔ والسمع ۔۔ امیر کے حکم کی فرمانبرداری کا۔

۳۔ والطاعۃ ۔۔ حکم کی تعمیل اور اطاعت کا۔

۴۔ والہجرۃ ۔۔ اجتماعی مطمح نظر کے لیے وطن سے ہجرت کے اختیار کرنے کا۔

۵۔ والجہاد ۔۔ خدائے واحد کے راستہ میں جہاد کرنے کا۔

آخر میں فرمایا جو فرد جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوگا۔ اُس کی گردن سے فوراً رشتہ اسلام کٹ کر علیحدہ ہو جائیگا۔ اسلام کے بعد جو شخص زمانۂ جاہلیت کی روایات کی طرف رجوع کریگا اُس کا مقام جہنم ہے خواہ وہ روزوں پر روزے رکھے اور نمازوں پر نمازیں پڑھتا رہے“

یہ حدیث قرآن کے واضح احکام کی صاف تفسیر ہے۔ اس سے ان مسلمانوں کو اپنا حشر معلوم ہو سکتا ہے جنھوں نے صدیوں سے نمازوں اور روزوں پر قناعت کر رکھی ہے اور فرمان نبوی کی واجب التعمیل ہدایات کی تکمیل سے اپنی جان کو چرا رکھا ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) قول و عمل کی مطابقت کا نمونہ احسن تھے اس لیے

---

[1] رواہ احمد والترمذی، کتاب الامارۃ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۲۱)

ہر معاملہ کی طرح جماعت کے قیام کے لیے زبان مبارک سے جو جملے ادا ہوئے تھے اُن کو حکمت عملی کی صورت میں بھی پیش فرمایا۔ حضور اکرمؐ نے تکوین اُمت کے لیے وہ تمام طریقے اختیار فرمائے جو ایک ترقی یافتہ ملی نظم کے لیے ضروری ہو سکتے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے دنیا کے سامنے "بنی آدم کی عظمت" کا قانون پیش کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ تمام انسان بحیثیت انسان دارائے عظمت ہیں[1]۔ اس کے بعد تمام نسل انسانی کو قانون مساوات سے آگاہ کیا اور فرمایا تمام انسان خدا کی مخلوق اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ قومیں، قبیلے اور قبیلے محض اس لیے ہیں تاکہ اُن کو علیحدہ علیحدہ پہچانا جا سکے۔ شرافت و عظمت کا معیار یہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ نکوکاری اور پرہیزگاری ہے۔ ارجمند انسان وہ ہے جو کردار کا اچھا ہے اور نفس انسانی کو بدترین کاموں سے بچا سکتا ہے[2]۔

جب تک آپ کا قیام مکہ میں رہا قرآن نے انسانی سوسائٹی کو اپنا مخاطب بنایا[3]۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ اسلام کے ملی نظم کا منتہٰی انسانیت کی تنظیم ہے۔ جب مکہ میں زمانہ جاہلیت کے لیڈروں نے آپ کی کامیابی کو دشوار سے دشوار تر کر دیا تو تکوینِ اُمت کے کام کو نئے میدانوں اور نئے اشخاص کی تلاش میں مکہ سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لیے دوسرے شہروں میں جانا پڑا۔ آنحضرت کی پیغمبرانہ سیاست نے خدا کی مرضی سے ہجرت کا اصول وضع کیا۔ ہجرت کے قانون نے توسیع اُمت کی مہم کو کامیابی کی معراج پر پہنچا دیا۔ پہلے آپ زید بن حارثہ کو لے کر طائف گئے اس مشکل سفر میں ایک کافر سردار مطعم کی حمایت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد آپ کی ہدایت پر سنہ نبوی اور سنہ تبلیغی

---

[1] قرآن عظیم پ ۱۵ سورہ اسراء ۷۰ [2] قرآن عظیم پ ۲۶ الحجرات ۱۳ یا ایھا الناس انا خلقناکم ـــــ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

[3] بحر المحیط ج ۱ ص ۹۴

میں دو بار حبش کی طرف ہجرت کی گئی پہلی مرتبہ گیارہ آدمیوں نے وطن چھوڑا دوسری مرتبہ بیاسی مسلمانوں نے اپنے تحفظ اور نئی کامیابیوں کے لیے حبش کو اپنا وطن بنایا[1] آخر میں مدینہ کی ہجرت عمل میں آئی جس کے نتیجہ میں مدینہ اسلام کی ریاست عامہ کا پہلا دارالخلافہ قرار پایا۔ مکہ کے مہاجرین اور مدینہ کے انصار آپ کی ہدایت پر بھائی بھائی ہوگئے اور اس طرح اخوت کا اصول مسلمانوں کی سیاست ملی میں داخل ہوگیا۔

جب مدینہ میں مہاجرین و انصار جمع ہوگئے تو پہلی مرتبہ اُمت کی حقیقی تصویر تیار ہوگئی۔ قرآن میں پہلے صرف انسانوں کو خطاب کیا گیا تھا اب اس میں ایماندار انسانوں (مومنوں) کی اجتماعی ہیئت سے بھی خطاب شروع ہوگیا[1]۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (مسلمان مسلمان حقیقی بھائی ہیں) یہ وہ قانون تھا، جو اسلامی معاشرہ کی رُوح پر چھا گیا۔ انسانیت کو پہلی مرتبہ حکمت عملی کے میدان میں اس قانون کا تجربہ ہوا جو تجربوں کی دنیا میں فاتح بن کر نمودار ہوا تھا۔

آنحضرت نے اُمت مسلمہ کی تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے سیاسی اسلوب پر زبردست ہدایات جاری کیں۔ احادیث میں جا بجا مسلم فرد اور اسلامی جماعت کی حقیقت پر زور دیا۔ قرآن نے اسلامی سوسائٹی کے برگزیدہ رکن (مومن) کی تعریف یہ کی تھی "ایماندار ہو اور کردار کا اچھا ہو یعنی مومن صالح ہو۔ خواہ مرد ہو یا عورت" آنحضرت نے فرمایا۔ مرد مومن کی مثال ایسی ہے جیسے (الراس من الجسد) "دماغ جسم کے نظام میں" اُمت کے ایک فرد کو دوسرے فرد سے جو تعلق ہے۔ آنحضرت نے اُس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا (المسلمُ اخو المسلم)[2] "مسلمان مسلمان کا حقیقی بھائی ہے"۔

---

[1] بحر المحیط   [2] صحیح البخاری

آپ نے مسلمانوں کے سیاسی معاشرہ کی وحدت اور اتحاد پر زور دیا، اور فرمایا۔ (مثل المومنین الخ کمثل جسد واحدٍ الخ) مسلمان اپنی اجتماعی شان اور باہمی تعامل کے اعتبار سے ایسے ہیں جیسے "جسم واحد" اس جسم واحد کے عناصر میں جو ربط وضبط ہے اس کا استحکام معمولی نہیں ہے۔ بلکہ پوری قوت کے ساتھ بستہ و پیوستہ ہے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں ہوا (المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہٗ بعضاً) ایک فرد دوسرے فرد سے مل کر ایسا ہو جاتا ہے جیسے بنیاد واحد جس کے اجزاء ایک دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ بستہ ہوتے ہیں۔

چونکہ اُمت کے اجتماعی نظم کا سرچشمہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے اور انسانی انتشار میں نسلی تفریقات کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس لیے آنحضرت نے اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیا۔ آپ نے انسانیت عامہ کی مجموعی ہیئت کو خطاب کر کے فرمایا۔ تمہارا خدا ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ تم میں ارجمند وہ ہے جو کردار کا زیادہ اچھا ہو۔

آنحضرت نے اجتماعی نظم کے موجبات پر زور دینے کے ساتھ ان عوامل سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی جن سے اسلامی معاشرہ میں داخلی جنگ، بدنظمی، اختلاف و انتشار اور تقسیم و تفریق کی صورتیں پیدا ہوں۔ اجتماعی نظم دو طرح خراب ہو سکتا ہے۔ (ا) افراد مرکزی نظم حکومت سے جنگ کے لیے تیار ہو جائیں (ب) افراد آپس میں جنگ و پیکار پر کمربستہ ہو جائیں۔

پیغمبر اعظمؐ نے دونوں صورتوں کے متعلق ہدایات جاری فرمائیں جماعتی نظم کے قیام کا حکم دیا اور اختلاف کی ہر ایک صورت سے باز رہنے کا حکم جاری فرمایا۔ آپ نے

اصحاب کرام سے عہد لیا کہ وہ معاملاتِ حکومت میں حکمبرداری کے ساتھ کام کرینگے اور امیرِ حکومت کے خلاف محاذ جنگ قائم نہیں کرینگے۔ جب تک کہ وہ اسلام کے قانون کے مطابق امیر ہے اور اُس سے کھلا ہوا کفر ظاہر نہیں ہوتا[1]۔

داخلی جنگ کے وقوع کو روکنے کے لیے قرآن نے مسلمانوں کے نام فرمان صادر کیا "اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں لڑیں تو اُن میں صلح کرادی جائے۔ اگر ایک جماعت نہ ملنے تو تمام مسلمان مِل کر اس سے جنگ کریں یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم پر لوٹ آئے۔"

آنحضرت نے اس حکم کی تائید میں مسلمانوں کے نام یہ اصولی ہدایت جاری فرمائی "خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو کو تم پر حرام کردیا ہے[2]۔ میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردن اُڑانے کے لیے تیار ہوجاؤ" قرآن نے مسلمان کے قاتل مسلمان کی سزا جہنم تجویز کی۔ اس سلسلہ میں بھی آپ نے دو حکم جاری کیے۔ (۱) جو مسلمان مسلمان پر لشکرکشی کرے وہ ہمارے دائرۂ اجتماعی سے خارج ہے (۲) اگر دو مسلح مسلمان ایک دوسرے پر حملہ کریں تو قاتل اور مقتول دونوں کی سزا جہنم ہے۔ کیونکہ دونوں ارادۂ قتل میں برابر کے شریک ہیں"۔

آپ نے داخلی جنگ کے موجبات کو روکنے کے لیے بھی احکام جاری کیے اجتماعی نظام کے دائرہ میں جو چیزیں آمادۂ جنگ کرتی ہیں آپ نے ان کو متعین کیا جو یہ ہیں۔ افراد کی باہمی بدگمانی عیب جوئی، ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی دو طرف کا بغض و عناد۔ ایک کے خلاف دوسرے کی مخالفانہ تدبیریں۔ دیر پا قطع تعلق اور غصہ۔ پیغمبر خدا نے ان سب سے منع کیا۔ اس سلسلہ میں آنحضرت کی جاری کردہ ہدایات درج ذیل ہیں۔

---

[1] مشکوٰۃ شریف (متفق علیہ) عن عبادہ بن الصامت۔ کتاب الامارہ۔ ص ۳۱۹ [2] تیسیر الوصول شیبانی ج ۱ ص ۲۲

(د) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے حملہ سے مسلمان سلامت رہے۔

(ب) مسلمان مسلمان کے خلاف بُرا گمان قائم نہ کرے۔ بدگمانی لغو اور جھوٹ ہے۔ آپس میں عیب جوئی نہ کی جائے، باہم حسد نہ کیا جائے بغض کو جائز نہ رکھا جائے۔ کوئی مسلمان دوسرے کے خلاف مخالفانہ تدبیریں نہ کرے۔ سب کے سب خدا کے بندے بن کر رہیں اور بھائی بھائی ہو جائیں۔

(ج) کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ربط و ضبط کو منقطع کرے۔

(د) "غصہ نہ کیا جائے، بہادر وہ نہیں ہے جو بہادر کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر کنٹرول رکھے"[1]

یہ تھے وہ احکام و قوانین جن کی تعمیل کرنے سے منتشر عرب ایک ایسی اُمت عظمیٰ کی شکل میں جمع ہو گئے جس کی مثال تلاش کیے سے نہیں ملتی۔

---

[1] بخاری (فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۲۸) کتاب الادب

(دفعہ ۲۰) شوریٰ

اسلام کی شورائی حکومت (ریاست عامہ)

کا قیام ودوام شوریٰ پر موقوف ہے۔ اس کا بننا، باقی رہنا اور قوت واقتدار کی جولانگاہ میں ترقی کرنا، اُمت کی عام رائے۔ اہلِ حل وعقد (مشیران حکومت) کے مشورے۔ جماعت کے خداداد اجتہاد اور شوریٰ کے بحث ومباحثہ پر موقوف ہے۔

شوریٰ اسلامی حکومت کا خاصۂ لازمہ ہے اور امامۃ کبریٰ کے عہدہ کے لیے ایک لابدی وصف ہے جو کبھی اُس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس حکومت کی صحیح تعبیر کے لیے یہ کہنا قطعاً درست ہوگا کہ شوریٰ حکومت کی جان ہی بلکہ شوریٰ ہی حکومت ہے

قانونی تشریحات ونظائر

اِسلامی حکومت اپنے شوری میلان اور سچے جمہوری اور پارلیمنٹری رجحان کے لحاظ سے تمام دنیا کے لیے ایک نمونہ اور معیار ومنہاج ہی۔ افلاطون کے زمانے (۴۲۷ سنہ قبل مسیح) سے لے کر انگلستان میں پارلیمنٹ کے زمانۂ قیام (۱۶۸۸ء) تک زمین کے کسی حصہ میں ایسی عظیم الشان پارلیمنٹ کا پتہ نہیں چلتا جو اسلام کے نظامِ شوریٰ کی طرح سادہ ہو حقیقی ہو بے قید ڈکٹیٹرشپ اور بے لگام سرمایہ دارانہ شہنشاہیت سے بے واسطہ وتعلق ہو۔ اس کا مدار قومیت سے زیادہ بین الاقوامیت پر ہو اور بین الاقوامیت سے زیادہ ایک ایسی عالمگیر متحدہ قومیت (انسانیت) پر جس کے دائرہ میں دنیا کے تمام منطقوں، قوموں، نسلوں اور طبقوں کے افراد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر داخل ہو سکیں اور چاہیں تو ایک منٹ کے فیصلہ پر مساوی درجہ کے رکن بن سکیں۔

موجودہ زمانہ تعمیر و ترقی کا زمانہ ہے۔ اِس دور میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں پارلیمنٹ کے قواعد کی زبردست نمائش ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ کہنا آج بھی صحیح ہوگا کہ ہماری دُنیا اسلام سے علیحدہ رہ کر کوئی ایسا پارلیمنٹری نظام قائم نہیں کر سکی جو شوریٰ کی طرح تمام دنیا کی بڑی پارلیمنٹ کی صورت اختیار کر سکتا اور اہل دنیا کو بغیر امتیاز اپنا گرویدہ بنا لیتا۔

شوریٰ کی حقیقت | شوری کی حقیقت رائے عامہ کا اظہار ہے۔ امام راغب تصریح کرتے ہیں "شوریٰ کا مفہوم آرار کا حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے پہلے دو سمتیں متعین ہوتی ہیں۔ ایک سمت رائے لینے والے ہوتے ہیں، دوسری طرف رائے دینے والے"۔ ایک سمت اپنی ذمہ داریوں کے دائرہ میں مہم معاملات سے دوچار ہے۔ ایسی حالت میں ایک سمت کے اصحاب دوسری سمت کے لوگوں سے رائے طلب کرتے ہیں۔ اور سلامتی و کامیابی کے لیے ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ بس اسی کا نام شوریٰ[1] ہے۔

اسلامی قانون میں پہلی سمت ارکان حکومت، امام اور اولوالامر (مدبرین حکومت) پر مشتمل ہے دوسری سمت افراد اُمت پر۔

علامہ ابوحیان اندلسی نے شوریٰ کے متعلق جو تصریحات پیش کی ہیں، اُن کے مطابق شوریٰ[2] اس اظہار رائے کے اُس مطالبہ کا نام ہے جس کا خطاب اُمت کے افراد سے ہو جس کے ماتحت اُمت کے افراد اجتماعی صورت میں آپس میں مل کر بیٹھیں، دنیا کے متعلقہ معاملات کی بہتری کے لیے اپنی عقل اور اجتہاد سے کام لیں اس اصول پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب حکومت کے ارکان اور اُمت کے قابلِ اعتماد افراد اپنے بہترین فائدوں کے لیے جمع

---

[1] مفردات القرآن۔ امام راغب اصفہانی (لفظ شوریٰ) ج ۲ ص ۲۴۵۔ الذریعہ الیٰ مکارم الشریعہ ت، ب ۴ ص ۱۰۸۔ کلیات ابوالبقار حنفی ص ۳۹۵۔

[2] بحر المحیط ابوحیان اندلسی (۶۵۴ھ - ۷۵۴ھ) ج ۳ ص ۹۸۔

ہو کر رائے طلب کریں اور رائے دیں تو یہ سمجھا جائیگا کہ شوریٰ اپنی حقیقت کو پیش کر رہا ہے۔

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس سلسلہ میں وہ رائے ظاہر کی ہے جو آج کل کے ترقی یافتہ پارلیمنٹری نظام کے لیے بھی پیش کی جا سکتی ہے وہ کہتے ہیں کہ[1] شوریٰ کی روح یہ ہے کہ جماعت کے افراد میں سے ہر فرد اپنے علم اور قابلیت کے مطابق اپنی آرا اور خیالات پیش کر دیتا ہے ایک دوسرے کے نظریات آپس میں ملتے ہیں اور اُس سے ایک اچھا فیصلہ ہاتھ آجاتا ہے[2] ہمارے زمانہ میں بھی پارلیمنٹ کی حقیقت کے اظہار کے لیے اس سے بہتر الفاظ نہیں پیش کیے گئے۔ یہ وہ بیان ہے جس کی بنا پر شوریٰ کی معنویت پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ اور یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ پارلیمنٹ کا وجود کوئی ایسی منفرد حقیقت نہیں ہے جس کو آج سے پہلے اسلامی عہد میں نہیں سمجھا گیا۔

شوریٰ کی قانونی حیثیت شوریٰ کی بنیاد ایک ایسے قانونی حکم اور آئینی تعامل پر ہے جو کبھی کمزور نہیں ہو سکتا۔ اس کی قانونی حیثیت کے اظہار کے لیے پہلی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اور حکم بھی کسی معمولی انسان اور معمولی قوم کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے سردار اعظم پیغمبر معظم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور دنیا کی اس عظیم الشان عالمگیر قوم کے لیے جس کو عرش اعظم سے خیر الملل کا خطاب عطا کیا گیا ہے یعنی اس پیغمبر کے لیے جس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں اور اس قوم کے لیے جس سے بہتر کوئی قوم نہیں۔

۱۔ آنحضرت کو حکم دیا گیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ[2] حکومت کے معاملات میں شوریٰ پر عمل کیجیے۔

---

[1] تفسیر مظہری پ۴ آل عمران ج ۲ ص ۱۶۲ (بناء المشاورة استخراج ما عندهم من العلم بالاصلح بتلاحق الافکار)

[2] قرآن عظیم پ۴ آل عمران ص ۹۰ طبع متوسط بجنور۔

۲۔ مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کے متعلق ضابطہ کے طور پر یہ تصریح ہے (اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[1]) ان کی حکومت کے کام شوریٰ سے انجام پاتے ہیں

قرآن حکیم نے ان دونوں مواقع پر شوریٰ کا ذکر ان امور کے متعلق کیا ہے جو قرآن کے قانون اساسی میں طے شدہ نہیں ہیں[2] اور جو دین کے ماتحت دنیا کے کارخانے کو چلاتے ہیں۔

شوریٰ کی یہی وہ قانونی حیثیت ہے جس کا اظہار چھٹی صدی ہجری کے مستند عالم قانون امام ابن عطیہ[3] نے ان الفاظ میں کیا ہے (ان الشورىٰ هي من قواعد الشريعة وعزائم الاحكام) شوریٰ شریعت کے قوانین میں سے ایک اساسی قانون اور حکومت کے فیصلوں کی بنیاد ہے[4]۔

شوریٰ کی غایت اسلام کے علماء قانون نے صراحت کے ساتھ اُن قانونی غایتوں کو ظاہر کیا ہے جن کا تعلق شوریٰ سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شوریٰ کے اجراء سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(ا) (استصواب رائے عامّہ) اس سے رائے عامہ اپنی اجتماعی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

(ب) (رائے عامہ کا اطمینان) شوریٰ کے فیصلہ سے رائے عامہ مطمئن ہو جاتی ہے۔

(ج) (تکوین قانون عامہ) عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے تعامل کی وجہ سے شوریٰ نے

---

[1] پ ۲۵۔ الشوریٰ[42] ص ۶۳۲ [2] فتح القدیر امام شوکانی ج ۱ ص ۳۶۰۔

[3] الحافظ القاضی۔ الامام المفسر عبدالحق ابن غالب بن عطیہ (۴۸۱ھ – ۵۴۶ھ) صاحب الوجیز فی التفسیر (بستانی ج ۱ ص ۶۰۹)

[4] بحر المحیط ج ۳ ص ۱۹، فوائد القرآن صاحب فتح الملہم علامہ عثمانی (ترجمہ شیخ مولانا محمود حسن دیوبندی) الشوریٰ ص ۶۳۲ طبع متوسط بجنور "خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر تھی"۔

ہمیشہ کے واسطے اُمت کے لیے واجب التعمیل قانون کی صورت اختیار کرلی ہے۔

(د) (حصولِ رہنمائی) حکومت کو اعلیٰ رہنمائی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملتا ہے اور رشد و ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

(ہ) (اجتہاد) شوریٰ سے مدبرانہ غور و فکر کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور درست نتائج تک پہنچنے میں امداد ملتی ہے۔[1]

شوریٰ ایک حکمت عملی کی حیثیت سے

شوریٰ مجرد قانون ہی نہیں ہے بلکہ ایک زبردست حکمت عملی بھی ہے۔ اگر اسلام کا نظام حکومت امام کے اختیار مطلق پر مبنی ہوتا تو نہ شوریٰ کا حکم آتا اور نہ دنیا کے سردار اور اسلام کے برگزیدہ پیغمبرؐ اس پر عمل کرتے۔ آنحضرت نے قول اور فعل سے یہ ثابت کیا ہے کہ شوریٰ قانون بھی ہے اور حکمت عملی بھی۔ حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو حضور اکرمؐ نے فرمایا۔ اگرچہ اللہ[2] اور اس کا رسول شوریٰ سے بے نیاز ہیں مگر شوریٰ کا یہ حکم اس لیے ہے تاکہ اُمت کے لیے رحمت ہو۔ اس کے بعد اُمت کا فرد رائے اور مشورہ طلب کریگی کبھی اعلیٰ درجہ کی رہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کردیگا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلیگا۔"

حضرت قتادہ کے اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو وحی نازل ہونے کے باوجود اپنے اصحاب سے مشورہ کا حکم ملنا اس لیے تھا کہ قوم کا ضمیر اور رائے مطمئن ہوجائے اور شوریٰ

---

[1] علماء قرآن و حدیث و فقہائے اُمت نے مندرجہ بالا غایتوں کے اظہار کے لیے بالترتیب حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں۔ الاستظہار برایہم۔ التطییب لانفسہم۔ ان تکون سنۃ بعد لامۃ۔ رشد۔ ارشاد الاجتہاد۔ دیکھو۔ البحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۳ ص ۹۸۔ روح المعانی علامہ آلوسی ج ۴ ص ۹۴-۹۵۔ تعریفات سید شریف ص ۵ (الاجتہاد)

[2] بیہقی۔ شعب الایمان۔ عن ابن عباس (بسندِ حسن) روح المعانی ج ۴۔ ص ۹۴۔

اُمت کے لیے قانون بن جائے۔ حضرت حسنؓ[1] کی روایت سے بھی اسی امر کی تائید ہوتی ہے کہ شوریٰ کے حکم کا مقصد یہ تھا کہ اس میں صحابہ کے لیے قانونی وجوب پیدا ہو جائے اور بعد میں اُمت کے لیے ایک مستقل حکمت عملی بن جائے

مندرجہ بالا احادیث کے بعد آنحضرت کے عمل کو دیکھنا موجب سعادت ہوگا حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے۔ (ما رأیتُ احدًا اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے رفقاء (اصحاب) سے مشورہ کرنے میں اتنا زیادہ سرگرم ہو جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے[2]۔

حضرت قتادہ نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ "آنحضرت کو منجانب اللہ حکم تھا کہ اہم معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیجیے" آنحضرت خدا کے اس حکم کی قوت کو محسوس فرماتے تھے اور اس کی تعمیل کو لازمی سمجھتے تھے۔ حضرت عائشہ بھی فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے رائے اور مشورہ کرنے والا انسان نہیں دیکھا۔ آنحضرت کا قول تھا کہ اگر ابوبکر و عمر شوریٰ میں ایک رائے پر جمع ہو جائیں تو میں اس کے خلاف عمل نہیں کرونگا) ایک مرتبہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو تحریری طور پر ہدایت کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون شوریٰ پر عامل تھے۔ تم بھی لازمًا اس پر عمل کرنا"۔ ضحاک کا بیان ہے کہ فاروق اعظم نے عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا تھا اور وہ معاملات میں ان کی رائے بھی لیتے تھے[3]۔ علامہ شوکانی یمانی شوریٰ کے متعلق اسلامی تعامل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

---

[1] روایت ابن جریرؒ۔ [2] اس اثر کو ابن ابی حاتم نے سند حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دیکھو فتح الباری (عسقلانی) ج ۱۳ ص ۲۸۶۔

[2] رجالہ ثقات (ترمذی الجہاد) بخاری (کتاب وسنۃ) فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۸۶۔

[3] تفسیر مظہری علامۃ الامام ثناء اللہ پانی پتی ج ۲ ص ۱۶۱

مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ سے کام لیتے ہیں۔ جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے[۵]۔

فاضل قانون داں ابن خور بنداد مسلمانوں کے لیے شوریٰ کو لابدی قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ

امیر حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قانون شوریٰ سے قوت حاصل کرے یہ ہو سکتا ہے کہ امیر حکومت کسی معاملہ میں اتنی واقفیت اور مہارت نہ رکھتا ہو جس قدر معاشرہ کے دوسرے افراد رکھتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم پر صورتِ حال مشکلات سے پُر ہو جائے دونوں صورتوں میں شوریٰ کا انعقاد اور ماہرین علم وفن کی رائے لینا ضروری ہے۔ جنگی معاملات میں فوج کے کمانڈروں سے مصالح عامہ کے سلسلہ میں عوام کے نمائندوں سے مملکت کے نظم اور تعمیر و ترقی کے معاملہ میں اوّل درجہ کے مدبروں دفتری حکام، انتظامی افسروں اور وزیروں سے شوریٰ میں رائے لینی چاہیے[۲]۔

یہ ہیں وہ روایات جن سے شوریٰ کے تعامل پر روشنی پڑتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ شوریٰ ایک قانون بھی ہے اور حکمت عملی بھی۔

ایوان شوریٰ

شوریٰ کے جلسوں کے لیے ایوان کا ہونا ضروری ہے جس طرح عصر حاضر میں ہر دار العوام کے لیے ایک عمارت ہوتی ہے اسی طرح مکہ میں مسلمانوں کے اجتماع اور اجتماعی مشوروں کے لیے دارالارقم ابتدائی ایوان تھا جس کو دارالاسلام (ایوان حکمبرداری) کے

---

[۱] فتح القدیر ج ۴ ص ۵۲۶ [۲] فتح القدیر علامہ شوکانی ج ۱ ص ۳۶۰۔

نام سے پکارا جاتا تھا۔ مدینہ میں عہد سعادت تک کھلے میدانوں سے ایوان کا کام لیا جاتا تھا مسجد نبوی بہت ہی باعظمت اجتماعوں کے لیے وقف تھی۔ خلافت راشدہ میں سب سے پہلے سقیفۂ بنی ساعدہ سے ایوان شوریٰ کا کام لیا گیا[۱]۔

حضرت عمر کے انتخاب کے متعلق خاص شوریٰ، صدیق اکبر کی قیامگاہ پر ہو عام شوریٰ کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ عوام الناس ایک مقام پر جمع تھے جہاں اُن کی رائے لی گئی۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ اجتماع مسجد نبوی میں تھا یا کسی اور جگہ[۲]۔ حضرت عثمان کے متعلق "دار المشورہ" کو ایوان شوریٰ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا[۳]۔ چوتھے انتخاب میں حضرت علی نے مسجد نبوی کے ایوان تقدیس کو استصواب رائے عامہ کے لیے تجویز کیا[۴]۔

یہ ہے ایوان شوریٰ کی تاریخ اگر اُمت کسی زمانہ میں وقت کے مطابق کوئی ایوان تعمیر کرے تو یہ اسلام کے عمرانی رجحان کے عین مطابق ہوگا۔

شوریٰ کے عناصر | ۱۔ امام (شورویٰ حکومت کا منتخب رہنما، اور قائد اعلیٰ)۔

۲۔ اُمت (خدائے واحد کو ماننے والوں اور اس کے فطری قوانین پر گامزن ہونے والے انسانوں کا عالمگیر گروہ اور شیرازہ بند شورویٰ نظام)۔

۳۔ مجلس اہل حل وعقد، حکومت کے مدبروں اور مشیروں کا مرکزی ادارہ جس کے ارکان اپنے اعلیٰ کردار اور بلند خدمات کی وجہ سے پوری طرح اُمت کے اعتماد کا مرکز ہوتے ہیں۔

۴۔ ارکان شوریٰ، اسلامی ریاست عامہ کے وہ تمام شہری جو اسلام کے فطری قوانین

---

[۱] یہ سایہ دار احاطہ تھا جہاں عام اجتماعات ہوتے تھے (دائرۃ المعارف بستانی ج ۹ ص ۴)
[۲] اُسد الغابہ ج ۴ ص ۶۹ [۳] بعض تاریخی روایتوں میں بیت المال کی عمارت اور بعض میں حضرت عائشہؓ کی قیام گاہ کا ذکر ہے۔ دیکھو تاریخ طبری ج ۵ ص ۳۶ (قصۃ الشوریٰ)
[۴] تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۵۲۔ ۱۵۷۔

کے پابند ہوں بشرطیکہ اوسط درجہ کے علم و عقل سے بہرہ مند ہوں۔ اُمت کے وہ تمام افراد جو شوریٰ میں شرکت کر سکیں۔ جو اجتماعی نظم کے بہی خواہ ہوں۔ ذاتی غرض اور شخصی نفع اندوزی کے تصور سے خالی ہوں یعنی امین ہوں اور اس درجہ سلامتی فکر کے مالک ہوں کہ صحیح رائے پیش کر سکیں[۹]۔ اشتراک کا طریقہ حالات کے مطابق بدل سکتا ہے)

۵۔ رائے دہندگان۔ ہر وہ انسان جو اسلام کے معاشرۂ اخوت کا رکن ہو۔ عاقل بالغ اور پابند قانون ہو۔ کسی معاملہ پر رائے دینے کے لیے جتنا علم اور سمجھ بوجھ ضروری ہے اُس سے محروم نہ ہو

استصواب رائے عامہ کی صورت میں حق رائے دہی کی دو شرطیں ہیں۔ اسلام[۱] اور اسلامی شعور۔ اس کے علاوہ نہ کسی علمی ڈگری کی ضرورت ہے نہ ثروتمندی کی اور نہ کسی خاص قیمت کی جائداد کے مالک ہونے کی نہ رنگ و نسل کی نہ قوم و وطن کی۔

اس صورت میں مردوں اور عورتوں، بوڑھوں اور بچوں، شہریوں اور دیہاتیوں مقیم اور مسافر سب حق رائے کے مالک ہیں[۲]

شوریٰ کے تاریخی اجلاس سنہ تا سنہ ۳۵

ذیل میں شوریٰ کے ان اجلاسوں کا نقشہ درج کیا جاتا ہے جنہوں نے سچی پارلیمنٹری روایات کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

(عہد نبوی)

۱۔ شورائے اذان۔ سنہ ہجری، اس شوریٰ کے نتیجہ میں نماز کے اجتماع کے لیے منجانب اللہ

---

[۱] ادب الدین والدنیا۔ الماوردی۔ الشوریٰ ص ۱۹۸۔ ۱۰۰ (استرشد والعاقل فرشد۔ الحدیث) (الدین النصیحۃ الحدیث)، (المستشار موتمن الحدیث) تفسیر مظہری، استخراج، عندہم من العلم بالاصلح بتلاحق الافکار۔ آل عمران ج ۲ ص ۱۶۲

[۲] الذریعہ الی مکارم الشریعہ امام راغب اصفہانی۔ ادب الدین والدنیا ماوردی، تاریخ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۹۵۔

اذان دینے کا حکم دیا گیا[۱]۔

۲۔ شورائے بدر الکبریٰ ۲ سنہ ہجری۔ (معرکہ بدر کے متعلق[۲])

۳۔ شورائے اسارئے بدر الکبریٰ ۲ سنہ ہجری (بدر کے جنگی قیدیوں کے متعلق[۳])

۴۔ شورائے اُحد ۳ سنہ ہجری (محاذ اُحد کے متعلق[۴])

۵۔ شورائے خندق ۵ سنہ ہجری (حضرت سلمان کا مشورہ، مدینہ لائن کی تیاری[۵])

۶۔ شورائے افک ۶ سنہ ہجری۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق ایک ناواجب بہتان تراشا گیا۔ یہ مسئلہ عام مشورہ کے لیے رائے عامہ کے سامنے پیش کیا گیا[۶]۔

۷۔ شورائے حدیبیہ ۶ سنہ ہجری۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی زیارت کے متعلق رائے عامہ سے استصواب فرمایا[۷]۔

۸۔ شورائے اسیران ہوازن ۸ سنہ ہجری۔ ہوازن کے چھ ہزار جنگی قیدیوں کے متعلق نمائندہ اسمبلی طلب کی گئی[۸]۔

۹۔ شورائے معاذ بن جبل ۱۰ سنہ ہجری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کو گورنر یمن مقرر کرنے کے لیے شوریٰ طلب فرمایا[۹]۔

عہدِ خلافتِ راشدہ

۱۱۔ شورائے سقیفہ بنی ساعدہ ۱۱ سنہ ہجری (ریاست عامہ کے پہلے صدر کا انتخاب اس شوریٰ

---

[۱] فتح الباری بدئ الاذان۔ ج ۲ ص ۶۱۔ ۶۵ [۲] تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۷۳، تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۴۵
[۳] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۹۶۔ [۴] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۱۔ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۳۔ ۲۳۔ تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۵۷ [۵] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۹۵۔ ۹۹۔ تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۶۷
[۶] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴، تاریخ ابن اثیر ج ۴ ص ۱۴۲۔ ۱۶۰۔ طبری ج ۳ ص ۶۸
[۷] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۰ [۸] صحیح البخاری بحوالہ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۳۵۴
[۹] مجمع الزوائد الہیثمی ج ۹ ص ۴۶۔ تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۹۹۔

میں ہوا[1])

۱۲۔شوریٰ جیش اسامہ ۱۱ سنہ ہجری (پیغمبر اعظم نے آخری لمحات میں جلیل القدر صحابہ کا ایک لشکر مرتب کیا تھا اور اُس کی کمان بیس سالہ نوجوان اسامہ کو دی تھی۔ وصال مبارک کے بعد حضرت صدیق نے اس کو محاذ پر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ شوریٰ اسی فیصلہ پر غور کرنے کے لیے ہوا تھا[2])

۱۳۔شورائے مرتدین زکوٰۃ ۱۱ سنہ ہجری (پیغمبر اعظم کی وفات کے بعد نو مسلم قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ صدیق اکبر نے صدر حکومت کی حیثیت سے اس معاملہ کے قابلِ بحث پہلو کو رائے عامہ کے سامنے رکھا[3])

۱۴۔ دوسرا انتخابی شوریٰ ۱۳ سنہ ہجری۔ صدیق اکبر نے آخری لمحات میں اپنے جانشین (فاروق اعظم) کے انتخاب کے لیے مجلسِ حکومت سے مشورہ کیا اور اس کے بعد عام شوریٰ سے منظوری حاصل کی[4]۔

۱۵۔شورائے محاذ عراق ۱۴ سنہ ہجری (عراق میں دوسری فوجی مہم کے متعلق فاروقی عہد میں اس شوریٰ کا اجلاس[5] ہوا۔

۱۶۔شورائے میثاق بیت المقدس ۱۵ سنہ ہجری (اہلِ قدس نے صلح کے لیے یہ خواہش کی تھی کہ خود امیر المومنین مدینہ سے قدس تشریف لائیں اور شرائط طے کریں۔ فاروق اعظم نے اپنی روانگی کو رائے عامہ کے فیصلہ پر موقوف رکھا اور اس کے لیے شوریٰ طلب فرمایا[6])

۱۷۔شورائے محاصل عراق ۱۶ سنہ۔ یہ شوریٰ عراق کی مفتوحہ زمینوں کے محاصل کے متعلق ہوا تھا

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۹۹، الاصابہ فی تمیز الصحابہ

[2] تاریخ ابن کثیر ج ۶ ص ۳۰۴۔ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۶ ص ۳۱۲

[4] اسد الغابہ ابن اثیر ج ۴ ص ۶۷-۷۰۔ [5] تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۵

[6] تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۵۵ فتح بیت المقدس۔

جس میں فیصلہ ہوا کہ زمینوں کا محصول فوج کے فاتح سپاہیوں پر تقسیم کی بجائے خلافت کے خزانہ میں جمع کیا جائے۔ (کتاب الخراج امام ابویوسف)

۱۸۔ شوریٰ جنگ نہاوند ۲۱ سنہ ہجری (عہد فاروق) تاریخ اسلام کی مشہور جنگ۔ جہاد نہاوند سے پہلے فاروق اعظمؓ نے اس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا تھا۔[1]

۱۹۔ تیسرا انتخابی شوریٰ ۲۴ سنہ ہجری (خلافت راشدہ کے تیسرے امیر حضرت عثمان غنیؓ کے متعلق چھ اصحاب کی مجلس شوریٰ کا تقرر اور استصواب رائے عامہ[2]

۲۰۔ شورائے انتخاب چہارم ۳۵ سنہ ہجری (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتخاب[3] کے متعلق رائے عامہ کا اجتماع

شوریٰ کی قانونی صورتیں

ا سنہ ہجری سے ۳۵ سنہ ہجری تک شوریٰ نے جس طرح کام کیا ہے اُس سے مندرجہ ذیل صورتیں منظر عام پر آتی ہیں۔

۱۔ عمومی اجلاس، جو رائے عامہ کے مطالبہ پر منعقد ہوتا ہے (دیکھو شوریٰ سقیفہ بنی ساعدہ)

۲۔ باضابطہ رسمی اجلاس، جو رئیس الحکومت کی طرف سے کسی اہم معاملہ کو پیش کرنے کے لیے طلب کیا جاتا ہے۔ (نظائر شوریٰ بدر الکبریٰ، سفر حدیبیہ، میثاق قدس وغیرہ)

۳۔ مشورۂ جماعت۔ اس صورت میں چند افراد ہم رائے ہو کر بطور خود رئیس الحکومت سے ملتے ہیں اور اپنا مشورہ پیش کرتے ہیں اور صدر حکومت ان کا مشورہ دلی توجہ سے سُنتا ہے (نظائر صلح حدیبیہ، جیش اُسامہ)

۴۔ مشورہ فرد جماعت کا ایک فرد اپنی نمایاں قابلیت کی بنا پر امام اور اُمت کو مشورہ دیتا ہے جس کو منظور کر لیا جاتا ہے (دیکھو غزوۂ خندق مشورۂ سلمان فارسی)

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۰۷ [2] ایضاً ص ۱۴۴-۱۴۶ [3] تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۵۲

۵۔ نمائندہ اسمبلی۔ اس صورت میں بڑی بڑی قوموں کے نمائندے حکومت کے زیر اثر جمع ہو کر کسی معمولی مسئلہ پر رائے دیتے ہیں (ہوازن کے چھ ہزار جنگی قیدیوں کے متعلق اس قسم کا اجلاس طلب کیا گیا تھا۔

۶۔ شوریٰ اہل حل و عقد:۔ امام حکومت کے مشیروں اور مدبروں کی محدود مجلس مقرر کرتا ہے۔ اس کے نامزد ارکان مقررہ مقصد کا فیصلہ شوریٰ سے کرتے ہیں اور اس کا نفاذ رائے عامہ کی منظوری سے ہوتا ہے (دیکھو شوریٰ انتخاب سوم)

۷۔ استصواب رائے عامہ۔

اس صورت میں شوریٰ کے اہم فیصلہ کو نافذ کرنے سے پہلے بڑے پیمانہ پر رائے عامہ طلب کی جاتی ہے جس میں شہری دیہاتی۔ مرد عورتیں، بوڑھے بچے رائے دیتے ہیں (دیکھو شوریٰ انتخاب سوم۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے مدینہ میں استصواب رائے عامہ کے مقصد کی تکمیل کے لیے تین دن تین رات ووٹ لیے[1]

امام اور شوریٰ | دنیا میں حکومت کے صدر اور پارلیمنٹ کے باہمی تعلق کا مسئلہ جس قدر پیچیدہ ہے اسلام کے قانون میں اسی قدر صاف اور محکم ہے۔ اسلامی حکومت شورٰی حکومت ہے اور امام اُس کا با اقتدار رہنما ہے۔ قدرۃً امام شوریٰ کے اختیارات کا نمائندہ ہے اور حکمت عملی کے دائرہ میں مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کا ترجمان! اس حیثیت سے اسلامی حکومت کا رہنما عام انسانوں میں سے ایک انسان ہے اور اس کی ہستی عوام کی ساختہ پرداختہ ہے۔ شوریٰ کا فیصلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے امام صدارت کے منصب عظمیٰ پر آتا ہے اور اُمت کی عام رائے ہی وہ مقیاس ہے جو امام کو اس کے عہدے سے معزول ہونے کا پتہ دیتی ہے یہ وہ اصول ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نظام میں پارلیمنٹ کا فیصلہ صدر کی

[1] حوالوں کے لیے دیکھیے عنوان شوریٰ کے تاریخی اجلاس۔

قوتِ فیصلہ پر قانونی فوقیت رکھتا ہے۔

یادداشت | اسلامی تاریخ میں صدیق اکبر کا انتخاب پہلا انتخاب تھا اس موقع پر سقیفہ کے شوریٰ میں فاروق اعظم نے عوام کو یہ اصولی تنبیہ کی تھی رفمن بایع عن غیر مشورۃ المسلمین فانہ لا بیعۃ لہ[1] اگر شوریٰ کے فیصلہ کے بغیر کسی شخص کو سربراہ حکومت بنا دیا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔ اس قانونی حکم کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اس کے بعد ہر انتخاب میں استصواب رائے عامہ اور بیعت عامہ کے بعد صدر کا تقرر عمل میں آیا اور اس تنبیہ کو مستقل قانونی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اور یہی بات اس امر کی اہم نظیر بن گئی کہ شوریٰ اسلامی حکومت کے جسم میں جان کی مانند ہے۔

شوریٰ کی قوت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ امام کی عہدہ سے علیحدگی جمہورِ اُمت کے اختیار کی چیز ہے۔ علامہ عضدالدین نے لکھا ہے کہ امام کو معزول کرنا تنہا اُمت کا قانونی حق ہے۔ سید شریف اس کی تائید میں لکھتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے کام درست طریقہ پر انجام نہ پائیں اور دین کے معاملات میں خرابی کی صورت نظر آئے تو اُمت امام کو عہدہ سے علیحدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اجتماعی نظم کے لیے امام کا تقرر بھی اُمت کا حق ہے اور معزول کرنا بھی[2]

امام کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی طاقت شوریٰ کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے اس لیے اس سے بے نیاز ہو کر کام کرنا اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ ابن عطیہ نے اس معاملہ میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ اگر صدر حکومت ماہرین علم و فن اور اُمت کے دیندار افراد کا شوریٰ طلب کیے بغیر اپنی رائے سے کام کرتا ہے تو اُس کو عہدہ سے معزول کر دینا چاہیے۔ اس پر تمام علماء قانون متفق ہیں[3]۔

شوریٰ کی یہ طاقت کیوں ہے محض اس لیے کہ امام کی ہستی مطلق العنان نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین نے اسی پر لکھا ہے کہ امام کا تقرر ایک فرض ہے جس کا تعلق سر تا سر عوام کے مفاد سے ہے[4]۔ ایک ایسی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام (المتوفی ۲۱۳ھ) (روض الانف) ج ۲ ص ۳۷۳ طبع مصر [2] المواقف مع شرح۔ ج ۸ ص ۳۵۳
[3] وحکی القرطبی عن ابن عطیہ لاخلاف فی وجوب العزل من لا یستشیر اہل العلم والدین فتح القدیر شوکانی (آل عمران) ج ۱ ص ۳۶۰ [4] رد المحتار ج ۱ ص ۵۱۱۔

حکومت جو مفادِ عامہ سے ربط و ضبط رکھتی ہے قانوناً عوام کے اختیار پر مبنی ہوگی اور ایسی حالت میں اس کے رہنما کو اعلیٰ روایت کے طور پر شوریٰ کے فیصلوں کا احترام کرنا ضروری ہوگا۔

شوریٰ اور عزم | شوریٰ کے متعلق قرآن کی دونوں آیات کو سامنے رکھنے سے بظاہر دو خیال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک جگہ حکم ہے (امرھم شوریٰ بینھم)[1] مسلمانوں کے کام آپس کے مشورہ سے انجام پاتے ہیں"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اہم فیصلے مہم معاملات اور اجتماعی امور باہمی شوریٰ، بحث و مباحثہ اور مبادلۂ آراء سے طے پاتے ہیں یہ حکم عام ہے جس کی رو سے حکومت کے صدر نشین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ شوریٰ کے بعد اپنے ذاتی رجحان یا فیصلہ پر عمل کرے اور اپنے ذاتی اختیار کو اُمت کے اختیار کردہ فیصلہ پر ترجیح دے۔

دوسری جگہ آنحضرت کے لیے خاص ربانی حکم ہے (وشاورھم فی الامر فاذا[2] عزمت فتوکل علی اللہ) اہم معاملہ میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرلیا کیجیے اور جب آپ معاملہ متعلقہ میں عزم کرلیں تو اب اعتماد خدا ہی پر رکھیے۔ ان الفاظ سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے امیر و امام کو مشورہ کرنے کے بعد اپنے عزم اپنے ذاتی فیصلے کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہے مشورہ کرنا ضروری ہے مشورہ کی پابندی ضروری نہیں۔

شوریٰ کے متعلق قرآن کے یہ دونوں حکم بنظرِ ظاہر دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ پیش کرتے ہیں مگر حقیقت میں یہ خلاف کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں نتیجہ پر پہنچنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ قرآن کی "آیت عزم" کا کیا مفہوم ہے؟ یہاں چند نکتے قابلِ لحاظ ہیں

۱۔ اس آیت میں آنحضرت کو حکم ہے کہ حکومت کے معاملات کو صحابہ کے شوریٰ میں پیش کیجیے اور شوریٰ کے بعد جب آپ عزم کریں تو خدا پر اعتماد کیجیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عزم کی پیدا ہونے والی رائے شوریٰ کے فیصلہ کی پابند ہے یا آزاد۔ قرآن میں شوریٰ کو پہلے ذکر کیا گیا ہے

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۸۶ [2] البحر المحیط ج ۳ ص ۹۸

اور عزم کو بعد میں۔ قدرتاً حکم کا منشا یہ ہے کہ پہلے شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا جائے۔ ظاہر کہ یہ اجلاس کسی مسئلہ کے فیصلہ کے لیے ہوگا۔ جب فیصلہ ہو جائیگا تو وہی عزم کی بنیاد بن جائیگا۔ اگر اہم مواقع پر شوریٰ ہوتا ہے۔ شوریٰ کے فیصلے وجود میں آتے رہیں اور صدر حکومت شوریٰ کے ہر فیصلہ کے بعد مطلق العنانی کے ساتھ یا اپنی صوابدید کے مطابق ذاتی عزم اور شخصی اختیار سے کام کرتا رہے تو شوریٰ کا کیا حشر ہوگا۔ اور اگر اس زمانہ میں نازک ترین حالات میں صدر کی تنہا رائے غلط ثابت ہو جائے اور ایک سے زیادہ مرتبہ اسی طرح غلط ثابت ہوتی رہے تو اس صورت میں خدا کے حکم کا منشا کس طرح پورا ہوگا۔ عصرِ حاضر میں جمہوریت کا لفظ ڈکٹیٹرشپ (مطلق العنانی) کے لیے بولا جاتا ہے اور جمہوریتوں کے صدر ڈکٹیٹروں کی طرح کام کرتے ہیں اگر قرآن کی رو سے صدر حکومت کو شوریٰ کے فیصلوں کو رد کرنے اور مطلق العنانی سے کام کرنے کی اجازت دے دی جائے تو اس کو کوئی شے اپنی ذاتی رائے پر عمل کرنے سے نہیں روک سکیگی۔ حالانکہ قرآن کا حکم عام بہتری کے لیے ہے اور اس میں شوریٰ کو عزم پر اوّلیت حاصل ہے۔

۲۔ آیت عزم میں بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے آنحضرت کے پیغمبرانہ احکام شوریٰ کے باوجود واجب التعمیل ہیں۔ اس آیت کی رو سے کسی صدرِ حکومت کو وہ اختیار حاصل نہیں ہو سکتا جو آپ کی ذات کو مخاطب قرار دے کر صرف آپ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ دوسری آیت میں جہاں مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کا ذکر ہے وہاں تنہا شوریٰ کو فیصلہ کن اہمیت دی گئی ہے۔ امیر کا، امیر کے ذاتی فیصلہ کا اور اس فیصلہ کو شوریٰ سے پہلے اور شوریٰ کے بعد استعمال کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے جب اس زمانہ میں اسلامی پارلیمنٹ اور صدر حکومت کے فیصلوں کے درمیان مقابلہ

ہوگا تو قرآن کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے باہمی شوریٰ کا فیصلہ واجب التعمیل ہوگا "مسلمانوں کے کام شوریٰ سے طے پاتے ہیں" یہ الفاظ قرآن میں ایک مستقل دفعہ کی صورت میں موجود ہیں ان کے خلاف کسی حکومت کا کوئی امیر حرکت نہیں کرسکتا نہ ان الفاظ میں کمی ہوسکتی ہے اور نہ ان پر اضافہ جائز ہے۔

اگر آیت عزم ہی کی دلائل کو بنیاد قرار دیا جائے تو حقیقت وہاں بھی وہی ہے جو یہاں ہے۔ حکومت کے رہنما کو ایک فیصلہ کرنے اور عزم کے مطابق عمل کرنے کی اجازت حاصل ہے لیکن یہ عزم شوریٰ کے فیصلہ کے بعد اور اس فیصلہ کے مطابق ہوگا نہ کہ مخالف مشہور محدث، مفسر اور مورخ حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی معتبر ترین تفسیر میں ابن مردویہ سے حضرت علی کی روایت کے مطابق یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا (مشاورۃ اھل الرای ثم اتباعھم)[1] پہلے اہل رائے کا باہمی مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے فیصلے کی پیروی معلوم ہوا عزم وہ ارادہ ہے جو امام کے دل میں شوریٰ کے فیصلہ پر کاربند ہونے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ارادہ شوریٰ کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ عیناً شوریٰ کے مطابق ہوتا ہے۔

شوریٰ اہم معاملات کا فیصلہ کرتا ہے اور امام رہنمائی حکومت کی حیثیت سے اس کو نافذ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ امام کا فیصلہ وہی ہو جاتا ہے جو شوریٰ کا فیصلہ ہوتا ہے۔

حجۃ الاسلام امام ابوبکر الجصاص الحنفی (المتوفی ۳۷۰ھ) آیت عزم کی تفسیر کے بعد صریح اور صاف لفظوں میں لکھتے ہیں (و فی ذکر العزیمۃ عقیب المشاورۃ دلالۃ علی انھا صدرت عن المشورۃ)[2] قرآن میں عزم کو شوریٰ کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے

---

[1] تفسیر قرآن العظیم ابن کثیر ج ۱ ص ۴۲۰۔ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۵۰ (شاورھم فی الامر)

کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہوسکتا ہے جو شوریٰ کے فیصلہ کا نتیجہ ہو اور شوریٰ سے صادر ہوا ہو۔

حافظ ابن کثیر نے بھی آیت کا ترجمہ اس طرز پر کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام کا وہی عزم اور عمل معتبر ہے جو شوریٰ کے بعد شوریٰ کے فیصلہ پر مبنی ہو۔ ان تمام تصریحات کے بعد امام کے شخصی فیصلہ کو شوریٰ کے فیصلہ پر ترجیح دینا بڑی جرأت کا کام ہے۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغام کی قوت سے فیضیاب تھے۔ آپ کو بظاہر نہ کسی مشورے کی ضرورت تھی نہ استصواب رائے عامہ کی۔ اس کے باوجود آپ کے لیے شوریٰ کو ضروری قرار دیا گیا۔ اگر نبی خدا صلی اللہ علیہ وسلم اہم معاملات میں شوریٰ کے لیے مامور تھے اور معاملاتِ حکومت میں شوریٰ کے فیصلوں پر عمل فرماتے تھے تو دنیا میں اب کبھی وہ شخص پیدا نہیں ہوسکتا جو شوریٰ کی پابندی سے آزاد ہو[۱]۔

یادداشت | مشہور محدث حاکم نے مستدرک میں حضرت علی سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت نے مشورہ کی اہمیت کو پیش کیا اور فرمایا (لوکنت مُستخلفاً احداً عن غیر مشورۃ لاستخلفت ابن ام عبد[۲]) اگر میں شوریٰ کے بغیر کسی کو خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو خلیفہ بناتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص موقع پر یہ حضور کی ذاتی رائے تھی مگر آپ نے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ آپ نامزد فرما سکتے تھے مگر آپ نے شوریٰ کے حق کو باقی رکھا۔

میمون بن مہران کا بیان ہے۔ صدیق اکبر کا تعامل یہ تھا کہ جب فیصلہ کن مرحلہ آجاتا تو وہ قانونِ الٰہی اور قانونِ نبوت سے رہنمائی حاصل کرتے اگر کوئی نظیر نہ ملتی تو اُمت کے نمائندے، سربراہ کار اور بہترین افراد کو جمع کرتے، معاملہ اُن کے سامنے پیش کیا جاتا اور اتفاقِ رائے سے جو طے ہوجاتا۔۔۔

---

[۱] السیاستہ الشرعیہ ابن تیمیہ ص ۵۔ [۲] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۱۸۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۲۲، مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۲

وہی فیصلہ نافذ ہوتا[۱]۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہم مواقع پر فیصلہ کا حق اُمت کے صالح اور صلاحیت مند افراد کو حاصل ہے[۲]۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ بعض صحابہ نے فاروق اعظم حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی بات اللہ کی کتاب اور رسول کے قانون میں نہ ملے تو ہم کیا کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جس طرف رائے دینے والے اصحاب کی کثرت ہو اس پر عمل کرو۔

جناب ابن عمر جابر بن زید کو ہدایت کرتے ہیں کہ اگر تم نے قرآن اور قانون نبوت کو چھوڑ کر اپنی رائے پر عمل کیا تو خود ہلاک ہو گے اور دوسروں کو ہلاک کرو گے[۳]۔ اس سے زیادہ اہم حضرت علیؓ کی روایت ہے۔ وہ دربار رسالت میں حاضر ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اگر ہم کوئی چیز (کتاب وسنت) میں نہ پائیں تو کیا کریں حضور اکرم فرماتے کہ قانون جاننے والے عبادتگذار مسلمانوں سے مشورہ کرو۔ پھر یہ ہدایت ہوتی ہے (لاتمضوا فیہ رائے خاصۃ) ایسے موقع پر کسی شخص کی انفرادی رائے کو جاری نہ کرو[۴]۔

یہ تمام روایتیں رائے عامہ کے قانونی اقتدار کے حق میں فیصلہ دیتی ہیں۔ اور ان کی بنا پر قرآن کے مفہوم ومقصد کو معین صورت میں پیش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان تمام روایتوں کا منشار ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے دائرہ میں فیصلہ کا انحصار کسی ایک انسان کے عزم وعمل پر نہیں بلکہ رائے عامہ پر ہے جس کی رہنمائی امیر کا مشورہ کرتا ہو۔

شوریٰ کے متعلق تاریخی تعامل

اسلامی پارلیمنٹ اور صدر حکومت کے اختیار کی صحیح حیثیت دریافت کرنے کے

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵۱ [۲] ایضاً ص ۵۲ (کلام الصحابہ فی الرائے)

[۳] دائرۃ المعارف - وجدی ج ۲ ص ۳۰۹

[۴] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۲۰ مجمع الزوائد

لیے اسلامی تاریخ آخری عدالت ہے جس کا فیصلہ بہرصورت مستند قرار پائیگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ نبوت میں پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طرزِ عمل رہا اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی حکومت کے صدر نشین اصحاب نے اس مسئلہ خاص میں کس حکمت عملی سے کام لیا۔

عہد رسالت پر ایک پاک بیں نظر ڈالنے سے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ آنحضرت حکومت کے ہر اہم معاملہ میں شوریٰ طلب فرماتے تھے۔ صورت حال کا تعلق دین کی مصلحتوں سے ہوتا یا دنیا کے مفاد سے۔ گھر کے وقائع سے ہوتا یا شخصی حوادث سے، صحابۂ کرام آنحضرت کو مشورہ کے لیے بیچین پاتے تھے۔ شوریٰ کے متعلق پیغمبرِ اعظمؐ کی یہ سرگرمی اور گرمجوشی درحقیقت خدا کے حکم کی آئینہ دار تھی، شوریٰ کا تعلق امرِ الٰہی سے تھا اور امرِ الٰہی کی تعمیل کے لیے ایسی ہی سرگرم سعی کی ضرورت تھی۔

یادداشت | اسلامی تاریخ میں حادثہ افک ایک دردناک واقعہ تھا حضور کی پاکدامن رفیقۂ حیات پر بہتان تراشا گیا۔ آنحضرت نے اپنی عائلی زندگی کے اس مخصوص معاملہ میں بھی حضرت علیؓ حضرت اسامہ اور عام مسلمانوں سے مشورہ کیا، اور یہ ثابت فرمایا کہ زندگی کے عام تعامل میں بھی شوریٰ مفید ہو سکتا ہے[۱]۔

آنحضرت نے ایک فرد اور ایک سے زیادہ افراد کے مشورہ کو قانونی اہمیت دی۔ آپ نے فرمایا اگر جماعت کا فرد اپنے بھائی سے مشورہ کرے تو مشورہ دینا اس کی ذمہ داری میں داخل ہو جاتا ہے[۲]۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ سے ارشاد ہوا کہ اگر تم دونوں کا مشورہ ایک ہو جائے تو میں اس کے خلاف نہیں کرونگا۔

بدر کے محاذ پر حضور اکرم ایک جگہ خیمہ زن ہوئے۔ خباب بن منذر نے دوسری جگہ محاذ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے ذاتی عزم کر لینے کے باوجود مشورہ کو قبول کیا اور ترجیح دی[۳]۔ ۵ہجری میں حضرت سلمان

---

[۱] طبری ج ۳ ص ۱۸ ۔ تاریخ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۶۰ - ۱۶۲ -

[۲] ابن ماجہ عن جابر اذا استشار احدکم الخ

[۳] روض الانف سہیلی ج ۲ ص ۱۸۷ -

نے حملہ آوروں کے خلاف مدینہ سے باہر خندق کھودنے کا مشورہ دیا جس کی منظوری عمل سے دی گئی۔ اس محاذ پر آنحضرت یہ عزم کر چکے تھے کہ قبیلۂ غطفان سے صلح کر لی جائے تاکہ مدینہ کا محاصرہ کرنے والا لشکر کم ہو جائے لیکن سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے معاہدہ صلح کے خلاف مشورہ دیا۔ آنحضرت نے اپنے عزم پر عمل کرنے کی جگہ سعدین کے مشورہ پر عمل فرمایا[1] اور مجوزہ معاہدہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ۶ھ میں آپ نے بحیثیت پیغمبر مکہ معظمہ کا عزم فرمایا۔ پیغمبرانہ کاموں میں شوریٰ کا کوئی دخل نہ تھا لیکن حضور نے وحی الٰہی سے پہلے سفر حدیبیہ کے متعلق شوریٰ طلب کیا اور اس کے فیصلہ کے بعد سفر کا عزم فرمایا۔[2]

ان نظائر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم شخصی اور اجتماعی زندگی کے ہر مرحلہ پر شوریٰ کے شاندار تعامل، انسانی ضمیر کی آزادی اور رائے عامہ کے حقوق کا کس درجہ خیال رکھتے تھے۔ اگر آنحضرت امت کے قابل افراد کی رائے کو اس درجہ دارائے اہمیت قرار دیتے تھے تو اس سے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی جولانگاہ میں اجتماعی شوریٰ کا فیصلہ قائد حکومت کے لیے کتنا اہم اور کس قدر واجب التعمیل ہوگا"

شوریٰ کے تاریخی اجلاس

ذیل میں شوریٰ کے نمایاں اجلاسوں کی کارروائی درج کی جاتی ہے۔ یہ وہ چند نمونے ہیں جو شوریٰ اور امام کے اختیارات کے لیے معیار و منہاج ہیں کیونکہ ان سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عہد نبوت اور عہد خلافت میں شوریٰ ہی کے فیصلوں کو ترجیح کا حق دیا جاتا تھا

---

[1] غطفان کے سرداروں کے نام عیینہ بن بدر اور حرث بن عوف۔ (شرط صلح) مدینہ کی تہائی پیداوار پر جنگ سے علیحدگی۔ (سعدین کا جواب) اس معاہدہ کی کوئی ضرورت نہیں ہم ان کو تلوار کے علاوہ کچھ نہ دینگے۔ دیکھو سیرۃ ابن ہشام غزوہ خندق۔ روض الانف ج ۲ ص ۱۹۱۔ احکام القرآن ج ۲ ص ۴۹۔

[2] سیاق البخاری لعمرۃ الحدیبیہ (ابن کثیر ج ۴ ص ۱۷۰) کتاب المغازی۔

۱۔ **شورائے بدر الکبریٰ** (سنہ ۲ھ) اسلام کے دشمن اسلامی قوت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے جو جارحانہ اسکیمیں تیار کر رہے تھے اُن کا فیصلہ جن میدانوں میں ہوا اُن میں بدر کا میدان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آنحضرت مدینہ سے روانہ ہوئے، عقیق، ذوالحلیفہ، ذات الجیش وادی ذفران سے گذر کر خیمہ زن ہوئے، جانباز اصحاب کا لشکر ساتھ اور دشمن اپنے محاذ پر نقل و حرکت میں مصروف تھا۔

اس اہم اور نازک موقع پر آپ نے شوریٰ منعقد کیا۔ مجلس کا افتتاح ان الفاظ سے فرمایا (اشیروا علیّ ایّھا الناس) آپ سب لوگ مجھ کو یہ مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیے" اس کے بعد عام بحث شروع ہوئی حضرت ابوبکر صدیق کھڑے ہوئے انہوں نے ایک اعلیٰ درجہ کی تقریر کی۔ حضرت عمر بن الخطاب کھڑے ہوئے اور انہوں نے بہترین تقریر کی۔ اس کے بعد حسب ذیل تقریریں سُنی گئیں

"مقداد بن عمرو" یا رسول اللہ۔ خداوند برتر کی رہنمائی جس طرف ہو اسی طرف چلیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم ہم موسیٰؑ کے حواریوں کی طرح یہ نہ کہینگے کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو۔ (ہم آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے چار طرف لڑینگے) ہم برک غماد تک جائینگے اور ہرگز آپ کا ساتھ نہ چھوڑینگے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کی عمومیت پر زور دیا اور سب کی طرف عام خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی رائے بیان کرے۔ چونکہ اس وقت انصار کی اکثریت تھی اس لیے آپ نے دوبارہ توجہ دلائی۔ چنانچہ انصار کے سردار سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے

سعد:۔ یا رسول اللہ۔ ہم آپ کی اطاعت کا اور وفاداری کا عہد کر چکے ہیں۔ جس طرف مرضیِ

مبارک ہو چلیے۔ اگر آپ ہم کو سمندر میں جست لگانے کا حکم دینگے تو قسم بخدا ہم ضرور اس میں آپ کے ساتھ کود جائینگے، ہم میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہیگا۔"[1]

اِن تقریروں سے جنگ کے حق میں فیصلہ ہوگیا اور اس کی تعمیل میں اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم مل گیا۔ اس جنگ میں تین سو تیرہ مسلمانوں نے ایک ہزار دشمنوں کے مقابلہ میں فتح عظیم حاصل کی۔ جنگ کے بعد جنگی قیدیوں کے متعلق بھی شوریٰ منعقد ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظمؓ نے نمایاں طور پر اپنی رائیں پیش کیں اور اس سے ایک اور نظیر قائم ہوگئی۔[2]

۲۔ شورائے اُحد ۳ھ ۔ اُحد پہاڑ کے میدان میں شوال ۳ھ ہجری میں معرکہ کارزار گرم ہوا تھا۔ اس موقع پر آنحضرت نے اپنے اصحاب کا شوریٰ منعقد کیا۔ تین ہزار دشمنوں کے مقابلہ میں صرف ایک ہزار مسلمان تھے۔

آنحضرت نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا، اس وقت جنگ کی اسکیم کے دو پہلو ہیں ہمارا لشکر مدینہ سے باہر نکل کر جنگجو دشمنوں کو روکے یا مدینہ میں انتظار کیا جائے۔ جب وہ حملہ آور ہوں تو حملہ کا جواب دیا جائے۔ آنحضرت کی رائے یہ تھی کہ شہر میں دشمن کا انتظار کیا جائے۔

عبداللہ ابن ابی نے تقریر کرتے ہوئے کہا میں نبی اکرمؐ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ ہمیں شہر سے باہر نہ نکلنا چاہیے۔

"مسلمانوں کی اکثریت" نے پرزور انداز اختیار کر کے کہا: یارسول اللہ ہمارے ساتھ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ (واقعہ بدر الکبریٰ) ص ۶۱-۶۴۔ تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۲-۲۶۳۔

[2] الیضاح ج ۳ ص ۲۹۶۔ عن حسن۔ استشاد رسول اللہؐ فی الاساریٰ۔ یوم بدر

دشمنوں کی صفوں کی طرف چلیے اور ہماری کمان اپنے ہاتھ میں لیجیے۔" ابن ابیؓ نے اپنی رائے پر اصرار کیا اور کہا یا رسول اللہ ہرگز بیرونی محاذ پر نہ جائیے۔ اگر ہم باہر نکلے تو شکست ہوگی اور شہر میں رہ کر لڑے تو فتح ضرور ہوگی۔ شوریٰ کی اکثریت نے جواب میں باہر نکلنے پر زور دیا۔ چونکہ یہ خالص اجتماعی معاملہ تھا اور آنحضرت اُمت کے کاموں کو اُمت کے عام فیصلہ کے مطابق انجام دیتے تھے اس لیے آپ نے شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ فوجی لباس پہنا اور باہر نکل کر رہنمائی کرنے کا عزم کر لیا۔ آپ کی ذاتی رائے یہ نہ تھی مگر آپ نے اپنے عزم کی جگہ شوریٰ کے فیصلے کو اختیار فرمایا۔ اس فیصلہ کے فوراً بعد اصحابؓ کو کچھ خیال پیدا ہوا اور اُنھوں نے عرض کیا۔ اگر آپ اپنی رائے پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو اس پر عمل کیجیے۔ شوریٰ کا فیصلہ ہو چکا تھا، آپؐ عزم کر چکے تھے اور مرحلہ تھا خدا کے توکل کا اس لیے آپ نے فرمایا جب پیغمبر اپنی اُمت کے لیے فوجی لباس پہن لیتا ہے تو اُس کے لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ وہ محاذِ جنگ پر اپنا فرض انجام دینے سے پہلے اپنی وردی اور اسلحہ اتار دے[1] چنانچہ آنحضرت میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے، محاذ قائم ہوا، جنگ ہوئی اور چند لوگوں کی غلطی سے پہلے حملہ میں کچھ شکست بھی ہوئی اور اس کے نتیجہ میں آنحضرت کے دانت بھی شہید ہوئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر آنحضرت نے شاورھم فی الامر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شوریٰ کے فیصلہ پر عمل جاری رکھا۔ اور اپنے ذاتی فیصلہ پر ذرا زور نہیں دیا۔

۳۔ شوریٰ سقیفہ بنی ساعدہ (سنہ ۱۱ھ) پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں شوریٰ کے متعلق جس عظیم الشان حکمت عملی پر عمل کیا تھا۔ خلافت راشدہ کے بہترین دورِ حکومت میں ہو بہو اس کی پیروی کی گئی۔ خدا کے رسولؐ کے بعد خدا کے نکو کار بندوں کو

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۳ و ۲۳

پہلی مرتبہ سقیفہ کے شوریٰ میں جمع ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

آنحضرت کا وصال اسلام کے نظام اجتماعی کے لیے سب سے بڑا حادثہ تھا۔ یہ اولین موقع تھا جب صحابۂ کرام کو اپنے فرض کی تکمیل کرنی تھی، انسانی بصیرت تاریخ کے صفحات پر ان کے فیصلہ کی منتظر تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ پیغمبر اسلام کے بعد شہنشاہیت قائم کرتے ہیں یا مطلق العنان آمریت (جابرانہ ڈکٹیٹرشپ) یا خدا کے حکم کے مطابق شوریٰ کے فیصلے اور اُمت کے اختیار پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

صحابہ نے شوریٰ کو ترجیح دی۔ یہ پہلی حقیقی پارلیمنٹ تھی جس میں خدا کی حکمبردار قوم کے بہترین دماغوں نے مل کر شوریٰ کے قانون پر عمل کیا۔ اس موقع پر ان کے لیے یہ بات غیر معمولی طور پر اہم تھی کہ آنحضرت نے اسلامی تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلہ پر اپنے عزم اور ذاتی فیصلہ سے کسی کو قائد الحکومت مقرر نہیں کیا بلکہ سب کچھ اُمت کے اختیار پر چھوڑ دیا ہے۔

حضور کے وصال کے بعد حضرت عباسؓ نے مجمع عام میں دریافت کیا حضرات! کیا آپ میں سے کوئی جانتا ہے کہ آنحضرت نے کسی شخص کو حکومت کے لیے نامزد کیا ہے سب نے کہا "نہیں" صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم سے بھی یہی سوال کیا، اُنھوں نے بھی یہی کہا کہ "نہیں" اس بحث سے اُمت کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت نے اس معاملہ کو اُمت کی رائے عامہ کے سپرد کر دیا ہے۔

آخر معاملہ شوریٰ کے سامنے پیش ہوا۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اور صدیق اکبرؓ کے انتخاب سے پہلے جب کسی کا اختیار نہ تھا تو شوریٰ ہی کا اختیار بحال تھا۔ اس موقع پر جو بے لاگ صاف صاف بحثیں ہوئیں اور اُن سے اصل مقصد کو تقویت حاصل ہوئی

اس کی مثال اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس شوریٰ کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ "سعد بن عبادہؓ": انصار کو اسلام لانے کا جو شرف ہے وہ عرب میں کسی کو حاصل نہیں جب مسلمان کمزور تھے تو انصار نے ان کو قوت بہم پہنچائی اس لیے خلافت انصار کا حق ہے۔

"انصارؓ":۔ آوازیں۔ تمہاری رائے صحیح ہے۔

"صدیق اکبرؓ": مہاجرین اسلام لانے میں شرف سبقت رکھتے ہیں۔ عرب کے قبائل کی رائے عامہ قریش پر ہی جمع ہو سکتی ہے۔ تم ہمیں بیحد محبوب ہو۔ تمہاری عزت پر ہمیں رشک نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم عمرؓ یا ابو عبیدہ کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔

"عمرؓ اور ابو عبیدہؓ": نہیں نہیں۔ تم سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔

"انصار":۔ ہمیں ابو بکرؓ کی عظمت کا اعتراف ہے ہم کو مہاجرین سے دلی محبت ہے۔ خلافت کے معاملہ میں ہماری خواہشیں صرف اسلام کی قوت کے لیے ہیں۔ اس لیے دو امیر مقرر کیے جائیں، ایک انصاری دوسرا مہاجر۔

"صدیق اکبرؓ": انصار مہاجرین اولین کے بعد سب سے افضل ہیں اس لیے مناسب یہ ہے کہ امارت کے لیے مہاجرین میں سے انتخاب کیا جائے اور انصار وزراء مقرر ہوں۔ اور تمام کام شوریٰ سے طے پائیں۔

"حباب انصاریؓ": معشر انصار، اپنی جگہ مضبوط رہو۔ خلافت تمہارا حق ہے۔ یہ نہ ہو تو دو امیر مقرر کیے جائیں۔

"عمر فاروقؓ": نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ عرب کی رائے عامہ تمہاری امارت پر جمع نہیں ہوگی۔

"خباب": انصار! خدا کی قسم تم خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہو۔

"ابوعبیدہ": جماعت انصار۔ تم پہلے تھے جنھوں نے دین کو قوت دی اب تم دین کو کمزور کرنے میں پہل نہ کرو۔

یہ بحث جاری رہی آخری تقریر نے فیصلہ کر دیا۔

"بشیر بن سعد انصاری": اے انصار۔ بیشک ہم نے اسلام قبول کرنے میں اور راہ جہاد میں فضیلت حاصل کی ہے لیکن اس کی بنا پر ذاتی حقوق پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔ خدا سے ڈرو اور مخالفت سے دست بردار ہو جاؤ۔

بشیر بن سعد کی تقریر نے شوریٰ کو فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچا دیا۔ انصار اسلامی سوسائٹی کے اتحاد کی خاطر ایثار پر تیار ہو گئے۔ شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق صرف ایک ووٹ کے اختلاف سے صدیق اکبر کا انتخاب عمل میں آیا اور مسجد نبوی میں بیعت عامہ کی مبارک رسم عمل میں لائی گئی[1]۔

یہ ہے وہ تفصیل جو شوریٰ اور عزم کے باہمی تعلق کو قطعی صورت میں پیش کرتی ہے۔ اگر عزم کو مبینہ اہمیت حاصل ہوتی تو آنحضرت ضرور اپنا شخصی فیصلہ صادر کرتے۔ صدیق اکبر امت میں بہترین ہستی تھی۔ آپ کے بعد وہ اپنے فیصلہ سے امین الامۃ ابوعبیدہ کو یہ عہدہ دے سکتے تھے لیکن اتنے زبردست موقع پر اس طرح کے اہم معاملہ کا مجرد شوریٰ کے حوالہ ہونا اور شوریٰ سے طے پانا یہی اس امر کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے معاملات حکومت میں شخصی عزم

---

[1] سیرۃ ابن ہشام مع حاشیہ (روض الانف ج ۲) ص ۴۰۲، ۳ امر سقیفہ بنی ساعدہ، تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۲۳، ۱۲۶، تاریخ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۴۵۔

پر فیصلوں کا مدار نہیں بلکہ شوریٰ پر ہے۔

۴۔ دوسرا انتخابی شوریٰ (۱۳ھ) حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخاب کو تین مرحلوں سے گذرنا پڑا (۱) نامزدگی بصورت تجویز (۲) شوریٰ (۳) استصواب رائے عامہ۔

اس زمانہ کا علمی رجحان فاروق اعظم کے انتخاب کے متعلق زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ آج کی دنیا پہلی صدی ہجری سے تیرہ سو سال کی مسافت پر آباد ہے۔ زمانہ کے اس بُعد نے عصر جدید کے علمی دماغوں کو یہ فرض کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ فاروق اعظم کا تقرر صدیق اکبر کے شخصی فیصلہ اور قطعی اختیار کی بنا پر عمل میں آیا ہے اور اس میں امت کے شوریٰ اور جمہور کی رائے کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ رائے پیغمبر اعظم کے جانشینوں کے متعلق ایک بڑی جسارت ہے جس کو آسانی سے گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

صدیق اکبرؓ کو ہر شخص سے زیادہ یہ معلوم تھا کہ "شوریٰ" خدا کا حکم ہے۔ اِن کا انتخاب بجائے خود شوریٰ سے ہوا تھا۔ فاروق اعظم پہلے شخص تھے جنہوں نے اس موقع پر یہ اعلان کیا تھا (لا خلافۃ الا عن مشورۃ) شوری کے بغیر منصب خلافۃ کا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ علم و تحقیق کی دنیا میں یہ تسلیم کرنا دشوار ہے کہ صدیق اکبر چند ہی دن کے بعد اُس قانون کو بھول گئے جس کی بنا پر ان کا انتخاب ہوا تھا اور فاروق اعظم نے دو ہی سال کے بعد یہ گوارا کر لیا کہ ان کے تقرر میں اصولِ شوریٰ کو نظر انداز کر دیا جائے (عیاذاً باللہ)

فاروق اعظم کا تقرر شوریٰ سے ہوا ہے یا صدیق اکبر کے منفرد شخصی فیصلہ سے۔ اس کا جواب صورتِ انتخاب سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ انتخاب تین منزلوں سے نکل کر مکمل ہوا تھا۔

۱۔ تجویز نامزدگی۔ اس انتخاب میں سب سے پہلے صدیق اکبرؓ نے فاروق اعظم کا نام تجویز کیا۔ (اسلامی قانون میں اس کا نام تجویز استخلاف ہے) یہ حکم نہ تھا بلکہ خلیفۃ المومنین کی رائے کا مطالبہ اور جانشین حکومت کے لیے ذاتی تجویز تھی۔[1]

۲۔ شوریٰ۔ صدیق اکبرؓ نے دوسرے مرحلہ پر مسلمانوں کا شوریٰ طلب کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، سعید بن زیدؓ، ابوالاعورؓ، اسید بن حضیرؓ اس شوریٰ کے ممتاز افراد تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن کو رائے عامہ اپنا نمائندہ سمجھتی تھی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ جب مجوزہ نام عام شوریٰ میں پیش ہوا تو رائیں صاف طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں[2]۔ کچھ لوگ اس کے حامی تھے اور کچھ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ مخالفین نے کہا کیا آپ ہماری امارت کی زمام ایک سخت گیر انسان کو دینا چاہتے ہیں۔ آپ خدا کو کیا جواب دینگے۔ صدیق اکبرؓ نے جواب دیا میں کہونگا کہ میں نے منصب امارت کے لیے تیرے انسانوں میں سے بہترین آدمی کو مسلمانوں کا امیر بنایا ہے۔ امیر ہونے کے بعد اس کی یہ سخت گیری ختم ہو جائیگی۔

۳۔ استصواب رائے عامہ۔ صدیق اکبرؓ نے شوریٰ کے بعد مجوزہ نام کو رائے عامہ حاصل کرنے کے لیے عوام کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے مکان کے جھروکے سے ان الفاظ میں لوگوں کو مخاطب کیا۔

---

[1] مورخ ابن اثیر نے زید بن وہب سے حضرت علی کا یہ بیان درج کیا ہے کہ "صدیق اکبر نے زندگی کے آخری لمحات میں یہ رائے قائم کی کہ منصب حکومت کے لیے عمرؓ کی ہستی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اُن کی رائے تھی اُنہوں نے حکومت کو خاندانی میراث نہیں سمجھا ورنہ وہ اپنے بیٹے کو امیر نامزد کرتے۔ چنانچہ اُنہوں نے مسلمانوں کا شوری طلب کیا۔ شوریٰ کی رائے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی کچھ موافق، کچھ مخالف۔" اسد الغابہ۔ ذکر صدیق اکبر

[2] اسد الغابہ ابن اثیر ج ۴ ص ۶۸ (عمرؓ) واستشار المسلمین فی ذلک فمنہم من رضی ومنہم کرہ ... وشاور من ... المہاجرین والانصار ص ۶۹۔

"لوگو! میں نے نامزدگی کے ذریعہ سے ایک شخص کا نام طے کیا ہے (افترضون به) کیا آپ لوگ اس کے حق میں ووٹ دیتے ہیں۔ تجویز پر غور کرنے کے بعد سب لوگوں نے کہا (قد رضینا) ہم سب کی مرضی عامہ اس تجویز کو منظور کرتی ہے۔ صرف حضرت علیؓ نے للکار کر کہا۔ ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ کسی دوسرے کا نام منظور نہیں کر سکتے۔[1]"

مندرجہ بالا تینوں منزلوں سے گذرنے کے بعد یہ انتخاب مکمل ہوا اور فاروق اعظم منصب خلافت پر فائز ہوئے۔

غلط اندیشی کی بنیاد جو دماغ زمانۂ حال میں اس انتخاب کو صدیق اکبر کے ذاتی فیصلہ کا نتیجہ تصور کرتے ہیں اُن کو انتخاب کے تینوں پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو پر قناعت نہیں کرنی چاہیے۔ ایک شخص کا نام تجویز کرنے اور حکم جاری کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر اس فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو خیالات کی بنیاد لازماً غلط ہو جائیگی۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ صدیق اکبرؓ نے نام پہلے تجویز کیا اور شوریٰ بعد میں طلب کیا حالانکہ شوریٰ امام کے عزم پر مقدم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بعنوان عزم نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی خیرسگالی کے لیے ایک رائے تھی جس کا نفاذ شوریٰ کی بحث، متفقہ فیصلے اور جمہور کی عام منظوری کے بعد عمل میں آیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صدیق اکبر پہلے شوریٰ طلب کرتے اور اس کے بعد اپنے فیصلے کا اعلان کر دینے پر کفایت کرتے۔

یادداشت صدیق اکبر سے زیادہ کوئی شخص اس امر سے واقف نہ تھا کہ شوریٰ خدا کا حکم ہے۔ اور منصب خلافت کا تعلق جمہور کی مرضی عامہ سے ہے۔ یہ وہ بات تھی جس کا علم خود آنحضرت کی زبان سے ہو چکا تھا۔[2]

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۶۹، ۷۰۔ حدثنا داؤد بن عمرو تاریخ الامم والملوک طبری ج ۴ ص ۵۱، ۵۲۔

[2] عن علی (قال ان تومروا ابا بکر الخ) رواہ احمد والبزاز والطبرانی فی الاوسط ورجال البزاز ثقات، مجمع الزوائد کتاب الخلافۃ ج ۵ ص ۱۷۶۔

ایک مرتبہ حضرت علی نے حضور سے دریافت کیا (یا رسول اللہ من نؤمر؟) یا رسول اللہ ہم کس کو امیر بنائیں؟" جواب میں ارشاد ہوا اگر تم (اجتماعی حیثیت میں) ابوبکر کو امیر مقرر کروگے تو اُن کو امانت بردار، دنیاداری سے دور اور آخرت کا دلدادہ پاؤگے، اگر عمر کو مقرر کروگے تو اُن کو طاقتور امانت کا اہل، اور اللہ کے معاملہ میں ملامت سے بے پرواہ دیکھوگے اور اگر علی کو مقرر کروگے تو وہ تم کو صراطِ مستقیم پر لیجانے والے رہنما کا کام دینگے۔[۱]

یہ سوال اور اس کا جواب دونوں اس امر پر شاہد ہیں کہ حکومت کے اہم معاملہ کا فیصلہ کرنا کسی ایک شخص کے دائرہ اختیار سے باہر ہے بلکہ اس کا طے کرنا جمہور کے باہمی فیصلہ پر منحصر ہے آنحضرت نے اس حدیث میں مسلمانوں کو خطاب کرکے یہ فرمایا ہے کہ امیر بنانے والے اسلامی سوسائٹی کے تمام ارکان ہیں یہ نہیں اجازت دی کہ امیر وقت لوگوں کی رائے لے کر اپنے ذاتی عزم سے حکومت کے رئیس امام کو مقرر کردیا کرے۔ صدیق اکبر اس فرمان سے باخبر تھے کیا یہ ممکن ہے کہ جو بات پیغمبر اعظم کی طرف سے علم میں لائی جاچکی ہے صدیق اکبر اس کی خلاف ورزی کرتے۔ یہ وہ بات ہے کہ مسلمان جس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

۳۔ تیسرا انتخابی شوریٰ (۲۳ھ)۔ فاروق اعظمؓ کے بعد حضرت عثمان ذی النورینؓ اسلامی حکومت کے قائد اعلیٰ (امام) منتخب ہوئے پہلے انتخابات کی طرح یہ انتخاب بھی شوریٰ کے فیصلہ اور رائے عامہ کی منظوری سے تکمیل پذیر ہوا۔ فاروق اعظم نے (مجوسی غلام) ابولولو کے خنجر سے زخمی ہونے کے بعد سب سے پہلے مجلس شوریٰ کے ارکان کا انتخاب کیا اور فرمایا میں اپنے اختیار سے کسی شخص کو نامزد نہیں کرونگا بلکہ جمہور صحابہ میں سے وہ

---

[۱] عن علی۔ (قال ان تومروا ابا بکر الخ) رواہ احمد والبزاز والطبرانی فی الاوسط ورجال البزاز ثقات۔ مجمع الزوائد کتاب الخلافۃ ج ۵ ص ۱۷۶۔

اصحاب اس کے زیادہ مستحق ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر خوش رہے
اس زمانہ میں رائے عامہ کے اعتماد کا اہم عنصر آنحضرت کی مرضی تھی اس لیے آپ نے
اسی کا لحاظ فرمایا۔ جب حالت نازک ہوگئی تو امیر المومنین نے امامت کے تمام اختیارات
سے دستبرداری دے دی اور حضرت عائشہ کو یہ اطلاع دے دی کہ میں آج سے امیر المومنین
نہیں ہوں۔ اور یہ بھی طے کردیا کہ عبوری دور میں شوریٰ کو اختیارات حاصل ہونگے۔

آپ نے عام مسلمانوں کو مجلس شوریٰ کے ارکان کے ناموں کی اطلاع دی اور یہ بھی
بتایا کہ ان کے انتخاب میں وہ اصول کارفرما ہے جس پر جمہور اُمت کا اتفاق ہے۔ ارکان شوریٰ
میں یہ حضرات تھے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت عبدالرحمٰن
بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ

یادداشت | صورت انتخاب۔ فاروق اعظم نے منصب خلافت کے متعلق طے کیا کہ پہلے چھ اصحاب میں سے کسی
ایک کو منتخب کرلیا جائے، عبداللہ بن عمر کو محض مشورہ دینے کا حق ہوگا۔ خلافت کے منصب سے کوئی تعلق
نہ ہوگا۔ فیصلہ اکثریت کے مطابق ہوگا۔ اگر رائیں برابر ہونگی تو عبداللہ بن عمر فیصلہ کن ووٹ دینگے۔ اگر ارکان
شوریٰ ان کے فیصلہ کو منظور نہ کریں تو اُمت کو اس جماعت کی رائے منظور کرلینی چاہیے جس کے ساتھ
عبدالرحمٰن بن عوف ہوں۔ میرے بعد تین دن کے اندر کسی ایک شخص کو منتخب کرلیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ چوتھا
دن آجائے اور تم پر کوئی اُمیر نہ ہو۔

امیر المومنین نے ایک ایک لمحہ کے بعد ایسی ہدایتیں دیں جن کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ
مفاد عامہ اور مرضی عامہ بنیادی شے ہے۔ آپ نے مجلس شوریٰ کے منتخب ارکان سے فرمایا کہ تم کو صرف
اس لیے رکن قرار دیا گیا ہے کیونکہ تم عوام الناس کی نظر میں ان کے قائد اور سردار ہو اور اس لیے منصب
خلافت کو تمہارے دائرہ میں محدود[1] کیا گیا ہے۔ آخر میں یہ ہدایت کی "جب مجوزہ ضابطہ کے مطابق اُمت

[1] تاریخ طبری ج ۵ ص ۳۴۔ انی نظرت فوجدتکم رؤساء الناس وقادتہم الخ

کے عام افراد ایک فیصلہ پر جمع ہو جائیں اور اس کے بعد کوئی جماعت نافرمانی کرے تو اُس کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے[1]۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مجھے رائے عامہ کی طرف سے اطمینان ہے۔ وہ تم پر بے اعتمادی نہ کریگی کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر تم لوگوں سے خوش رہے ہیں لیکن مجھے یہ خطرہ ضرور ہے کہ تم میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں رائے عامہ بھی اختلاف سے دو چار ہو جائے[2]۔ امیرالمومنین نے مجوزہ اصحاب میں سے بعض افراد کو خاص طور پر یہ ہدایت کی تم اپنے خاندان کے افراد کو عوام الناس کی گردن پر مسلط نہ کر دینا[3]۔ اور اپنے ہونے والے جانشین کے متعلق فرمایا:" اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ عوام پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ اس کو مہاجرین، انصار، اہل عرب، فوج کے عام سپاہیوں اور اسلام کے شہریوں کے حق کو محسوس کرنا چاہیے۔ سرمایہ داروں سے زائد مال لے کر عام غریبوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیے[4]۔

شوریٰ اور استصواب رائے عامہ

شوریٰ کے ارکان فاروق اعظم کے مجوزہ ضابطوں کے مطابق ایوان مشاورت میں جمع ہوئے اُنھوں نے گرم گرم بحثیں کیں اور یہ سمجھ لیا کہ ان کا فیصلہ عام شوریٰ سے منظوری حاصل کیے بغیر قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ شوریٰ کے بعد حضرتِ عبدالرحمن بن عوف کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے تدبر سے حضرت علی اور حضرت عثمان میں سے کسی ایک کے لیے اُمت کی رائے عامہ کا فیصلہ حاصل کریں۔ اُنھوں نے اُمت کے تمام افراد کو رائے دہی کا حق دیا اور پہلے دونوں منتخب اشخاص سے گفتگو کی اس کے بعد استصواب رائے عامہ کا اعلان کیا۔ اس موقع پر برگزیدہ لوگوں، فوج کے کمانڈروں

---

[1] تاریخ طبری ج ۵ ص ۳۵ (واقتلوا الباقین ان رغبوا عما اجتمع علیہ الناس الخ) [2] ایضاً ص ۳۴۔
[3] الفتوحات الاسلامیہ (دحلان) ج ۲ ص ۴۲۱ (قال لعثمان لا تحملن بنی معیط علی رقاب الناس الخ)
[4] اسد الغابہ ابن اثیر ج ۴ ص ۳۸۱۔

فوجی دستوں، عام سپاہیوں، افراد اور جماعتوں، عورتوں اور بچوں اور مدینہ آنے جانے والے مسافروں سے رائے لی گئی۔ تین دن اور تین رات مسلسل رائے لینے کے بعد دو راؤں کے اختلاف سے حضرت عثمانؓ کے نام کا اعلان ہوا۔[1] اس طرح تیسری مرتبہ بھی یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کے امیر اور عوام نے شوریٰ کی پابندی کی اور شوریٰ کا طریقہ بھی وہ اختیار کیا جو موجودہ ترقی یافتہ ممالک میں صدیوں بعد جاری ہوا ہے اور جس سے برطانوی پارلیمنٹ آج تک محروم ہے۔

جو اصحاب یہ سمجھتے ہیں کہ منصبِ خلافت کے انتخاب میں فاروق اعظم کے ذاتی اختیار کا زبردست دخل تھا۔ انھیں ان کی مندرجہ ذیل تین ہدایتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

(ا) لاخلافۃ الاعن مشورۃ۔ خلافت کا قیام اس وقت تک ناجائز ہے جب تک شوریٰ کا فیصلہ نہ ہو (کنزالعمال)

(ب) من بائع عن غیر مشورۃ المسلمین فانہ لابیعۃ لہ۔ جو عام مسلمانوں کے شوریٰ کے بغیر کسی شخص کو امیر قرار دے کر بیعت کریگا تو یہ بیعت کالعدم ہوگی۔[2]

(ج) فان الخلافۃ شوریٰ فی ھؤلاء الرھط الستۃ الذی توفی رسول اللہ وھو عنھم راضی۔ خلافت کا فیصلہ ان چھ افراد کی مجلس شوریٰ کریگی جن سے زندگی بھر آنحضرتؐ خوش رہے۔[3] (یہ الفاظ اُس وقت فرمائے جب عوام نے آپ سے یہ درخواست کی کہ امیر المومنین منصب خلافت کا فیصلہ اپنے ذاتی اختیار سے فرمائیں)

امیر المومنین کی یہ تینوں ہدایتیں اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ فاروق اعظم اصولاً شوریٰ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر دمشقی، ج ۷، ص ۱۴۵۔ ۱۴۶، سیلا تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۴ و ۳۹۔
[2] سیرۃ ابن ہشام، روض الانف ج ۲ ص ۳۷۲، اسدالغابہ ج ۴ ص ۷۰۶، ۷۰۰۔

کے فیصلہ کو اپنے فیصلہ پر ترجیح دیتے تھے۔ اور انہوں نے تیسرے انتخاب کے موقع پر بھی شوریٰ کے فیصلہ کو حکمت عملی کی بنیاد قرار دیا۔

چوتھا انتخابی شوریٰ (۳۵ھ)۔ ۳۵ھ میں[1] مسلمانوں نے بار چہارم اسلام کی ریاست عامہ کے امیر کا انتخاب کیا۔ حضرت عثمان ذی النورین کی شہادت ایک دردناک حادثہ کی صورت میں رونما ہوئی۔ فاروق اعظم کی زندگی کے آخری لمحوں میں یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ جمہور زیادہ تر حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کے حق میں ہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے انہی دونوں بزرگوں کے متعلق استصواب رائے عامہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں عثمان غنیؓ کامیاب ہو گئے تھے۔ چونکہ وہ آج شہید ہو چکے تھے اس لیے ان کے بعد صرف حضرت علیؓ ہی کی ہستی ایسی تھی جس پر رائے عامہ کی نظر تھی۔

مدینہ میں ممتاز صحابہ موجود تھے وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے پرزور طریقہ پر یہ رائے دی کہ اب آپ منصب امارت کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لیں۔ اس موقع

---

[1] امیر المومنین فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب اپنے جانشین کے تقرر کے متعلق تین صورتیں اختیار کر سکتے تھے۔ ممتاز صحابہ سے مشورہ کرنے کے بعد اپنے اختیار سے کسی شخص کو حکماً مقرر کر دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے سب کچھ امت کے اختیار اور مرضی پر چھوڑ دیتے۔ یا صدیق اکبر کے اسوۂ سیاسی پر کاربند ہو کر اپنے جانشین کا نام تجویز کر دیتے اور امت سے رائے لے کر اس کا نفاذ فرما دیتے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنے جانشین کا نام تجویز کر سکتا ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نام تجویز کرنے کی ذمہ داری نہ لوں دونوں صورتوں میں میرے سامنے ایسی نظیریں ہیں جو مجھ سے بہتر ہستیوں نے چھوڑی ہیں۔
فاروق اعظم نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ اپنے اختیار کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور آخری کام یہ کیا کہ جمہور کے معتمد نمائندوں کی مجلس شوریٰ مقرر کر کے سب کچھ رائے عامہ کے اختیار میں دے دیا، اور ایک ایسی صورت تجویز کی جس میں ماضی کی دو اعلیٰ روایتیں اپنی بہترین خوبیوں کے ساتھ جمع تھیں۔

[2] ۳۵ھ (مطابق ۶۵۶ء)

[3] تاریخ طبری ج ۵ ص ۳۷-۳۸ (۳۵ھ)

جانبین میں جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی" عوام الناس کے مفاد کا مطالبہ یہ ہے کہ امیرِ حکومت کا تقرر جلد عمل میں لایا جائے۔ ہم سب کی رائے میں اس عہدہ کے لیے آپ سے زیادہ اور کوئی مستحق نہیں۔ آپ ہر طرح صفِ اوّل کی اولین شخصیت ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ نے عہدۂ امامت سے انکار فرمایا اور کہا "مجھے امیر نہ بنائیے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے وزیر بنا دیں۔"

اس موقع پر تمام آرا متحد ہو گئیں۔ صحابہ کی رائے عامہ نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنایا ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم ضرور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرینگے" حضرت علی مرتضیٰ نے اس کے جواب میں جو الفاظ فرمائے وہ اس حقیقت پر ناطق ہیں کہ حکومت کے غیر معمولی معاملات کے لیے عوام کی مرضی ہی وہ آخری عدالت ہے جس کا فیصلہ بڑے سے انسان کے عزم پر غالب ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں (ففی المسجد۔ فان بیعتی لا تکون خفیاً ولا تکون الا عن رضی المسلمین) اگر یہی فیصلہ ہے تو منصب امامت کا قطعی فیصلہ مسجد نبوی میں ہوگا۔ آپ نے مجھے حکومت کا جو کام سپرد کر رہے ہیں وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر نہ ہوگا۔ اور میرے متعلق جو بھی طے ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی مرضی عامہ سے ہوگا" چنانچہ اس رائے کو تسلیم کر لیا گیا۔ صحابہ نے آپ کا نام تجویز کیا تھا جب مسجد نبوی میں مجوزہ نام پیش ہوا تو پہلے مہاجرین و انصار نے اور اس کے بعد عام انسانوں نے اس کو منظور کر لیا[1]۔ یہ آخری انتخاب تھا جس نے مرضی عامہ اور شوریٰ کے قانون کی اہمیت کا اعلان کیا۔

امام کا اختیارِ مطلق (عزم) شوریٰ کی شاندار تاریخ سے باخبر ہونے کے باوجود بعض علمی دماغ اسلامی حکومت کے رئیس (امام) کو مختارِ مطلق مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام کو قابل اعتماد مشیروں کی رائے لے کر اپنے عزم اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنا چاہیے اس دعوے کی تائید تین نظیروں

[1] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۵ ص ۱۵۲ (رفاتا۔ اصحاب رسول اللہ ۔ لا بد للناس امام ۔ الخ)

سے کی جاتی ہے۔ آنحضرت نے صلحنامہ حدیبیہ کے موقع پر اور صدیق اکبر نے جیش اسامہ اور مرتدین زکوٰۃ کے متعلق صحابہ کی رائے اور مشورہ کے خلاف اپنے فیصلہ پر عمل فرمایا۔ تاریخی اعتبار سے یہ بیان درست ہے لیکن اس سے امام کے اختیار مطلق کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

غلط اندیشی کی بنیاد اس مسئلہ میں مرحلہ اول پر غلط اندیشی کی بنیاد کو صاف کر دینا ضروری ہے علماء اسلام نے تصریح کی ہے کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں دو قسم کی ذمہ داریوں پر فائز تھے۔

(۱) منصب رسالت (پیغمبری) (۲) منصب امامت (حکومت و ریاست)

یہی دونوں ذمہ داریاں ہیں جن سے آنحضرت کے طرز عمل میں فرق پیدا ہو جاتا تھا۔ آنحضرت منصب رسالت کا کام خدا کے حکم (وحی الٰہی) کے مطابق انجام دیتے تھے اور منصب امامت کا کام شوریٰ کے ذریعہ سے۔ آپ پیغمبرانہ ذمہ داریوں میں وحی سے پہلے حسب مرضی مشورہ تو کر لیتے تھے لیکن شوریٰ طلب کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ تھا، ایسے حالات میں صرف خدا کا حکم واجب التعمیل ہوتا تھا۔ البتہ اس معین شکل کے علاوہ حضور اکرمؐ نے کبھی اپنے عزم کو شوریٰ کے خلاف استعمال نہیں کیا، یہ امر قدرتی بھی ہے کیونکہ پیغمبر کی ہستی، امام کی ہستی پر اور پیغمبری کا منصب، حکومت و امامت کی ذمہ داری پر فائق ہے۔ اگر دونوں ذمہ داریوں کے اس فرق کو بخوبی ذہن نشین کر لیا جائے تو امام و شوریٰ کے باہمی اختیار کے متعلق غلط اندیشی کی بنیاد اپنی جگہ پر باقی نہ رہیگی[1]۔

---

[1] شوریٰ کے ایوان میں اور امامت کی ذمہ داریوں کے دوران میں امام کی انفرادی رائے کا کیا درجہ ہے اس کا جواب خیر القرون کی تاریخ شوریٰ بخوبی پیش کرتی ہے۔

(۱) عہد نبوی میں اس سلسلہ کی پہلی روشن مثال اس وقت سامنے آئی جب پیغمبر اعظم نے حضرت معاذ کو یمن کا حاکم اعلیٰ گورنر مقرر فرمایا۔ آنحضرت نے امت کے بلند پایہ مشیروں کو شوریٰ میں طلب کیا۔ اس وقت (بقیہ بر صفحہ ۴۵۶)

یادداشت | پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل اور شوریٰ کی تاریخ مندرجۂ بالا ذمہ داریوں کے فرق کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے۔ ثبوت کے طور پر صرف دو مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) آنحضرت نے بدر کبریٰ کے محاذ پر ایک خاص جگہ خیمہ زن ہونے کا فیصلہ کیا اور صحابہ کو اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۵) حضور اکرم نے شوریٰ سے پہلے جو تاریخی الفاظ فرمائے وہ یہ تھے (انی فیما لم یوح الیّ کاحد کم) وہ مسائل جن کے متعلق میرے پاس خدا کی وحی نازل نہیں ہوئی اُن میں میری انفرادی رائے تم لوگوں کی ایک رائے کے برابر ہے (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۴۶ (کتاب المناقب) ج ۱ ص ۷۸، باب الاجتہاد۔ رواہ الطبرانی عن معاذ بن جبل) اس شوریٰ میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور اُسید بن حضیر شریک تھے۔ شوریٰ میں ہر ایک نے بحث میں حصہ لیا۔ اس کے تمام رجال ثقات ہیں۔ طبرانی نے صرف ابو العطوف کے متعلق لم اعرفہ لکھا ہے۔

(۲) دوسرے موقع پر صدیق اکبرؓ نے اپنے انتخاب کے بعد جمہور کے ایوان عام میں یہ الفاظ کہے تھے "مجھے تم نے امیر بنایا ہے حالانکہ میں تم پر فائق نہیں ہوں۔ اگر میرا طرز عمل بہتر ہو تو مجھ سے تعاون کرو، غلطی کروں تو اصلاح کردو"۔ ان جملوں کا منشا یہ ظاہر کرنا تھا کہ عوام کی مجموعی طاقت امام کی منفرد قوت پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور جمہور کی رائے مناسب مواقع پر امیر کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ (سیرۃ ابن ہشام (روض الانف ج ۲) امر سقیفہ ص ۴۰۷)

(۳) صدیق اکبر کے بعد فاروق اعظم نے اپنے زمانہ میں امام کی انفرادی رائے کی قانونی حیثیت کو متعین کیا۔ آپ نے عراق کی زمینوں کے متعلق شوریٰ طلب کیا اور بھرے ہوئے ایوان میں فرمایا "میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ حکومت کی ان ذمہ داریوں میں شریک ہوں جو خود آپ ہی نے مجھے سپرد کی ہیں۔ اس شوریٰ میں میری حیثیت شوریٰ کے ایک فرد کی برابر ہے۔ آج تم کو ایک حق بات کا فیصلہ کرنا ہے (کتاب الخراج امام ابویوسف باب قسمۃ الغنائم ص ۲۵۔ (فانی واحد کاحدکم)

اسلام کے تینوں درخشاں زمانوں کی یہ تین مثالیں اپنی حقیقت کی آپ گواہ ہیں۔ فاروقی عہد میں جو شوریٰ ہوا اس میں جمہور نے ارض عراق کے متعلق امیر المومنین سے شدید بحثیں کیں۔ آخر کار فاروق اعظم کو قرآن سے چند نظیریں مل گئیں اور اس پر شوریٰ کے تمام ووٹ متحد ہو گئے۔ اس واقعہ نے یہ ثابت کر دیا کہ خدا کے قانون کی نظیر لانے سے پہلے امام اپنی منفرد رائے سے جمہور کے فیصلہ کو دبا نہیں سکتا۔ اور اگر کسی معاملہ کا فیصلہ وحی الٰہی سے ہو چکا ہے تو عوام امام کی منفرد رائے کے خلاف کوئی رائے پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ امام کو ایسی رائیں مسترد کر دینے کا حق حاصل ہے۔

پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ صحابہ میں سے حضرت خباب بن منذر نے فوراً عرض کیا حضور! کیا اس جگہ قیام کے متعلق خدا کا حکم ہے؟ یا آپ کا فیصلہ ہے؟ یا جنگ ہے یا جنگی تدبیر؟ جواب ملا یہ ہمارا ذاتی عزم ہے"۔ خباب نے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ہدایت کا تعلق پیغمبرانہ ذمہ داری سے نہیں ہے بلکہ حضور کے سیاسی عزم و اختیار سے ہے مجوزہ مقام سے اختلاف کیا اور مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ جگہ غیر موزوں ہے یہاں سے لشکر کو لے کر چلیے اور دوسری جگہ خیمے ڈالیے آنحضرت نے اس مشورہ کو سنا، صحابہ بھی متفق نظر آئے۔ زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ خباب کے مشورے کے مطابق فوجوں کی فرودگاہ بدل گئی[1]۔

(ب) محاذ خندق کے موقع پر مدینہ دشمنوں کی متحدہ افواج کے محاصرہ میں تھا۔ آنحضرت نے شہریوں کی پریشانی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ قبیلہ غطفان کے سرداروں ——————
سے مدینہ کی تہائی پیداوار پر صلح کر لی جائے۔ بنی غطفان نے حضور کی مجوزہ صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ صلحنامہ پر دستخط نہ ہوئے تھے کہ آنحضرت نے سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے صورت واقعہ کو سننے کے بعد پہلا سوال یہ کیا۔ "مجوزہ صلح خدا کا حکم ہے یا حضور اکرم کی ذاتی رائے؟ جواب ملا" ہماری ذاتی رائے ہے"۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ صلح کا تعلق پیغمبرانہ ذمہ داری سے نہیں ہے بلکہ ذاتی عزم سے ہے تو دونوں حضرات نے صلح کے خلاف مشورہ دیا اور کہا کہ "واللہ ہم اپنے دشمنوں کو تلوار کے علاوہ اور کچھ نہیں دینگے"۔

آنحضرت نے اپنے ماہر مشیروں کو جب اس درجہ مخالف پایا تو مجوزہ صلحنامہ پر دستخط کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے فیصلے پر عمل نہیں فرمایا۔ یہ دونوں مثالیں صاف ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے تعامل کا مدار دو قسم کی ذمہ داریوں پر تھا اور صحابہ مشورہ پیش کرنے سے پہلے یہ

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۷۔ ارایت هذا المنزل منزلاً انزلك الله ليس لنا ان نتقدمه ولا نتاخر عنه روایت ابن اسحاق۔

یہ معلوم کر لیتے تھے کہ معاملہ متعلقہ شوریٰ کی دسترس کے اندر ہے یا خارج از اختیار۔

خلفاء راشدین کی تاریخ حکومت میں بھی یہ دونوں ذمہ داریاں خاص فرق کے ساتھ نمایاں رہی ہیں۔ اس مبارک زمانہ میں یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ معاملات جو اسلام کے قانونِ اساسی (وحی الٰہی) اور رسالتمآب کے پیغمبرانہ فرامین کی رو سے ہمیشہ کے لیے واجب العمل تھے، ان کے باب میں شوریٰ کا اختیار فائق نہ تھا۔ ایسے معاملات میں امام مشورہ نہ کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص بے خیالی میں مشورہ دیتا تو امام اس تصریح کے ساتھ اس کو نامنظور کر دیتا کہ یہ خدا کا قانون ہے یا اس کے رسول کا حکم ہے۔ صحابۂ کرام یہ سُن کر باخبر ہو جاتے اور اختلافی مشورہ آناً فاناً وحدت افکار میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

صلح حدیبیہ | صلح حدیبیہ اُن واقعات میں سے ہے جن کو شوریٰ کے خلاف اور امام کے اختیار مطلق کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے حالانکہ غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ واقعہ اصلاً شوریٰ کا مؤید ہے۔

درحقیقت یہ صلح عام اُمیدوں کے خلاف صرف پیغمبرانہ ذمہ داری کے ماتحت طے پائی، آنحضرتؐ نے مکہ معظمہ کا عزم کرنے سے پہلے بڑے اہتمام سے شوریٰ طلب کیا اور اس کے فیصلہ پر عمل فرمایا۔ یہ اس بات کا گرانقدر ثبوت تھا کہ حضور اکرم وحی الٰہی آنے سے پہلے ان معاملات میں بھی شوریٰ منعقد فرماتے تھے جو بعد میں خدا کے حکمِ مطلق کے ماتحت طے پائے ہیں[1]۔

[1] آنحضرت نے ۶ھ ہجری میں چودہ سو اصحاب کے ساتھ بیت اللہ کی زیارت کا عزم کیا۔ قافلہ کو غدیر اشطاط پر اطلاع ملی کہ قریش درندوں کی کھالیں پہن کر جنگ کے لیے تیار ہیں۔ یہ سُن کر حضور اکرم نے شوریٰ طلب فرمایا اور صورتِ معاملہ کو اس کے سامنے پیش کیا۔ صدیق اکبر نے ارکان کو خطاب کر کے تقریر کی: "یہ سفر جنگ کے لیے نہیں ہے۔ ہم نہ جنگ میں پہل کریں گے اور نہ کسی کو قتل کریں گے۔ اگر حملہ ہوا تو مقابلہ ضرور کیا جائیگا" آخر میں شوریٰ کا فیصلہ ہوا کہ سفر جاری رکھا جائے۔ چنانچہ اسی فیصلہ پر عمل کیا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ صلحنامہ حدیبیہ کی تجاویز[1] عوام کے لیے دلشکن اور مایوس کن تھیں لیکن اس سے شوریٰ اور رائے عامہ کی قدر و قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو کچھ ہوا خدا کے حکم سے ہوا۔ مرضی عامہ قانوناً بڑی چیز ہے لیکن خداوند تعالیٰ کی مرضی اعلیٰ اس سے بھی بلند و بالا ہے۔

فاروق اعظم، حضرت علی اور دوسرے صحابہ جن کو کمزور صلح ناگوار تھی وہ رائے دیتے ہوئے یہ اندازہ نہ کر سکے کہ صلح حدیبیہ آنحضرت کے اختیار مطلق کی جگہ پیغمبرانہ ذمہ داری پر تکمیل پا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فاروق اعظم نے صدیق اکبر سے غصہ میں یہ کہا "اگر ہم مسلمان اور یہ لوگ کافر ہیں تو ہم کیوں کمزوری کا اظہار کریں" تو صدیق اکبر نے فوراً غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا۔ "عمر! حضور اللہ کے رسول ہیں، آپ کا فیصلہ درست ہے، آپ نے خدا کے حکم کے خلاف نہیں کیا۔ خدا ضرور آپ کی امداد کریگا" جب یہی شکایت حضور کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے بھی اس کو ان الفاظ میں رد کر دیا۔ "میں خدا کا رسول ہوں میں اس کے حکم کے خلاف کچھ نہ کرونگا، مجھے یقین ہے خدا میرے ثمرہ کو ضائع نہ کریگا۔"[2]

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ آنحضرت نے صلح حدیبیہ کے لیے شوریٰ سے منظوری کیوں نہیں لی اور رائے عامہ کے احتجاج کو کس لیے نظر انداز فرمایا۔ اس باب میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر صلح حدیبیہ کا تعلق آپ کی مخصوص پیغمبرانہ ذمہ داری سے نہ ہوتا تو آپ ہمیشہ

---

[1] تجاویز صلح میں متعدد باتیں بظاہر عام جذبات کے خلاف تھیں۔ صلحنامہ کی ترتیب کے وقت قریش نے کلمہ رسول کے لفظ پر اعتراض کیا، آپ نے اس کی جگہ اپنے نام کے ساتھ عبداللہ لکھوایا۔ بسم اللہ پر اعتراض ہوا تو اس کی جگہ دستور قریش کے مطابق "باسمک اللھم" درج کرا دیا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل شرائط کو منظور کر لیا

(۱) دس سال کے لیے جنگ بند رہیگی۔ مسلمان تکمیل مقصد (بیت اللہ کی زیارت) کے بغیر واپس ہو جائینگے

(۲) قریش کے جو آدمی بھاگ کر آئیں گے مسلمان ان کو واپس کر دینگے لیکن قریش مسلمانوں کے بھاگے ہوئے آدمیوں کو واپس نہیں دینگے۔ (۳) مسلمان سال آئندہ چند پابندیوں کے ساتھ حج کر سکینگے۔

[2] سیرۃ ابن ہشام (روض الانف ج ۲ ص ۲۳۰)۔

کی طرح اس معاملہ کو بھی اپنے صحابہ کی رائے عامہ سے طے فرماتے[1]۔

شورائے جیش اُسامہ سلا۱۱ھ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صدیق اکبر نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت اُسامہ کی فوج کو شام کے محاذ پر روانگی کا حکم دیا، حالانکہ دارالخلافہ مدینہ قبائلی بغاوت کی وجہ سے خطرات میں محصور تھا اور صحابہ کا مشورہ یہ تھا کہ اُس وقت اس فوج کو باہر نہ روانہ کیا جائے۔

اس واقعہ سے امام کو آمر مطلق قرار دینا ایک تاریخی واقعہ کی غلط تعبیر پیش کرنا ہے۔ اس معاملہ میں صدیق اکبر نے جو کچھ کیا اس میں مطلق العنانی کا ذرا دخل نہ تھا۔ آنحضرت نے اسامہؓ کی فوج کو مرتب کر کے محاذ پر جانے کا حکم دیا تھا، صدیق اکبر نے اُس کو واجب التعمیل سمجھا، اور صحابہ کے مشورہ کے مقابلہ میں یہ ضروری خیال کیا کہ حضور اکرم کی پیغمبرانہ وصیت[2] اور آخری حکم پر عمل کیا جائے۔

شورائے مرتدین زکوٰۃ۔ آنحضرت کی وفات کے بعد مدینہ کے اطراف میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے خلاف بغاوت رونما ہوئی۔ باغی کہتے تھے کہ نماز بدستور رہے زکوٰۃ معاف کر دی جائے۔

---

[1] آنحضرت نے خدا کے حکم سے صلح کر لینے کے بعد رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے غیر معمولی توجہ کی جس سے مرضی عامہ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن میں عام اطمینان کے لیے فتح مبین اور فتح قریب کی خبر دی گئی۔ اور اسی مقصد کے لیے سورۃ الفتح نازل ہوئی معاہدہ پر سات جلیل القدر صحابہ نے دستخط کیے۔ جن میں دو بڑے معترض حضرت عمرؓ اور حضرت علی بھی تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت حال واضح ہونے کے بعد صحابہ صلح پر متفق ہو گئے تھے۔

[2] صدیق اکبر نے اس وقت صحابہ سے اختلاف کیوں کیا اس کا سبب خود ان کے الفاظ میں یہ ہے۔ "اگر میں یہ اندیشہ بھی کرتا کہ مجھے درندے اُٹھا لے جائیں گے اور میں بستی میں تنہا رہ جاؤنگا تو میں ایسی حالت میں بھی اسامہ کی فوج کو بھیجتا اور وہ کام کر کے دکھاتا جس کا حکم اللہ کے پیغمبر نے دیا تھا"۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ جیش اسامہ کی روانگی میں امیر المومنین کے شخصی عزم اور فیصلہ کا دخل نہ تھا بلکہ اس کا تعلق پیغمبر اعظم کی آخری وصیت اور دربار نبوت کے قطعی حکم کی تعمیل سے تھا کیونکہ آنحضرت نے اپنی زندگی میں اس فوج کو روانگی کا حکم دیا تھا۔ دیکھو سیرت ابن ہشام (روض الانف) جلد ۲ ص ۳۵۲ و ۳۶۹۔ تاریخ طبری جلد ۳ ص ۲۱۲۔

شوریٰ کا مشورہ یہ تھا کہ نرمی کی جائے۔ صدیق اکبر نے دونوں باتوں کو رد کر دیا۔ اُنھوں نے شوریٰ کے ارکان کو یاد دلایا زکوٰۃ خدا کے حکم سے واجب ہے۔ شوریٰ اس میں کمی کا مشورہ نہیں دے سکتی۔ آپ نے فرمایا۔

قانون الٰہی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ میری زندگی میں اسلام میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اگر فرض زکوٰۃ دینے سے انکار کیا گیا تو میں انکار کرنے والوں سے تنہا جہاد کرونگا۔

یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ صدیق اکبرؓ قانون الٰہی کو پیش کر کے صحابہ کو صحیح طور پر سمجھا رہے ہیں۔ مگر دوسری طرف کچھ دماغ یہ باور کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینؓ شوریٰ کے فیصلوں کو رد کر کے اپنے شخصی عزم پر عمل کرنے کے عادی تھے اور مطلق العنان امیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

یادداشت | صدیق اکبرؓ کے بعد بہت آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ صدیق اکبرؓ نے خدا کے قانون کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کیا تھا۔ صدیق اکبر کے دلائل ایسے تھے جنھوں نے شوریٰ کو مطمئن کر دیا تھا اس لیے یہاں شوریٰ کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرتِ عمرؓ جن کو صدیق اکبر نے برسرِ مجلس ڈانٹا تھا اس وقت یہ کہتے ہوئے نظر آئے۔ واللہ خدا نے ابوبکر کا سینہ جہاد کے لیے کھول دیا (فعرفت انہ الحق[1]) اب مجھے معلوم ہوا کہ اُنھی کی رائے درست ہے"

علامہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت عمر نے صدیق اکبر کی رائے کی اطاعت نہیں کی بلکہ مدلل بحث کے بعد خود اپنی آزاد رائے قائم کی[2]۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے صحابہ نے بھی اپنی اپنی رائے کے ماتحت آخری فیصلہ پر پہنچے ہیں کامیابی حاصل کی اور اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۶ ص ۳۱۴

[2] شرح مسلم بشرح النووی ج ۱ ص ۲۱۰ (طبع مصریہ) عن ابی ہریرۃ۔

وہ صدیق اکبرؓ کی حاکمیت کے ماتحت نہیں ہوا بلکہ اُمت کی رائے عامہ کی قوت سے رونما ہوا۔

زمانۂ حال کی پارلیمنٹ پر تنقید

اس زمانہ میں پارلیمنٹ نے جو نمایاں ترقی کی ہے اُس کے بعض ظاہری پہلو ایسے ہیں جو دلوں کو مرعوب کر دیتے ہیں لیکن جب پارلیمنٹ کو نظام شوریٰ کے مقابلہ میں وزن کیا جاتا ہے تو صاف طور پر نظر آجاتا ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ ناقابلِ اصلاح خرابیوں کا مجموعہ ہے۔

پارلیمنٹ کی عمارت کے چار بڑے ستون ہیں۔ ۱۔ شہنشاہیت (امپریلزم۔ Imperialism) ۲۔ نسلی تعصب اور عدم مساوات

۳۔ سرمایہ دارانہ آمریت

۴۔ جاگیردارانہ تفوق

پارلیمنٹ مرحلۂ اول پر شہنشاہیت کی سخت گیر قوت کو ساتھ لے کر کام کرتی ہے۔ اس کا رجحان ہمیشہ سے کمزور قوموں کی غلامی کی طرف ہے۔ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کی صدہا قومیں اور کروڑوں افراد آج بھی اس کے زیر سایہ مساوی حقوق سے محروم، پسماندہ، بیکار و بے روزگار، غریب اور غلام ہیں۔

یورپ کی وہ قومیں جنھوں نے اپنے نام کو روز روشن کے فرزندوں سے عزت دی ہے ان قوموں پر حکومت کرنا چاہتی ہیں جن کا نام اُنھوں نے "سیاہ رات کی قومیں"[1] رکھا ہے۔ یہ لوگ اپنی مغرور نسل کے علاوہ کسی دوسری نسل کو اپنی برادری میں شامل ہونے

[1] جے کے بلنچلی نظریہ سلطنت

کے قابل نہیں سمجھتے۔ پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے لیے سرمایہ داری شرط ہے مملکت کے قابل سے قابل غریب کے لیے اس کی رکنیت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ جاگیرداری اس کا آخری نقص ہے، جاگیردار اس پارلیمنٹ کے شاہی شہزادے ہیں جن کا حق موروثی طور پر محفوظ رہتا ہے۔ جس قدر بھی غور کیا جائے پارلیمنٹ کا موجودہ نظام اب تک انسانیت عامہ کی اعلیٰ خصوصیات سے حقیقی مطابقت پیدا نہیں کرسکا بلکہ وہ ایسی خرابیوں کا سرچشمہ ہے جس نے ہماری خوبصورت دنیا کو وحشی حیوانوں کی چراگاہ بنا دیا ہے۔ اس دعوے کا ثبوت ہر ایک پارلیمنٹ پیش کرتی ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ، فرانس کے جمہوری ایوان اور امریکن کانگریس سب میں یہ خرابیاں مشترک ہیں۔

مناسب ہوگا اگر سب سے پہلے (ایک تنقیدی یادداشت کی صورت میں) انگلستان کی پارلیمنٹ کا جائزہ لیا جائے اور اس کے ضمن میں دوسرے جمہوری ایوان بھی معرضِ بحث میں آجائیں۔

تنقیدی یادداشت (پارلیمنٹ انگلستان) برطانوی سلطنت ایک بہت ہی کم عمر سلطنت ہے اس کے مقبوضات ساری دنیا کے پانچویں حصہ سے بھی زائد رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یورپ میں شمالی آئرلینڈ سے مالٹا تک افریقہ میں راس اُمید سے اسکندریہ اور کیمروں تک۔ ایشیا میں ہندوستان سے ایشیائے کوچک کی پہلی سرحد اور بحرالکاہل تک۔ امریکہ میں کینیڈا سے نیوفاؤنڈلینڈ، برٹش گائنا، جزائر فاک لینڈ اور برموڈا اس تک، اسٹریلیا میں نیوزی لینڈ سے لے کر نیوگنی تک انگلستان کا جھنڈا حکومت کر رہا ہے۔ یہ سلطنت دنیا کے ہر براعظم پر موجود ہے[1]۔ اور اس پر برطانوی پارلیمنٹ حکومت کرتی ہے۔ اس پارلیمنٹ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ایک ناقابل فہم قانونی شہنشاہیت پر مبنی ہے۔ اس کی شہنشاہیت سلطنت کے سب

---

[1] نیو پاپولر اٹلس آف دی ورلڈ ص ۲-۲۰-۲۷-۳۰-۳۳-۳۴۔

حصوں پر حکومت کرتی ہے مگر کسی حصہ کے نمائندوں کو اپنے ایوان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی اور کسی براعظم کے بڑے سے بڑے مدبر کو مشورہ دینے کا حق نہیں دیتی۔ ہندوستان تاج برطانیہ کا سب سے بڑا نگیں ہے مگر چالیس کروڑ متمدن انسانوں کا یہ براعظم برطانوی پارلیمنٹ کا جنگل ہے جس سے ہر وقت سوختے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ رائٹ آنریبل سر سرینواس شاستری کا یہ خیال صحیح ہے کہ سلطنت متحدہ کے قلمرو میں انگلستان اور نو آبادیوں کی متحدہ حکومت کا قیام ابھی زیر بحث ہے" گویا یہ سلطنت "متحدہ" ہونے کے باوجود غیر متحدہ ہے۔ یہ ایک ایسی مہمل بات ہے جو برطانوی پارلیمنٹ کی تباہ کن انفرادیت کا ثبوت اور اُس کے غیر قانونی ہونے کی نمایاں علامت ہے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک جو امپیریل کانفرنسیں ہو چکی ہیں اُنھوں نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ آزاد نو آبادیات ایک طرف برطانوی پارلیمنٹ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتیں اور دوسری طرف آزادی کے باوجود اس کی غلام ہیں اور کبھی اُس کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ ہندوستان کی حالت اور بھی قابل رحم ہے۔ شاستری صاحب کہتے ہیں کہ انگلستان کے پارلیمنٹری نظام میں اس ملک کی مثال ایسی ہے جیسے شاہی خاندان میں ایک ادنیٰ درجہ کی باندی کی۔ ہم انگلستان کی پارلیمنٹ ہی کے ماتحت نہیں ہیں بلکہ موجودہ انتظام کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان، نیو فونڈلینڈ، کناڈا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کا بھی کفش بردار بن جائے"

برطانوی پارلیمنٹ ایک موروثی شہنشاہیت کے ماتحت ہے۔ وہ ایک ایسا تالاب ہے جس میں رود بار انگلستان کی موٹی موٹی مچھلیاں ہی تیر سکتی ہیں۔ یہ دنیا کے چند انسانوں کا ادارہ ہے جو ساری دنیا کی گردن پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے لیے جمہوریت ہے مگر اپنے قلمرو کے لیے ڈکٹیٹر شپ۔ اسلام کا شورائی شہنشاہیت کے اس تصور سے بالکل پاک ہے۔ یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ کے خاتمہ پر پارلیمنٹ

لہ سلف گورنمنٹ شاستری طبع ۱۹۳۰ء ص ۱۲۔

ے مضمون ذیل کے حوالے۔ نظریہ سلطنت تنجلی دمقنن المانی) م ۹ سب ۱۴ ص ۳۱۰۔

کا معمولی ظہور ہوا۔ اسلام اس سے پہلے ہی شورائے اُمت کا نظریہ پیش کر چکا تھا۔ مونٹسکیو کہتا ہے کہ پارلیمنٹری حکومت کا تخم قدیم جرمنی کے جنگلوں میں بویا گیا تھا اور بلنچلی کا بیان ہے پارلیمنٹ کو سب سے پہلے انگلستان میں عروج حاصل ہوا۔ مگر اس عروج کا حاصل کیا ہوا، شہنشاہیت ختم ہو کر پارلیمنٹری شہنشاہیت قائم ہو گئی حالانکہ اسلامی حکومت عروج سے پہلے (سنہ ۶۲۲ء) میں بھی عوام کی ریاست تھی اور عروج کے بعد بھی خلفاء اربعہ (سنہ ۳۵ھ ۶۹۵ء) تک ریاست عامہ رہی۔ تیرھویں صدی اور سترھویں صدی میں انگلستان نے دو انقلاب دیکھے اور اُن کے نتیجہ میں سنہ ۱۶۸۹ء میں پارلیمنٹری شہنشاہیت قائم ہو گئی۔ ثابت یہ ہوا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ کئی صدی بعد بھی وہاں نہ پہنچ سکی جہاں اسلام کی ریاستِ عامہ کا پہلا قدم پڑا تھا۔

انگلستان آج بھی پارلیمنٹ کا مالک ہے، مگر قانوناً اس وقت بھی "بادشاہ نظم سلطنت کا زندہ ٹیس ہے" اگر اس کا اختیار عملاً نہیں ہے بلکہ صرف اخلاقی طور پر ہے تو یہ بات اور بھی ناقابلِ فہم ہے۔ انسانی معاشرے کے اُن افراد کو جن کے ہاتھ میں ایک صاف شورائی نظام ہے اس قسم کی پارلیمنٹ سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ بادشاہ کبھی نہیں مرتا مگر ہر کام اُس کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس پر بادشاہ غیر ذمہ دار بھی ہے اور یہ غیر ذمہ داری سلطنت کا ایک اصول ہے۔ شاہان اسٹوارٹ اور ملکہ این کے عہد کے واقعات سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اس طرزِ حکومت میں عوام اور بادشاہ کے درمیان ناقابلِ اصلاح تصادم ہر وقت ممکن ہے۔

یورپ کے علماء یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رومیوں نے سب سے پہلے سلطنت کو اس کی معین شکل میں ڈھالا، اگرچہ یہ دعویٰ نسلی تعصب پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے عراق و عرب اور افریقہ میں معین سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں اور ان کی حیثیت اخلاقی نظام سے زیادہ سیاسی نظام کی تھی لیکن اس دعوے کے باوجود

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ "انگلستان کا نظامِ سلطنت ظاہراً شاہی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے" (بلنچلی حاشیہ ص ۱۴ و ۴۵۵) یہ خیال کس قدر معقول ہے۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے ذرا سی عقل کافی ہو گی۔ غازی

اب تک روم کی پارلیمنٹ شہنشاہیت کے اثر اور مطلق العنانی سے آزاد نہ ہوسکی فرانس میں ۱۷۹۱ء کے نظام سلطنت میں شاہی اصولوں کی جگہ جمہوری اصول رائج ہوگئے، مگر اس میں شہنشاہیت کا جز بھی بے جوڑ صورت میں باقی رہا۔ آخر نپولین نے اس جمہوریت کا خاتمہ کردیا جمہوری اصولوں سے قوم گرگئی تھی نپولین نے اس کو زمین سے اٹھالیا۔ انتہا یہ ہے کہ ۱۸۱۴ء کے منشور عام کے بعد ۱۸۴۳ء تک بھی پارلیمنٹ موروثی دولتمندوں کے قبضہ میں تھی۔ انگلستان پارلیمنٹری شہنشاہیت کا مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور فرانس جمہوریت اور عمومیت کا صدر اوّل۔ مگر یہ دونوں صدیوں تک شہنشاہیت کے سنگین بوجھ سے آزاد نہ ہوسکے۔

موجودہ زمانہ کے شورائی نظام کا سب سے بڑا نقص معیار رائے دہی ہے۔ انگلستان میں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۸ء کے قوانین کی رو سے دس پونڈ سالانہ (مالیت[1]) کی جائداد کا ہونا شرط ہے۔ ایوان خاص اور ارکان میں شہزادے۔ شاہی شہزادے (لارڈ) موروثی امراء اور پادری تاحیات نامزد ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ہمیشہ پارلیمنٹ کے لیے خطرہ رہتا ہے۔ فرانس میں اب تک یہ نقص نہ تھا مگر یہ جمہوریت بہت بعد کی پیداوار ہے اس کے علاوہ روسو جو اس عمومیت کا بانی ہے خود اسلام سے متاثر ہوا ہے۔ اس لیے ہم اس کو مستقل حیثیت نہیں دے سکتے۔

اٹلی میں بھی رائے دہی کے لیے سَتّو لیرہ (پندرہ روپیہ) سالانہ محصول دینا ضروری ہے۔ یہاں قومی ڈکٹیٹرشپ کے رنگ میں عیسائیت کا غلبہ ہے اور حکومت کے سر پر ایک شہنشاہیت بھی موجود ہے۔

امریکہ جمہوریت کی دنیا میں صدر نشین کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس کے نظام میں نسلی تفریق اور سرمایہ داری کا دخل ایسا ہی ہے جیسے چھت کی لکڑی میں گھن کا اثر۔

قدیم یونان کی عمومیت پسندی کو یورپ کی تاریخ مملکۃ کا جز بنا دیا گیا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یونان کے بڑے بڑے فلسفی زنوفون، افلاطون اور ارسطو سب ایتھنز کی ڈیماکریسی (عمومیت) کو ناپسند کرتے

---

[1] مبادی سیاسیات شروانی ضمیمہ باب ۵ ص ۱۳۱ بحوالہ اسٹیٹسمینس ایر بک [2] مبادی سیاسیات۔ ص ۳۱۸۔

تھے یونان کی حکومت میں عیسائیت کا بھی دخل تھا۔

ایوان عام (اکلیسا) میں چالاک، حریص اور لستان ممبر چھے آدمیوں پر غالب رہتے تھے اور عوام میں خود مختار بادشاہ کی سی مطلق العنانی تھی[۱]۔ اسلامی شوریٰ میں اس قسم کی کوئی بات نہیں جس کو ناقابل فہم کہا جائے اور جس کی وجہ سے وہ خرابیاں پیدا ہوسکیں جنہوں نے پارلیمنٹ کے ایوان کو تاریک بنا رکھا ہے۔

شوریٰ کا امتیاز اور خصوصیات

اسلام دنیا کی پہلی طاقت ہے جس نے موجودہ پارلیمنٹ سے ایک ہزار سال پہلے شوریٰ کے نام سے ایک سچے پارلیمنٹری نظام کی تشکیل کا کام اپنے ذمہ لیا اسلام نے اس وقت اختیار عامہ کے اصول کی بنیاد رکھی جب یورپ کی تاریخ جہالت پر پانچ صدی کا زمانہ گذر چکا تھا[۲]۔ دنیا روم و فارس کی شہنشاہیتوں کے شکنجہ میں دبی ہوئی تھی اور ایشیا سے لے کر افریقہ تک اور افریقہ سے یورپ تک زمین کے کسی حصہ میں جمہوریت اور ڈیماکریسی (عمومیت) کا چمن سرسبز و شاداب نہ تھا[۳]۔

---

[۱] نظریہ سلطنت ملنچلی۔ م ۲ نبلا ص ۴۷۰-۴۷۴

[۲] دائرۃ المعارف فرید وجدی (اوربا) ج ۲ ص ۷۲٦ - الاسلام فی عصر العلم ج ۱ ص ۲۳۴۔

[۳] یورپ میں پارلیمنٹ کی بنیاد شاہ ہنری سوم کے عہد میں ۱۲٦۵ء میں ارل سائمن ڈی مانٹفورڈ کے ہاتھوں پڑی لیکن یہ جمہور کے اختیار کا ناقص ظہور تھا جس کو ہنری نے ۱۲٦۱ء میں ختم کر دیا۔ انیسویں صدی تک پارلیمنٹ کا نظام بے حقیقت تھا۔ ۱۸۱٦ء کے انتخاب کے بعد مسٹر پٹ اصغر وزیر اعظم انگلستان نے خود یہ اعتراف کیا تھا کہ "انگلستان کی پارلیمنٹ تمام برطانیہ عظمیٰ کی نمائندہ نہیں ہے بلکہ نام نہاد شہروں، اعلیٰ خاندانوں اور سرمایہ داروں کی قائم مقام ہے"۔ ۱۸۸۹ء میں انگلستان میں دوسرا انقلاب رونما ہوا، اس وقت پارلیمنٹ اپنی معین شکل میں دنیا کے سامنے آئی۔ اسی تاریخ سے آج تک ایوان پارلیمنٹ نے جو ترقی کی ہے اس کے متعلق ماہرین قانون کی رائے ان الفاظ میں قلمبند کی گئی ہے۔ "اگرچہ دنیا کی کوئی مجلس ہاؤس آف کامنز (پارلیمنٹ) انگلستان سے بہتر نہیں لیکن یہ ہاؤس اپنے ترکیبی اصول و طریق کے لحاظ سے مکمل نہیں ہے"۔
یہ ہے پارلیمنٹ کی ابتدا، اس کے مقابلہ میں (شوریٰ) کا سیاسی ظہور ۲ھ ٦۲۲ء میں ہوا یعنی موجودہ پارلیمنٹ سے بارہ سو سال پہلے۔ گورنمنٹ انگریزی کے اصول و طریق حکومت (P. R. S.) لاہور ۱۹۰۳ء ہاؤس آف کامنز نبلا ص ۸۵ - ۱۰۸۔

آرسینس وان میری نے بجا طور پر یہ اعتراف کیا ہے کہ "کائنات ارضی کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جسے ڈیماکریسی (حقیقی جمہوریت) کی بنا پر امتیاز اور فوقیت حاصل ہے۔ انسان کی عمرانی تاریخ سے آج تک اگر صحیح معنی میں کوئی شوروی (پارلیمنٹری اور جمہوری) حکومت قائم ہوئی ہے تو بقسم یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ خلفاء راشدین ہی کی خلافت راشدہ تھی[1]"

زمانۂ حال کی پارلیمنٹ غلط طریقہ پر اولیت کا شرف حاصل کرنا چاہتی ہے موجودہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں بڑے رعب و داب کے ساتھ پارلیمنٹ کی معین تصویر اور اس کے قانونی طریقوں کی تکوین کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن یہ جزئی کام ہے جس کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ حقیقی پارلیمنٹ کا موجد ہے اور یورپ دوسرے درجہ کا کاریگر کیونکہ شوریٰ دنیا کے سامنے اس وقت آیا جب پارلیمنٹ زمین کے کسی حصّہ پر پیدا نہیں ہوئی تھی مسٹر جولیو کسٹلاٹ (Jolivet Castelat) نے اپنی کتاب "قانون تاریخ" میں لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد چار صدی کا زمانہ ایسا گذرا ہے جب دنیا میں عربی تمدن کے علاوہ اور کوئی تمدن نہ تھا[2]" اس بیان کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ یورپ میں شہنشاہیت کی شکست و ریخت اور عوام کے اختیار کا ظہور اسلام ہی کے جمہوری آثار میں سے ایک اثر ہے جس کی صورت بدل دی گئی ہے۔

---

[1] دیکھو نظام العالم والامم جوہری ج ۲ ص ۲۲۴ - جی ڈبلیو برے - عرب ہمیشہ ڈیماکریسی اور شوریٰ کا گہوارہ رہے ہیں"۔ دیکھو برے کی اسلامی سوسائٹی بحوالۂ بالا ج ۲ ص ۲۴۵ -
سروجنی نائیڈو - اسلام نے سب سے پہلے جمہور کی حکومت قائم کی جس کو قانونِ الٰہی چلاتا ہے - حوالہ کے لیے دیکھو - الحدیقہ محب الدین الخطیب مصری -

[2] موسیو رینہ مارشل (Rene Martial) نے اپنی کتاب "فرانسیسی عنصر" میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں عربوں نے اپنے تمدن کے جو آثار چھوڑے ہیں وہ جرمن نسل کے لوگ بھی نہ چھوڑ سکے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام کی شوروی حکومت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی اگر بنی اُمیہ اسلامی جمہوریت کا خاتمہ نہ کرتے اور بنی عباس اور بنی عثمان ان کے بعد شہنشاہیت کو اپنا اصول نہ بناتے اور شوریٰ کی جگہ ولیعہدی کا اصول نہ جاری ہوتا تو مسلمان یقیناً شوریٰ کی تشکیل و ترقی کا کام بھی اتنے ہی شاندار طریقہ پر عمل میں لاتے جس قدر خود شوریٰ نے اپنی سچی عظمت کو ظاہر کیا ہے لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جو کچھ ہوا اس کے یہ معنی نہیں کہ شوریٰ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی معمولی ادارہ ہے اور اُس کو اولیت کا جو شرف حاصل ہے اُس پر کسی دوسرے ادارہ کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ شوریٰ اسلام کی خلاقی کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مستقل ہے۔ سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو خرابیاں پارلیمنٹ کے نظام کی روح بن چکی ہیں اُن کو شوریٰ کے نظام میں خوردبین کی امداد سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔

شوریٰ کی خصوصیات

اسلامی شوریٰ زمانۂ حال کی پارلیمنٹ سے کئی امور میں مختلف ہے۔

۱۔ معین قانون شوریٰ ایک ایسے معین خدائی قانون کا پابند ہے جس کی اصل میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ پارلیمنٹری نظام میں قوم کی مطلق مرضی کو حکومت کی جان گنا جاتا ہے[1]۔ شوریٰ میں یہ مرضی مطلق نہیں ہوتی بلکہ اقتدار اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) کی مرضی کے ماتحت ہوتی ہے[2]۔

۲۔ ایوان ریاست عامہ کی مجلس شوریٰ وحدانی پارلیمنٹ ہے شوریٰ کے مختلف طریقوں

---

[1] گورنمنٹ انگریزی کے اصول (P.R.B.S) ہے پارلیمنٹ کی حکمرانی ص ۱۱۱۔

[2] خدا کا قانون چاند سورج کی طرح ابد تک اپنی اصل پر برقرار رہیگا۔ شوریٰ مملکت کے ارتقائی مدارج میں قواعد وضوابط کو ترتیب دیتی ہے مگر اصل قانون کے خلاف کبھی فیصلہ نہیں دیتی۔

میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس پر ایوان واحد کا اطلاق ہوگا۔

یادداشت | مجلس اہل حل وعقد شوریٰ کی مجلس ہے۔ مگر وہ ہاؤس آف لارڈز نہیں ہے جس کے ارکان موروثی طور پر نامزد ہوتے ہیں اور شاہی شہزادے سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے "شوروی کابینۂ حکومت"

۳۔ رئیس الحکومت کی طاقت | شوریٰ کے نظام میں رئیس الحکومت کی ہستی ایک طاقتور مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ منصب امامت پر فائز ہونے کے بعد اس کا ہر قانونی حکم واجب التعمیل ہے۔ جب وہ حکومت کا عام کام انجام دیتا ہے تو رائے عامہ اور مفاد عامہ کا خیال رکھتا ہے لیکن غیر معمولی حالات کے علاوہ اس کا ہر کام مضبوط حکمت عملی اور قوت کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ اُمت کا ہر فرد ہر وقت اظہار رائے کے لیے آزاد ہے لیکن جہاد عمل کے میدان میں امیر کے احکام سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ریاستِ عامہ کا رئیس ایک طاقتور آمر تو ہے آمر مطلق نہیں ہے، بلکہ اُس کا مقام بے لگام جمہوریت اور بے قید ڈکٹیٹرشپ کے درمیان ہے۔

یادداشت | امام شوریٰ کے فیصلہ سے منتخب ہوتا ہے اس کے انتخاب کے بعد تمام مفرد رائیں مرکب ہو کر پورے نظام کی قوت بن جاتی ہیں۔ اب نہ وہ وقت معینہ پر بار بار بے وجہ بدلتا ہے اور نہ اس کے کابینۂ حکومت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس سے پارلیمنٹ محروم ہے[۱]۔

۴۔ ترکیبی حیثیت | "شوریٰ" مستقل نمائندہ اور نیابتی ایوان نہیں ہے۔ اور نہ وہ انتخاب کے ان قوانین، طریقوں اور صورتوں کا پابند ہے جو سرمایہ دار شہریتوں اور جمہوریتوں کا طغرائے امتیاز ہیں اور جن کی رو سے بسا اوقات جمہور کی صحیح نمائندگی ناممکن ہو جاتی ہے[۲]۔

---

[۱] زمانہ حال کی جمہوری پارلیمنٹ میں حکومت کا مرکز بے حد کمزور ہے جس کی وجہ سے اُس کا رجحان ٹوٹنے کی طرف رہتا ہے، اس کا صدر بدلتا رہتا ہے۔ وزارتی انقلاب تیزی سے رونما ہوتا ہے قوت عاملہ آتی جاتی رہتی ہے۔ جمہوری پارلیمنٹ کی یہ کمزوری ڈیموکریسی (عمومیت) کی توسیع کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور طوائف الملوکی سے ہاتھ ملانے پر تیار رہتی ہے۔ دیکھو نظریۂ سلطنت بلنچلی (نیابتی عمومیت کے اقتدار کی کمزوری ۴-۶ ب ۲۳ ص ۴۹۳۔

[۲] (بر صفحہ ۴۷۱)

جمہور کی سچی مرضی اور حقیقی مشورہ شوریٰ کی جان ہے۔ اصل شوریٰ رائے عامہ کا اظہار ہے۔
معین ایوان نہیں ہے۔ ایوان کی حیثیت کا انحصار حالات اور وقت کے واجبات پر ہے۔
قانون میں شوریٰ کے طریقے اور تاریخی صورتیں موجود ہیں امام کو اختیار ہے کہ وہ امن و جنگ
اور صلح و نظم کے لحاظ سے جیسا زمانہ ہو اُسی کے موافق شوریٰ طلب کرلے۔ اس کے معنی یہ
ہیں کہ اسلامی قانون ایک جامد ایوان کی جگہ بدلتی سدلتی ہوئی دنیا کے ارتقاء پذیر حالات
کا لحاظ رکھتا ہے۔ امام وقت کی مناسبت سے ماہرین کی مجلسِ شوریٰ بھی بلا سکتا ہے مجلسِ
نمائندگاں بھی طلب کرسکتا ہے۔ استصواب رائے عامہ بھی کرسکتا ہے۔ اور دوسری صورتوں
پر بھی عمل کرسکتا ہے۔

یادداشت | اگر دنیا کے حالات کا تقاضا ہو تو شوریٰ متعین قوانین اور معین ایوان کی حیثیت قبول کرسکتا
ہے۔ بشرطیکہ جمہور کا مفاد اس کے حق میں ہو۔ اور اسلام کے اساسی قوانین کا لحاظ رکھا جائے۔

۵ جماعت بندی | شوریٰ۔ ایک متحدہ شیرازہ بند نظام ہے۔ جس میں افراد آزادیِ ضمیر کے ساتھ
شریک ہوسکتے ہیں۔ شوریٰ کے ایوان میں مستقل جماعت بندی (پارٹی سسٹم) نہیں ہے[۵]۔ نہ برسرِ
اقتدار اکثریت ہے، اور نہ اقتدار سے محروم اقلیت۔ نہ مزدور، کسان اور غریب ہیں، اور نہ اونچے
نیچے طبقے ہیں بلکہ وہ ایک متحدہ[۲] ایوان ہے جس کے ارکان تمام ذمہ داریوں میں یکساں شریک

(حاشیہ صفحہ ۰۰) [۲] پارلیمنٹری انتخاب کے جملہ طریقوں کی تکمیل سرمایہ داری کے بغیر ناممکن ہے، حالانکہ جمہور ہمیشہ سے غریب ہیں۔ پارلیمنٹ کے سرمایہ دار ارکان ایک معین ایوان میں پانچ سال تک عوام کے نام پر کام کرتے ہیں۔ اس عرصہ میں عوام کے خیالات بدل جاتے ہیں مگر پارلیمنٹ کے ارکان ووٹروں کی رائے کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ایوان سے علیحدہ نہیں ہوسکتے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] اسلامی عہد میں سقیفہ کے موقع پر صرف ایک مرتبہ انصار و مہاجرین نے دو جماعتوں کی حیثیت سے بحث کی تھی لیکن شوریٰ کے فیصلے نے یہ طے کردیا کہ اسلامی معاشرے کا اتحاد اصل شے ہے اور اُس کا باقی رہنا ضروری ہے۔ [۶] تاریخ میں بار بار جماعت بندی کرنے کے بعد مسلمان متحد ہوجاتے تھے۔ اس کی بناپر ایک مغربی فاضل (باقی برصفحہ ۴۷۲)

ہیں۔ اور مساوی اقتدار کے مالک ہیں۔ ایوان کا اہم عنصر فرد ہے اور ایوان مجموعۂ افراد کا نام۔ فرد کو ضمیر اور رائے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ ہر فرد ہر وقت رائے کا اظہار کرسکتا ہے اور مناسب مشورے سے کارگر بحث کا آغاز کرسکتا ہے چونکہ فرد مشورہ دینے میں قوم کا امین ہوتا ہے اور اُس کو اپنی سچی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے ایک فرد جماعت سے زیادہ اچھا کام کرگزرتا ہے۔ اس طرح جمہوریت کی سب سے بڑی خوبی عمومیت (ڈیماکریسی) برروئے کار آجاتی ہے اور ایوان شوریٰ جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری غیر عادلانہ جماعت بندی سے محفوظ ہوجاتا ہے۔[۱]

عمومیت (ڈیماکریسی)

عمومیت، شوریٰ کے تعامل کی اساس ہے۔ اس نظام میں جبّار شہنشاہیت کا کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۱) (سناوک ہرگرونشے پروفیسر لیڈن یونیورسٹی) لکھتا ہے کہ "اتحاد اور اجتماع اسلام کی ہمہ گیر فطرت کا نام ہے جو ان کو جماعتی لڑائیوں کے بعد بھی متحد کردیتی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] موجودہ جماعتی اور طبقاتی جنگ جس نے نظم عالم کو درہم برہم کر رکھا ہے اور نہ ختم ہونے والے اختلافات زمانۂ حال کے پارلیمنٹری نظام کی پیداوار ہیں اسلام اس تقسیم و تفریق کے خلاف ہے وہ سوسائٹی کی بنیاد جمہور کے مفاد پر، جمہور کی نگرانی پر رکھتا ہے اور تمام طبقوں کو حقوق اور معاشرت کی مساوی سطح پر رکھتا ہے۔ عصر حاضر کے ایوانوں میں تین طرح پر حکومت کا کارخانہ چل رہا ہے۔ یا تو کسی ایک مسلک کی جبری حکومت ہے یا کسی ایک قابو یافتہ اکثریت کی یا کسی مطلق العنان اقلیت کی۔ شوریٰ ان میں سے کسی طرز کو گوارا نہیں کرتا۔ اگر فرد کو اختلاف کا حق ہے تو اس اختلاف کی طاقت کمزور رہتی ہے اور اس کا فائدہ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ فرد کو دو ہدایتیں ہر وقت ذہن میں رکھنی پڑتی ہیں

۱۔ اختلاف اُمتی رحمۃٌ (الجامع الصغیر سیوطی (حدیث ۲۸۸) بحوالہ المقدسی والبیہقی۔ ج ۱ ص ۳۹) اُمت کا اختلاف رحمت ہے۔ اختلاف رائے میں صرف وہی اسلوب اختیار کرنا جائز ہے جو تمام سوسائٹی کے لیے موجب رحمت ہو۔

۲۔ المستشار موتمن (ادب الدین والدنیا (لماوردی) عن عائشۃ عن النبی صلعم ص ۲۰۲ رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی عن ابی ھریرۃ) شوریٰ میں رائے دینے والا فرد امانت بردار ہے، اس کو رائے اس طرح دینی چاہیے جیسے ایک امین دوسرے کی امانت ادا کرتا ہے۔

وجود نہیں۔ شوریٰ کی حکومت میں نہ تاج ہے نہ عرشِ سلطنت ہے نہ شاہی دربار ہے نہ شہنشاہ ہے نہ شاہی شہزادے اور نہ سرمایہ دار اور جاگیردار

یادداشت | عمومیت کی خصوصیت یہ ہے کہ حکومت میں عوام کا اختیار کارفرما ہو۔ رنگ و نسل کا امتیاز نہ ہو، سرمایہ داری کا بیجا غلبہ نہ ہو، ایوان کے ہر کام میں سادگی اور کفایت کا دخل ہو تاکہ عامی سے عام شخص بھی حکومت کو اپنی چیز سمجھے۔ شوریٰ اس قسم کی تمام خصوصیتوں کی حامل ہے۔

عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے چاروں دور اس امر کی دلیل ہیں کہ تاریخ کے کسی عہد میں کسی قوم نے اسلام کی طرح مثالی عمومیت نہیں قائم کی۔ اسلامی دور میں انتخاب کے لیے بہت ہی سادہ تعامل تھا، جس میں سرمایہ داری کا ذرا اثر نہ تھا رائے دہی کے لیے ایک شرط تھی انسان ہو، اور جو اسلام کے قانون کا پابند۔[1]

دفعہ (۲۱) امامت کبریٰ کا دفتر

امامت کبریٰ کے دفتر سے رہنمائے مملکت (لیڈر آف دی اسٹیٹ Leader of the state) کا مرکزی دفتر مراد ہے۔ اس دفتر کے عناصر ترکیبی اور عہدیدار حسب ذیل ہیں:۔

امام ملت حکومت اور مملکت کا قائداعظم، ریاست عامہ کا سب سے بڑا رہنما۔[2]

---

[1] اسلامی عہد میں صدیق اکبرؓ کی۔ سعد بن معاذ مدنی، سلمان فارسی، صہیب رومی، عبداللہ بن سلام (اسرائیلی) بلال حبشی، زید بن ثابت اور اسامہ بن زید (غلام اور غلام زادہ ہونے کے باوجود) یکساں حقوق کے مالک تھے۔

[2] جرمنی کے چانسلر کو رائشس فیوہرر (Reishs fuehrer) رہنمائے مملکت کا لقب دیا گیا ہے۔ در اصل یہ لفظ امام کا صحیح ترجمہ ہے اور اسلام کے قانون کی لفظی تقلید ہے۔

۲۔ امین الامۃ (اُمت کا بلند پایہ سیاسی امین) کابینۂ امامت کا رکنِ اعظم[۱] مملکت کا معتمد عام!

یادداشت | اگر اسلامی نظامِ حکومت میں اس عہدہ کو مستقل قرار دیا جائے تو یہ وزیر اعظم کے عہدہ کے برابر اہم ہوگا۔ امین الامۃ کو وزیر فوق العادہ[۲] کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں اور وہ حکم ملنے پر خاص سفارتی فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ عہد نبوی میں حضرت ابو عبیدۃ بن الجراحؓ کو ایک خاص فرمان کے ذریعہ یہ منصب عظمیٰ دیا گیا تھا۔

۳۔ اولوالامر۔ اہل حل و عقد — امامت کے مشیران سیاسی (وزراء) ارباب بست وکشاد[۳]۔

۴۔ کاتب۔ مرکزی محکمہ تحریرات کے کارکن جو دفتر امامت کے احکام کو ضبط تحریر میں لاتے

---

[۱] حضرت ابو عبیدہ رضؓ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نظم حکومت کے سب سے بڑے رکن تھے اُن کو فوق العادہ ذمہ داریاں سپرد کی جاتی تھیں امن وجنگ کی مہمات میں آنحضرت کے ساتھ رہتے تھے انہیں ممتاز ماہر قانون کی حیثیت سے یمن کی خاص مہم پر بھیجا گیا۔ ذات السلاسل (فولادی زنجیروں کے محاذ) پر اُس زبردست مہم کا سردار بنایا گیا جس میں صدیق اکبر اور فاروق اعظم عام ارکان کی حیثیت سے شامل تھے۔

حضور کے وصال کے بعد شورائے سقیفہ میں صدیق اکبرؓ نے تجویز پیش کی " یہ امین الامۃ ہیں ان کو امیر بنایا جائے " فاروق اعظم نے بھی اپنے عہد حکومت میں ان کو قیام امن کی اہم ذمہ داریوں پر فائز رکھا اور اپنے جانشین کا نام تجویز کرتے ہوئے فرمایا اگر ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو میں ان کا نام تجویز کرتا۔ (دیکھو اسد الغابہ۔ ابن الاثیر ج ۲ ص ۸۵-۸۶) البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۵ ص ۳۵۵

[۲] وزیر فوق العادۃ (وہ سفیر جس کو دوسری طاقتوں سے معاہدہ کے لیے مقرر کیا جاتا ہے اور اس کے اختیارات فوق العادہ ہوتے ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ کا قول ہے (نحن رسل رسول اللہ وفی سبیل اللہ) ہم اللہ کے راستہ میں رسول اللہ کے سفراء ہیں۔ الاصابہ ابن حجر عسقلانی ج ۴ ص ۱۱-۱۲۔

[۳] علامہ منصور انصاری کی تصریح ہے اولوالامر وہ منظم جماعت ہے جو اُمت کے حلقہ میں نیابتی طور پر قانون حکومت کو نافذ کرتی ہے، یعنی اہل حل وعقد۔ حکومت الٰہی فارسی "امامت امت" ص ۳۳)

حدیث میں حکومت کے مشیروں کو "اہل الرائے" کا نام دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کے علماء نے اسی لفظ کی بنا پر ان کے لیے اہل حل وعقد[عسہ] کا نام تجویز کیا ہے (عسہ یہ روایت حضرت علی کے حوالہ سے عزم کی بحث میں موجود ہے۔ عسہ دیکھو شرح المواقف سید شریف الامامۃ ج ۳ ص ۲۵۱-۲۵۲، الملل والنحل ج ۱ ص ۱۱۵ - مقدمہ ابن خلدون ص ۲۲ ص ۱۳۵)

ہیں اور اُن کو متعلقہ افراد تک پہنچاتے ہیں۔

یادداشت | عہدِ نبوت میں دفتری نظم و نسق اور صیغہ تحریرات کا کام ارباب انشاء کی ایک ذمہ دار جماعت کرتی تھی۔[۵۱] (تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۱۹) جن کو السجل (رجسٹرار) کہتے تھے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں دفتر نبوت کے ممتاز کاتبوں کے بارہ نام درج کیے ہیں۔ جن میں سے حسب ذیل حضرات نمایاں ہیں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ، معاویہ بن ابو سفیانؓ، علاء ابن الحضرمی، حنظلہ (الاسیدی))۔

۵۔ ترجمان (غیر ملکی زبانوں کے ماہرین) جو دفتر خارجہ میں غیر ملکی دستاویزوں، یادداشتوں اور معاہدوں کا ترجمہ کرتے ہیں اور سیاسی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

یادداشت | عہدِ نبوی میں دنیا کی دوسری طاقتوں سے سیاسی دستاویزوں کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔[۵۳] آنحضرت نے اُسی وقت اپنے صحابہ میں سے چند افراد کو ایشیا، یورپ اور افریقہ کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا اور ان زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد ان کو بحیثیت ترجمان[۵۴] مقرر فرمایا۔

---

۵۱ عن ابن عباس السجل کاتب للنبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ سجل معاہدوں مقدموں اور دفتری احکام کے رجسٹر کو کہتے ہیں اس کو دفتر۔ ان کارکنوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو صیغہ تحریرات کے انچارج ہوتے ہیں۔ (ابو داؤد بحوالہ تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۳۴۷-۳۴۸)

۵۲ مورخ طبری نے لکھا ہے ابی بن کعب صیغہ تحریرات کے اصل ذمہ دار تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں دوسرے اصحاب لکھتے تھے۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۸۲۔ (ذکر من کان یکتب لرسول اللہ)

۵۳ آنحضرت کے عہد میں یورپ میں سلطنت روم سے۔ افریقہ میں مملکت حبش اور مقبوضات مصر سے اور ایشیا میں شہنشاہیت فارس۔ ریاست حیرہ و انبار (عراق) اور ریاست غسان (شام) سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوا تھا۔ (روض الانف ج ۲ ص ۳۵۲-۳۵۹۔

۵۴ زید بن ثابت، عہدِ نبوی میں صیغہ تراجم کے ذمہ دار اعلیٰ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کو یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دیا اور اُنہوں نے اس کی تعمیل کی۔ زید خود کہتے ہیں (ما مرت خمس عشرۃ لیلۃ حتی حذقتہ) "پندرہ دن نہ گذرے تھے کہ میں نے یہود کی زبان میں کمال حاصل کر لیا"۔ (قال الامام احمد... عن خارجہ بن زید ـــ البخاری فی الاحکام عن خارجہ۔ ابو داؤد عن احمد بن یونس قال الترمذی حسن صحیح۔ دیکھو تاریخ ابن کثیر ج ص ۳۴۹

۶ - امین الخاتم - (مہر کا محافظ اعلیٰ) انگلستان کے نظام حکومت میں شاہی مہر بردار (لارڈ پریوی سیل (Lord Prevy Seal) کا عہدہ امین الخاتم کے عہدہ کے مماثل ہے - برطانیہ میں یہ عہدہ اسلامی عہد حکومت سے صدیوں بعد قائم ہوا ہے - آنحضرت اور آنحضرت کے خلفائے راشدین کے دور میں مہر مملکت کو قانونی اہمیت حاصل تھی[1] - یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنتِ برطانیہ کا ظہور بھی نہ ہوا تھا -

دفعہ ۲۲ مجلس وزراء (CABINET)

کابینۂ اہل حل و عقد - (عاملۂ مملکت) مجلس مشیران حکومت (ایڈوائزری کیبنٹ (Advisry cabinet)

یادداشت | امام رہنمائے مملکت کی حیثیت سے امن کی کارفرما طاقت کا مظہر ہو اور وہ اپنے اختیار سے اس مجلس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۵) ابن اثیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت نے زید کو سریانی زبان سیکھنے پر مامور کیا اور انہوں نے اس کو اس امر کی تعمیل کرتے ہوئے یہ زبان سیکھی - اس زبان کے علاوہ زید بن ثابت نے دوسری اجنبی زبانیں بھی سیکھیں - سفیر ایران سے فارسی - دربانِ نبوت سے رومی (یونانی) آپ کے ایک خادم سے حبشی اور ایک تیسرے خادم سے قبطی زبان سیکھی - (عقد الفرید (بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ کرد علی ج ۱ ص ۱۶۳ - نظام الحکومۃ النبویہ کتانی ج ۱ ص ۲۰۳) زید بن ثابت آنحضرت کے حضور میں دوسری حکومتوں اور طاقتوں کو سرکاری طور پر خطوط لکھتے تھے - ان کی زبانوں میں اسلامی فرامین کو لکھتے تھے - اور باہر سے جو پیغام آتے تھے اُن کا ترجمہ کرتے تھے - (عمدۃ - تلمسانی (بحوالہ نبوت و سلطنت - حامد - ص ۹) دوسرے صحابہ بھی غیر ملکی زبانیں جانتے تھے - عبداللہ بن زبیر متعدد غیر ملکی زبانوں پر عبور رکھتے تھے - مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۴۹ (کان لابن زبیر مأتہ غلام وتیکلم مع کل غلامٍ منھم بلغۃ غیر الاخری -

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] معیقیب بن ابی فاطمۃ الدوسی، آنحضرت کی مہر کے امین تھے - عہد صدیقی میں اور اس کے بعد عہد فاروقی میں ان کو بیت المال کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا - آنحضرت کی مُہر چاندی کی تھی اور اُس پر (اللہ رسول محمد) نقش تھا - حضور کی وفات کے بعد یہ مہر خلفاء راشدین کے پاس محفوظ رہی، اور حضرت عثمان کے عہد میں چھ سال بعد پانی میں گر کر گم ہوگئی -
(تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۳۵۵ - ۳۵۶)

کو ترتیب دیتا ہی مجلس ارباب حل وعقد ونظم وانتظام، کا تقرر قابل تقلید قانونی روایات کے مانع ہی۔ یہ مجلس شوروی ہی اور مجلس شوریٰ کا جوہر ہی اور بذاتِ خود ایک بالادست مجلس شوریٰ ہی۔ اس کے ارکان امام کے سیاسی مشیر، دفتر امامت کے وزیر اور اُمت کے معتمد ہوتے ہیں۔ ان میں چند باضابطہ وزرار کی حیثیت سے مقرر ہوتے ہیں اور اپنے صیغوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور بیشتر ارکان مشیران حکومت کی حیثیت سے جن کا کام مشورہ دینا اور ان اہم ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہی جو اُنہیں مملکت کی طرف سے سپرد کی جائیں۔

اس مجلس کے ارکان کی تعداد مقرر نہیں ہی بلکہ حالات کے تابع ہی اور ضرورت کے لحاظ سے کم وبیش ہوسکتی ہی۔ یہ مجلس اسلام کے قانون اور شوریٰ کے سامنے جوابدہ ہی اور امام کے ساتھ مشترکہ ذمہ داری کے اصول پر کام کرتی ہی۔

| قانونی نظائر | (قرانِ عظیم "واجعل لی وزیرًا من اھلی" سورۂ طٰہٰ) (واجعلنا معہ اخاہ ھٰرون وزیرًا الفرقان)

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند عالم سے یہ درخواست کی تھی کہ میرے لیے ہارون کو وزیر مقرر کردیا جائے تاکہ میں مشترکہ طاقت اور مشترکہ ذمہ داری پر فرعون کی شہنشاہیت کا خاتمہ کرسکوں۔ یہ پہلی درخواست تھی جس پر ان الفاظ میں منظوری دی گئی "موسیٰ تمہاری درخواست منظور کرلی گئی ــــ ہارون کو تمہارا وزیر بنادیا گیا"۔

(۲) فرمانِ نبوی :۔ عرب کا کوئی جوانمرد وہ نصب العین لے کر ظاہر نہیں ہوا۔ جو میں لایا ہوں، تم میں سے کون ہی جو اس منصب کی ذمہ داریوں میں میرا وزیر ہو (تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۲) اسلامی حکمت عملی کا یہ پہلا مطالبہ تھا جو ہمارے لیے قانونی سند ہی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ پہلی ہستی تھیں جنہوں نے اسلام کے وزیر کی حیثیت سے مکہ

ہیں حضور کی ذمہ داریوں میں شرکت کی (خل مجتبہ۔ کانت لہ وزیر صدق علی الاسلام
ابن ہشام (روض الانف ج ا، ص ۲۵۸)

۳۔" امیر کے لیے وزیر کی ہستی ایک خداداد بھلائی ہے۔ جب خداوند تعالیٰ اسلامی حکومت کے صدر کے ساتھ بہتر معاملہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے ساتھ مخلص اور صادق وزیر کو وابستہ کر دیتا ہے جو اُسے اہم امور کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اُس کی ذمہ داریوں میں شریک و معاون ہوتا ہے (اذا اراد اللہ بالامیر خیراً۔ عن عائشہ ابوداؤد والنسائی ــ من ولاہ من امر المسلمین الخ رواہ احمد والبزاز مجمع الزوائد الہیثمی ج ۵ ص ۲۱۰۔ باب الوزراء)

۴۔ عہد نبوی میں کابینۂ امامت کے ارکان (امین الامہ ابو عبیدہؓ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، اسید بن حضیرؓ) جن میں صدیق اکبر اور فاروق اعظمؓ مستقل وزیر تھے۔ آنحضرت ان کے متعلق خود فرماتے ہیں (وزرائی من اہل الارض فابوبکر و عمر) ابوبکرؓ اور عمرؓ روئے زمین پر میرے وزراء ہیں (اسد الغابہ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۱۳)

۵۔ سقیفہ میں صدیق اکبر کا خطاب انصار سے (نحن الامراء وانتم الوزراء) ہم میں سے امیر ہوں اور تم میں سے وزیر" (تاریخ ابن کثیر (اعتراف سعد) ج ۵ ص ۲۴۷)

۶۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے انتخاب کے وقت منصب امامت سے انکار کرتے ہوئے فرمایا۔ مجھے امیر نہ بنائیے بہتر یہ ہے کہ میں وزیر بنایا جاؤں نہ کہ امیر (تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۵۲، ۳۵ھ)

مندرجہ بالا نظائر سے کابینۂ وزارت کے قیام کا قانونی وجوب ثابت ہوتا ہے یہاں بطور مثال عہد صدیقی کی وزارت کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

صدیقی وزارت	۱۔ صدیق اکبر صیغۂ صدارت عظمیٰ، قیام امن عامہ، قانون شریعت،

صیغۂ دفاع وجہاد ۔ ۲ عمر بن الخطاب صیغہ عدل ومحاکم عدلیہ ۔ ۳ ۔ ابو عبیدہ بن الجراح صیغۂ مالیات عامہ (بیت المال) ۴ ۔ حضرت علیؓ صیغۂ تحریرات ریاست عامہ ۔ ۵ ۔ عثمان بن عفان صیغہ اخبار واطلاعات ۔ ۶ ۔ زید بن ثابت صیغۂ امور عامہ (دیکھو تاریخ طبری ج ۴ ص ۔ ۵ ۔ تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶۱)

ریاست عامہ کے وزارتی صیغے

اسلامی حکومت میں مملکت کا انتظام چند بڑے صیغوں میں تقسیم ہوتا ہے ۔

ا ۔ امامت کبریٰ (بحیثیت وزارت عظمیٰ) امام اس منصب کے اعتبار سے ریاست عامہ کا صدر اعظم ہوتا ہے ۔ اور شوریٰ، عاملہ، عدلیہ کا رہنما! صیغوں کی تعداد مقرر کرنا ۔ مشیروں کا تقرر اور اُن کی ذمہ داریوں کی تقسیم تنہا اس کا حق ہے ۔ وہ ضروری صیغوں کا کام اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اور باقی صیغوں کے لیے وزیر ومشیر مقرر کر سکتا ہے "

امین الامۃ ۔ امام اپنی بالادست ذمہ داریوں میں سہولت کے لیے اپنے وزیروں میں سے اول درجہ کے مدبر کو امین الامۃ مقرر کر سکتا ہے ۔ امین الامۃ ۔ امام کے اختیارات کا مظہر اتم اور وزیر اعظم کے ہمپایہ ہوگا ۔

وزارتی صیغے

ا ۔ صیغۂ دینی (امور مذہبی ومفاد عامہ) ب ۔ صیغۂ امن عامہ ۔ ج ۔ صیغۂ خارجہ (شعبہ تعلقات ممالک خارجہ) د ۔ صیغہ امور داخلہ عامہ اور انتظام داخلی ۔ ہ ۔ صیغۂ عدل وانصاف (محکمہ دار الفتویٰ ودار القضاء) و ۔ صیغۂ جہاد ودفاع ۔ ز ۔ صیغۂ بیت المال

(محکمۂ مالیات و معاشیات)

دفعہ ۲۳ صیغۂ دینی

فرائض: مذہب کی حفاظت اور اسلام کی عالمگیر اشاعت۔ ارکان اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا انتظام اور نگہداشت۔ قانونِ اسلام اور احکام شرع کی تعلیم و ترویج۔ تمام برائیوں کا خاتمہ اور تمام بھلائیوں کا اجراء۔

صیغۂ دینی کے محکمے | ا۔ محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ یہ محکمہ اپنے عالمگیر حلقۂ اثر میں دو فرض انجام دینے پر مامور ہے۔ دنیا سے تمام برائیوں کے خاتمہ پر اور تمام بھلائیوں کی ترویج پر

ب۔ محکمۂ دعوت و تبلیغ۔ اس محکمہ کے نمائندے اپنے قلمرو میں اور قلمرو سے باہر تمام دنیا میں اسلام کی دعوت لے کر پہنچتے ہیں اور عالمگیر فکری انقلاب کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

ج۔ محکمۂ احتساب (جزا و سزا) یہ محکمہ اسلامی زندگی کے تمام اخلاقی پہلوؤں کا نگراں ہے اور اس کی خلاف ورزی پر مناسب وقتی سزا دینے پر مامور ہے

د۔ محکمۂ تعلیم و تربیت۔ اسلامی اصول پر امت کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتا ہے۔

امیر صیغۂ وزارت صیغہ دینی۔ دینی حکومت کی جان ہے۔ اس لیے ہر زمانہ میں امام ہی اس صیغہ کا امیر ہوتا ہے۔

یادداشت | اسلام میں شیخ الاسلام کا کوئی عہدہ نہیں ہے۔ امت کا رہنما حکومت کا امیر بھی ہوتا ہے اور اسلام کا محافظ بھی۔ شیخ الاسلام کا عہدہ نو ایجاد بدعت ہے جسے سلاطین نے قائم کیا تھا۔ اسلام کا قانون اس کا تحمل نہیں کرتا۔

قدیم زمانہ کی طرح اس زمانہ میں بھی تمام برائیوں، ہر قسم کی بدمعاشیوں (شراب، جوا، سود،

عیاشی، بدکاری، جھوٹ، فریب، لوٹ کھسوٹ، دھوکہ بازی) کو قانونی جواز حاصل ہے۔ ان سب چیزوں کو یکسر ختم کرنے کے لیے جو قوت درکار ہے اُس کا سرچشمہ امام ہی کی ذات ہوسکتی ہے۔

وزارت دینی کی تشکیل

امام۔ (بحیثیت امیر شریعت اور وزیر امور دینی)

امین الامۃ[1]۔ (وزارت شرعیہ کا مشیر اعلیٰ)

نقیب[2] (وزارت شرعیہ کے باضابطہ نمائندے جو مستقل اور مقررہ حلقوں میں کام کے ذمہ دار ہوتے ہیں)

داعی[3]۔ (وہ کارکن جو دنیا کے منطقوں میں اسلام کے حوصلہ مند سفیر بن کر جاتے ہیں)

محتسب۔ وزارت مذہبی کے سپاہی محکمہ امر بالمعروف کے مجاہدین جو سوسائٹی کے زبردست نگراں ہوتے ہیں۔

علماء امت۔ وہ اشخاص جو علم و تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی ذات ایک یونیورسٹی کے برابر ہوتی ہے۔ کبھی مرکز میں کام کرتے ہیں اور کبھی مرکز سے باہر اسلامی تعلیم و تربیت کی راہ میں جانفشانی اُٹھاتے ہیں۔

---

[1] الاصابہ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) عامر (ابوعبیدۃ الجراح) ج ۴ ص ۱۱ (امین ہٰذہ الامۃ ابوعبیدۃ بن الجراح یہ اُن الفاظ کا خلاصہ ہے جو نبی اکرمؐ نے امین الامۃ کو ایک شرعی مہم پر روانگی کے وقت فرمائے۔

[2] پیغمبر اسلامؐ نے اس قسم کے تیرہ نقیب مقرر فرمائے تھے جو اوس و خزرج کے علاقوں کے نمائندے تھے اور دو طرفہ نمائندگی کا فرض انجام دیتے تھے۔ سیرۃ ابن ہشام (۲۱۳ھ) ج ۱ ص ۲۷۶

[3] داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں بہت سے داعی مقرر کیے ہیں۔ دیکھو سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۴۶۲۔ ۶۶۹۔

دفعہ ۲۴ صیغہ امن عامہ

اسلامی حکومت کی حدود اور اس کے عالمگیر حلقہ اثر میں امن و نظم کا قیام اس صیغہ کی ذمہ داری ہے۔

صیغۂ امن عامہ سیاسی نظام کے اعتبار سے درجہ اوّل کی چیز ہے۔ یہ صیغہ صیغۂ دینی کا خادم ہے اور تمام صیغے اس کے فرمانبردار ہیں۔ اس کا کام وزارت امور مذہبی کے بعد اور وزارت جہاد سے پہلے ہے

مذہب عالمگیر امن کا نصب العین پیش کرتا ہے، یہ صیغہ اس کی تعمیل کرتا ہے۔ جب ریاست کا کوئی حلقہ یا دنیا کی کوئی طاقت اس نصب العین کے خلاف حملہ کرتی ہے تو وزارتِ جہاد میدان میں آجاتی ہے۔ صیغۂ جہاد کی کامیابی کے بعد متعلقہ رقبہ کا انتظام پھر اسی وزارت کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔

وزارت امنِ عامہ

۱۔ امام (بحیثیت رہنمائے حکومت اور وزیر صیغہ) صیغہ کا وزیر اور ذمہ دار ہے۔

۲۔ امین الامة[۵۱] (جو امام کے سکریٹری کی حیثیت سے قیام امن کی خاص خاص مہموں میں امام کی نمائندگی کرتا ہے۔

۳۔ امیر الرایہ[۵۲] (علمبردار امن۔ امامت عظمیٰ کے حکم سے قیامِ امن کی خاص مہم پر مقرر ہوتا

---

۵۱ امین الامۃ ابو عبیدہؓ اسی قسم کی ایک مہم میں عمرو بن العاص کے ساتھ مقرر کیے گئے تھے۔ اصابہ ابن حجر ج ۲ ص ۲۵۲

۵۲ سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۲۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قیام امن کی مہم کے موقع پر سعد بن عبادہ کو علمبردار امن کی حیثیت حیثیت سے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا، مگر انہوں نے (باقی بر صفحہ ۴۸۳)

ہراو رہبدامنی کے محاذ پر نرمی اور انسانیت کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔

امیر الامن۔ (انتظامی حاکم جو قیام امن کے فوراً بعد امن کی بقا اور استحکام کے لیے مقرر کیا جاتا ہے یا وہ انتظامی افسر جو امام کے جانشین کی حیثیت سے خاص حالات میں اس خاص عہدے پر فائز ہوتا ہے۔

یادداشت | مکہ میں قیام امن کے بعد عتاب بن اسید بن ابی العیص اس عہدے پر مقرر ہوئے (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۸۸)

قرآن حکیم میں بیت اللہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ یہ پہلا ایوان ہے، انسانیت عامہ کے لیے اس کے حلقہ میں جو انسان داخل ہو جاتا ہے اس کے لیے امن ہے (آل عمران رکوع ۱۰)

حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی۔ رب اجعل ھذا بلداً اٰمناً وارزق اھلہ من الثمرٰت اس شہر کو امن کا دارالخلافہ بنا دے اور اس کے وابستگان کو پُر ثمر اور بہار آفریں زندگی عطا فرما۔ البقرہ رکوع ۱۵

قرآن نے جس امن و خوشحالی کا ذکر کیا ہے۔ اسلامی حکومت اپنے دور میں اسی کا مظہر اتم تھی۔

مورخ وان کریمر نے عہد نبوی کے امن کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔[۱]

آنحضرت نے نئے مذہب کے ساتھ ایک نیا نظام حکمرانی بھی پیش کر دیا جو بالکل جدید اور خاص صورت رکھتا تھا۔ متعدد چھوٹے بڑے اور مختلف اقسام کے قبیلوں کو جو رات دن بدامنی میں مبتلا رہتے تھے آنحضرت کے پیغام نے ایک قوم بنا دیا..... جب آنحضرت کا وصال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۲) شہر میں داخل ہوتے ہوئے یہ نعرہ لگایا "آج جنگ عظیم کا دن ہے آج خون حلال ہے حضرت عمرؓ نے دربار نبوت میں عرض کیا کہ سعد کے ہاتھوں امن خطرہ میں ہے۔ آپ نے سعد کی جگہ حضرت علی کو امیر الرایہ (علمبردار امن) مقرر کر دیا"

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] لے وان کریمر (۳) ص ۳۰۹۔ ۳۱۰ بحوالہ ترجمہ پریچنگ آف اسلام ص ۵۷۔

ہوا تو تمام عرب پر خدا کا امن چھایا ہوا تھا۔

ڈاکٹر آرنلڈ اسی امن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ایک اعرابی نے سُنی وہ چلّا کر بولا۔ افسوس محمد کی وفات پر جب تک وہ زندہ تھا میں دشمنوں سے حفاظت اور امن میں تھا۔[1]

امن و امان کا یہی داعیہ تھا کہ جب مدینہ پہنچ کر آپ نے پہلا خطبہ دیا تو اس کو امن و سلامتی کی دعا پر ختم کیا اور جب آپ دنیا کے سردار کی حیثیت سے دنیا کے دارالسلطنت مکہ میں داخل ہوئے تو اُس وقت صاف طور پر ظاہر ہو گیا کہ دشمنانِ امن سے جنگ کرنے کے بعد امنِ عامہ کا قیام اسلامی حکومت کی پہلی ذمہ داری ہے، دنیاوی نقطۂ نگاہ سے فتح مکہ کا دن بدامنی کا دن تھا، لیکن آپ نے بدترین دشمنوں کے لیے بھی امن کے دروازے کھول دیے اور حکم دیا "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اُس کو امن ہے، جو حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے اُس کو امن ہے جو مسجد حرم میں داخل ہو جائے اُس کو امن ہے، جو گھر کا دروازہ بند کرے اُس کو امن ہے۔[2] یہ پہلا دن تھا جب امن عالم کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا اور اس کے بعد اسلام کے اچھے زمانہ تک کبھی غروب نہیں ہوا۔

دفعہ ۲۵ صیغہ خارجہ

اسلامی حکومت دنیا میں عالمگیر امن کی ذمہ دار ہے، صیغۂ خارجہ اس ذمہ داری کی تکمیل پر مامور ہے۔ یہ وزارت درحقیقت صیغۂ امن و نظم کا ایک شعبہ ہے جس نے مستقل اہمیت حاصل کر لی ہے۔

صیغۂ خارجہ، بیرونی طاقتوں کو باضابطہ امن و سلامتی کا پیغام بھیجتا ہے، سفارتی

[1] ترجمہ پریچنگ آف اسلام ص ۵۷ [2] تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۹۳

تعلقات، اور یادداشتوں کا تبادلہ کرتا ہے اور دنیا میں امن و امان کے مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے معاہدے طے کرتا ہے، اپنے سفراء روانہ کرتا ہے اور دوسری حکومتوں کے سفیروں کو امامتِ عظمیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے۔

یادداشت | زمانۂ حال کے دفاتر خارجہ قومی مفاد کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کا صیغۂ خارجہ انسان کے ہمہ گیر فائدوں کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اور تمام دنیا کو اپنے حلقۂ اثر میں سمجھتا ہے۔ سفراء کا تقرر امامتِ عظمیٰ کے حکم سے ہوتا ہے حکم کی تعمیل کرنا صیغۂ خارجہ کا کام ہے۔

وزارت خارجہ کی تشکیل

امام۔ (بحیثیت رہنمائے حکومت)

وزیر۔ (وہ ہستی جس کو امام دنیا میں قیام امن کا صیغہ سپرد کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے سیاسی اختیارات اس کے حوالہ کر دیتا ہے۔

دفتر خارجہ۔ دفتر خارجہ وزیر خارجہ کے ماتحت ہے۔ اس کی تشکیل زمانہ کی ضرورت، امامتِ عظمیٰ کے عزم اور امت کے مفادِ عامہ پر منحصر ہے۔

سفراء مملکت (سیاسی نمائندے۔ صیغۂ تعلقات خارجہ کا وہ اہم عنصر جو دوسری قوتوں کے سامنے اسلامی حکومت کی نمائندگی کرتا ہے اور ریاست عامہ کی طرف سے سفارت کے فرائض انجام دیتا ہے۔

یادداشت | عہدِ نبوی میں اس منصب پر متعدد اصحاب کا تقرر ہوا۔ بارہا داخلی امن کے مقصد کو تقویت دینے کے لیے سفارتیں بھیجی گئیں اور متعدد مرتبہ عالمگیر امن کے لیے سفراء کا تقرر ہوا

سفراءِ دول ۔ (دوسری طاقتوں اور حکومتوں کے نمائندے جو امامتِ عظمیٰ کے دربار میں حاضر ہو کر نمائندگی کے فرائض انجام دیتے ہیں)

یادداشت | عہدِ نبوی میں دوسری حکومتوں کی سفارتیں اور سفراء اس قسم کی نمائندگی کر چکی ہیں۔ ذیل میں ان سفارتوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

(۱) سفارت بنی خزاعہ (حدیبیہ ۶ھ) صدر سفارت۔ بدیل بن ورقاء خزاعی۔ رسالتمآب نے سفارت کو یقین دلایا کہ سفرِ مکہ کا مقصد جنگ نہیں ہے۔

(۲) قریش کی سفارت اولیٰ (حدیبیہ ۶ھ) سفیر مکرز بن حفص عامری

(۳) قریش مکہ کی سفارت دوم۔ سفیر حلیس بن علقمہ۔ یہ فوجی سفارت تھی۔ سفیر حلیس قبائل کی اتحادی

(حاشیہ صفحہ ۴۸۵) ۔۵ عہدِ نبوی کی سفارتیں :۔

شمار	سفیر	دربار	سنہ روانگی
۱	خراش بن امیہ	قریش مکہ	حدیبیہ ۶ھ
	قریش نے خراش کو قتل کرنے کی سعی کی اس لیے وہ واپس آ گئے۔		
۲	عثمان بن عفان (دوسری سفارت)	قریش مکہ	حدیبیہ ۶ھ
۳	عمرو بن امیہ ضمری	نجاشی (حکومت حبش)	”
۴	دحیہ بن خلیفہ کلبی	قیصر (حکومت روم)	”
۵	عبداللہ بن حذافہ سہمی	کسریٰ (حکومت فارس)	”
۶	حاطب بن ابی بلتعہ	مقوقس (حکومت مصر)	”
۷	عمرو بن عاص سہمی	فرمانروائے عمان	”
۸	سلیط بن عمرو عامری	فرمانروائے یمامہ	”
۹	علا بن حضرمی	منذر بن ساوی (حکومت بحرین)	”
۱۰	شجاع بن وہب اسدی	والی غسان	”
۱۱	مہاجر بن امیہ	ریاست حرث بن عبد حمیری	”

ماخذ۔ دیکھو سیرۃ ابن ہشام (روض الانف) ج ۲ ص ۳۵۲-۳۵۸۔ تاریخ طبری تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۲۶۲ تا ۲۷۷۔

فوجوں کا سردار تھا۔

۴۔ قریش کی تیسری سفارت (حدیبیہ ۶ھ) سفیر، عروہ بن مسعود۔

مندرجہ بالا تینوں سفارتیں مطمئن ہو کر واپس گئیں۔ عروہ جو ماہر سیاست سفیر تھا اس نے قریش کو یہ رپورٹ دی "میں نے قیصر، کسریٰ، نجاشی کی حکومتیں دیکھی ہیں مگر محمدؐ کی سلطنت کی مثال میں نے کہیں نہیں دیکھی اب تم جو مناسب سمجھو اقدام کرو۔

۵۔ سفارت بنی ثقیف (۹ھ) ارکان چھ افراد، صدر وفد۔ عبد یالیل۔

۶۔ ۹ھ میں حسب ذیل علاقوں کی سفارتیں رسالتمآب کے حضور میں باریاب ہوئیں۔

سفارت بنی تمیم (ترجمان سفارت عطارد بن حاجب) سفارت بنی عامر، سفیر عامر بن طفیل۔ سفارت بنی سعد سفیر ضمام بن ثعلبہ۔ سفارت عبد القیس۔ سفیر جارود بن عمر (یا بن بشر)۔ سفارت بنی حنیفہ۔ سفارت بنی طے سفیر زید الخیل۔ سفارت بنی زبید، سفیر عمرو بن معدی کرب۔ سفارت بنی کندہ (۸۰ افراد) سفیر اشعث بن قیس۔ سفارت ازد، سفیر صرد بن عبد اللہ۔

۷۔ سفارت شاہان حمیر (بعد تبوک ۹ھ)

۸۔ سفارت ہمدان۔ سفیر مالک بن عنط کے علاوہ تین اور قبائلی سردار تھے۔

اسلامی عہد کے معاہدے

معاہدوں کا اساسی مقصد | دنیا میں بہت سے عہد نامے ہو چکے ہیں اور ابھی لاتعداد معاہدے ہونگے۔ اسلامی قانون کی رو سے اسلامی معاہدوں کا مقصد اور غایت وہی ہے جو اسلامی حکومت کی غایت ہے۔ نظریۂ توحید کے مطابق تمام دنیا کے تعلقات کی توحید اور تمام انسانوں کی بہتری، ساری دنیا میں امن کا قیام، ظلم کا خاتمہ اور اسلام کی رہنمائی (لیڈر شپ)

میں دنیا کے باشندوں کے معاشی، سیاسی اور اجتماعی حقوق کی مساوات۔ اسلامی حکومت عالمگیر حکومت ہے اور وہ اس حیثیت سے بین الاقوامی تعلقات کو بروئے کار لاتی ہے لیکن معاہدوں کی وجہ سے اصل مقصد سے دستبردار نہیں ہوتی۔

پہلا تاریخی معاہدہ | میثاقِ فضول پہلا معاہدہ ہے جس میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی۔ عبداللہ جدعان زمانۂ جاہلیت میں قبائل قریش کے سن رسیدہ سردار تھے ان کے مکان میں یہ معاہدہ ہوا۔ قریش کے تمام قبائل کے نمائندے اس میں شریک ہوئے اور سب نے اس معاہدے پر دستخط کیے کہ ہم شہر مکہ میں جس مظلوم کو دیکھینگے اُس کے حلیف ہو کر ظالم سے لڑینگے اور ظلم کی تلافی کرائینگے، یہ مظلوم مکہ کا باشندہ ہو یا غیر ملکی سیاح۔[1]

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ "میں اس معاہدے کے وقت موجود تھا اور یہ معاہدہ مجھ کو سُرخ اونٹوں سے زیادہ پیارا ہے اگر اسلام میں بھی کوئی اس قسم کے معاہدہ کے لیے مجھے دعوت دیگا تو میں اُس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نظر آؤنگا۔"[2]

یادداشت | یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت کے جہلا اس معاہدہ پر زیادہ مدت تک عمل نہیں کر سکے مگر مسلمان پہلی صدی ہجری میں خلافت راشدہ کے بعد بھی اس کے پابند رہے۔[3] اُنھوں نے وقت کے جبار اور ظالم انسانوں، طاقتوں اور مملکتوں کی سازشوں کا مقابلہ کیا۔ صرف اس لیے تاکہ امن قائم ہو۔ انصاف بروئے کار آئے۔ انسانی حقوق تسلیم کیے جائیں اور ظالموں کو اتنا بے بس کر دیا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۹۰ حلف فضول۔ [2] یہ معاہدہ عہد معاویہؓ تک بھی مؤثر تھا۔ ولید بن عتبہ حضرت معاویہ کی طرف سے گورنر تھا حضرت امام حسینؓ کو اس سے اختلاف ہوا تو اُنھوں نے فرمایا مجھ کو میرا پورا حصہ دے دیا جائے ورنہ میں مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر میثاق فضول کو پکارونگا۔ حاضرین نے اس کی تائید کی اور گورنر مدینہ کو امامؑ کا حق دینا پڑا۔ [3] روض الانف سہیلی ج ۱ ص ۹۳

جائے کہ اُن کے تاریخی مظالم کی پوری تلافی ہوسکے۔

مکہ میں قریش اسلام کے دینی نظام اور سیاسی اثر کے خلاف تھے۔ آنحضرت نے ان کو ایک طاقتور حریف سمجھ کر معاملات طے کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں اس عہد کے تعلقات میں پیغمبرانہ عزیمت کے علاوہ سیاسی فراست کا اعلیٰ نمونہ بھی نظر آتا ہے۔

آنحضرت نے حریف طاقتوں کے سامنے دو باتیں پیش کیں (۱) جئتکم بخیر الدنیا۔ میں تمہارے لیے دنیا کی بہتری کا پیغام لایا ہوں (۲) قولوا معی لا الٰہ الا اللہ وان تفلحوا میرے ساتھ مل کر خدائے واحد کا نعرہ بلند کرو۔ انسانوں کی اجتماعی بہتری کا نظام بروئے کار آجائیگا۔

ابتدا میں اسلام اور قریش کے درمیان ابو طالب ترجمان تھے۔ قریش بار بار سفارتیں لے کر آتے تھے لیکن آنحضرت ہر بار صرف اس لیے نامنظور کر دیتے تھے کہ اُن کے مطالبات اساسی مقصد کے خلاف تھے۔

ایک مرتبہ عُتبہ بن ربیعہ قریش کے حکم سے نمائندہ بن کر آیا اور اُس نے آنحضرت کے سامنے تین چیزیں پیش کیں۔ خزانہ، سلطنت، عدالت عالیہ کی ججی۔ کیونکہ یہ تینوں پیشکشیں اصل مقصد کی تکمیل میں حارج تھیں اس سبب ان کی بنیاد پر کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔

ابو طالب کی وفات سے کچھ پہلے قریش کے طاقتور سردار (عتبہ، شیبہ، ابوجہل، اُمیہ، ابوسفیان) معاہدہ کرنے کے لیے آئے۔ ابو طالب درمیانی ایلچی بنے پیغمبر خدا نے ارکان سفارت کے سامنے صرف ایک شرط پیش کی "کلمۂ توحید پر متحد ہو جائیے۔ اس کے بعد آپ لوگوں کو دنیا بھر کی حکومت مل جائیگی"۔ اس شرط کو قبول نہیں کیا۔ اور ارکانِ سفارت تالیاں بجا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سفارت ناکام ہوگئی اور ابو طالب نے کہا "اب فیصلہ[1] خدا کے حکم سے ہی ہوگا"۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۵۹۔ وفات ابو طالب

معاہدۂ عقبہ — (عقبہ اوّل اور عقبہ دوم) یہ دونوں معاہدے مدینہ کے قبائل اوس و خزرج سے ہوئے اور ان سے اسلامی قوت کا پارہ بلند ہوگیا۔ قریش مکہ اسلام کی قوت کے ساتھ ہموار نہ ہوسکے ان معاہدوں نے دوسری طاقتوں کو اسلام کی قوت بنادیا اور اسلام کے خارجی اثر کو دنیا کی سرحدوں تک پھیلا دیا۔

معاہدۂ عقبۂ اول (۱۱ سنہ نبوت) — "ہم آنحضرت کے حکم سے سرتابی نہ کرینگے اور تمام فسادانگیز سرگرمیوں سے باز رہینگے اس یادداشت پر مدینہ کی سفارت کے بارہ ارکان نے دستخط کیے۔ اس کے بعد مصعب ابن عمیر آنحضرت کے سفیر مقرر ہو کر مدینہ روانہ ہوئے۔ اس وقت مدینہ میں سخت داخلی جنگ جاری تھی مگر اس معاہدہ نے بے مثال امن قائم کردیا"[1]۔

معاہدۂ عقبۂ دوم (۱۲ سنہ نبوی) — یہ دوسری سفارت تہتر ارکان پر مشتمل تھی۔ ایک تہائی رات گذرنے کے بعد یہ معاہدہ طے پایا۔

ا۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ آنحضرت کی ایسی ہی حفاظت کرینگے جیسی اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔

ب۔ آنحضرت اطمینان دلاتے ہیں جو تمہارا دشمن ہے وہ میرا بھی دشمن ہے، جو تمہارا حلیف ہے وہ میرا بھی حلیف ہے، تمہاری ذمہ داری میری ذمہ داری ہے، میری ذمہ داری تمہاری ذمہ داری ہے تمہاری عزت میری عزت ہے، میری عزت تمہاری عزت ہے

آنحضرت کے تعلقات خارجہ کا بھی وہ مرحلہ ہے جو اسلام کے خارجی تعلقات کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ یہاں اس امر کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ معاہدہ اس وقت عمل

---

[1] اس معاہدہ سے پہلے ۱۰ سنہ نبوت میں مدینہ کے چھ سردار اسلام کی وفاداری کا اعلان کرچکے تھے۔ اس زمانہ میں یہود اور قبائل مدینہ کے درمیان بدامنی موجود تھی مگر وہ آنحضرت کے اثر امن و امان میں تبدیل ہوگئی۔

[2] یہ سفارت حضرت مصعب بن عمیر کی سعی سے مکہ آئی تھی کعب کا بیان ہے آنے والوں میں مسلمان اور مشرک دونوں شریک تھے۔

میں آیا جب اہل مدینہ نے ان اساسی مقاصد کو تسلیم کر لیا جن پر ایمان لانا دنیا کی وحدت اور قیامِ امن کے لیے ضروری تھا چنانچہ اس معاہدہ نے مدینہ کو دنیا کا دارالخلافہ بنا دیا۔

معاہدہ جہینہ جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے چند منزل پر آباد تھا۔ اس سے یہ معاہدہ طے پایا کہ وہ دونوں فریقوں سے برابر کے تعلقات رکھیگا اور غیر جانبدار رہیگا[1]۔ مدینہ کے اس پہلے معاہدہ کو معاہدہ جہینہ کا نام دینا صحیح ہوگا۔

معاہدہ بنی ضمرہ ۲ھ مدینہ سے کچھ دور قبیلہ بنو ضمرہ آباد تھا آنحضرت نے ودان کی مہم کے وقت ابواء میں قبیلہ کے سردار مخشی بن عمرو ضمری سے قیام امن کا معاہدہ کیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ یہ محمد رسول اللہؐ کا تحریری معاہدہ ہے، بنو ضمرہ کو اس بات کی ضمانت دی جاتی ہے کہ ان کا مال اور جان امن میں رہیگا۔ دوسرے حملہ آور کے خلاف ان کی مدد کی جائیگی۔

۲۔ بنی ضمرہ خدائی مذہب کے خلاف محاذ قائم نہیں کرینگے اور جب پیغمبر خدا اُن کو مدد کے لیے بلائینگے تو وہ اپیل کا جواب عمل سے دینگے[2]۔

یہ معاہدہ مدینہ کی پہلی سیاسی مہم کا نتیجہ ہے۔ اس میں قیام امن کا مقصد اصلی بھی موجود ہے اور یہ داعیہ بھی کہ ہر اسلامی معاہدہ کو اساسی مقصد کے مطابق ہونا چاہیے۔

معاہدہ یہود مدینہ ۱ھ اسلام سے پہلے مدینہ میں یہود کا اقتدار اور تسلط تھا، ہجرت کے بعد آنحضرت نے پیغمبرانہ فراست سے کام لے کر یہ طے کیا کہ مدینہ میں جو خارجی طاقتیں ہیں اُن سے معاہدہ کر لیا جائے۔ مدینہ کے اطراف میں یہود کے تین قبیلے تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ۔ انصار میں اوس و خزرج دو بڑے قبیلے تھے۔ حضور اکرمؐ نے یہود و انصار کو ایک صلح کانفرنس میں جمع کر کے اُن کے باہمی روابط کو منظم کر دیا۔ مدینہ میں اسلام کے صیغۂ خارجہ کا یہ پہلا معاہدہ ہے جس سے اسلامی سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل میں زبردست امداد ملی

معاہدہ کی اہم دفعات حسب[3] ذیل ہیں:۔

[1] سیرۃ النبی (علامہ شبلی) ج ۱ ص ۲۸۸۔ [2] روض الانف جلد ۲ ص ۵۸ (غزوۃ العشیر) [3] سیرۃ ابن ہشام ج ۱۔ (مدینہ میں پہلا خطبہ) تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲۴۔

۱۔ یہ میثاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریری دستاویز ہے۔ یہ ایک معاہدہ ہے جو مسلمانوں اور یثرب کے ان لوگوں کے درمیان طے پایا جو ان کے اتحادی بن گئے ہیں اور جہاد کے محاذ پر اُن کا ساتھ دینگے۔

۲۔ خوں بہا کا موجودہ قانون رہی باقی رہیگا، اور دونوں فریق اس معاملہ میں عدل و انصاف کے اصول پر قائم رہینگے۔

۳۔ جو مسلمان امن شکنی کریگا، فتنہ و فساد برپا کریگا۔ قابلِ اعتراض طریقہ اختیار کریگا، سرکشی اور دسیسہ کاری میں حصّہ لیگا دوسرے مسلمان اس کا ساتھ نہ دینگے۔ ایسے مسلمان کو سب مسلمان مل کر سزا دینگے خواہ یہ شخص ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ مسلمان مسلمان کے مقابلہ میں کافر کی مدد نہ کریگا۔ بلکہ جنگ کی صورت میں تعاون سے کام کرینگے۔ مسلمانوں کی صلح ایک ہے، کوئی مسلمان کسی دوسری طاقت سے تنہا صلح نہ کریگا۔

۵۔ یہودیں سے جو لوگ مسلمانوں کے اتحادی رہینگے اُنہیں مذہبی آزادی کا حق ہوگا اور مسلمان اپنے مذہب کے معاملہ میں آزاد ہونگے۔ بنی عوف کے یہود مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی میں داخل سمجھے جائینگے اور اسی طرح دوسرے یہودی قبائل بھی۔

۶۔ سب مسلمان اس معاہدہ سے متفق ہیں، اس سے برگشتہ ہوجانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ فریقین میں اختلاف ہوگا تو فیصلہ کے لیے خدا و رسول کی طرف رجوع کیا جائیگا۔

۷۔ فریقین ایک دوسرے کے معاون اور بہی خواہ رہینگے اور آپس میں سچے مشیروں کی طرح کام کرینگے۔ بشرطیکہ معاملہ جائز ہونا جائز نہ ہو۔

۸۔ مظلوم کی مدد کی جائیگی۔ ظالم ظلم کا ذمہ دار ہوگا۔

۹۔ مدینہ فریقین کے لیے امن کا شہر ہوگا۔ مدینہ میں رہنے والے اور غیر ملکی مسافر کو امن

حاصل ہوگا، اُس کو خدا اور رسول کی پناہ حاصل ہوگی۔ یہاں قتل کرنا اور فساد پھیلانا حرام ہوگا۔

۱۰۔ خارجی تعلقات صرف آنحضرت کی منظوری سے قائم ہونگے۔

۱۱۔ کسی تیسری طاقت سے صلح کی جائیگی تو وہی معتبر ہوگی جس میں دونوں فریق شریک ہونگے۔ مذہبی جنگ اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

مندرجہ بالا معاہدہ اور اس کی دفعات اپنی حقیقت پر آپ گواہ ہیں۔ امن و سلامتی، آزادی اور انصاف کا ہر جوہر اس میں موجود ہے۔ یہ معاہدہ اُن لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو قرآن کی زبان میں "ظلم اور گناہ کی راہ میں تیز رو تھے۔ جھوٹ کے عادی، حرام کھانے میں جری سود خور سرمایہ دار، غریبوں کا مال ناحق ہضم کرنے والے تھے۔ آنحضرت نے اس معاہدہ کے بعد بھی اس قوم کو مزید رعایتیں دیں مگر بدنام اور بدکردار یہودیوں نے ہر رعایت کو نظر انداز کر دیا۔

اس زمانہ میں مسلمان مکہ سے بے وطن ہو چکے تھے۔ مدینہ میں صورتِ حال نازک تھی بیرونی دشمن مدینہ کی دیواروں تک پہنچ کر جارحانہ حملے کر رہے تھے۔ اسلامی نظام ابھی خطرہ میں تھا۔ ایسی حالت میں یہود نے ایک اچھے معاہدہ کو توڑ دیا۔ اُنہوں نے حملہ آوروں کو مدد دی، سازشیں کیں، جاسوسی کی، آنحضرت کی جان لینے کی کوشش کی، خارجی دشمنوں قریش اور داخلی دشمنوں (منافقوں) سے ساز باز کیا جب سازش کھل گئی، مجرموں نے جرموں کا اقرار کر لیا تو اُن کو معمولی سزا دی گئی، دنیا میں جن جرائم کی سزا موت ہے اسلام نے انتہائی نزاکتوں کے وقت بھی ان کی سزا یہ تجویز کی کہ اثر پذیر علاقوں کو خالی کرا لیا۔

معاہدہ حدیبیہ (۶ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شوریٰ کے بعد چودہ سو مسلمانوں کو لے کر ۶ھ میں عازم حج ہوئے۔ جنگ کا ارادہ قطعاً نہیں تھا۔ یہ سن کر جنگجو قریش درندوں کی کھالیں پہن کر اور مسلح ہو کر ذی طویٰ میں جمع ہو گئے۔

آنحضرت عسفان میں خیمہ زن تھے قریش کی خبر سن کر بڑی حسرت سے فرمایا۔

"قریش کو کیا ہو گیا ہے آپس کی لڑائی اور جنگجوئی ان کو کھا گئی ہے، پھر بھی اُس سے باز نہیں آتے کیا ہی بہتر ہوتا کہ یہ مجھ کو اور تمام عرب کو معاملہ کرنے کے لیے چھوڑ دیتے اور درمیان سے اپنا دخل نکال لیتے۔"

آپ کے انسانی احساس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے ثنیۃ المرار پہنچ کر قریش کے ارادوں کا حال معلوم کرنے کے بعد بھی یہی فرمایا "آج قریش صلہ رحمی کے جو حقوق طلب کرینگے میں وہ ان کو ضرور دونگا"۔ یہی وہ احساس تھا جس نے قریش کے ان سفیروں کو موافق بنا دیا جو مخالفت کے لیے آئے تھے[۵۱]۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو آخری سفیر کی حیثیت سے بھیجا یہ سفارت کامیاب ہوئی اور اس کے نتیجہ میں حدیبیہ کا مشہور صلحنامہ طے پایا۔

---

[۵۱] بدیل بن ورقاء پہلا سفیر تھا جس نے سفارت کی مہم سے واپس ہو کر قریش کو بتایا کہ تمہاری جنگی تیاری بے بنیاد ہے۔ قریش کا دوسرا سفیر مکرز بن حفص تھا اور تیسرا قبائلی افواج کا سپہ سالار حلیس بن علقمہ تھا۔ یہ دونوں بھی حضور کے پیام امن کو سن کر مطمئن لوٹے۔ چوتھا سفیر عروہ بن مسعود ثقفی تھا جس نے واپس جا کر قریش کو رپورٹ دی کہ میں نے قیصر و نجاشی کے درباروں میں بھی وہ حکومت نہیں دیکھی جو آج دیکھی۔

جب قریش نے اپنے سفراء کی رپورٹوں اور فیصلوں کو مسترد کر دیا تو مسلمانوں کی طرف سے خراش بن امیہ سفیر بنا کر بھیجے گئے مگر قریش نے ان کے اونٹ کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے اور خود ان کو قتل کرنا چاہا۔ اب حضرت عمر تجویز ہوئے اور آخر میں اُن کی جگہ حضرت عثمان کو بھیجا گیا۔ قریش نے ان کو بھی روک لیا۔ مسلمانوں میں ان کے قتل کی خبر مشہور ہو گئی۔ اس خبر پر آنحضرت نے مسلمانوں کو جمع کیا اور اُن سے موت کا حلف لیا، یہی وہ حلف ہے جس کا نام بیعتِ رضوان ہے۔

قریش نے معاہدہ صلح کی تحریر کے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر اعتراض کیا۔ حضور نے اس اعتراض کو قبول کرلیا اور قریشی روایات کے مطابق باسمک اللھم لکھوا دیا۔ اس کے بعد آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر اعتراض کیا تو آپ نے اس کی جگہ عبداللہ لکھوا دیا۔ اس کے بعد حسب ذیل دفعات قلمبند کی گئیں۔[۵]

۱۔ یہ معاہدہ صلح محمد بن عبداللہ اور سہل بن عمرو عامر کے درمیان طے پایا ہے۔

۲۔ دس سال تک کسی قسم کی جنگ نہ ہوگی، دونوں فریق جنگ سے باز رہینگے۔

۳۔ قریش کا جو شخص بے اجازت محمد کے پاس چلا جائیگا اُس کو مکہ واپس کردیا جائیگا۔ اور جو محمد کا آدمی مکہ آجائیگا اُس کو قریش واپس نہ کرینگے۔

۴۔ جو قبیلہ محمد صلعم کے عہد میں داخل ہونا پسند کریگا اُس کو آزادی ہوگی اور جو قریش کے عہد میں آنے کا آرزومند ہوگا وہ بھی آزاد ہوگا۔

۵۔ آنحضرت اس سال واپس چلے جائینگے، آئندہ سال اپنے اصحاب کے ساتھ آسکینگے۔ جو لوگ اسلحہ ساتھ لائینگے وہ میان میں اور غلافوں میں رکھینگے کھلے طور پر لے کر چلنے کے مجاز نہ ہونگے۔

بیرونی تعلقات کے قیام کا اس سے بہتر نمونہ ملنا دشوار ہے۔ دنیا کا کوئی سیاسی دماغ ایسی حالت میں اس قسم کی شرائط منظور نہیں کرسکتا جبکہ اس کے ساتھ ایک جانباز فوج بھی ہو لیکن آپ نے اسلام کے مطمح نظر کی تکمیل کے لیے اس معاہدے کی پوری پوری پابندی کی۔[۶] حالانکہ حضرت عمر اور حضرت علی جیسے جانباز کمانڈر اس کمزور صلح کے خلاف تھے۔

---

[۵] تاریخ الامم والملوک طبری ج ۳ ص ۷۹ (السنۃ السادسہ)

[۶] معاہدہ کی تکمیل کے بعد ابو جندل قریش کی قید سے فرار ہوکر مسلمانوں سے آملے لیکن سہیل نے تیسری دفعہ کے ماتحت ان کو واپس طلب کیا، ابو جندل نے شور مچایا۔ یا رسول اللہ کیا مجھے پھر دشمنوں کے قبضہ (باقی برصفحہ ۴۹۶)

یادداشت | حدیث و تاریخ اس پر متفق ہے کہ حدیبیہ کا یہی وہ صلحنامہ ہے جس نے فضا کو بدل دیا۔ عرب کے لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام انسانیت اور امن کا پیغام ہے اور مسلمان اس راہ میں اس حد تک صادق ہیں کہ انہوں نے وحشیانہ تشدد کے باوجود قیام امن کی کوششوں کو ترک نہیں کیا۔ انہوں نے جانیں گنوا دیں مگر اس یقین کا دامن نہیں چھوڑا جس کا مقصد و منشا تمام دنیا کو اپنے حلقۂ اثر میں لینا تھا۔

اسلامی صیغہ خارجہ اور دول عالم

اسلامی صیغہ خارجہ کے تعلقات دنیا کی حکومتوں سے | دربار نبوت کے صیغۂ خارجہ نے حبش، روم، فارس، مصر، یمامہ عمان غسان، بحرین کے درباروں میں خاص طور پر سفیر بھیجے۔ ان میں سے ہر سفیر اسلام کی طرف سے امن و سلامتی کا پیغام لے کر گیا۔ نجاشی حبش کے دربار میں عمرو بن اُمیہ جو پیغام لے گئے تھے اس میں حضور اکرم نے لکھا تھا (اسلم تسلم) خدائے واحد کی اطاعت قبول کرو، امن و سلامتی سے بہرہ یاب ہو گے۔ مہاجرین کے متعلق جو تحریری یادداشت بھیجی گئی تھی اس میں یہ درج تھا۔

میں تمہارے سامنے خداوند عرش کی تعریف کرتا ہوں۔ اللہ کی اطاعت کی طرف دعوت دیتا ہوں، مسلمانوں کو پناہ دینا اُن پر تشدد نہ کرنا، میں تم کو اور تمہاری افواج کو خداوند بلند و برتر کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ یہ خیر خواہی کا پیغام ہے اس کو قبول کرنا تمہارا کام ہے امن و سلامتی کا وہی مستحق ہے جو سچی رہنمائی کو قبول کرتا ہے[1]۔

نجاشی نے اس پیغام کو عزت سے قبول کیا اور اچھے عنوان سے اس کا جواب دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۵) میں دے دیا جائیگا اور میں پھر اس ظالمانہ تشدد کا شکار بنونگا۔ حضور نے فرمایا ابوجندل صبر کرو۔ خدا تمہاری آزادی کا جلد سامان کر دیگا میں معاہدہ کی پابندی پر مجبور ہوں۔

حاشیہ صفحہ ہذا [1] تاریخ البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۸۳۔ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۵۲۔

اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ حبش کا امن ایک ہزار سال تک بدستور باقی رہا۔

اسلام کے صیغۂ خارجہ پر یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ اس کا کام ملک گیری ہے اور مقصد شہنشاہیت کو رواج دینا۔ اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی سفارت نہیں مل سکتی جس نے شہنشاہیت کے قیام کے لیے کسی معاہدہ پر دستخط کیے ہوں۔

یادداشت شجاع بن وہب، دربارِ غسان میں معاہدہ کے لیے بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ جو دستاویز تھی اُس میں امن و سلامتی کا پیغام تھا اور حضور نے صاف لکھ دیا تھا (یبقی لک ملکک) "تمہارا ملک تمہارے ہاتھ میں آزاد رہیگا"۔ کسریٰ شہنشاہِ ایران کے نام جو تحریری وثیقہ بھیجا گیا تھا اُس میں بھی یہ پیشکش تھی کہ اسلامی نظام کو قبول کرلیا جائے۔ تمہاری سلطنت سلامت رہیگی[1]۔ یہ پیشکش صحیح تھی کیونکہ اسلام کے بعد حکومت کا مزاج بدل جاتا ہے، فساد مٹ جاتا ہے اور انسانیت کی بہتری باقی رہ جاتی ہے۔ یہ واقعات اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ اسلام کا صیغہ خارجہ عالمگیر امن کے لیے عالمگیر انسانیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو خیالات اس کی طرف منسوب ہیں وہ دل و دماغ کی گمراہی پر مبنی نہیں ہیں۔

تبوک کا معاہدۂ صلح ۹ھ رجب ۹ھ میں تبوک کا صلحنامہ عمل میں آیا۔ جب حضور تبوک پہنچ گئے تو یحنہ بن رُوبہ فرمانروائے ایلہ خود حاضر ہوا، اس نے صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ آپ نے درخواست کو شرفِ قبول عطا کیا اور مندرجہ ذیل صلحنامہ منظور فرمایا۔

۱۔ یہ وثیقۂ امن اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری پر لکھا گیا ہے۔ یحنہ بن رُوبہ اور ایلہ کے شہری ان کا بحری بیڑہ، ان کے سیاح اور مسافر بحری ہوں یا بری اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے امن میں ہیں۔ اس امن میں شام اور یمن کے وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اُن کے حلیف ہیں۔

۲۔ ان لوگوں کو بحری اور بری راہوں سے گذرنے کا حق ہوگا اور وہ ہر چشمہ پر خیمہ زن ہو سکینگے۔

[1] تاریخ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۴ ص ۲۶۸، ۲۷۲۔ تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۰-۲۸۲۔

اس عہدنامہ کا ایک ایک لفظ انسانیت امن اور خوشحالی کے نظام کا آئینہ دار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر مسلم حکومت بھی اسلام کے نظام امن میں برابر کی حصہ دار ہوسکتی ہے۔ اس سے وہ الزام بھی باطل ہوجاتا ہے کہ اسلام نے مذہبی تشدد اور تلوار کی قوت سے غلبہ پایا ہے۔ اسلام کو اور اسلامی حکومت کو انسانیت اور امن کا قیام مطلوب ہے۔ اگر دنیا کی طاقتیں اس صداقت کو محسوس کریں تو وہ خود یہ اعتراف کرینگی اسلام انسانیت کی بہتری کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا۔

صلحنامۂ ثقیف ۹ھ

آنحضرت نے ۹ھ میں ثقیف سے معاہدۂ صلح کیا۔ یہ قبیلہ اسلامی سفیر عروہ بن مسعود ثقفی کو قتل کرچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کو صلح کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت اسلام کی طاقت غلبہ حاصل کر رہی تھی لیکن آپ نے ثقیف کے سفیر عبدیالیل اور اس کے پانچ رفقاء کو باریابی کا موقع عنایت کیا۔ آپ نے سفیر کے چند نامناسب مطالبوں کو ماننے سے انکار کردیا لیکن معاہدۂ صلح کو منظور کرلیا۔ اس صلحنامہ کے الفاظ یہ تھے:[1]

۱۔ یہ تحریری وثیقہ محمد رسول اللہ کی ذمہ داری پر لکھا گیا ہے۔

۲۔ مسلمان ثقیف کے علاقہ میں نہ گھاس کاٹینگے نہ لکڑی، نہ یہاں کے جانوروں کو شکار کرینگے۔

۳۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کریگا اس کو سزا دی جائیگی، جو زیادہ تجاوز کریگا اس کو گرفتار کرکے دربار نبوت میں پیش کیا جائیگا۔ یہ رسول اللہ کا حکم ہے جو اس کے خلاف جائیگا وہ اپنے نفس پر ظلم کریگا۔

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲۔

یادداشت | اس صلحنامہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اسلام کا سیغہ خارجہ صرف اصلاح حال کا منتظر رہتا ہے[1]
اگر ایک سرکش منطقہ کے قاتل افراد بھی قیام امن کے لیے آمادہ ہوجائیں تو اُن کے معاشی حقوق کی
حفاظت کی جاتی ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں اسلامی حکومت کے بڑے سے بڑے شہری کو
سزا دی جاتی ہے، یہ وہ خصوصیت ہے جو موجودہ حکمراں قوموں میں صداقت کے ساتھ نظر نہیں آتی

معاہدۂ بیت المقدس ۱۵ھ | بیت المقدس کا صلحنامہ فاروق اعظم کے عہد کی یادگار ہے مضمون درج ذیل ہے۔

امیں عمر خدا کے ایک بندے اور مسلمانوں کے امیر کی حیثیت سے بیت المقدس کے باشندوں
کے لیے اس معاہدۂ صلح کو منظور کرتا ہوں۔

۲۔ بیت المقدس کے باشندوں کے لیے امان ہے۔ اور یہ امان جان، مال، گرجا صلیب،
تندرست اور بیمار اور قدس کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے۔ گرجاؤں پر قبضہ نہیں کیا جائیگا
نہ اُن کو منہدم کیا جائیگا، نہ ان کی صلیبیں اور اُن کے مال میں کچھ کمی کی جائیگی، نہ اُن کے مذہب
کے متعلق کسی قسم کا جبر کیا جائیگا نہ اُن پر کسی قسم کا جبر و تشدد کیا جائیگا۔[2]

اس معاہدہ میں عیسائیوں کی پاسداری کی وجہ سے یہود کو بیت المقدس میں
قیام کی اجازت نہیں دی گئی۔[3]

---

[1] غیر قوموں کو اسلام قبول کرنے کے لیے جو پیغام بھیجا جاتا ہے اُس کا مقصد بھی اصلاح اور امن و سلامتی کے علاوہ
اور کچھ نہیں۔ اسلام کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید نے نجران میں نبی کریم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بنی حرث
کو بھی پیغام دیا۔ "اسلام قبول کرلو امن و سلامتی کے حلقہ میں رہو گے" ابن ہشام ج ۲ ص

[2] تاریخ طبری ج ص فتح بیت المقدس۔ پریچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) آرنلڈ ص ۳۰،

[3] عیسائی یہود کو حضرت مسیح کا قاتل سمجھتے تھے۔ چونکہ اس حادثہ کا مرکز وقوع بیت المقدس تھا اس لیے
عیسائیوں کی رعایت ضروری تھی۔ رومی مسلمانوں کے حریف تھے۔ مگر معاہدہ میں ان کو امان دیا گیا اور
انہیں رومی علاقوں میں جانے کی اجازت دی گئی۔

یادداشت | قدس کا معاہدہ اسلام کے صیغہ خارجہ کے مقصد کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے۔ اگر اسلام مذہبی تشدد اور دینی تعصب کا قائل ہوتا اور غارتگری کو جائز رکھتا تو فتح قدس سے زیادہ اور کوئی اچھا موقع نہ تھا۔ ایک ایسی حکومت جو محاذ پر فاتح کی حیثیت رکھتی۔ دوسرا مذہب رکھنے والے حریفوں کے علاقہ میں امن انسانیت کا اس سے بہتر مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ دنیا کی تاریخ میں اس پُر امن انقلاب کی مثال نہیں ملتی جو فتح مکہ اور فتح بیت المقدس کے بعد رونما ہوا۔ یہ انسانیت کا انقلاب تھا جس کی مثال دریافت کرنا مشکل ہے مسٹر آرنلڈ نے بجا طور پر یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ دور اندیشی کی ایسی مثال تھی جو عیسائیوں کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔

دفعہ ۲۶ صیغہ امور داخلہ

اسلامی حکومت کے نظام میں داخلی امن و نظم کا کام صیغہ امور داخلہ سے متعلق ہے ریاست عامہ کے شہریوں کے حقوق، جان و مال اور عزت و آبرو کی نگہداشت اس صیغہ کی ذمہ داری ہے۔ یہ صیغہ جمہور کے باہمی معاملات کو درست رکھنے پر زور دیتا ہے صیغہ عدل و انصاف اور صیغہ مفاد عامہ کو اُن کے فرائض کی ادائگی کے قابل بناتا ہے۔ اور حکومت کے اعلیٰ و ادنیٰ حکام کو قانون کے مطابق کام کرنے پر آمادہ رکھتا ہے

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلنہ میں یثرب پہنچ کر اس کو اسلام کی حکومت کا دار الخلافہ قرار دیا اس کا نام مدینہ اور قبۃ الاسلام رکھا، اسے حرم کا خطاب دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے حلقہ امن و نظم میں انسان کی جان و مال اور آبرو کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔[1]

---

[1] مدینہ کا نام مکینہ اور سید البلدان (دار الحکومت اور شہروں کا سردار) بھی ہے۔ وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ۔ ج ۱ ص ۷، ۸، ۱

آنحضرت نے مدینہ میں سب سے پہلے امور داخلہ کی طرف توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں اپنی حکمت عملی کی بنیاد حسب ذیل امور پر قائم کی۔

ا۔ مدینہ کو نظم مملکت کا مرکز قرار دیا اور داخلی نظام کے تمام شعبوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔[1]

ب۔ یہود (بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع) مدینہ کے اطراف میں قلعہ بند مکانوں اور برجوں میں بود و باش رکھتے تھے۔ دولتمند تھے، بااثر تھے اور جنگ کا ساز و سامان رکھتے تھے آپ نے ان سے یہ معاہدہ کیا کہ "انہیں مذہبی آزادی حاصل رہیگی اور وہ زمانۂ امن میں مسلمانوں کے حلیف اور زمانہ جنگ میں رفیق متصور ہونگے"[2] اس معاہدہ سے آغاز کار میں معاملات داخلہ کی تنظیم میں کافی امداد ملی۔

ج۔ قریش مکہ ہجرت کے واقعہ سے شدید برہم تھے۔ اُن کے لیے مدینہ میں مسلمانوں کا اجتماع ناقابل برداشت تھا، اُن کا پروگرام یہ تھا کہ اس نظام پر جارحانہ حملہ کر کے اس کو ختم کر دیا جائے۔ آنحضرت صلعم نے اس کے مقابلہ میں سرحدی دفاع کا انتظام کیا۔ اور حملہ آوروں کو باز رکھنے کے لیے نیم فوجی گشتی مہمیں (جن کو سریہ کہتے تھے) جاری کیں۔[3]

---

[1] مدینہ کے نظم داخلی کے متعلق آنحضرت کے طریقہ کار کا ذکر سیرت و تاریخ کی تمام مستند کتابوں ابن ہشام، طبری ابن اثیر اور ابن کثیر میں موجود ہے آپ نے وقتاً فوقتاً جو احکام اس سلسلہ میں نافذ کیے ان میں سے اہم درج ذیل ہیں۔

احکام نبوی:۔ کوئی شخص دوسرے شخص پر تلوار نہ اٹھائے۔ امراء حکومت رعیت کی خیر خواہی کریں۔ عوام رئیس حکومت کی اطاعت کریں۔ حکومت حکمت اور تدبر کے ساتھ کی جائے اور شوریٰ کو حکمت عملی کا جز سمجھا جائے۔

(صحیح البخاری کتاب الاحکام۔ فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۵-۱۸۴)

[2] سیرۃ ابن ہشام (روض الانف ج ۲ ص ۱۶ طبع جمالیہ مصر۔

[3] حملہ آوروں کی اطلاع آنحضرت کو ملتی تھی اور آپ اسی اطلاع پر سریہ روانہ کرتے تھے اس سلسلہ کی پہلی مہم کے امیر (کمان افسر) عبیدہ بن حرث تھے۔ اس مہم میں ساٹھ آدمی تھے جنھوں نے ثنیہ مرہ کے قریب دفاعی محاذ قائم کیا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کی ترپن مہموں کا ذکر کیا گیا ہے (طبری ج ۳ ص ۱۲۷ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۱۶ و ۱۴۱)

(د) مدینہ پر اکثر بیرونی حملہ کا خطرہ پیدا ہوتا تھا، آنحضرت شدید مواقع پر محاذ کی کمان کے لیے خود باہر تشریف لیجاتے تھے اور اپنی عدم موجودگی میں مدینہ کا داخلی انتظام اپنے نائب الحکومۃ کو سپرد کردیتے تھے۔ اس قسم کے نائب ہر ایک غزوہ کے موقع پر مقرر کیے جاتے تھے[1]۔

(ہ) مدینہ کی اسلامی ریاست ابتدا میں صرف ایک شہری ریاست تھی۔ چند سال کی تنظیمات کے بعد اس کا رقبہ بڑھ گیا آنحضرت نے داخلی نظم کے لیے اس کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا اور ہر صوبہ پر ایک امیر عامل (گورنر) مقرر فرمایا۔ یہ تھا صیغۂ داخلہ کا پہلا باضابطہ کام جو آئندہ کے لیے تنظیم مملکت کی بنیاد بنا[2]۔

---

[1] آنحضرت کے نائب حکومت (حوالہ کے لیے تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ کے صفحات دیے گئے ہیں)

۱۔ غزوہ ودان وابواء سنہ ۲ ہجری ص ۴۲ نائب الحکومت سعد ابن عبادہ انصاری

۲ " بواط سنہ ۲ھ " " " سعد بن معاذ انصاری

۳ " العشیر سنہ ۲ھ " " " ابو سلمہ بن عبد الاسد

۴۔ " معرکہ العفری (وادی سفوان) سنہ ۲ھ " " " یزید بن حارثہ

۵۔ " بدر الکبریٰ سنہ ۲ھ (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۳) " " عمرو بن ام کلثوم

۶۔ " بنی قینقاع سنہ ۲ھ (ابن کثیر ص ۵۱) " " ابو لبابہ بن منذر انصاری

۷۔ " الکدہ سنہ ۲ھ " " " عمرو بن ام کلثوم

۸۔ " نجران سنہ ۳ھ ص ۵۳ " " " "

۹۔ " احد سنہ ۳ھ " ۵۷ " " "

۱۰۔ " بنی نضیر سنہ ۳ھ " ۶۵ " " "

۱۱۔ " بدر ثانیہ سنہ ۳ھ " ۶۶ " " عبد اللہ بن رواحہ

۱۲۔ " خیبر سنہ ۷ھ " ۸۲ " " سباع بن عرفطہ انصاری

۱۳۔ " فتح مکہ سنہ ۸ھ " ۹۲ " " ابو رہم کلثوم بن حصین غفاری

۱۴۔ " تبوک سنہ ۹ھ " ۱۰۶ " " سباع بن عرفطہ

[2] (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۰۳)

خلیفۂ اوّل صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) اور خلیفہ دوم فاروق اعظم کے عہد میں بھی معمولی صیغۂ داخلہ نے اپنے فرائض بخوبی انجام دیے۔ صدیق اکبر کے زمانہ میں یہ صیغہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک حصہ میں باقاعدہ نظام قائم تھا۔ ملک متعدد صوبوں میں منقسم تھا اور ہر صوبہ پر ایک گورنر حکومت کرتا تھا۔ دوسرا حصہ شام کے محاذ جنگ پر مشتمل تھا۔ یہاں انتظامی حکومت فوجی کمان کے ماتحت تھی۔ فوج کے سپہ سالار ہی اس علاقہ کے گورنر ہوتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۲) ؎۲ عہد نبوی کے امراء اور عامل)

صوبے	صوبائی حکام	صوبے	صوبائی حکام
		۶- صنعاء (یمن)	باذان (العجمی) مہاجر بن اُمیہ
۱- مکہ	عتاب بن اسید انصاری		ابان بن سعید بن العاص
۲- طائف	مالک بن عوف، عثمان ابن ابی العاص	۷- السواحل	ابو موسیٰ اشعری
۳- بحرین	العلاء بن الحضرمی	۸- جند	معاذ بن جبل
۴- عمان	عمرو بن العاص	۹- وادی القریٰ	عمرو بن سعید بن العاص
۵- نجران	سفیان بن الحرب	۱۰- تیماء	یزید بن ابی سفیان
--	-- --	۱۱- یمامہ	ثمامہ بن اثال

دیکھو صحیح البخاری (ماکان یبعث للامراء) فتح الباری کتاب التمنی ج ۱۳ ص ۲۰۵ طبع البہیہ مصر۔ تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۶۷۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎۱ عہد صدیقی کے صوبے اور گورنر

صوبہ	عامل (گورنر)	صوبہ	عامل (گورنر)
۱- مکہ معظمہ	عتاب بن اسید	۹- جُرش	عبداللہ بن ثور
۲- طائف	عثمان بن ابی العاص		
۳- صنعاء (یمن)	مہاجر بن ابی اُمیہ		
۴- حضر موت (رر)	زیاد بن لبید		
۵- جند (رر)	معاذ بن جبل		
۶- زبید رر (معہ رمع)	ابو موسیٰ اشعری		
۷- خولان	یعلی بن اُمیہ		
۸- بحرین	علاء بن الحضرمی		
۹- نجران	جریر بن عبداللہ		

(دیکھو تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۰ حسینیہ مصر)

عہد فاروقی کے صوبے اور گورنر (۲۳ھ)

صوبہ	گورنر
۱- مکہ	نافع ابن عبدالحارث
۲- طائف	سفیان بن عبداللہ الثقفی
۳- صنعاء	یعلی بن منیہ
۴- الجند	عبداللہ بن ابی ربیعہ
۵- کوفہ	مغیرہ بن شعبہ
۶- البصرہ	ابو موسیٰ اشعری

اس حصۂ ملک میں حضرت ابوعبیدہ حضرت خالد، شرجبیل، یزید، عمرو، امرا لشکر جمع تھے
(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۱)

دفعہ ۲۷ صیغۂ جہاد و دفاع

جہاد کا مفہوم، انتہائی قوت سے حملہ آور دشمن کی مدافعت کرنا، جہاد ہے۔ (الجہاد استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو "امام راغب"[1])

جہاد پہلے درجہ میں صرف ایک جد و جہد ہے جو حق و صداقت کے لیے حرکت میں آتی ہے[2] اور اس کو جنگی معرکہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ جد و جہد صرف ایسے ماحول کا مطالبہ کرتی ہے جس میں اسلام کا ضمیر، زبان اور قلم اپنا پیغام دلوں تک پہنچانے میں آزاد ہو لیکن اس وقت جبکہ دشمن طاقتیں علم و عقل کی رہنمائی سے محروم ہو کر مقابلہ پر آجائیں اور اسلام کی طاقت اور اسلامی جماعت کے خلاف تباہ کن سازشیں اور علی الاعلان جنگی تدبیر عمل میں آنے لگیں تو ایسے وقت میں جہاد کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دشمنوں اور ان کے تمام جنگی مرکزوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے[3] اور ان کو فتح کر کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۳)

صوبہ	گورنر	صوبہ	گورنر
۷۔ مصر	عمرو بن العاص	۹۔ دمشق	معاویہ بن ابوسفیان
۸۔ حمص شام	عمیر بن سعد	۱۰۔ بحرین	عثمان بن ابی العاص

(تاریخ الامم طبری ج ۵ ص ۴۲ سنہ ۲۳ھ)

عہد عثمانی میں ماورائے عرب کے حسب ذیل صوبوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بصرہ دار الحکومہ مقبوضات عراق، ایران۔ قنسرین دار الحکومۃ آرمینیہ۔ کوفہ مرکز حکومت آذربائیجان۔ مصر مرکز حکومت مقبوضات شمالی افریقہ۔ شام صوبہ متحدہ اردن فلسطین، دمشق حمص۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] مفردات القرآن امام راغب (جہد) [2] تعریفات سید شریف (طبع استنبول) "الجہاد ہو الدعا الی دین الحق" ص ۵۵۔ [3] کلیات العلوم ابی البقا حنفی الجہاد الدعا الی دین الحق والقتال مع من لا یقبلہ ص ۲۶۰

دم لیا جائے۔

جہاد کا نصب العین | جہاد کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ خدا کا بول بالا رہے۔ قرآن حکیم نے اس نصب العین کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے (کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ وکلمۃ اللہ ھی العلیا) "خدا کے باغی منکروں کا دعویٰ سرنگوں رہے اور اللہ کا بول ہمیشہ بالا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے بھی یہی نصب العین متعین ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک دیہاتی حاضرِ خدمت ہوا اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا "یارسول اللہ ایک شخص مال لوٹنے کے لیے جنگ کرتا ہے، دوسرا شخص ذاتی شہرت کے لیے محاذِ جنگ پر لڑتا ہے اور تیسرا شخص غرور شجاعت کی نمائش کے لیے میدانِ جنگ میں آتا ہے۔ ان میں سے کونسا شخص جہاد فی سبیل اللہ کے نصب العین کو پورا کرتا ہے۔ آنحضرت نے فرمایا (من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ) تینوں میں سے کوئی نہیں بلکہ وہ شخص جو اس لیے جنگ میں حصہ لیتا ہے تاکہ ہمیشہ کلمۃ اللہ بلند رہے اور اللہ کا بول بالا نظر آئے"

جہاد کا یہ نصب العین اتنا صاف ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں اس کے بعد یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اسلام کے بدترین مخالفوں نے بدترین تعصب کے ماتحت جہاد کا جو کچھ مفہوم سمجھا ہے اسلام کا قانون اور جہاد کی تاریخ اس سے بری ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ | اسلام نے جنگ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے (ا) جہاد فی سبیل اللہ وہ معرکۂ جنگ جو خدائے واحد کی راہ میں انسانیت عامہ کی توحید، تنظیم اور فلاح و صلاح کے لیے گرم ہوتا ہے۔ (ب) قتال فی سبیل الطاغوت وہ جنگ جو خدا سے بے پروا ہوکر

لہ عمدۃ القاری شرح بخاری عینی (عن ابی موسیٰ کتاب الجہاد) ج ۶ ص ۵۵۷۔

طاقت کے غرور میں انسانی بہتری کے ہمہ گیر مطمحِ نظر سے علٰحدہ ہو کر لڑی جاتی ہے اور جس کے نتیجہ میں خدا کا نام لینے والی کمزور قوموں، مردوں، عورتوں اور بچوں کو پامال کیا جاتا ہے۔[1]

قرآن نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایماندار انسانوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہوتی ہے اور خدا کے منکر جب لڑتے ہیں تو اُن کی جنگ طاغوتی جنگ ہوتی ہے جس کا اصلی نام شیطانی جنگ ہے۔

قرآن کی رُو سے اس دنیا کے فرمانروائے حقیقی کا منشاء یہ ہے کہ اس کا پیغمبر اور اُس کے فرمانبردار انسان ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ اختیار کریں[2]۔ مسلمان معرکۃ الآراء ہوں تو فی سبیل اللہ[3] اور جان دیں تو فی سبیل اللہ

ایک مرتبہ پیغمبرِ اعظم نے ابوسعیدؓ سے فرمایا "وہ انسان جس نے اللہ کو خوش کر لیا اسلام کو اپنا مذہب بنا لیا اور محمد کو رسول تسلیم کر لیا، جنت پر اُس کا قبضہ ہو گیا لیکن اس مرحلہ پر ایک اور کام باقی ہے جس سے انسان سو درجے بلند ہو جاتا ہے"۔ ابوسعید نے دریافت کیا "یا رسول اللہ اُس کام سے بھی مطلع فرمایئے" آنحضرت نے اس کے جواب میں تین بار ایک ہی نعرہ بلند کیا۔ جہاد فی سبیل اللہ! جہاد فی سبیل اللہ! جہاد فی سبیل اللہ![4]

---

[1] دیکھو قرآنِ عظیم وما لکم لا تقاتلون الخ الذین آمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت الخ پ النساء رکوع ۱۰) طاغوت کا مفہوم۔ دیکھو مفردات امام راغب (معبود من دون اللہ۔ الصارف عن طریق الخیر) دیکھو لفظ طغیٰ (النہایہ ج ۳ ص ۳۲)

[2] قرآنِ عظیم (حکم بنام پیغمبرِ اعظم) فقاتل فی سبیل اللہ۔ النساء آیۃ ۸۴، وجاھد فی سبیل اللہ پ ۱۰ توبہ۔ (حکم بنام جمہورِ امت) جاھدوا فی سبیل اللہ پ ۲ ۲۱۶ بقرہ۔ قاتلوا فی سبیل اللہ پ بقرہ۔ آیۃ ۲۴۴۔ [3] المجاھدون فی سبیل اللہ پ ۵ النساء۔

[4] صحیح مسلم (دیکھو مشکوٰۃ کتاب الجہاد ص ۳۳۴) عن ابی سعیدؓ

حکم جہاد | جہاد ایک فرض ہے عظیم الشان فرض! حکم ہے اور حکم بھی فرمانروائے حقیقی، خداوند ذوالجلال کا:

حکم اور مفہوم حکم | جنگ تم پر عائد شدہ فرض ہے، اگرچہ وہ تمہیں ناگوار ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو بُری معلوم ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ایک چیز تمہیں اچھی لگتی ہو اور وہ تمہارے حق میں اچھی نہ ہو، اللہ ہی جانتا ہے کہ تمہارے لیے کس بات میں بہتری ہے اور کس میں خرابی) اور تم نہیں جانتے (قرآن عظیم سیقول[۲] بقرۃ[۲] آیت ۲۱۶ شیخ الہند متوسط[۴۲])

اسلامی فوج (جُنْد[۲])

"اسلامی فوج" شیرازہ بند مجاہد سپاہیوں کی ترکیب، تنظیم، اتحاد اور اجتماع سے وجود پذیر ہوتی ہے، اس کا ہر فرد صیغۂ جہاد و دفاع کے حکم کی تعمیل کرتا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ پر مامور ہے۔

اسلامی فوج قانوناً خدا کی فوج ہے اور خدا کا اعلان یہ ہے (وانّ جُندنا لھم الغالبون) "بیشک ہماری فوج ہی غالب و فاتح ہے"[۳]

عہدِ سعادت میں اسلام کے دشمنوں کو اپنی فوجی طاقت اور کثرت پر غرور تھا لیکن قرآن نے دشمن فوج کو (اَضْعَفُ جُنْداً)[۴] "ایک بہت ہی کمزور فوج" کا خطاب دیا۔ ان دونوں بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی کم سے کم فوج اور دشمن کے زیادہ سے زیادہ لشکر کے متعلق کیا نظریہ رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی کم

۱؎ قرآن عظیم پ[۲] بقرۃ[۲] کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم[۲۶]

۲؎ قرآن حکیم میں فوج کے لیے جند کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ دیکھو مفردات امام راغب لفظ جند النہایہ ابن اثیر ج ا ص[۲۱۵]

۳؎ قرآن حکیم پ[۲۳] والصّٰفّٰت[۳۷] رکوع[۵] ۴؎ قرآن حکیم پ[۱۶] سورہ مریم[۱۹] رکوع ۵

سے کم فوج کے متعلق اسلام کی روح کیا ہے اور دشمن کی زیادہ سے زیادہ فوج کے لیے اسلام کیا نظریہ رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کے آخری حصہ میں اسلام کی اجتماعی اور عسکری شیرازہ بندی کی طرف نہایت ہی پاکیزہ اشارہ کیا گیا ہے۔ جب خدا کی کمک اور فتح پہنچ جائیگی تو یہ صاف نظر آئیگا کہ انسان فوجوں کی صورت میں اللہ کے دینی نظام میں داخل ہوتے ہیں[1]۔ قرآن کے اس مفہوم سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان اللہ کے دین کی فوج ہیں۔ جن کے لیے فتح منجانب اللہ مقدر ہے[2]۔

سپاہی (مجاہد) اسلامی فوج کے سپاہی کا قانونی نام مجاہد ہے۔ صرف مجاہد نہیں بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ۔ جس کے معنی ہیں خدا کی راہ میں جہاد و جنگ کرنے والا لشکری مجاہد اسلامی فوج میں حاضر رہنے والا رکن ہے۔ اس اعتبار سے ان تمام شہریوں پر فوقیت رکھتا ہے جو فوجی خدمت پر حاضر نہیں ہیں (دیکھو قرآن عظیم) "وہ لوگ جو گھر پر بیٹھے ہیں اور وہ لوگ جو مجاہد فی سبیل اللہ ہیں برابر نہیں ہیں"۔ اللہ نے مجاہدین کو قاعدین (غیر فوجی افراد) پر اجر کے اعتبار سے فضیلت دی ہے[3]۔

ان آیات کی رو سے فوجی سپاہیوں کے حقوق کی فوقیت کا اظہار ہوتا ہے اسلامی حکومت ان کو غیر معمولی اہمیت کے ساتھ پورا کرنے پر مامور ہے۔

فوجی سپاہی کا عقیدہ انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولہو[4] "زندگی نرا کھیل ہے"

---

[1] کشاف زمخشری ج ۴ سورۃ النصر ص ۲۴۹ - (اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجًا)

[2] اسلامی عہد میں فوج کو جند اور افواج کو اجناد کہا جاتا تھا۔ دیکھو النہایہ ابن اثیر ج ۱ ص ۲۴ - باب الجیم مع النون (فی حدیث عمر انہ خرج الی الشام فلقیہ امراء الاجناد الشام الخ) ۱۲

[3] قرآن عظیم پ۵ ، النساء (لا یستوی القاعدون الخ) — فضل اللہ المجاہدین علی القاعدین

[4] قرآن حکیم پ۲۶ سورۂ محمد ۳

(۱) نصرٌ من اللہ وفتحٌ قریب[1] "فتح منجانب اللہ اور فتح جلدی" (ب) وما النصر الا من عند اللہ[2] امداد پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے اللہ! (ج) (انما اموالکم و اولادکم فتنۃ[3]) میدان جنگ میں مال اور اولاد کا تصور ایک فتنہ ہے جس سے محفوظ رہنے ہی میں نجات ہے۔

مجاہد سپاہیوں کا باہمی تعلق | سب سپاہی ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں (اولئک بعضہم اولیاء بعض)

فوجی خدمت سے مستثنیٰ شہری | کمزور، مریض اور تنگ حال شہری فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں۔ لیس علی الضعفاء ولا علی المرضیٰ ولا علی الذین ما ینفقون حرجٌ اذا نصحوا) بشرطیکہ وہ دوسری شکل سے اسلام سے خیرخواہی کا حق ادا کریں۔

فوج کی تشکیل

۱۔ اسلامی فوج کا پہلا دستہ۔ بیس مجاہد سپاہی (ان یکن منکم عشرون[4]) (قرآن حکیم)

۲۔ اسلامی فوج کا دوسرا دستہ۔ سو مجاہد سپاہی (ان یکن منکم مائۃ[5])

۳۔ اسلامی فوج کا تیسرا دستہ۔ ایک ہزار مجاہد سپاہی (فان تکن منکم الف[6])

۴۔ اسپ سوار فوج۔ قرآن عظیم میں اس فوج کو رباط الخیل کا نام دیا گیا ہے اور دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے سوار فوج کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے[7]۔ بدر کبریٰ ۲ھ میں اسلامی

---

[1] قرآن حکیم پ۲۸ الصف ۲/۱۰ [2] قرآن پ۹، الانفال
[3] حوالۂ بالا [4] حوالۂ بالا
[5][6][7] قرآن عظیم سورۂ انفال ۹ یا ایہا النبی حرض المؤمنین علی القتال الخ
[8] سورۂ انفال (ومن رباط الخیل ترہبون بہ الخ

فوج کے ساتھ صرف دو سوار تھے احد ۳ سنہ ھ میں مستقل سوار فوج قائم ہوئی جس کی کمان زبیر بن العوام کو ملی ۹ سنہ ھ میں تبوک کے محاذ پر سوار فوج کی تعداد دس ہزار تک پہنچ چکی تھی جو پوری فوج کا ۱/۳ حصہ تھی۔[ا]

۵۔ فولاد پوش فوجی دستے۔ قرآنِ حکیم نے دنیا میں سب سے پہلے انسان کی طبع ایجاد کو اس بات سے مطلع کیا ہے کہ فولاد کے اندر خداداد فولادی قوت موجود ہے وہ ایک ٹھوس جنگ میں کام کرنے والی شدید اور سنگین چیز ہے۔ جس میں انسان کے لیے بے حد و بے قیاس فائدے ہیں۔

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں قرآن کی اس تحقیق سے پورا پورا فائدہ حاصل کیا۔ یہ بات تعجب انگیز ہے کہ بدر کبریٰ ۲ سنہ ھ میں آپ کی فوج کا ایک سپاہی بھی فولاد پوش نہ تھا۔ احد ۳ سنہ ھ میں آپ نے پہلی مرتبہ سو سپاہیوں کی زرہ پوش پلٹن قائم کی لیکن فتح مکہ کے تاریخی محاذ پر جب آپ نے اپنی دس ہزار فوج کا مظاہرہ کیا تو اُس کا ہر سپاہی فولاد میں غرق تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمی لوہے کے سمندر میں تیر رہے ہیں حضرت عباسؓ نے ابو سفیان کو یہ مظاہرہ ایک ٹیلہ سے دکھایا تو وہ پکار اُٹھا "اب محمد کی حکومت زبردست ہوگئی ہے"۔

۶۔ ایک مکمل فوج۔ ہر وہ فوج جو کسی ایک محاذ پر دشمن کی فوج کا مقابلہ کرے اسلام کے قانون عسکری کی رو سے ایک مکمل فوج سمجھی جائیگی۔ اس فوج کی تعداد حالات کی نسبت اور وقت کی ضرورت کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے۔

[ا] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے (البرکۃ فی نواصی الخیل۔ عن انسؓ) گھوڑے کی پیشانی میں برکت ہے (الخیل معقود فی نواصیہا الخیر الی یوم القیامۃ الاجر والمغنم عن عروہ) گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک بہتری بندھی ہوئی ہے یعنی اجر ہے اور غنیمت" صحیح البخاری کتاب الجہاد۔

عہدِ نبوی میں مختلف محاذوں پر فوج کی تعداد اور تناسب حسبِ ذیل تھا:-

محاذ	اسلامی فوج	دشمن فوج
۱- بدر ۲ھ	تین سو تیرہ ۳۱۳	ایک ہزار ۱۰۰۰
۲- احد ۳ھ	سات سو	
۳- موتہ ۸ھ	تین ہزار	ایک لاکھ
۴- فتح مکہ ۸ھ	دس ہزار	
۵- حنین ۸ھ	بارہ ہزار ۱۲	
۶- تبوک ۹ھ	تیس ہزار	

۷- عام لام بندی (جمع آوریِ افواج) جب بیرونی دشمن کی طرف سے عام حملہ ہو اور جنگ میں جنگِ عمومی کی شان پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں اسلامی فوجوں کی لام بندی اور جمع آوری از روئے حکم فرض ہے۔ اس قسم کے حالات میں ریاست عامہ کے ہر شہری کے لیے فوجی خدمت لازمی ہے۔ (قاتلوا المشرکین کافۃً کما یقاتلونکم کافۃً (قرآن عظیم پ۱۰۔ التوبہ ۹ ۳۶)

۸- فوجی لباس۔ فوج کا لباس خاص ہونا چاہیے، اس کی تجویز اور تیاری میں جداگانہ امتیاز حفاظت اور جنگی ضرورت و مصلحت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

یادداشت | آنحضرت نے جنگِ بدر کی ایک گفتگو میں عوف بن حرث سے جنگی لباس کا ذکر کیا ہے۔

غزوۂ احد میں آپ کے محافظ دستہ کے پچاس تیرانداز سپاہی مکمل سفید وردی میں ملبوس تھے اور آنحضرت خود دو۲ فولادی زرہیں پہنے ہوئے تھے۔

فتح مکہ کے محاذ پر اسلامی فوج کے دس ہزار سپاہی فولادی لباس میں اس طرح غرق تھے

کہ آنکھوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آتا تھا۔ آنحضرتؐ فولادی زرہ کے علاوہ نشانِ امتیاز کے طور پر سُرخ رنگ کی چادر میں ملبوس تھے۔

فتح مکہ کے بعد ایک فوجی افسر نے فاتح فوج کے ہر سپاہی کو توشہ خانہ سے اعلیٰ لباس دیا تھا۔ جسے حضرت علیؓ کی تجویز پر واپس لے لیا گیا تھا۔

۹۔ امیرالافواج (امیرالاجناد) اسلامی افواج کا سالارِ اعظم

| یادداشت | امام تمام اسلامی افواج کا قائدِ اعظم ہوتا ہے کسی ایک فوج یا متعدد فوجوں کے لیے امیرالافواج کا

تقرر اسی کا حق ہے۔

پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں دس سال کے اندر کم وبیش اکیس[1] جنگی محاذوں پر امیر الافواج کے فرائض بذاتِ خود انجام دیے اور پینتیس فوجی مہموں کے لیے امراءِ[2] افواج کا تقرر فرمایا۔

خلافتِ راشدہ کے عہد میں فوجی تنظیم کا کام بڑے پیمانہ پر تھا۔ اس عصر میں عراق، شام اور ایران کے محاذوں پر تمام فوجیں امراءِ افواج کے ماتحت تھیں[3]۔

---

[1] مشہور ترین محاذ۔ بدرالکبریٰ ۲ھ، احد ۳ھ، خندق ۵ھ، موتہ ۸ھ، فتح مکہ، حنین سنہ ۸ھ، تبوک ۹ھ

[2] مشہور ترین امراءِ افواج۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ، ابو عبیدہ بن الجراح، عبدالرحمٰن بن عوف، زید بن حارثہ، عمرو بن العاص۔ آنحضرتؐ کی آخری فوج کے آخری امیر اسامہ بن زید تھے۔ یہ فوج شام کے محاذ کو فتح کرنے کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ دیکھو تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲۔ فتح الباری عسقلانی ج ۱۳ ص ۲۰۵

[3] خلافتِ راشدہ کے مشہور فوجی کمانڈر۔

محاذِ عراق (سنہ ۱۲ھ تا سنہ ۱۴ھ) ۱۔ امیرالامراء خالد بن ولید (محاذ اللیس۔ حیرہ۔ الفراض) ۲۔ امیرالامراء مثنیٰ بن حارثہ۔ محاذ فرات۔ ۳۔ بشیر بن خصاصہ قائم مقام امیرالامراء

محاذ یرموک شام سنہ ۱۳ھ۔ امیرالامراء خالد بن ولید، اس محاذ پر چار منظم فوجیں چالیس ڈویژنوں پر مشتمل تھیں اور ان پر چار کمانڈر مقرر تھے۔ ۱۔ ابو عبیدہ بن الجراح امیر قلب ۲۔ عمرو بن العاص اور شرحبیل بن حسنہ امراءِ میمنہ ۳۔ یزید بن ابی سفیان، امیر میسرہ۔ ۴۔ القعقاع بن عمرو امیر الجند (خاص کمکی فوج) دیکھو تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۷۔ ۱۵۸

محاذِ جنگ کی تشکیل

امیرافواج کا مستقر۔ سپہ سالار افواج کا جنگی ہیڈکوارٹرد جو بلند اور محفوظ جگہ پر قائم ہوتا ہے اور راز کی طرح خفیہ رکھا جاتا ہے[1]۔

سالار افواج کی حفاظت۔ امیرالاجناد (کمانڈرانچیف) کی حفاظت کے لیے طاقتور اور مسلح فوجی دستہ کا تقرر محاذ کی دوسری اہم ضرورت ہے جس کی تکمیل لازماً کی جاتی ہے[2]۔

فوجی حکم کی اطاعت۔ امیرالافواج کا ہر وہ حکم جو مطابق قانون ہو واجب التعمیل ہے[3]۔

نقشۂ محاذِ جنگ
فوجی جاسوسی اور عسکری تفتیش

جنگ کا مدار محاذ جنگ کے نقشے پر ہے۔ دشمن کے محاذ کی حالت، طاقت، فوجی تعداد کا معلوم کرنا امیرافواج کے فرائض میں اہم فرض ہے اس کام کے لیے فوجی جاسوسی اور عسکری تفتیش سے امداد لینی چاہیے۔ اسلامی عہد میں سب سے پہلے بدرالکبریٰ کے محاذ پر محاذ جنگ کے نقشے اور عسکری تفتیش سے باقاعدہ کام لیا گیا[4]۔

---

[1] ۸ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدر فوجی مستقر بالائی مکہ کے بلند حصہ پر قائم کیا گیا تھا۔ ۲ھ میں بدرالکبریٰ کی پہلی فیصلہ کن جنگ میں ایک خفیہ اور محفوظ مقام پر آپ کا ہیڈکوارٹر بنایا گیا تھا۔ جہاں آنحضرت فوجی پریڈ کا معائنہ کرنے کے بعد تشریف رکھتے تھے۔ (سیرۃ ابن ہشام، روض الانف ج ۲ ص ۲۸۰۔ طبع جمالیہ

[2] ۲ھ بدرالکبریٰ کے معرکۂ جنگ میں انصار کے ایک مسلح دستہ نے سعد بن معاذ کی کمان میں اس فرض کو انجام دیا۔ ابن ہشام (روض ج ۲) ص ۶۹۔ جنگ احد ۳ھ میں پچاس تیراندازوں کے ایک دستہ نے عبداللہ بن جبیر کی کمان میں یہی ڈیوٹی انجام دی تھی سیرۃ ابن ہشام (روض جلد ۲)

[3] صحیح البخاری کتاب الاحکام۔ فتح الباری ج ۱۳ ص ۱۰۱۔ باب السمع والطاعت للامام۔

[4] آنحضرت نے بدر کی جنگ سے پہلے عرق الظبیہ میں سب سے پہلے ایک دہقانی سے دشمن کے متعلق تحقیق کی تھی صفرا کے قریب پہنچ کر بسیس بن عمرو اور عدی بن زغبا کو دشمن کی صف کی طرف عسکری تفتیش کے لیے ارسال کیا تھا۔ صفرا پہنچ کر آپ نے محاذ جنگ کے نقشہ کے خطوط پر توجہ کی۔ آپ نے پہاڑوں کے نام دریافت کیے اور ان قوموں کے متعلق علم حاصل کیا جن کی یہاں بودوباش تھی۔ اس کے بعد ذفران سے گذر کر اسافر کے (باقی بر صفحہ ۵۱۴)

فوجی علم (بیرق عسکری) اسلامی فوج کے لیے فوجی علم سربلندی کا ایک نشان ہے جو ہر محاذ پر لہراتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کو الرایہ اور اللواء کے نام سے ذکر کیا گیا ہے علمبردار کو امیر الرایہ اور امیر اللواء کا منصب حاصل ہوتا ہے۔

یادداشت	عہد نبوی میں حسب ذیل محاذوں پر علم نبوی بلند کیا گیا :۔

۱۔ لواءِ اول ثنیہ مرہ ۱ھ۔ امیر الافواج عبیدہ بن حرث امیر اللواء مسطح بن اثاثہ

۲۔ لواء دوم۔ سیف البحر ۱ھ۔ امیر اللواء حضرت حمزہؓ

۳۔ لواء سوم۔ امیر الافواج سعد بن ابی وقاص۔ امیر اللواء المقداد بن عمر۔ وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۹۴

۴۔ لواء چہارم (بیرق ابیض) بدر الکبریٰ۔ امیر اللواء مصعب بن عمیر (ابن ہشام غزوہ بدر)

۵۔ لواء پنجم (بیرق اسود عقاب) بدر الکبریٰ میں دو سیاہ جھنڈے ہراول دستوں کے پاس تھے جن میں ایک کا نام عقاب تھا اور اس کے امیر اللواء حضرت علی بن ابی طالب تھے۔ دوسرا ایک انصاری کے پاس تھا (ابن ہشام بدر) تفصیل کے لیے دیکھو وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۹۴-۱۹۵۔

(بقیہ صفحہ ۵۱۳) ٹیلوں کے بعد بدر پر خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے آنحضرت سوار ہو کر صرف ایک شخص کے ساتھ آگے بڑھے اور ایک بوڑھے شخص سے دشمن کے متعلق دریافت کیا اس سے معلومات لے کر واپس آئے جب بوڑھے نے دریافت کیا کہ تم دونوں کہاں کے ہو تو آپ نے جواب دیا "پانی کے ہیں" وہ یہ کہہ کر رہ گیا کیا عراق کے پانی سے ہو؟۔

شام کو حضرت علی، زبیر، سعد اور چند آدمیوں کا دستہ جاسوسی کے لیے بھیجا۔ یہ دستہ دشمن کے دو آدمیوں کو پکڑ لایا۔ آنحضرت نے ان سے یہ سوالات کیے۔ قریش کے لشکر کی تعداد کیا ہے۔ وہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا، نو دس۔ حضور نے فرمایا معلوم ہوا کہ اُن کی تعداد نو سو یا ہزار ہے۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ قریش نے کہاں چھاؤنی ڈالی ہے اور قبائلی سرداروں میں سے کون کون سے سردار اپنے لشکر کے ساتھ ہیں۔ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد آنحضرت نے فرمایا "یہ مکہ ہے جس نے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے لاکر ڈال دیے ہیں"۔ سیرۃ ابن ہشام غزوہ بدر الکبریٰ۔

محاذ خندق پر سورج طلوع ہونے سے پہلے حضور نے فرمایا۔ کون ہے جو دشمنوں کی خبر مجھ کو لاکر دے اور جنت میں میرا رفیق ہو۔ حذیفہ نے لبیک کہا۔ فوراً گئے اور خبر لائے کہ دشمن طوفان باد کی وجہ سے منتشر ہو رہے ہیں۔ ابن ہشام غزوہ خندق۔ غزوۂ حنین کے محاذ پر عبداللہ ابی حدرد کو ہوازن کے لشکر میں جاسوسی کے لیے بھیجا تھا اور وہ کامیاب واپس آئے تھے۔ ابن ہشام غزوہ حنین۔

محاذ کی تشکیل (ا) قلب فوج کا مرکزی حصہ (ب) میمنہ فوج کا دایاں بازو (ج) میسرہ فوج کا بایاں بازو۔[1]

فوج کی صف بندی ۔ ۲ھ بدر الکبریٰ کے محاذ پر پہلی مرتبہ باقاعدہ صف بندی عمل میں لائی گئی تھی۔ آنحضرت ایک نازک لکڑی کے اشارہ سے صف بندی فرماتے تھے اور ہر سپاہی کو حکم تھا (اِسْتَوُوا) صف کے برابر رہو۔ دیکھو قرآن حکیم "خدا کی نظر میں وہ لوگ محبوب ہیں جو اس کی راہ میں صف بندی کر کے لڑتے ہیں جیسے کہ وہ ایک سیسہ کی مضبوط دیوار ہیں" پ ۲۸ الصف ۶۱

قلعہ بندی ۔ اسلامی فوج کی صف بندی (بنیانٌ مرصوص) سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ہونی چاہیے، محاذ منظم ہو اور اس میں قلعہ بندیاں قائم کی جائیں۔

خندقیں اور کمیں گاہیں ۔ حملہ کے لیے، دفاع کے لیے اور دشمن کو جال میں لینے کے لیے خندقیں اور کمیں گاہیں جنگی لائن کا جزو لاینفک ہیں (واقعدوا لھم کل مرصد)

حملہ کا طریقہ ۔ جب دونوں فوجیں محاذ جنگ پر جمع ہو جائیں تو مجاہد سپاہیوں کا کام یہ ہے کہ وہ حملہ کریں اور گردنیں اڑاتے چلے جائیں فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب[2] پ ۲۶ محمد ۴۷

حالت جنگ ۔ جس وقت دشمن حملہ آور ہو اور صلح و امن کے تمام امکانات ختم ہو جائیں تو اس حالت کو حالتِ جنگ قرار دیا جائے گا۔ اس صورت میں قرآن کے احکام یہ ہیں۔

---

[1] فتح مکہ ۸ھ کے موقع پر محاذ جنگ کی تشکیل اسی صورت سے کی گئی تھی۔ آنحضرت کا ہیڈ کوارٹر قلب میں تھا۔ فوج کا دایاں بازو (میمنہ) خالد بن ولید کی کمان میں تھا۔ جو زیریں مکہ سے شہر کی طرف بڑھا تھا۔ میسرہ زبیر بن العوام کے ہاتھ میں تھا جس نے مقام کدا سے پیشقدمی کی تھی۔ فوج کا وسطی حصہ قلب ابو عبیدہ بن الجراح کی کمان میں تھا جو حضور کے آگے آگے بالائی مکہ سے آگے بڑھا۔ دیکھو سیرۃ ابن ہشام (روض الانف ج ۲) ص ۲۷۰-۲۷۱ [2] بحوالہ بالا ص ۶

مجاہد فوجیں دشمنوں کو محصور کرکے پکڑ لیں، میدان جنگ کے ہر حصہ میں جہاں دشمن کے آدمی نظر آئیں اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ ہر سپاہی یہ سمجھے کہ اس کو فاتحانہ جنگ کی کھلی سند حاصل ہے[۱]۔ اور کوئی دشمن ایسا نہیں جس کو اپنا حلیف، دوست اور اتحادی سمجھا جائے[۲]

طریقۂ جنگ

فوج کشی۔ فوج کشی کے لیے دو صورتیں متعین ہیں ایک ایک دستہ آگے بڑھے اور حملہ کرے، یا تمام فوج مل کر بڑھے اور عام یلغار کرے[۳]

جنگی شعور۔ فوج کشی کا آغاز جنگی شعور کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ امیر افواج کو مرحلۂ اوّل پر مجاہد سپاہیوں کو میدان جنگ میں جوہر دکھانے کے لیے برانگیختہ کرنا چاہیے۔ قرآن کی رو سے مجاہدین کی جنگی روح اس درجہ طاقتور ہونی چاہیے کہ بیس مجاہد دو سو دشمنوں پر غالب ہوں سو ایک ہزار پر، اور ہزار دو ہزار پر[۴]

طرز جنگ (قرآن کے احکام اسلامی فوج کے سپاہیوں کے لیے) "دشمنوں اور ان کے حلیفوں سے جنگ کرو"۔ جنگ میں طاقت اور شدت کا مظاہرہ کرو" جب دشمن تم سے نبرد آزما ہوں تو وہ محسوس کریں کہ تمہارے جسم میں ایک شدید روح ہے۔

محاذ جنگ پر کمزور اور بودے نہ ہو، پیغام صلح کا نام نہ لو۔ فتح تمہاری ہے خدا تمہارا ہے، تمہارے عمل نتائج کے اعتبار سے ہرگز کم نہ رہینگے۔

---

[۱] فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم واولئک جعلنا لکم علیھم سلطانا مبینا۔ پ، النساء
[۲] ولا تتخذوا منھم ولیا ولا نصیرا۔ حوالہ بالا ۱۲
[۳] (فانفروا ثبات او انفروا جمیعا) پ، النساء
[۴] یاایھا النبی حرض المومنین علی القتال "اے پیغمبر مومنین کو جنگ کے لیے برانگیختہ کیجیے" الخ پ، التوبہ

محاذ کے پیچھے محاذ - دشمن سے جنگ کی جائے اور محاذ کے پیچھے جو دشمن کی جو طاقتیں جمع ہیں ان کو بھی درہم برہم کر دیا جائے - جنگ ہو تو پسپا نہ ہو پیٹھ نہ دکھاؤ، فرار نہ ہو - البتہ اگر کسی جنگی تدبیر کے سلسلہ میں محاذ چھوڑ کر پیچھے دوسرا محاذ بنایا جائے اور اس کا تعلق فوجی قوت کو بچانے سے ہو تو یہ صورت مستثنیٰ ہے - اس کے علاوہ جو شخص اپنی جگہ چھوڑ کر پسپا ہوگا اُس کو شدید سزا دی جائیگی -

اختتام جنگ - "جب دشمن کی طاقت کا خون ہو جائے" جنگ جب خود اپنے ہتھیار رکھدے جس وقت دشمن جنگ سے دست بردار ہو کر میدان جنگ سے کنارہ کش ہو جائے یا حقیقی معنی میں صدق دل سے صلح کی خواہش کرے"۔ ایسی تمام صورتوں میں ہر صورت کو خاتمہ جنگ کی علامت سمجھا جائیگا -

جنگی قیدی - قرآن عظیم کا حکم ہے شدید اور فیصلہ کن قتال کے بعد دشمنوں کو جنگی قیدی بنالیا جائے اس کے بعد پہلی بات یہ ہے کہ ان کو احسان کر کے چھوڑ دیا جائے اور دوسری یہ کہ اُن سے زر فدیہ لینے کے بعد رہا کر دیا جائے (فشدوا الوثاق فاما مناً بعد و اما فداء)

اسلام سے پہلے جنگی قیدیوں کے متعلق کوئی قانون نہ تھا، لیکن اسلام نے انتقام کی آگ پر پانی ڈال دیا - اسلامی فوج کو احسان کا حکم دیا اور آسان شرائط پر رہائی کی اجازت مرحمت کی - یہ انسانیت کا ایسا مظاہرہ ہے جس کی مثال مغرب کے مدبرین جنگ آج بھی پیش نہیں کر سکتے - اس زمانہ میں مفتوح کو جنگ کے بعد اربوں پونڈ تاوان جنگ سالہا سال تک دینا پڑتا ہے - اسلام کے قوانین جنگ میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی - یہی وجہ ہے کہ مسٹر اسکاٹ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "اسلام نے جنگ کی بے رحمیوں کو بہت کچھ ہلکا کر دیا ہے - اس نے مفتوحین کو بشرط اسلام پوری آزادی کا حق دیا اور بد قسمت

قیدیوں کو جبر و تشدد سے بچایا۔"[1] یہ اعتراف مبالغہ نہیں ہے بلکہ اسلامی حکمت عملی کے حسن و خوبی پر ایک محتاط اظہار خیال ہے۔

صیغۂ عدل و انصاف

صیغۂ عدل اسلامی حکومت کا ایک مستقل اور اہم ترین شعبہ ہے۔ اس کا نام صیغۂ قضاء اور صیغۂ جزا بھی ہے۔ اس محکمہ کا قیام خدا کے حکم سے عمل میں آتا ہے۔ خدا حکومت کا اقتدارِ اعلیٰ اور انصاف کا سرچشمہ ہے۔ اس کی مرضی یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ کی طرح حکومت کے شعبہ میں بھی عدل اور اعتدال برابر جاری و ساری رہے معمورۂ ارض سے حقیقی معنی میں ظلم اور زیادتی کا خاتمہ ہو جائے اور اس کے تمام بندے صحیح طور پر بسہولت انصاف حاصل کر سکیں۔

اسلامی صیغۂ عدل دنیا کی عدالتوں پر اسلامی عدالت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔ دنیا کی یہ عدالتیں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے انصاف کے گوہر آبدار کو حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں جس نے ایک مرتبہ بھی کسی عدالت کا مُنہ دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ نامبارک عدالتیں انصاف کی رُوح سے خالی ہیں۔ ان سے انصاف حاصل کرنے کے قارون کا خزانہ جھوٹے گواہوں کی فوج رشوت کی تھیلیاں عمرِ نوح اور صبرِ ایوب کی ضرورت ہے۔ بسا اوقات یہ سب چیزیں میسر ہو جاتی ہیں لیکن انصاف حاصل نہیں ہوتا۔[2] اس کے

---

[1] اخبار الاندلس۔ سی پی اسکاٹ ج ۱ ص ۱۰۲ مقدمہ [2] قرآنی احکام (ظالم صاف گمراہی میں ہیں ۳۱/۱۱) (ظالم ایک دوسرے کے معاون ہیں ۴۵/۱۹) (ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا ۲۲/۷۱) (ظالم فلاح نہیں پا سکتے ۶/۲۱) (جو افراد انسانوں پر ظلم کرتے ہیں وہ ملزم ہیں ۴۲/۴۲) (جو ظلم کریگا اس کو فوراً بعد سزا دی جائیگی ۱۸/۸۷)

ہدایت: ۳۱/۱۱ اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔

برعکس اسلام کا صیغہ عدل اصلی معنی میں انصاف کو بروئے کار لانا ہے وہ عدالتوں کی کثرت اور نمائش پر زور نہیں دیتا بلکہ عدل کی حقیقت پر اصرار کرتا ہے۔

(۱) عدل۔ تمام انسان انسانی حقوق میں برابر ہیں (بشرطیکہ پابند قانون ہوں) عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو اس کا حق ملے اور اگر کوئی اس حق پر ہاتھ ڈالے تو جرم کے برابر ظلم کی سزا پائے[1]۔

نظائر ۱۔ امام راغب اصفہانی: "مکافات میں مساوات کا لحاظ رکھنا عدل ہے یعنی نیکی کا صلہ نیکی اور بدی کا صلہ بدی ملنا چاہیے[2]"

۲۔ سید شریف۔ "عدل افراط و تفریط کے درمیان ایک نقطۂ مساوات ہے جو اطراف کو برابر رکھتا ہے، اور حق پر آکر رک جاتا ہے[3]۔

۳۔ ابوالبقا حنفی۔ عدل ظلم کی ضد ہے۔ عدل یہ ہے کہ حقدار کو حق دلایا جائے اور جس کا حق نہیں اُس سے لے لیا جائے[4]۔

۴۔ علامہ عینی۔ "عدل واجب التعمیل احکام کی تعمیل کا نام ہے۔ عدل یہ ہے کہ حق کو تسلیم کیا جائے اور ظلم کا خاتمہ کر دیا جائے[5]۔

---

[1] (ظلم) قرآن نے اسلام کے قانون کی حیثیت سے ظالم قوموں، ملتوں، فوجوں، جماعتوں اور ظالم افراد کے خلاف پرجوش آواز بلند کی ہے۔ قرآن میں ایک سو سے زائد ایسی آیتیں ہیں جن میں ظلم کو ناقابل برداشت اور قابل سزا قرار دیا ہے (دیکھو مصباح الاخوان لتخریج آیات القرآن وزارت جلیلۂ معارف ۱۳۲۲ھ طبع قسطنطنیہ ص ۱۷۵)

[2] العدل ہو المساوات فی المکافات الخ۔ مفردات امام راغب باب العین ص ۸۴-۸۸۔

[3] تعریفات سید شریف (امر المتوسط بین طرفی الافراط والتفریط الخ) باب العین ص ۹۸۔ طبع آستانہ

[4] العدل اصلہ ضد الجور الخ کلیات العلوم ابی البقاء فصل العین ص ۲۶۶۔

[5] العدل امتثال المامورات و بذل الحق الخ۔ عمدۃ القاری شرح البخاری علامہ عینی ج ۱۰ ص ۲۷۵۔

قضاء و جزاء - صیغۂ عدل مملکت کے تمام شہریوں کے حقوق (امن، آزادی اور مساوات) کا محافظ ہے۔ محکمۂ عدل معاملات کا فیصلہ کرنے میں حَکَم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ قانون کی تشریح کرتا ہے۔ قانونی حکم دیتا ہے اور قانون کے مطابق ثابت شدہ حق کو ظاہر کرتا ہے اس لیے اس کو قضا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ اُس کو جزا و سزا کا حق حاصل ہے اس لیے اس کا ایک نام صیغۂ جزا[1] بھی ہے۔

نظائر - حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ "ان القضاء فریضۃ محکمۃ و سنۃ متبعۃ"[2] قضا ایک فرض اور محکم ذمہ داری ہے اور ایک قانون ہے واجب العمل"۔

ابن ہمام حنفی - قضا، وہ ادارہ ہے جو نزاعی مقدمات کا فیصلہ دیتا ہے[3]۔

السرخسی - معاملہ کی حقیقی نوعیت کا دریافت کرنا، فریقین کا بیان سُننا اور اُن کی مُراد کو سمجھنا اور اس کے مطابق فیصلہ دینا قضا کا کام ہے[4]۔

سید شریف - دلائل کی بنا پر حق واجب کو تسلیم کرنا اور ثابت شدہ حق کو حکم سے ظاہر کرنا قضا کی حقیقت ہے[5]۔ (ضمیمہ[6])

قانون عدالت - عدل خدا کا حکم ہے[7]، اس لیے خدا کا قانون ہی اسلامی عدالت کا قانون

---

[1] قولِ عمرؓ میں صیغہ جزاء کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں" ابن کثیر ج ۲ ص ۶۱،

[2] المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۶۰ ادب القاضی - [3] فتح القدیر ج ۶ ص ۳۵۶ (ادب القاضی)

[4] المبسوط ج ۱۳ ص ۴۰ [5] تعریفات سید شریف ص ۱۱۸

[6] (ضمیمہ) قضا قرآن و حدیث میں (قرآنی نظائر) فاذا جاء امر اللہ قضی بالحق (مومن ۹/۷۸) اذا قضی اللہ و رسولہ امراً (سورۂ احزاب ۳۶/۳۳) وقضی بینھم بالقسط (یونس ۵۴/۱۰) دیکھو مفتاح القرآن بیت القرآن لاہور فصل القاف مع الطاء ص ۵۳۹-۵۴۰)

(نظائر احادیث) امن قضی بالحکمۃ عمدۃ القاری شرح بخاری عینی ج ۱۱ ص ۳۷۶-۳۸۴-۲۔ ان الزبیر خاصم رجلاً فقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۷۔

[7] العدل ھو حکم اللہ عمدۃ القاری شرح بخاری عینی ج ۱۱ ص ۳۹۳

کلی ہے

(وما اختلفتم فیہ من شیٔ فحکمہ الی اللہ شوریٰ ۴۲ پ ۲۵) جملہ فیصلہ طلب معاملات میں حاکم عدالت کے فیصلہ اور اجتہاد کا مرجع خدا کا قانون ہے[۱]۔

میزانِ عادل۔ میزانِ عدل کے دونوں پلّے برابر ہونے چاہئیں۔ ہر عدالت کا فرض ہے کہ اس کا خیال رکھے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام پیغمبر اسلامی معاشرہ کے رہنما اور سردار رکھے۔ ان کے ساتھ قانون عدالت اور میزانِ عدل دونوں چیزیں تھیں (وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط پ ۲۷ الحدید ۵۷ رکوع ۳ ع[۲])

(د) مسئولیت انسانی۔ ہر انسان حکومت کے قانونِ عدل کے سامنے جوابدہ اور مسئول ہے

نظائر | ۱۔ ہر انسان اپنے نفس کا نگراں اور ذمہ دار ہے (بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ پ ۲۹ القیامۃ) ۲۔ تمام انسان جوابدہ ہیں (وھم یسئلون پ ۱۷ انبیاء) ۳۔ انسان کا ہر عضو اپنے عمل کا جوابدہ ہے (ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا پ ۱۵ بنی اسرائیل) (بیشک انسان کے کان اور آنکھ اور دل سب جوابدہ ہیں۔ ۴۔ قانون نفسِ انسانی کو انسانی طاقت کے مطابق مکلف قرار دیتا ہے (لا نکلف نفسا الا وسعھا پ ۸ الانعام)

(ہ) ضابطۂ جزا و سزا۔ ہر پابند قانون شہری قانون کی طرف سے اچھا صلہ حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے[۳]

---

[۱] لولا قضی بحکم اللہ فسق اگر خدا کے قانون کے مطابق عدالتیں حکم نہ دینگی تو یہ بدترین جرم ہوگا۔ عمدۃ القاری (اجر من قضی بالحکمۃ) ج ۱۱ ص ۲۷۶ تفصیل کے لیے دیکھو مبحث قانون۔

[۲] قرآن عظیم (والمیزان بالقسط پ الانعام ۶) (بالقسطاس المستقیم پ ۱۵ اسرائیل ۱۷) (ووضع المیزان پ ۲۷ الرحمن)

[۳] ھل جزاء الاحسان الا الاحسان پ ۲۷ رحمن ۵۵)۔ (وان لیس للانسان الا ما سعیٰ وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزئہ الجزاء الاوفیٰ پ ۲۷ النجم ۵۳)

اور ہر قانونی مجرم جرم کے مطابق سزا پانے کا مستحق ہے۔

نظائر | ۱۔ جو انسان ذرہ بھر اچھا تعامل اختیار کریگا وہ اس کا اچھا نتیجہ دیکھیگا اور جو ذرہ برابر بدعملی (جرم) کا ارتکاب کریگا وہ اس کی سزا پائیگا (فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهٗ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهٗ پ ۳۰ الزلزال ۹۹)

۲۔ سزا جرم کے مطابق دیجائیگی نہ زیادہ نہ کم البتہ اصلاح نفس کے لیے سزا کم دی جاسکتی ہے اور معافی بھی ہوسکتی ہے (وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به پ ۱۴ النحل ۱۶) (جزاء سیئة سیئة مثلها۔ پ ۲۵، شوریٰ ۴۲) جو انسان جرم کریگا اُس کی سزا پائیگا (ومن یعمل سوءً یجزبه) کسی فرد کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دی جاسکتی (لا تزر وازرة وزر اُخریٰ پ ، انعام)

محاکم عدلیہ

۱۔ **عدالت عالیہ مرافعہ امامت کبریٰ**[۲]۔ اس اسلامی ریاست عامہ کی سب سے بڑی عدالت مرافعہ (   ) عدالت کا عادل اعظم اور قاضی اکبر مملکت کا قائد اعلیٰ (امام) ہوتا ہے[۳]۔ (اولی الناس بالقضاء الخلیفہ۔ عمدۃ القاری عینی ج ۶ ص ۴۱)

---

[۱] بالعدل والاحسان۔ عدل کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ پ ۱۴ النحل ۱۶)

[۲] قرآن حکیم (نرفع درجات من نشاء پ ۷ انعام ۶) کتاب، حکومت اور نبوت کے ساتھ آیت بالا کا ربط دیکھیے، (یا داؤد ـــــ فاحکم بین الناس الخ پ ۲۳ ص ۳۸)

[۳] پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اپنے عہد میں اس منصب کی ذمہ داریوں کی تکمیل کرتے رہے ہیں۔ (فان جاؤك فاحکم بینهم مائدہ ۵) (اُمرت لاعدل بینکم۔ قول نبوی، ہیں تمہارے درمیان عدل کرنے پر مامور ہوں پ ۲۵ شوریٰ ۴۲)۔ قول اعرابی یا رسول اللہ اقض بیننا الخ عمدۃ القاری عینی ج ۱۱ ص ۴۱۹ عدالت انبیاء کے لیے دیکھو ص ۳۹۳) عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کان رسول اللہ یقضی۔ والخلفا بعدہ المبسوط ج ۶، ص ۸۶ (عہد فاروقی کی عدالت عالیہ مرافعہ اور عدالتی کونسل ـــــ کان عمر اذا رفعت حادثة قال ادعوا لی علیا وزید بن ثابت وابی بن کعب الخ المبسوط ج ۱۶ ص ۱۱۰ ـــــ کتاب القضاء ترتیب ترجمہ ـــــ ترجمہ الیہ الا

۲۔ عدالت عالیہ وزارت عدل ۔ صیغۂ عدل کا وزیر اس عدالت کا رئیس[۱] ہوتا ہے۔

۳۔ عدالت عالیۂ ولایت ۔ یہ عدالت[۲] صوبہ کی سب سے بڑی اور آخری عدالت اپیل ہے۔

۴۔ عدالت فوق العادہ (اسپیشل ٹریبونل)

یہ عدالت خاص حالات میں خاص معاملات کے لیے مخصوص علاقوں میں قائم ہوتی ہے[۳]۔

ابتدائی عدالتیں ۔ ۱۔ عدالت صلح ۔ ۲۔ عدالتِ اصلاح ۔ ۳۔ عدالت تحکیم ۔ ۴۔ عدالت حاکمہ ابتدائیہ)

۱۔ عدالت اصلاح[۴] ۔ (اولین عدالت) عدل کا طبعی منشا یہ ہے کہ معاشرہ کے

---

[۱] عہد صدیقیؓ میں اس منصب پر فاروق اعظمؓ فائز تھے (قال لہ عمر انا اکفیک الجزاء (تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶۱) (لما ولی ابوبکرؓ ولی عمرؓ القضاء سنن کبریٰ بیہقی ج ۱۰ ص ۸۲) فاروق اعظمؓ نے اس عہدہ پر عبداللہ بن مسعودؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ دیکھو حوالہ مندرجہ بالا۔

[۲] اس عہدہ کے چند نظائر :۔ شریح بن الحارث (عہد فاروقی) قاضی عدالت عالیہ بصرہ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۳۹۷) ابوموسیٰ اشعری رئیس مجلس قضا، بصرہ عہد فاروقی ۔ المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۶۰۔ کعب ابن سور عہد فاروقی عادل اکبر ولایت بصرہ ۔ سنن کبریٰ بیہقی ج ۱۰ ص ۸۶ ۔ معاویہ رئیس مجلس قضا، شام (عہد فاروقی) حوالہ بالا ص ۶۵) عبیداللہ بن ابی بکرہ (عہد صدیقی) ولایت سجستان (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۳۸۷) موسیٰ بن انس تابعی (عہد عمرو بن عبدالعزیز) ولایت بصرہ (عمدہ القاری ج ۱۱ ص ۳۹۱) ــــ اسی عہدہ پر حسب ذیل تابعی اور تبع تابعی بھی مقرر ہوئے ہیں ۔ حسن بصری ۔ زرارہ بن اوفی بصرہ میں ۔ عبدالملک بن یعلی ۔ دیکھو عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۳۹۰ ۔ ۳۹۱ (کتاب الحاکم الی عمالہ)

[۳] عہد نبوی میں زیادہ تر اس قسم کی عدالتیں ضرورت کے مطابق قائم کی جاتی تھیں ۔ عہد خلفاء میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں (بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العمال والقضاۃ وکذالک الخلفاء بعدہ سنن کبریٰ بیہقی ج ۱۰ ص ۸۶ آداب القاضی) ــــ عہد نبوی کی خاص عدالتیں ۔ ابوعبیدۃ بن الجراح عدالت نجران ۔ علی مرتضیٰ کرم ۔ معاذ بن جبل ۔ ابوموسیٰ اشعری عدالت یمن (دیکھو حوالہ مندرجہ بالا) عمرو بن العاصؓ بھی اسی قسم کی عدالت کے رئیس مقرر کیے گئے تھے ۔ المبسوط ج ۱۶ ص ۶۷ (اضافی حوالہ عمدۃ القاری عینی ج ۱۱ ص ۳۸۶ ۔ ۳۰۴)

[۴] [illegible] (۵۲۲)

افراد برابر کے حقوق کے مالک ہوں، اور ان کے درمیان تباہ کن اختلاف بالکل پیدا نہ ہو اگر پیدا ہو تو ترقی نہ کرے۔ موجودہ عدالتی نظم اس منشاء کے خلاف ہے۔ اس کا کام عوام کے درمیان مستقل کشمکش کو باقی رکھنا اور مقدمہ بازی کو مستقل صورت دینا ہے۔ اسلام کا نظام عدل اس صورت کو گوارا نہیں کرتا۔ عدالت صلح پہلی عدالت ہے جو قانونی عوامل سے زیادہ جانبین کے اخلاقی عوامل سے کام لے کر ۹۹ فیصدی مقدمات کو ابتدائی عدالت حاکمہ میں پیش ہونے سے پہلے ختم کردیتی ہے۔ صلح کا یہ رجحان عدالتی لوٹ کھسوٹ سے بالاتر ہو کر آخری عدالت تک باقی رہتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں انسانی برادری کو ہمہ گیر سکون حاصل ہوتا ہے۔ عدالت اصلاح، عدالت تحکیم بھی قانونی طرز پر اس اہم مقصد کی تکمیل میں حصہ لیتی ہیں

عدالت اصلاح بین الناس (یہ عدالت قانونی دعاوی کو سننے کے بعد، صلح کی اخلاقی کوششوں کے ناکام ہونے پر نزاعی مقدمات کو مصالحت کے اصول پر طے کرتی ہے۔ اور اس مقصد میں قانون سے پورا کام لیتی ہے[۱]۔ اصلاح کے قانونی معنی یہ ہیں کہ پیدا شدہ باہمی فساد کو دور کردیا جائے (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۱۰۴) کتاب الصلح ص ۴۰۱-۴۲۷۔ قرآن حکیم فاصلحوا بینہما بالعدل پ ۲۶ حجرات سورۃ ۴۹ آیۃ ۹)

---

[۱] (الصلح خیر۔ قرآن حکیم "صلح بہتر ہے") قاضی عہدہ کے اعتبار سے اس امر پر مامور ہے کہ وہ سب سے پہلے مقدمہ کے فریقین کو صلح کی پیشکش کرے۔ المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۶۱ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم عدالت عالیہ امامت کبریٰ کے عادل اکبر کی حیثیت سے بحیثیت عدالت صلح کا کام کرتے تھے (فتح الباری ج ۱۳ ص ۱۵۵ باب الامام یأتی قوم فیصلح) [۲] قرآن حکیم میں نزاعی مقدمات کے سلسلہ میں قانوناً مصالحت پر زور دیا گیا ہے کہ (۱) انسانیت عامہ کے افراد کے درمیان نزاعی مقدمات میں اصلاح پر زور دینا بہترین ذمہ داری ہے (پ ۵ النساء ۱۲۸/۵) (۲) مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان میں مصالحت کرا دینی چاہیے۔ پ ۲۶ حجرات ۱۰/۱ (۳) بقرہ ۲۸/۲۲۵ وتصلحوا بین الناس فرمان نبوی: نماز، روزہ اور صدقہ سے بہتر یہ کام ہے کہ نزاعی معاملہ کو سلجھا کر مصالحت کرا دی جائے (ابو داؤد و ترمذی التاج ۳ ص ۱۸۳۔ عہد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا عدالت اصلاح کی ذمہ داریوں کو ادا کیا ہے۔ کبھی تنہا اور کبھی پوری مجلس عدلیہ کے ساتھ دیکھو بنی عمرو بن عوف کی مصالحت (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۴۰۲) دیکھو اہل قباکی

عدالت تحکیم[1] (ثالثی) یہ عدالت فریقین کی مرضی اور ثالثی کے اصول پر دعاوی کا فیصلہ کرنے کے لیے مقرر ہوتی ہے (یہ عدالت قتل اور شدید سزا کے مقدموں کے لیے وجود میں نہیں آتی بلکہ عام نزاعی امور اور مالیات کے لیے بنائی جاتی ہے)

عدالت حاکمہ ابتدائیہ[2] (مقدمہ کی قانونی سماعت کرنیوالی پہلی عدالت)

عدالت حاکمہ مصر[3] (عدالت شہر) ہر ضلع کے صدر مقام میں اس قسم کی عدالت ہوتی ہے

---

[1] شرعاً تولیۃ الخصمین حاکماً یحکم بینہما ثالثی جس پر فریقین متفق ہوں السعیدیات فقہ حنفی محمد سعید ازہری ج ۱ ص ۵۰۳ ۔ التاج الجامع للاصول ازہری ج ۳ ص ۸۱ المجلہ قانون حنفی سلطنت عثمانیہ باب ۴ مادہ ۱۷۹۰ ص ۳۳ (قرآن حکیم فابعثوا حکماً من اہلہ وحکماً من اہلہا ان یریدا اصلاحا) (حدیث نبوی دیکھو مقدمہ بائع اور مشتری رواہ البخاری عن ابی ہریرہ بحوالہ التاج ازہری ج ۳ ص ۸۲ التحکیم)
عہد فاروقی دیکھو امیر المومنین فاروق اعظمؓ اور ابی بن ابی کعب کا مقدمہ زید بن ثابت کی عدالت تحکیم میں المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۸۳ ۔

[2] اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ۔ قرآن عظیم پ ۵ ۴ حوالہ کے لیے خلافت راشدہ کی مستند تاریخیں ملاحظہ کیجیے ۱۲ ۔

[3] شدید سزاؤں کے مقدمے صرف اسی عدالت میں فیصل ہوتے ہیں ابتدائی عدالت ان میں حکم نہیں دیسکتی (لا یقیم الحدود الا امراء الانصار) ۔ عمدۃ القاری عینی ج ۱۱ ص ۳۸۵ حاکم بلد ص ۴۱۸ ۔

اسلامی عدالت کی قسمیں

امامت کبریٰ

سب سے بڑی اور آخری عدالت

صیغۂ عدل

محکمۂ دار الفتویٰ | محکمۂ عدل و انصاف

محکمۂ عدل

ابتدائی عدالتیں

عدالت صلح | عدالت اصلاح | عدالت تحکیم | عدالت محاکمہ

عدالت عالیہ

عدالت مرافعۂ مصر (شہر) | عدالت مرافعۂ ولایت | عدالت عالیہ امامت کبریٰ

مشیرانِ عدالت

یادداشت

وثیقۂ ہدایات عدلیہ[۱]	حاکم عدالت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قوانین اور ضابطوں کا علم

رکھتا ہو۔ قوت فیصلہ کا مالک ہو قانون کی تشریح پر قادر ہو اور قانون عدل کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہو[۲]۔

أ۔ حاکم عدالت کے لیے لازمی ہے کہ وہ عدالت کے فرائض اس یقین کے ساتھ انجام دے کہ خدا اس کے ساتھ ہے[۳]۔

ب۔ حاکم عدالت کو عدالت کا کام وقار کے ساتھ کرنا چاہیے[۴]۔

ج۔ قاضیٔ عدالت کا فرض ہے کہ وہ فریقین کے ساتھ برابر کا معاملہ کرے۔ اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ایک فریق کو دوسرے فریق پر برتری حاصل ہو[۵]۔ حتیٰ کہ کسی فریق سے تنہائی میں گفتگو اور مشورہ نہ کرے[۶]

د۔ قاضیٔ عدالت کو غریبوں اور باہر سے آنے والوں کے مقدمات کی سماعت پہلے کرنی چاہیے۔ اگر مقدمہ میں امیر و غریب دو فریق ہوں تو غریب سے بمدرمی کے ساتھ پیش آنا چاہیے[۷]۔

---

[۱] وثیقہ ہدایات فاروقی (دیکھو کتاب سیاسۃ القضاء، و تدبیر الحکومۃ بنام معاویہؓ عامل شام) حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے وثیقۂ ہدایات میں حاکم عدالت کے لیے پانچ چیزیں ضروری قرار دی ہیں:۔ (۱) دعوے کے ساتھ دلائل کی سماعت (۲) فیصلہ کے لیے حلف لینا، (۳) طاقتور اور کمزور کے درمیان نزاع ہو تو کمزور کے ساتھ نرمی کرنا تاکہ وہ طاقتور کے برابر ہو جائے (۴) مضافات سے آنے والوں کے مقدمات کی سماعت پہلے کرنا (۵) آغاز مقدمہ میں صلح پر زور دینا (المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۶۵ کتاب ادب القاضی

[۲] کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفتی ویقضی والخلفاء بعدھم (المبسوط حوالہ بالا ص ۶۶) (اذا کان عالماً (ایضاً ص ۶۷) [۳] اللہ مع القاضی مالم یجر اللہ قاضی عادل کے ساتھ ہے (الحدیث الترمذی) التاج الجامع للاصول الشیخ منصور ازہری ج ۳ ص ۶۰ کتاب القضاء ۱۲ [۴] فلمجالس القضا من المھابۃ و الحشمۃ۔ عدالت کے لیے وقار لازمی ہے (المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۶۶-۶۷) [۵] عدالت کو گفتگو میں طرز گفتگو، فریقین پر نظر اٹھانے میں، بلند آواز سے خطاب کرنے میں اور عام طریق عدل میں فریقین سے یکساں معاملہ کرنا چاہیے دیکھو عمر فاروقؓ اور ابیؓ کا مقدمہ زید بن ثابت کی عدالت میں (المبسوط السرخسی ج ۶ ص ۳-۷۴) (فیہ دلیل وجوب التسویہ) ص ۶۷ (ان الخصمین) [۶] (لا یشار احد الخصمین) المبسوط ج ۱۶ ص ۶۶۔

[۷] (ان یقدم الغرباء) (ان الغریب جناح سفر) المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۸۱ (للقاضی ان یقدمہ فی سماع الخصومۃ) ص ۶۶

ہ۔ حاکم کو غصہ کی حالت میں عدالت کا کام نہ کرنا چاہیے اور عدالت کے کمرہ میں کوئی بات ایسی نہ کرنی چاہیے جس میں زور زبردستی اور زیادتی کا دخل ہو[1]

و۔ عورتوں اور مردوں کی سماعت علیحدہ علیحدہ ہونی چاہیے[2]۔

ز۔ تردد کی حالت میں فیصلہ نہ لکھنا چاہیے[3]۔ اگر ضروری ہو تو وقت زیادہ دینا چاہیے[4]۔ اگر انصاف میں شک ہو تو مقدمہ کو دوسری عدالت میں بھیج دینا چاہیے[5]۔ اگر حاکم عدالت مجتہد نہ ہو تو اس کو علماء قانون کا فیصلہ (فتوی) حاصل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ دینا چاہیے اور اگر مقدمہ کے لیے ضروری ہو تو ترجمان سے امداد لینی چاہیے۔

ح۔ قانونی مشیروں (اسیسروں اور جیوری) سے مجلس قضا (عدالت) میں مشورہ اور رائے نہ لینی چاہیے بلکہ اس کام کو دوسری جگہ کرنا چاہیے[6]

ط۔ مقدمہ کے فریقین میں سے کسی کو ذاتی قیام گاہ پر ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع نہ دینا چاہیے اور عدالت میں تنہا ایک فریق سے سرگوشی نہ کرنی چاہیے[7]

ی۔ گواہ سے دریافت کرنا چاہیے تم اس معاملہ میں کس کس بات کی گواہی دیتے ہو اور کسی گواہ کو اپنے کسی لفظ سے متاثر نہ کرنا چاہیے۔

---

[1] عن ابی بکرة عن النبی "کوئی حاکم دو آدمیوں کے معاملہ میں بحالت غصہ فیصلہ نہ دے" (فتح الباری ج ۱۳ ص ۱۱۷) (ہدایات صدیق اکبرؓ) دیکھو حوالۂ بالا (ہدایات فاروق اعظمؓ) دیکھو المبسوط ج ۱۶ ص ۶۵ (کان معاویہ عاملہ بالشام الخ ص ۷۹ (القاضی لا یضار) [2] المبسوط السرخسی (للقاضی ان یقدم النساء) ج ۱۶ ص ۸۰
[3] عن النبیؐ (دع ما یریبک الی ما لا یریبک الحدیث) المبسوط ج ۶ ص ۸۷
[4] فاروق اعظم کی عدالت مرافعہ میں بعض مقدمات کا فیصلہ ایک ماہ بعد ہوا ہے (التأنی من اللہ الحدیث) المبسوط ج ۱۶ ص ۸۳ [5] حوالۂ بالا ۱۲۔ کتاب الحاکم الی عمالہ والقاضی الی القاضی عمدہ القاری ج ۱۱ ص ۳۸۹
[6] حوالۂ بالا ص ۲۰۴ المبسوط ج ۱۶ ص ۸۹۔ [7] (ومشاورة اولی الرائے) (دیکھو عہد فاروقی علی مرتضیٰ اور زید بن کعب اور صحابہ بحیثیت اسیسر جیوری اور مشیران عدالت) المبسوط ج ۱۶ ص ۷۱۔ مشیران عدالت کے لیے ضروری ہے کہ برابر کے قانون داں ہوں۔ [8] المبسوط السرخسی (لا ینبغی لہ ان یخلوا فی منزلہ مع احد الخصمین کما لا یشار) ج ۱۶ ص ۸۲

ک۔ جب فیصلہ سنائے تو ان الفاظ کے ساتھ سنائے ہیں اس عدالت کے حاکم کی حیثیت سے یہ حکم دیتا ہوں یا یہ فیصلہ دیتا ہوں[1]۔

ل۔ عدالت میں رویہ نرم رکھنا چاہیے[2] تاکہ اہل معاملہ دہشت زدہ نہ ہوں۔ حاکم عدالت کو اہل معاملہ سے کسی قسم کی رشوت، ہدیہ (ڈالی) نہ قبول کرنی چاہیے اور نہ اُن سے طمع رکھنی چاہیے[3]۔

م۔ حاکم عدالت کو سب سے پہلے عدل کا خیال رکھنا چاہیے۔ مقدمہ کی کارروائی۔ اس کارروائی سے پیدا ہونے والا علم[4]۔ اور انصاف تک پہنچنے کے لیے اجتہاد یہ تینوں چیزیں قابل لحاظ ہیں[5]۔

ضابطۂ شہادت (گواہی)

قرآن حکیم، قانونِ سنت اور قوانین فقہ میں اسلام کے ضابطۂ شہادت پر مستقل تفصیل موجود ہے۔ اسلام کی رو سے گواہ کا عادل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جس قدر حاکم کا عادل ہونا، کیونکہ شہادت (گواہی) ایک اہم درمیانی وسیلہ ہے جو عدالت کو عدل تک پہنچنے میں فیصلہ کرنے میں مدد دیتا ہے

---

[1] وہ ذور کنہ قول القاضی حکمت او قضیت) السعیدیات فی احکام المعاملات محمد سعید الغفار ازہری فقیہہ الحنفی النصف الاول ص ۳۰۸

[2] دیکھو آنحضرت کی ہدایت بنام معاذ (یسّروا ولا تنفروا) عمدۃ القاری ۱۱ ص ۲۰۴۔

[3] قرآن حکیم ولا تشتروا بآیاتی ثمنًا قلیلًا پ بقرہ۔ حوالہ بالا باب ہدایا العمال ص ۵۰۴ "ہدایا العمال رشوۃ ولیست بہدیۃ" ابن تیمیہ ص ۳۰۷ (قول علی کرم اللہ وجہہ "فیما فساد الامر قال بالطمع" المبسوط ج ۶ ص

[4] قول امام اعظم ابوحنیفہ "للقاضی ان یحکم بعلمہ فی حقوق الناس" لا فی الحدود الی حقوق اللہ عمدۃ القاری شرح بخاری ج ۱۱ ص ۲۸۸ باب من رای للقاضی ان یحکم بعلمہ۔

[5] قاضی محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اس کا وہی علم معتبر ہے جو اثنائے عدالت میں قانونی کارروائی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ البتہ قاضی اگر یہ جانتا ہے کہ انصاف کس طرف ہے تو وہ جرح میں اس سے کام لے سکتا ہے (یحکم بما سمعہ فی مجلس قضائہ قول ابو یوسف و محمد) (یحکم بعلمہ فی الجرح والتعدیل) عمدۃ القاری علامہ عینی حنفی ج ۶ ص ۲۴۴ باب اثم من خاصمہ فی الباطل ۱۲ منہ فتح الباری عسقلانی ج ۱۳ ص ۱۳۶ کتاب الاحکام الشہادۃ تکون عند الحاکم۔

گواہ کے لیے حکم قطعی یہ ہے، مذہب، اخلاق اور قانون کے معیار پر صحیح ہو اور اس کی شہادت سچی ہو اور انصاف پر مبنی ہو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ جب گواہ واقعہ کو سورج کی طرح صاف طور پر دیکھ لے تو گواہی دے ورنہ اس کی جرأت نہ کرے۔ اسلام نے شہادت اور شاہدوں کا جو معیار مقرر کیا ہے اُس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عدالت کا اصل مقصود انصاف ہے انصاف کی نمائش نہیں ہے۔ اس دعوے کی صداقت کے لیے ذیل میں ضابطہ شہادت درج کیا جاتا ہے۔

شہادت کی تعریف۔ شہادت اُس قطعی[1] اور فیصلہ کُن بیان کا نام ہے جو قانونی عدالت[2] میں حاضر ہو کر کسی ایسے معاملہ کے متعلق دیا جاتا ہے جسے بیان کرنے والے نے صاف طور پر دیکھا ہو[3]۔

شاہد (قانونی گواہ) وہ شخص جو عدالت کے سامنے یا ان لوگوں کے سامنے حاضر ہو کر کسی واقعہ کو دیکھنے کے بعد صحیح بیان دے جو عدالت کی طرف سے مجاز ہوں[4]۔

شاہد کے قانونی اوصاف۔ قانون کی نظر میں گواہ میں چند اوصاف ایسے ہیں جن کا ہونا لابدی ہے اور چند ایسے ہیں جو اس کی قانونی عزت کو ختم کر دیتے ہیں۔

شاہد عادل۔ قرآنِ حکیم کا حکم ہے کہ شہادت محض اللہ کے لیے درست طریقہ پر دینی چاہیے اور گواہ صرف وہ افراد ہوں جو انصاف اور سچائی پر عمل کریں[5] دوسری جگہ تمام اصحاب ایمان کو حکم ہے (کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ) انصاف پر قائم رہ کر محض اللہ کے لیے گواہی دو۔

اس کے بعد قرآن نے شہادت کی صداقت پر ایسا زور دیا ہے جو دنیا کے کسی قانون میں نظر نہیں آتا۔

---

[1] "خبر قاطع" قول جوہری۔ عمدۃ القاری عینی حنفی ج ۶ ص ۱۱۱ [2] فی معنی الحضور۔ حوالہ بالا

[3] (حوالہ بالا) حدیث نبوی "جب گواہ واقعہ کو سورج کی طرح کھلا ہوا دیکھ لے تو گواہی دے ورنہ باز رہے۔"

[4] انہ یحضر مجلس القاضی (حوالۂ بالا) عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۲۲۔

[5] واشھدوا ذوی عدل منکم واقیموا الشھادۃ للہ پ ۲۸ الطلاق ۲۵ (۱۲

شہادت دو تو انصاف کے ساتھ دو، خواہ یہ تمہاری ذات، تمہارے والدین، تمہارے عزیزوں کے خلاف
ہے۔ دوسرا فریق سرمایہ دار ہو یا غریب و محتاج ـــــ انصاف کے معاملہ میں دل کی خواہش کی پیروی نہ کرو[1]
احکام شہادت (گواہ کے لیے ہدایات) شہادت کے لیے انصاف شرط ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گواہی
بر حقیقت ہو، انصاف ہو، بیقین ہو، شک نہ ہو، دیکھی ہوئی بات ہو، سنی ہوئی نہ ہو[2]، گواہ گنتی میں قانون کے
مطابق ہوں۔ اور ہر گواہ میں عدل کے ساتھ عقل اور یادداشت کی قوت ہو[3]۔
اہم ہدایتیں ۔ جھوٹی شہادت نہ دی جائے۔ جھوٹی شہادت ناقابل قبول، قابل سزا اور لائق تشہیر ہے[4] ـــــ
گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے، فاسق و بدکار کی شہادت غیر معتبر ہے[5]۔ سزا یافتہ (تہمت طراز، چور، زناکار) شہرت
یافتہ دروغ گو، قانون کی خلاف ورزی کرنے والے مجرم، مذہبی احکام کے مجرم، قاتل، خائن، تہمت سے یا کسی
دوسری وجہ سے جرح میں مجروح شدہ گواہ کی گواہی ناقابل قبول ہے[6]۔ (سزا یافتہ تہمت طراز کی شہادت توبہ کے
بعد[7] بقول بعض عام مقدموں میں جائز ہے۔ اگر معمولی گناہگار ہو اور گناہوں پر اصرار نہ ہو تو اس کی گواہی بھی لی جا سکتی
ہے[8]۔ فاسق کی گواہی فاسق کے مقدمہ میں، اور ایسے فاسق کی گواہی جو ذاتی وقار کی وجہ سے سچی گواہی دے سکے
بعض حالات میں جائز ہے[9]) باپ بیٹے، میاں بیوی، غلام اور آقا کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں ناجائز ہے[10]
۲۔ گواہی میں تحریف نہ کی جائے۔ گواہی سے پہلو تہی نہ کی جائے[11]۔
۳۔ گواہی کو چھپایا نہ جائے۔ ایسا کرنا خلاف قانون ہے، گواہی کو خریدا نہ جائے۔

---

[1] (یا ایہا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط ـــ ان تعدلوا ـ پ، النساء)
[2] (دیکھو عمدۃ القاری عینی ج ۶ ص ۳۲۲ تا ۳۲۹ - المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۱۱۱ - ۱۶۸)
[3] ع ص ۳۳۱ سماعی شہادت حکم قطعی کے لیے ناکافی ہے ص ۳۳۰ [4] ان العدالۃ شرط ع ص ۳۳۱، المبسوط ص ۱۱۳
[5] المبسوط ص ۱۲۲ - ۱۲۳ - ۱۲۵ [6] المبسوط ص ۱۲۱، ۱۳۰ - المبسوط، ص
[7] المبسوط ص ۱۲۱ - ۱۳۰ - المبسوط، ص ۳۳۱، ۳۳۹ [8] عمدہ ص ۳۴۱ [9] المبسوط ص ۱۲۱
[10] المبسوط ص ۱۳۱ [11] المبسوط ص ۱۲۱
[12] عمدہ (دیکھو آیات قرآن) ص ۳۴۸

۴۔ گواہوں کی عزت کی جائے کیونکہ اُن کی وجہ سے حقوق عامہ زندہ ہیں (الحدیث[۱]) گواہ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہ بات ایک طرح کا جرم ہے[۲]۔

گواہوں کی قانونی تعداد۔ ثبوت زنا کے لیے چار گواہ مرد۔ قصاص قتل اور عقوبات (فوجداری) میں دو گواہ مرد۔ عام قانون مدنی کے مقدمات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں[۳]۔

حق گواہی[۴]۔ گواہ پیش کرنا مدعی کا حق ہے۔ (البینة علی المدعی)

حق یمین (قسم) ثبوت کی عدم موجودگی میں قسم اور حلف کے ذریعے سے اپنی صفائی پیش کرنا مدعیٰ علیہ کا حق ہے۔ (والیمین علی من انکر[۵])

حلف[۶]۔ حلف قاضی (حاکم عدالت) دیگا۔ خدائے واحد کا حلف لیا جائیگا۔ عیسائی کو خدائے انجیل کا۔ یہودی کو خدائے تورات کا، اور مجوسی کو صرف خدا کے نام کا حلف دیا جائیگا۔

جھوٹا حلف۔ اگر عدالت میں سچی گواہی سے حلف کا جھوٹ معلوم ہو جائیگا تو حلف اور قسم کالعدم ہو جائیگی[۷]۔

صیغہ نظام اقتصادی

ریاست عامہ کا اقتصادی نظم عوام کی ضروریات کا معاشی انتظام اور خزانۂ حکومت (بیت المال) کا کام۔ صیغۂ امور اقتصادی و بیت المال کے سپرد ہے[۸]۔

یہ صیغہ زر، زمین، پیداوار زمین اور سرمایہ و محنت کے تمام حاصلات کا انتظام عمل میں لاتا ہے اور اپنے دائرۂ کار میں ریاست کے تمام جمہور کی تمام معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

---

[۱] المبسوط ص ۱۱۲ [۲] (لا یضار کاتب ولا شہید) قرآن حکیم

[۳] المبسوط ج ۱۶ ص ۱۲۵۔ ایک شہادت فیصلہ کے لیے ناکافی ہے۔ ص ۱۱۲

[۴] عمدہ عینی ج ۶ ص ۳۲۲، ۳۷۷ دیکھو فیصلہ نبویؐ [۵] عمدہ ص ۳۸۳۔ دیکھو فیصلہ نبویؐ

[۶] عمدہ ص ۳۸۵، ۳۹۲ المبسوط ص ۱۱۸۔ ۱۱۹ [۷] حوالۂ بالا۔

سیفہ کی ذمہ داریاں | ارضی پیداوار کا انضباط۔ محاصل کی تحصیل اور جمع آوری۔ سرمایہ اور محنت کی متوازن شیرازہ بندی۔ زراعتی، صنعتی، تجارتی اور مالی امور کی نگہداشت، بیت المال کے مدات آمدنی (زکوٰۃ، صدقات، خمس، فئ، خراج، عُشر، جزیہ، عشور، کراء الارض، اوقاف، ضرائب، اموال فاضلہ) کی حفاظت جمہورِ مملکت کے درمیان ضروریات زندگی کی مساوی تقسیم، غریب اور محنت کش انسانوں کی فارغ البالی اور برابر کی خوشحالی کی کفالت اور ریاست عامہ کے مجموعی معاشی نظم اور اقتصادی تنظیمات کی نگرانی

(یادداشت)

معاشی زندگی اور اقتصادی نظم | دنیا میں کروڑوں انسان آباد ہیں۔ ان کی نسلیں اور قومیتیں مختلف ہیں مگر معاشی ضرورتیں یکساں ہیں۔ معاش کا مسئلہ انسانی فطرت کا قطعی مطالبہ ہے اور اس کی تکمیل ایک خدائی فرض ہے حکومت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے کہ جمہور کو ان کے حق کے مطابق کھانے پینے پہننے اور پاک صاف اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی سہولت حاصل ہو۔

کارخانۂ عالم کے موجد نے قرآن عظیم میں معاشی ضرورتوں سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہوئے چار باتیں پیش کی ہیں (ا) زمین معاشی پیداوار کا مخزن ہے[1] (ب) دن معاشی دوڑ دھوپ کے لیے ہے[2]۔ (ج) معاشی پیداوار کو تمام انسانوں کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے، کیونکہ یہ تقسیم قانونِ قدرت کا منشا ہے[3] (د) معیشت کے اچھے دور میں خدا کو نہ بھولنا چاہیے ورنہ خدا کی طرف سے معاش کا دائرہ تنگ کر دیا جائیگا[4]۔

درحقیقت خدا کی مرضی ہمیشہ سے یہ ہے کہ تمام انسان قوانین قدرت پر عمل کریں اور معاش کے اعتبار سے اچھے معیار پر نظر آئیں۔ البتہ انسان کی غربت، فقر و فاقہ اور محتاجی شیطان کی اسکیم کا جزو اعظم ہے۔

---

[1] جعلنا لکم فیہا معائش
[2] وجعلنا النہار معاشا
[3] نحن قسمنا بینہم معیشتہم
[4] فان لہ معیشۃ ضنکا

اقتصادی نظم | مملکت کے لیے اقتصادی نظم ضروری چیز ہے کیونکہ یہی وہ شعبہ ہے جس پر معاشی زندگی کا دارومدار ہے۔ اقتصادی نظم کا منشا معاشی توازن ہے اور معاشی توازن کے معنی یہ ہیں کہ مملکت کے افراد کے درمیان وسائل معیشت کے اعتبار سے اقتصاد (اعتدال) کی حالت پیدا ہو جائے، اقتصاد ہر شعبہ حیات میں ذریعہ نجات ہے لیکن اقتصادی صیغہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔[1]

پیغمبر اعظم نے اقتصاد اور حیات اقتصادی کے متعلق تین نکتے پیش فرمائے ہیں

(۱) اقتصاد نبوت کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے[2]۔ (۲) دولت خرچ کرنے میں اصول اقتصاد کا لحاظ رکھنا معیشت کے آدھے مقاصد کو پورا کر دیتا ہے[3]۔ (۳) انسانی نجات کے تین اصولوں میں سے ایک اصول، یہ ہے اقتصادی توازن، سرمایہ و غربت کے درمیاں (القصد فی الغنی والفقر)[4]

اسلامی مملکت اقتصادی زندگی کے میدان میں مندرجہ بالا اصولوں اور نکتوں پر عمل پیرا ہوتی ہے اور معاشی اسلوب پر اپنے اقتصادی نظام کو قائم کرتی ہے۔

معاشی زندگی کے عناصر ترکیبی

۱۔ انسانی معاشرہ[5]۔ بنی نوع انسان کا شیرازہ بند گروہ[6] جس کا ہر فرد سامان معیشت کا حاجتمند ہے۔

---

[1] قرآن عظیم میں اقتصاد کو مدنظر رکھنے والے اجتماعی نظم کو اُمۃ مقتصدہ اور اقتصاد کی راہ کو قصد السبیل اور اقتصادی نظم کو مقتصد کے نام سے یاد کیا ہے۔

[2] رواہ الترمذی (الاقتصاد جزء من اربع وعشرین جزءً من النبوۃ) مشکوٰۃ المصابیح باب الرفق وحسن الخلق ص ۴۳۳ (اصح المطابع دہلی) [3] الاقتصاد فی النفقۃ نصف المعیشۃ۔ بیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ (باب الحذر) ص ۴۳۰

[4] بیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ فصل الثالث باب الغضب والکبر ص ۴۳۴)

[5] انسانی سوسائٹی۔ دیکھو قرآن حکیم یا معشر الانس۔ انعام ع ۱۵۔ رحمٰن ع ۲

[6] (ولقد کرمنا بنی آدم) قرآن حکیم سورہ ۰، ۷ ع ۱

یہ کہ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں اور اسلامی سوسائٹی جسم واحد کی مانند ہے، ایک کی تکلیف تمام جماعت کی تکلیف ہے۔

عام معاشی حقوق | معاشی دائرہ میں ہر انسان کا ایک حق ہے اور دنیا کی پیداوار میں اس کا حصہ ہے ہر انسان کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے حصہ کو نہ بھولے (لا تنس نصیبك من الدنیا) پیغمبر اعظم نے انسانی سوسائٹی کے ہر رکن کے لیے مندرجہ ذیل حقوق رکھے ہیں۔

۱۔ (بیتٌ یسکنہ) گھر رہنے کے لیے۔

۲۔ (ثوب یواری عورتہ) کپڑا تن ڈھکنے کے لیے

۳۔ (جلف الخبز) روٹی پیٹ کے لیے

۴۔ (والماء) پانی۔ استعمال کے لیے خواہ وہ آسمان سے برسے یا نہروں اور کنوؤں سے آئے۔

مملکت کا خزانہ (بیت المال) خاص طور پر اُن شہریوں کا ذمہ دار ہے جن کے ہاتھ خالی ہیں۔ فاروق اعظم کا قول ہے کہ "اگر پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا والی نہیں ہوں"۔ یہ حقوق عامہ کے احساس کی انتہا ہے اور حکومت کی ذمہ داری کی آخری حد!

اسلامی نقطۂ نگاہ سے دو باتیں زیادہ قابلِ لحاظ ہیں (۱) تمام خلق اللہ کا کنبہ ہے" (۲)

لہ فاروق اعظم نے حضرت خالد کو ہدایت کی تھی کہ وہ سرکاری مال غریبوں کے لیے ہے (ہذا المال علی ضعفۃ المہاجرین) مجمع الزوائد ہیثمی کتاب المناقب ص ۳۴۹ (باب ما جاء فی خالدؓ)

یہ کہ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں اور اسلامی سوسائٹی جسم واحد کی مانند ہے، ایک کی تکلیف تمام جماعت کی تکلیف ہے۔

عام معاشی حقوق | معاشی دائرہ میں ہر انسان کا ایک حق ہے اور دنیا کی پیداوار میں اس کا حصہ ہے ہر انسان کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے حصہ کو نہ بھولے (لا تنس نصیبك من الدنیا) پیغمبر اعظم نے انسانی سوسائٹی کے ہر رکن کے لیے مندرجۂ ذیل حقوق رکھے ہیں۔

۱۔ (بیتٌ یسکنہ) گھر رہنے کے لیے۔

۲۔ (ثوب یواری عورتہ) کپڑا تن ڈھکنے کے لیے

۳۔ (جلف الخبز) روٹی پیٹ کے لیے

۴۔ (والماء) پانی۔ استعمال کے لیے خواہ وہ آسمان سے برسے یا نہروں اور کنوؤں سے آئے۔

مملکت کا خزانہ (بیت المال) خاص طور پر اُن شہریوں کا ذمہ دار ہے جن کے ہاتھ خالی ہیں۔ فاروق اعظم کا قول ہے کہ "اگر پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا والی نہیں ہوں"۔ یہ حقوق عامہ کے احساس کی انتہا ہے اور حکومت کی ذمہ داری کی آخری حد!

اسلامی نقطۂ نگاہ سے دو باتیں زیادہ قابلِ لحاظ ہیں (۱) تمام خلق اللہ کا کنبہ ہے" (۲)

لہ فاروق اعظم نے حضرت خالد کو ہدایت کی تھی کہ وہ سرکاری مال غریبوں کے لیے ہے (ہذا المال علی ضعفۃ المہاجرین) مجمع الزوائد ہیثمی کتاب المناقب ص ۳۴۹ (باب ما جاء فی خالدؓ)

تمام انسان اللہ کے نزدیک برابر ہیں۔ اب وہ اونچے طبقہ کے ہوں یا نیچے طبقہ کے۔ اللہ ان کا پروردگار اور فرمانروا ہے اور وہ اس کے بندے اور رعایا ہیں" (الخلق کلھم عیال اللہ[1] الحدیث "فالناس شریفھم و وضیعھم فی ذات اللہ سواء اللہ ربھم وھم عبادہ[2]" عمر بن الخطابؓ)

اسلامی حکومت معاشی زندگی کے دائرہ میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھنے پر مامور ہے۔ اللہ کے کنبہ کا کوئی فرد کھانے، کپڑے اور مکان وغیرہ سے محروم نہ رہے اور اللہ کے بندوں میں سب کو انسانیت کے عام حقوق میں برابر کا سمجھا جائے۔ اگر اسلامی حکومت اس کا خیال نہیں رکھیگی تو انسانیت کے بلند درجہ سے گر جائیگی۔

معاشی ذرائع

زراعت، تجارت، صنعت و حرفت۔ وراثت، بیت المال

۱۔ زراعت :۔ زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے قطعات ہیں، انگور کے باغات ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھجوریں " "اللہ نے .... پانی برسایا، کھیتیاں اُگائیں جو بعد میں خشک ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد زرد اس کے بعد چورا چورا کی جاتی ہیں" (قرآن حکیم) زمین میں خود کھیتی کر دیا اپنے کسی بھائی سے کھیتی کرا دو یا اپنے پاس رکھو[3] (پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم)

۲۔ تجارت :۔ تجارت معاش کا ایک ایسا اہم ذریعہ ہے جس کی طرف خدا بھی رہنمائی کرتا ہے[4]۔

---

[1] الذریعہ الی مکارم الشریعہ راغب

[2] حضرت فاروق اعظم کا فرمان عراق کے امیر الافواج کے نام دیکھو تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۵

[3] عن جابر متفق علیہ مشکوٰۃ باب المساقات والمزارعت ص ۲۵۷۔ آنحضرتؐ نے جرف میں خود کاشت فرمائی، اور صحابہ بھی زراعت کرتے تھے۔ (دیکھو حوالہ بالا)

[4] الا ان تکون تجارۃ۔ بقرہ ع ۳۵ الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم۔ نساء ع ۵

شرط یہ ہے کہ تجارت میں سود کا دخل نہ ہو (واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔ بقرہ ع ۳۸) (وذروا البیع جمعہ ع ۲) آنحضرت[۱] سے سوال کیا گیا اچھا ذریعہ معاش کونسا ہے، آپ نے جواب دیا۔ پاک صاف تجارت۔

۳۔ صنعت وحرفت۔ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا معاش کا پاکترین ذریعہ کیا ہے آپ نے فرمایا (عمل الرجل بیدہٖ[۲]) وہ صنعت وحرفت جس میں انسان اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا "انسان کی پاک روزی وہ ہے جو اپنے کسب ومحنت سے پیدا کرے[۳]۔ اس سے بہتر کوئی روزی نہیں[۴]۔

۴۔ وراثت۔ وہ سرمایہ اور سامان معاش جو باپ دادا کی میراث کے طور پر انسان کی معاشی زندگی میں معاون ہوتا ہے[۵]۔ اور جاگیرداری کے ظالمانہ طریقوں کو مٹاتا ہے۔

"حکم" کتاب اللہ کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔ (پیغمبر اعظم مسلم اور ابو داؤد)

بیت المال کے مالی وسائل

مدات آمدنی | ریاست عامہ کے خزانہ مرکزی بیت المال کے مالی وسائل اور مدات آمدنی (محاصل وغیرہ) مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ[۶]۔ سالانہ خدائی محصول جو سرمایہ اصلی (سونا، چاندی، مال تجارت اور تجارتی مکانوں)

---

[۱] رواہ احمد عن رافع بمشکوٰۃ کتاب البیوع ص ۲۴۲ طبع اصح (کل بیع مبرور)

[۲] رواہ احمد (مشکوٰۃ کتاب البیوع ف ۲ ص ۲۴۲ اصح) [۳] ابوداؤد۔ الدارمی (مشکوٰۃ حوالہٗ بالا) ان اطیب ما اکل الرجل من کسبہ [۵] للرجال نصیب مما ترک الخ قرآن حکیم دیکھو تفصیل البیان ممتاز علی کتاب الاحکام ج ۲ ص ۱۶۱ [۶] خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها (قرآن حکیم توبہ ۱۳۶)

کو پاک رکھنے ترقی دینے اور برکت حاصل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے[1] (چالیسواں حصہ)

۲۔ **صدقات**۔ وہ مال جو فیاض لوگ اپنی خوشی سے غریبوں کی امداد اور عام فائدہ کے لیے بیت المال کو دیتے ہیں[2]

۳۔ **خمس** (مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ[3]) مال رکاز، دفینوں اور کانوں سے نکلے ہوئے سونے چاندی کا پانچواں حصہ[4])

۴۔ **فیٔ**۔ وہ مال جسے مرعوب دشمن چھوڑ جاتا ہے اور جنگ کے بغیر بیت المال کے قبضہ میں آتا ہے[5]

۵۔ **خراج**۔ وہ سرکاری لگان ہے جو غیر مسلم کاشتکاروں کی غیر مقبوضہ زمین پر سالانہ عائد ہوتا ہے[6]۔ اور باہمی مرضی سے طے پاتا ہے۔

۶۔ **عُشر**۔ مسلمان کاشتکاروں پر عائد شدہ لگان (بارانی زمین پر دسواں حصہ اور چاہی زمین پر بیسواں حصہ[7])

۱؎ الزکوٰۃ الطھارۃ والنمأ والبرکۃ الخ النہایہ فی غریب الحدیث ج ۲ الزاء مع الکاف ص ۱۳۷۔ مفردات امام راغب (زکا)، تعریفات سید شریف (زکوٰۃ) ص ۷۷ طبع آستانہ۔ صحیح البخاری کتاب الزکوٰۃ (فتح الباری ج ص)

۲؎ قران عظیم (بقرہ ع ۳۷۔ صدقات کو ظاہر کرکے دو تو اچھا ہے الخ) (بقرہ ع ۳۶ صدقات کو احسان جتا کر باطل نہ کرو) بخاری کتاب النفقات (فتح الباری) (علیٰ کل مسلم صدقۃ عن ابی بردہ)

۳؎ واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ قرآن حکیم انفال ع ۵۔

۴؎ عن ابی ھریرہ (وفی الرکاز الخمس الحدیث) بخاری (فتح الباری ج ص) رکاز وہ سونا چاندی ہے جو خدا نے زمین کے اندر پیدا کیا ہے (دیکھو حدیث بروایت امام ابی یوسف) کتاب الخراج ص ۲۳

۵؎ تعریفات سید شریف باب الفاء ص ۱۱۳ قرآن حکیم (ما افاء اللہ) حشر ع ۱۔ احزاب ع ۳ ۔ مفردات القرآن راغب (فیٔ) باب الفاء۔

۶؎ تعریفات سید شریف (الخراج ہو الوظیفہ المعینۃ التی توضع علی الارض کما وضع عمرؓ علی سواد العراق) باب الخاء ص ۶۷ کتاب الخراج ابی یوسف ص ۲۳

۷؎ صحیح البخاری کتاب الزکوٰۃ (فتح الباری ج ص) عن عبد اللہ بن عمر۔ فیما سقت السماء ۔ العشر الخ النہایہ فی غریب الحدیث ابن اثیر ج ۳ باب العین (عشر "زکوہ ما سقتہ السماء" ص ۱۱۰۔ کتاب الخراج ابی یوسف ص ۶۹ درمختار ج ۲ ص ۶۶-۶۷-۶۸ ج ۳ ص ۳۵۰۔

۷۔ جزیہ۔ وہ ٹیکس جو ریاست عامہ کے قلمرو میں بسنے والے غیر مسلم افراد سے ان کی طے شدہ مرضی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس باشندوں کے مال، جائیداد عزت اور آبرو کی حفاظت کے لیے وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا جو مقصد بھی بیان کیا جائیگا وہ قانون شرع کے خلاف ہوگا۔

۸۔ عشور۔ تجارتی درآمد محصول جو غیر ملکی مال کی آمد پر لیا جاتا ہے۔[۱]

۹۔ کراء الارض۔ مملکت کی زمینوں کا مقررہ لگان جو کاشتکاروں کی باہمی رضامندی سے وصول کیا جاتا ہے۔[۲]

۱۰۔ وقف (سرمایہ اور جائیداد) جو خدا کے نام پر شخصی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں دے دی جائے۔[۳]

۱۱۔ ضرائب۔ وہ مالی امداد جو امیروں سے غریبوں کے لیے وصول کی جاتی ہے۔ امداد باہمی کا یہ ٹیکس اُس وقت لیا جاتا ہے جب سوسائٹی اپنی مرضی سے معاشی قوانین پر عمل نہیں کرتی اور سرمایہ دار طبقہ دولت جمع کر کے عوام کی غربت کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر کھاتے پیتے لوگ معاشی توازن برقرار رکھنے میں معاون نہ بنیں تو یہ ٹیکس جبراً وصول کیا جائیگا۔[۴]

۱۲۔ اموال زائدہ۔ وہ سرمایہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اور جو مندرجہ بالا مدات کے علاوہ

---

[۱] النہایہ فی غریب الحدیث (عشر اموال اہل الذمہ فی التجارات) باب العین مع الشین ج ۳ ص ۱۱۰۔ (انما العشور علی الیہود والنصاری الحدیث) ما کان من اموال تجارتھم۔ امام شافعی کے نزدیک یہ محصول معاہدہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ان ملکوں کے مال پر واجب ہوگا جنہوں نے ریاست عامہ کے شہریوں کے مال پر اس قسم کا محصول عائد کیا ہو" کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام۔ ص ۵۳۲ - ۵۳۴ کتاب الخراج ص ۱۳۲۔

[۲] در مختار ج ۳ ص ۳۵۳ باب العشر والخراج

[۳] جو مال بیت المال کے نام پر وقف ہونگے ان کا انتظام بیت المال کے ہاتھ میں ہوگا۔ صحیح البخاری (فتح ا عن ابی ہریرہ۔ دیکھو حدیث (خالد کے اسلحہ بطور مال وقف) ما ینقم ابن جمیل الخ۔ [۴] محلی بن حزم ج ۶ ص ۱۵۶-۱۵۸

دوسری مدات سے متعلق ہو۔[۱]

اسلام کا اشتراکی دستور

(معاشی حقوق اور قانون مساوات)

(۱) زمین کی تمام پیداوار تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ دنیا کے تمام سرمایہ میں دنیا کے جملہ باشندوں کا حصہ ہے ہر انسان ایک خدائی اشتراکی ہے اور اس سرمایہ میں برابر کا شریک ہے۔

یادداشت | ہر انسان کی فطرت معاش کا مطالبہ کرتی ہے۔ زمین کی پیداوار اس مطالبہ کی تکمیل کرتی ہے۔ قرآن عظیم کا بیان ہے (قدر فیہا اقواتہا) ہم نے زمین میں کھانے پینے کے سامان رکھے" (سواء للسائلین[۲]) برابر ان تمام انسانوں کے لیے جو حاجتمند ہیں۔ یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس ہے (تمام انسانوں کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے) کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوک خاص نہیں، بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کو علت ملک قرار دیا گیا۔ ہاں خود مالک وقابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس سے متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے زائد رکھنا بہتر نہ ہو گو زکوۃ بھی ادا کردی جائے اور انبیاء صلحاء اس سے بنایت مجتنب رہے۔ بعض صحابہ اور

---

[۱] بدائع صنائع (اموال فاضلہ) ج ۷ کتاب السیر ص ۱۳۶۔

[۲] تفسیر بحر المحیط ابوحیان اندلسی (۶۵۴-۷۴۵) طبع اول ۱۳۲۸ھ قاہرہ (معناہ مستویہا امر ہذہ المخلوقات ونفعہا للمحتاجین الیہا من البشر فعبر بالسائلین عن الطالبین لانہم من شانہم ولابد طلب ماینفقون بہ اذہم بحال حاجۃ۔ قال الزمخشری لاجل الطالبین لہا المحتاجین المقتاتین الخ ۱۲ حوالہ روح المعانی سید الوسی (۱۲۸۰) ج ۲۴ ص ۹۰-۱۲ حوالہ بجواہر طنطاوی الجوہری (سواء للسائلین) لے الذین یسئلون الاقوات وہو کل حیوان علی وجہ الارض وذلک السوال طبیعی فیہم مفروس عن جبلۃ الخ ج ۱۹

تابعین نے حاجت سے زیادہ رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہر کیف غیر مناسب اور خلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زائد علی الحاجۃ سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک من وجہ اس میں موجود ہے تو گویا شخص مذکور من وجہ مال غیر پر قابض و متصرف ہے۔ ایضاح الادلہ ص ۲۶۸

قرآن مجید کے اس بیان سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ جس طرح معاش کا سوال ہر انسان سے وابستہ ہے اسی طرح زندگی کی ضروریات میں انسانی سوسائٹی کے تمام افراد کا حصہ برابر ہے۔

قرآن نے دوسری جگہ ایک اور اعلان کیا ہے (خلق لکم ما فی الارض جمیعًا[1]) "تم سب کے لیے وہ تمام چیزیں پیدا کی گئیں جو زمین میں ہیں" اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طرف تمام انسان ہیں اور دوسری طرف زمین کی مجموعی پیداوار یہ مجموعی پیداوار تمام انسانوں کے لیے ہے اور سب کی ملکیت ہے۔

(ب) دنیا کی تمام پیداوار تمام انسانوں میں تقسیم ہونی چاہیے۔

یادداشت | قرآن حکیم نے معاشی پیداوار کی تقسیم کے متعلق دو خیال ظاہر کیے ہیں۔ خدا نے معاشی سامان جملہ انسانوں کے درمیان تقسیم کیا ہے اور اس میں سب برابر کے حقدار ہیں" (نحن قسمنا بینھم معیشتھم زخرف۔ فھم فیہ سواء[1]) پیداوار کی تقسیم کے سلسلہ میں عہد نبویؐ کی روایات بہت ہی شاندار ہیں آپ نے سب سے پہلے مدینہ کی زمینیں انصار و مہاجرین کے درمیان تقسیم کیں، اور زمین کے مالکوں سے ان لوگوں کو حصہ دلایا جن کے پاس کچھ نہ تھا۔

ابتدائی عہد میں حملہ آور دشمنوں کا مال غنیمت کے طور پر آتا تھا۔ آپ اس تمام سرمایہ کو اسی وقت تقسیم کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں حکومت کا تمام سرمایہ یہی مالِ غنیمت ہوتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں کوئی رقم خزانہ میں جمع نہ ہوتی تھی اور نہ اس وقت بیت المال کا وجود

---

[1] حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی آیت بالا کے ماتحت لکھتے ہیں۔ قرآن کے اس فرمان کے مطابق تمام اشیاء، تمام بنی آدم کی ملکیت معلوم ہوتی ہیں۔

تھا۔ جب کبھی غنیمت کا مال آتا اسی وقت آپس میں تقسیم ہو جاتا۔ صدقات اور زکوٰۃ کی آمدنی وصول ہوتی تو وہ مستحق افراد پر بانٹ دی جاتی تھی اور کچھ ہنگامی ضرورتوں کے لیے محفوظ کر لی جاتی تھی[۱]۔ پیغمبر اعظم کے زمانہ میں پہلی مرتبہ بحرین سے بڑی تعداد میں مال آیا۔ حکم ہوا کہ مسجد میں پھیلا دیا جائے۔ اس کے بعد اسی وقت مدینہ کے باشندوں میں تقسیم فرما دیا[۲]۔

اشتراکی مساوات (حکومت کی ذمہ داری) اسلام اشتراکیت سے پہلے ہے اور اشتراکیت سے بالکل ایک جداگانہ اصول ہے، البتہ سرمایہ کی تقسیم اور اشتراکی مساوات یہ دونوں باتیں اسلام کے قانون معیشت میں اوّل دن سے موجود ہیں۔ سرمایہ کی تقسیم کا مسئلہ اسلامی حکمت عملی کا پرانا مسئلہ ہے۔ ابتدائی دور میں پیغمبر اعظم اور ان کے بلند پایہ جانشینوں کا عمل سامنے ہے آخری دور کے متعلق آنحضرتؐ کی پیشین گوئی موجود ہے جس کے الفاظ یہ کہتے ہیں کہ بڑی بڑی جنگوں اور زبردست زلزلوں کے بعد تمام دنیا میں اسلام کی حکومت چھا جائیگی اور یہ حکومت اشتراکی حکومت ہوگی۔ آنحضرت کے الفاظ یہ ہیں[۳]۔

انسانی جھگڑوں اور زلزلوں کے بعد ایک رہنما تمام روئے زمین کی حکومت کا رہنما ہوگا۔ زمین پہلے ظلم اور تشدد سے معمور ہوگی اس کے بعد عدل و انصاف سے بھر جائیگی اس سے آسمان اور زمین کا ہر فرد خوش ہوگا، آپ نے اُس رہنما کے متعلق فرمایا (یقسم المال صحاحا) وہ سرمایہ کو صحیح طور پر تقسیم کریگا۔ کسی نے دریافت کیا صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا

---

[۱] تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان (تمدن اسلام ج ۲ ص ۳ (عہد نبوی)

[۲] بخاری (فتح الباری) کتاب الصلوٰۃ عن انس

[۳] مجمع الزوائد الہیثمی ج ۷ ص ۳۱۳ (باب ما جاء فی المہدی) عن ابی سعید الخدری قال ابشرکم بالمہدی ... یرضی عنہ ساکن السماء والارض یقسم المال صحاحا ..... ویملاء قلوب امت محمدؐ غناءً الخ رواہ الترمذی واحمد باختصار کثیر ورجالہما ثقات الخ ۲)

آپ نے فرمایا (بالسویۃ بین الناس) تمام انسانوں میں برابر کا حصہ تقسیم کریگا۔ انتہا یہ کہ اُمت محمدیہ کا کوئی فرد محتاج نہ رہیگا۔

سرمایہ کی تقسیم کے متعلق اسلام کا یہی وہ رجحان ہے جو ابتدا سے انتہا تک اسلامی نظام حکومت کے نقشہ میں نظر آتا ہے۔ مساوات کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کو اس کی فطری ضرورت کے مطابق حصہ ملے حکومت اس کی ذمہ دار ہے اور وہ اس کام کو تقسیم کی رو سے انجام دیتے ہیں۔ (دیکھو اہم نظائر[ل])

اسلام نے جمہور کی معاشی ضرورتوں کے معاملہ میں برابری کے اصول کا کس قدر لحاظ رکھا ہے اس کا قطعی اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حکومت کا رئیس بھی عوام کے برابر حق رکھتا ہے نہ زیادہ نہ کم۔

عہد فاروقی میں امیر المومنین کے لیے عوام نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ ۱۔ خورد و نوش کا ضروری سامان۔ ۲۔ سردی و گرمی کے کپڑے۔ ۳۔ نقل و حمل، حج اور جہاد کے لیے سواری[ے]

ل ا۔ فاروق اعظم نے بحرین سے آئے ہوئے مال (پانچ لاکھ درہم) کی تقسیم کے متعلق شوریٰ طلب کی (مقریزی ج ص ۹۲۔ تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان خلافت راشدہ ص ۵)

ب۔ فاروق اعظم نے ۱۵ھ میں درجہ بندی کرکے سالانہ وظائف کی تقسیم کا سلسلہ جاری کیا۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۶۲ ذکر فرض العطایا (فقیل لہ سوّیت فاروق اعظم سے کہا گیا کہ آپ نے تقسیم میں برابری کا لحاظ رکھا ہے)

ج۔ جمہور نے فاروق اعظم کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا تھا اور ان کی ذمہ داری بہ ظاہر کی تھی (والقسیم بالسویۃ الخ) سرکاری خزانہ کا روپیہ برابر برابر تقسیم ہونا چاہیے۔ تاکہ کوئی ضرورتمند خالی ہاتھ نہ رہے۔ طبری ج ۴ ص ۱۶۳ ۱۵ھ

(د) دیکھو حضرت سعد کے اقوال کسریٰ کے مال غنیمت کے متعلق (بعد القسم بین الناس۔ یتفق قسمۃ طبری ج ۴ ص ۱۷۱ (فسوبینا) ص ۱۶۳۔

(ہ) حضرت عباس کی ہدایت حضرت عمر کے لیے (الامانۃ فی المال والتسویۃ فی القسم) انصاف کے دو ستون ہیں، ۱۔ مال میں امانت۔ ۲۔ مال کی برابر کی تقسیم۔ طبری ج ۴ ص ۲۰۳ ۱۷ھ

ے طبری ج ۴ (ص ۱۶۳ ۱۵ھ) نفقتہ وقوت عیالہ لا وکس ولا شطط وکسوتہم وکسوۃ للشتاء والصیف عدد ابتان الخ

حضرت علیؓ نے اس موقع پر اپنا فیصلہ یہ دیا تھا (ما اصلحك واصلح عيالك بالمعروف ليس لك من هذا المال غيره) امیر المومنین آپ کو عام معیار کے مطابق اپنی اور اپنے گھر کی ضرورت کے لیے روپیہ لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور آپ کا حق نہیں۔ سب نے اس سے اتفاق کیا اور یہی آخر میں طے پایا۔[1]

فاروق اعظم نے عمر بھر اس فیصلہ پر عمل کیا۔ انہوں نے ان لوگوں کو سب کچھ دیا جن کے پاس کچھ نہ تھا۔ اور خود اتنا لیا جس قدر کہ حق تھا۔ انہوں نے کھانے پینے کی ضرورتوں کے سلسلہ میں تقسیم کا اصول رائج کیا۔[2] چنانچہ خود ان کے یہ الفاظ موجود ہیں "میرا معاشی حق اتنا ہی ہے جس قدر قریش کے ایک عام انسان کا نہ کہ سرمایہ دار کا"[3] "اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں حکومت کا اچھا والی نہیں ہوں"[4] ان الفاظ سے دو اصول پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ تقسیم میں معاشی ضرورتوں کے ساتھ برابری کا لحاظ رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ حکومت ہر فرد کے کھانے پہننے اور فارغ البال رہنے کی ذمہ دار ہے۔[5]

معاشی اصول قرآن نے معاشی زندگی کا بنیادی اصول یہ قرار دیا ہے (كلوا من الطيبات واعملوا صالحا) معیشت کے دائرہ میں کھانے کے لیے اعلیٰ اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عمل کے میدان میں اچھے عمل کرو۔ قرآن کی رو سے تمام

---

[1] طبری ج ۴ ص ۱۶۴ فقال القوم القول قول ابی طالب۔

[2] (قسم عمر الارزاق) طبری ج ۴ ص ۲۰۳ دسنہ ۱۷ھ (وامرنا لكم على اعطائكم وارزاقكم) طبری ج ۴ ص ۲۰۴ سنہ ۱۵ھ

[3] ابن کثیر ج ۷ ص ۱۳۵ (قوت رجلين كرجل من قريش ليس باغناهم)

[4] بئس الوالی انا ان شبعت والناس جياع

[5] بیت المال ان لوگوں کا ذمہ دار ہے جو غریب ہیں اور محتاج۔ مجمع الزوائد الہیثمی کتاب المناقب خالد (علی معفقة المهاجرين) ج ۹ ص ۳۴۹۔

انسان جو قانونِ قدرت کے فرمانبردار ہیں ایک متحدہ انسانی سوسائٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان سب کے لیے ایک ہی حکم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ زمین کی تمام پیداوار تمام انسانوں کے لیے ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ سب اتفاق و اجتماع اور یکسانیت کے ساتھ اُس کو کھائیں پئیں اور اپنے استعمال میں لائیں۔ (یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً)

قرآن میں جابجا کھانے، پینے، پہننے، روپیہ خرچ کرنے پھل اور میوے کھانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ شیطان انسان کو مفلس اور غریب دیکھنا چاہتا ہے اور خدا خوشحال اور باروزی رکھنا چاہتا ہے۔ قرآن نے اعلان کیا ہے کھاؤ اور پیو جب درخت پر پھل آجائے تو پھل کو دیکھو اُس کے پکنے کو دیکھو۔ جب پھل کا موسم آئے تو خوب پھل کھاؤ، پھل تمھارے لیے رزق ہے کھانے کی چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے کھانے کو دیکھے اور تمام انسانوں کے لیے یہ لابدی ہے کہ وہ شائستہ لباس پہنیں۔ یہاں ہر حکم عام ہے اور ہر خطاب عام انسانوں کے لیے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام معاشی خوشحالی کا ایسا نظام بروئے کار لانا چاہتا ہے جس کے سایہ میں ہر انسان کو اس کی لازمی ضرورت کے مطابق کھانے پینے، پہننے اور زندہ رہنے کا سامان میسر آئے اور جس میں پھل پھول کی بہار بھی نظر آئے۔

اسلام کے جملہ اقتصادی احکام اسی معاشی اصل کے تابع ہیں، وہ تمام کام جن کی وجہ سے اس مقررہ بنیاد پر اثر پڑتا ہے اسلامی روح کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق امتناعی احکام اور ہدایات موجود ہیں۔

امتناعی احکام | (۱) سرمایہ داری کے لیے سرمایہ دار ممنوع ہے۔ دنیا کا سرمایہ چند سرمایہ داروں کی ملک ہو کر رہ جائے، قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اس صورت میں انسانی

سوسائٹی کے زیادہ تر افراد اپنے حق اور حصہ سے محروم ہو جائیں گے۔ سرمایہ آتا ہے اور جائز طور پر خرچ ہوتا رہے۔ اگر جمع ہو تو صرف امانتِ عامہ کے طور پر۔ اس کے علاوہ سرمایہ جمع کرنا (اکتناز) اور سرمایہ جمع کر کے روک لینا (احتکار) دونوں ناجائز ہیں (دیکھو قرآن عظیم[1])

(ب) سود اور سود در سود قانوناً حرام ہیں۔ سود کی وجہ سے ایک فرد، ایک طبقہ اور ایک قوم کے بڑے لوگ دولتمند ہو جاتے ہیں، تمام سوسائٹی مفلس ہو جاتی ہے۔ سود کا سارا محل ضرورتمند انسان کی مجبوریوں پر تعمیر ہوتا ہے اس سے امداد باہمی اور اخلاقی تعاون کی روح پامال ہوتی ہے اس لیے ممنوع ہے (دیکھو قرآنی احکام[2])

(ج) جوا (قمار اور سٹہ) دولت کا کھیل (جوا) ہر طرح خلافِ قانون ہے۔ قانون کی رو سے یہ شیطانی کام ہے[3]۔ اس سے معاشی تعاون کی جگہ دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان خدا کی یاد سے دور ہو جاتا ہے[4]۔ اس لیے قانون نے اس کو بڑا جرم قرار دیا ہے[5]۔

---

[1] قرآن عظیم۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم (توبہ) جو لوگ سونے اور چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور فی سبیل اللہ خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دیدو" ـــــ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء (حشر) دولت و سرمایہ اس لیے غریبوں فقیروں اور یتیموں پر خرچ ہونا چاہیے" تاکہ وہ دولتمندوں کے درمیان رک کر نہ رہ جائے۔

[2] (احل اللہ البیع وحرم الربوا) اللہ نے تجارت اور خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے" بقرہ۔ (لا تاکلوا الربوا اضعافا مضعفا) تم سود در سود کو ہرگز ہرگز اپنی روزی نہ بناؤ" آل عمران۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ سود لینا خدا سے جنگ کرنا ہے (بحرب من اللہ) سود کو معاف کر دینا چاہیے۔" غریب انسان کو تو روپیے سے مدد دینی چاہیے" اللہ سود کو مٹاتا ہے اور امدادی صدقات سے دولت کو بڑھاتا ہے" امداد باہمی سے دولت عام ہو جاتی ہے۔ سود کے طریقوں سے عام قومی تنگدستی رونما ہوتی ہے۔ دیکھو تفصیل البیان ممتاز علی ج ۲ کتاب الاحکام ص ۱۶۴۔

[3] قرآن عظیم۔ انما الخمر والمیسر ـــــ من عمل الشیطن (بقرہ)

[4] (ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء ۔ فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ (مائدہ)

[5] والمیسر ـــــ اثم کبیر ۔ بقرہ)

سرمایہ داری | تاریخ کے قدیم زمانہ سے مال دولت کی محبت کا سلسلہ جاری ہے۔ قرآن نے انسان کے رجحانِ سرمایہ داری کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے (اِنّہٗ لِحُبِّ الخیر لشدید) انسان مال کی محبت پر بہت پکا ہے، صرف فرد ہی نہیں بلکہ پوری جماعت (سوسائٹی) بھی رجحانِ سرمایہ داری رکھتی ہے (تحبون المال حباً جماً) تم مال سے جی بھر کر محبت کرتے ہو۔ سرمایہ داری کی فطرت اپنے سرمایہ پر قانع نہیں ہوتی بلکہ یہ چاہتی ہے کہ روپیہ بڑھتا ہی چلا جائے۔ انتہا یہ کہ بہتات کی یہ حرص غفلت میں ڈال دیتی ہے (الھٰکم التکاثر۔ تمہیں بہتات کی حرص نے غفلت میں ڈال دیا)

سرمایہ داری میں نشہ بھی ہوتا ہے اور طبقے بھی ہر طبقہ اپنی جمع پر فخر کرتا ہے (کل حزب بما لدیھم فرحون آخر قرآن کو کہنا پڑا "اس کے لیے خرابی ہے جس نے مال جمع کیا اور اُسے گِن گِن کر رکھا۔ اُسے خیال ہے کہ اس کا مال سدا کو رہیگا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ ایک تباہ کن بکتی ہوئی آگ میں پھینکا جائیگا (الذی جمع مالاً وعدده. یحسب ان مالہٗ اخلده کلا لینبذن فی الحطمۃ الخ)

قرآن کی رو سے بنی اسرائیل (یہود) پہلی قوم ہیں جنہوں نے اپنے غرورِ سرمایہ داری کو ظاہر کیا۔ انہوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے حاکم طالوت کو نامنظور کر دیا تھا اور کہا تھا، (لم یوت سعۃً من المال) یہ شخص تو محنتی اور مزدور طبقہ کا فرد ہے، بڑا سرمایہ دار نہیں ہے۔

دنیا میں پیغمبروں نے معاشی حقوق کا اکثر نام لیا مگر ہر دور میں سرمایہ داروں کا یہ نعرہ رہا (نحن اکثر اموالاً) "ہم بڑے مالدار ہیں" ہم کوئی بات نہیں سن سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف پوری توجہ کی آپ نے فرمایا انسان سرمایہ داری کا اتنا دلدادہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کی دو بھرپور وادیاں ہوں تو

وہ ایک تیسری وادی اور چاہیگا" انسان کے بڑھاپے اور جوانی کے دو سبب ہیں سرمایہ داری کی حرص اور عمر کی حرص"۔

آنحضرت نے قانونِ قرآن کے مطابق قدم اُٹھایا اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ احکام نافذ کیے جن کا منشا ایک پسندیدہ معاشی نظام کا قیام تھا۔

(ا) غربت اور فقر و فاقہ کا احساس یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسانیتِ عامہ کا نظام قائم ہے" (الفقر و خوفہ سبب نظام امر الناس)

(ب) "دنیا کا نظام سرمایہ داری سے زیادہ غریبوں کی غربت پر قائم ہے"۔ (قیام العالم بالفقر اکبر من قیامہ بالغنی) یہ ہے اسلام کا وہ نظریہ جو آج کے اشتراکی رجحانات سے نو سو سال پہلے پیش کیا گیا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں سائنس اور صناعی کے تمام شعبے محنت و مزدوری سے متعلق ہیں اور تمام محنتوں کا سرچشمہ غربت ہے[1]

مملکت کے عوام کی غربت کا علاج کرنا معاشی حقوق کی بنیاد ہے۔ اگر عوام زندگی کی لازمی ضرورتوں میں برابر کے درجہ پر آجائیں تو یہ حقوق پورے ہو جائینگے۔

(ج) نظام عالم کا مدار مال اور سرمایہ پر ہے۔ سرمایہ نام ہے سونے، چاندی کا اور ان دھاتوں کا جن سے سکہ بنتا ہے۔

لغات قرآن کے مستند عالم اسلامی مالیات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں سکہ (الناض)[2] ان اہم چیزوں میں سے ہے جن پر نظام زندگی قائم ہے، سکہ خدا کا نشان ہے وہ ایک حاکم کے مانند ہے سکے اور سرمایہ کو چلتا رہنا چاہیے، کیونکہ اس کو جمع کر کے روک رکھنا ایسا ہی

---

[1] الذریعہ الی مکارم الشریعہ ف ۶ باب ۳ ص ۱۴۸-۱۴۹ (طبع الوطن ۱۲۹۹ھ)

[2] الذریعہ الی مکارم الشریعہ۔ راغب ج ۶ ف پ ص ۱۵۳، ۱۵۴ (ان الناض احد اسباب ما بہ قوام حیاۃ الدنیویہ الخ)

جیسے کہ ایک مدبر حاکم کو قید میں ڈال دیا جائے۔ اسلام سرمایہ کی بے ضرورت جمع آوری کے خلاف ہے اور خوشحالی کا ایک ایسا نظام چاہتا ہے جس میں سرمایہ کا توازن درہم برہم نہ ہو۔

الخلق کلھم عیال اللہ الخ الحدیث۔ تمام خلق ۔۔ جملہ انسان اللہ کا کنبہ ہیں ۔۔۔۔

اور ان سب کا روزی و رزق اللہ کی ذمہ داری ہے، اللہ کی مرضی یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کا حق ملے ۔ دنیا میں خدا کے پیغمبر آئے، معاشی ضروریات کی تنظیم و تکمیل میں حصہ لینا انھوں نے بھی اپنا فرض تصور کیا۔ یہ اسلام ہے جس نے انسان کو حکم دیا ہے دنیا کے سرمایہ میں اپنے حصہ اور حق کو فراموش نہ کر (لا تنس نصیبك من الدنیا۔ قصص ر ۸)

حضرت ابراہیم نے خدا سے امۃ مسلمہ کے لیے شہر امن اور پھلوں پھولوں کا رزق طلب کیا تھا، یہ آرزو پوری ہوگئی۔

معاشی اصول | اسلامی قانون میں معاشی نظام جن معاشی نظریات پر مبنی ہے وہ یہ ہیں :۔

(ا) زمین تمام انسانوں کا وطن اکبر اور مستقر ہے۔ (ولکم فی الارض مستقر۔ بقرہ۔ اعراف)

(ب) زمین ذریعۂ پیداوار ہے اور اس کی ہر پیداوار میں تمام انسانوں کا یکساں حق ہے۔ خلق لکم ما فی الارض جمیعاً۔

ج۔ زمین اور انسان کی پیدائش کے ساتھ سرمایہ (متاع) بھی پیدا ہوا ہے۔ اور یہ سرمایہ جملہ انسانوں کا حق ہے۔

د۔ ارضی حکومت اور معاشی تشکیلات باہم مربوط اور لازم و ملزوم ہیں۔ خدا نے انسان کو زمین کی حکومت بھی دی ہے اور اس کے ساتھ زمین میں تمام انسانوں کی معاش کا سامان بھی رکھا ہے۔ (ولقد مکنّٰکم فی الارض وجعلنا لکم فیہا معایش۔ اعراف)

ہ۔ سوسائٹی جسم واحد کی مانند ہے اس جسم کے ایک عضو کی تکلیف تمام اجتماعی نظام

کی تکلیف ہے۔

و۔ ارضی حکومت اپنی قلمرو کے تمام انسانوں کی مساوی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ دنیا کی دولت میں ہر انسان کا ایک حصہ اور حق ہے جس کو کوئی انسان فراموش نہیں کرسکتا (لا تنس نصیبک من الدنیا۔ قصص)

ز۔ محنت (مزدور کی مزدوری) انسانی محنت پیداوار کا ایک قابل قدر ذریعہ ہے۔ قرآن نے اس سلسلہ میں دو امور کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ انسانی محنت کی ایک صورت نہیں بلکہ مختلف صورتیں ہیں۔ (ان سعیکم لشتی۔ اللیل ۹۲)

۲۔ ہر انسان اپنی محنت کے پھل کا حقدار ہے (لیس للانسان الا ما سعی)

ح۔ امداد باہمی (انسانی معاشرہ کی وحدت) انسانی سوسائٹی ایک اکائی ہے اور اس کے تمام افراد انسانیت کے وحدانی مرکز پر یکساں حیثیت کے مالک ہیں۔ معاشی زندگی میں ان کا کام اسی طرح امداد باہمی کا محتاج ہے۔ جس طرح ایک انسان کے تمام اعضاء۔

یادداشت | الخلق کلھم عیال اللہ "تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں (حدیث) دنیا میں کوئی انسان دوسرے انسان کے تعاون کے بغیر اپنی معاش کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ روٹی کے ایک لقمہ کے لیے بھی کسان کی، چکی کے مالک کی، اور لوہوں کے مستری کی ضرورت ہے۔ ایک فرد کے لیے معاشی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے انسانی سوسائٹی کا مدار امداد باہمی پر ہے اور اسی لیے اسلامی سوسائٹی کو بنیاد کی دیوار اور ایک ایسے جسم واحد سے تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک کی تکلیف تمام سوسائٹی کی تکلیف ہے[۱] (امام راغب)

---

[۱] الذریعہ ف ۶ ب ص ۱۴۷ ۔ الوطن ۔ ایضاً ۔ ان الناس یحتاج بعض الی بعض ولا تمکن المعائش مالم یتظاہر (الخ) تمام انسان ایک دوسرے کی امداد کے محتاج ہیں ۔ امداد باہمی کے بغیر معاشی زندگی کا بروئے کار آنا ناممکن ہے۔ (الذریعہ حوالہ بالا ص ۱۵۳)

اسلامی حکومت کا موازنہ قدیم حکومتوں سے

اسلامی حکومت ایک اٹل خدائی تنظیم ہے اس کو عہد قدیم کی تاریخی حکومتوں پر اسی طرح فوقیت حاصل ہے جس طرح سونے کو لوہے پر، سورج کو ستاروں پر اور خدا کو اپنی دنیا پر۔

تاریخ کے نامعلوم عہد میں طاقتور انسان کمزور انسانوں کو اسی طرح ختم کردیتا تھا جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔[1] آخر انسان کے دل میں مل بیٹھنے کا جذبہ پیدا ہوا فرد سے افراد پیدا ہوئے، افراد سے گھر، گھر سے خاندان، خاندان سے قبیلہ وجود میں آیا اور قبیلہ سے معاشرہ (سوسائٹی)، یہ تھا حکومت کا پہلا نظم جس کا حکمراں خاندان کا بزرگوار باپ، اور قبیلہ کا شیخ ہوتا تھا۔ اسی طرح ملک سے ملک اور ملک سے مملکت (سلطنت State) کی بنیاد قائم ہوئی۔ جہاں پہلے قبیلے تھے وہاں قومیں آموجود ہوئیں اس مرحلہ پر فن حرب پیدا ہوا جس نے زمانۂ حال کی سیاسی تنظیم (حکومت) کو دنیا میں لاکر کھڑا کردیا جس کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ انسانی حکومتوں کی ابتداء اور استحکام، تنظیم اور ترقی فن جنگ کی بنا پر ہوئی ہے۔

اسلام کو اس قسم کی کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ ارتقائے معاشرت کی پہلی منزل جس سے اسلام آشنا ہے آبائی معاشرہ ہے جس میں گھر، خاندان اور قبائلی سوسائٹی کا سردار بزرگوار باپ ہوتا ہے۔ اسلام کی رو سے حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ اپنے زمانہ کی سیاسی تنظیمات کے سردار بھی تھے اور باپ بھی۔

---

[1] ہندوستان کے قدیم فلسفی کوٹیلیا نے اس صورتِ حال کو متسیا نیائے (منطق ماہی) کا لقب دے کر سیاسیات میں ایک نئے لغت کا اضافہ کیا ہے۔ مبادی سیاسیات شروانی ص ۳۱ "بحوالہ" مملکت ہند قدیم، بینی پرشاد

یہ ماضی تھا جس نے مستقبل کو یہ سبق دیا کہ اُمت اولاد اور اُمت کا رہنما (امام) باپ کی مانند ہے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ اسلام اپنے عروج وکمال کے زمانہ میں بھی شخصی خاندانی بادشاہت کا حامی ہے پیغمبروں کے عہد میں خرابی کا احتمال نہ تھا اس لیے آبائی معاشرہ باقی رہا لیکن پیغمبر اعظم اور حکومتِ راشدہ کے عہد میں اس کی جگہ "شورائے جمہور" نے لے لی اور آبائی معاشرہ ختم کر دیا گیا۔

اسلام کی نظر میں حکومت خدا کے حکم سے پیدا ہوئی ہے اور پہلے دن سے مکمل ہے خدا نے انسان کو معیار احسن پر پیدا کیا تھا مگر وہ ٹھوکر کھا کر پستی میں گر گیا اس نے خدائے واحد کی جگہ بہت سے خدا بنا ڈالے اور خدا کی جگہ خود حاکم بن بیٹھا۔ اسلامی حکومت اس پستی حال کو ارتقائے مستقبل سے بدلنے پر مامور ہے۔ اس نے جس طرح اب سے پہلے جابر اور ظالم شہنشاہیوں کا خاتمہ کر کے حکومت راشدہ کا نمونہ پیش کیا تھا۔ اسی طرح آج اس کا کام ایک ایسا انقلاب لانا ہے جو ساری دنیا میں خدائے واحد کی حکومت کا تخت بچھا سکے اور تمام انسانوں کو انسانیت کے خدائی قانون پر جمع کر سکے۔

دنیا کی قدیم ترین حکومتیں

دنیا کی قوموں کی تاریخ میں صدہا حکومتوں کا ذکر اس طرح موجود ہے جیسے افسانے، تین سو حکومتیں نمایاں اور قابلِ ذکر سمجھی گئی ہیں، ان سب میں ایک خرابی مشترک ہے اور وہ ہے "شاہی یا مطلق العنان شخصی بادشاہی"۔

مصر قدیم میں حکومت کے تین طبقے ہوئے جن میں دولت فارس کے قیام تک بارہ خاندانوں کے ستر سے زیادہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ ہجرت عامہ بنی اسرائیل کے

۵۶۲۶ سنہ ماقبل سے ۹۶۲ سنہ ماقبل تک چار ہزار سال کے عرصہ میں انسان کی قسمت شخصی بادشاہت کی غلامی سے نجات نہ پا سکی۔

چین میں مذہبی پیشوا فوہی نے ۳۵۰۰ سنہ قبل مسیح پہلی حکومت قائم کی فوہی کے بعد شین ٹانگ، ہوانگ ٹی، ہیا، شانگ، چیؤ، چین شی، ہان خاندانوں نے حکومت کو اپنے شکنجہ میں رکھا۔ ہیان کے زمانہ میں چینیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ "حکومت مرکزی پھول ہے حکومت آسمانی ہے اور بادشاہ آسمان کا بیٹا ہے، مگر ووانگ ٹی کے عہد (۲۷۵۰ سنہ ق م) میں شاہی کا فساد ظاہر ہوا حکومت کو شاہی خاندان نے پامال کر دیا۔

فوہی کے بعد لاؤچی اور اس کے بعد کنفیوشش (کانگ۔ فوچی) کا ظہور ہوا یہ دونوں مصلح تھے کنفیوشش نے تعلیم دی خدا دنیا کا خالق موجد اور بادشاہ اعظم ہے۔ آسمان اور اس کے عناصر خدا کے دلائل ہیں۔ فرمانروا خدا کا نائب (خلیفہ) ہے۔ کنفیوشش کی یہ تعلیم اسلام کی تعلیم سے بہت قریب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دین فطرت اور قانون فطرت کا پیغام کنفیوشش ہی کے ذریعہ اہل چین کے دل و دماغ کی امانت بنا ہو تاہم ایک بات صاف ہے اور وہ یہ کہ چین کے اس جلیل القدر حکیم نے "شاہی" اور شہنشاہی کے متعلق کوئی امتناعی قانون نہیں پیش کیا۔ چین میں ظہور اسلام کے وقت "ہان" خاندان کی حکومت تھی۔ جس طرح ووانگ ٹی (۲۷۵۰ سنہ ق م) کے عہد میں ملک بادشاہی کے عمل جبر کی سے اور چین شی کے زمانۂ استبداد سے پامال ہو رہا تھا، اسی "ہان" کے عہد میں فاسد شہنشاہیت موجود تھی۔

ہندوستان میں آریہ آئے اور انہوں نے ملک کے اصلی باشندوں کو اچھوت (بھنگی چمار اور غلام) بنا کر چھوڑا۔ ہندوستان کے ایک ماہر تاریخ داں کے اعتراف کے مطابق یہ آریہ مغرور تھے، خود بیں تھے دوسروں کو ذلیل سمجھتے تھے۔ ملک ایک تھا اور حکومتیں بیشمار ایک جسم کے ہزار ٹکڑے۔ بہار میں حکومت مگدھ اور ودیہ۔ یوپی میں کاشی، کوشل (اجودھیا)

پنچال (گنگا جمنا کا دوآبہ) متھرا اور قنوج، پاٹلی پتر (ویسالی) کی حکومتیں قائم تھیں۔ اسلام سے پہلے ملک کی خراب حال حکومتوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان گنت حکومتیں، ریاستیں، راجگان ٹھاکر دواریاں، نتیجہ یہ ہوا ملک کمزور ہوا اور اس پر زوال آگیا۔

نینویٰ (موصل کردستان) میں سینس کا اثوری خاندان سیاسی اور شاہی اقتدار کا مالک تھا اور بابل میں سلسلہ نمرود کے پچاس بادشاہ اپنی تعمیر کے لیے ہمسایوں کو زیر و زبر کرتے رہے۔

فارس میں مطلق العنان شہنشاہیت کے چار طبقے ہوئے پیشدادی، کیانی، اشکانی (شاہان طوائف) ساسانی (اکاسرہ) ان چاروں طبقوں کے بے شمار بادشاہوں میں صرف نوشیروانِ عادل نے نام نیک چھوڑا۔ آخر میں شاہی کا فساد پوری طرح ظاہر ہوا جب اسلام کا ظہور ہوا فارس کے مجبور و مقہور جمہور اپنے چھ بادشاہوں کو قتل کر چکے تھے۔ درحقیقت یہ انجام تھا اُس آغاز کا جس کا ظہور طبقہ مدبا کی "مانا ئی مملکت" کے شہزادوں کی جنگ میں ہو چکا تھا، تمام ایشیا اسی حال میں تھا۔ جابر حکومتیں جنگی بادشاہ، جنگجو شہزادے اپنے ظلم و جبر کی جولانگاہ میں آزاد تھے۔ اسلام آیا اور اُس نے صورتِ حال کو یکسر بدل دیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومت نے شہنشاہیت کے فاسد تصور کا خاتمہ کر کے جب مرضی جمہور (شوریٰ) کا قانون جاری کیا تو اُس سے مجبور و مقہور دنیا کو کتنی بڑی دولت ملی ہو گی۔

یونان و روما | دنیا کی تاریخ میں یونان و روما کا نام بہت اُچھالا گیا ہے اور اس سے دورِ جدید کا اسلامی فکر بھی بہت متاثر ہوا ہے لیکن جدید علم تحقیق نے ان دونوں یورپی سلطنتوں کی بربادی کی داستان بھی سامنے رکھ دی ہے۔ اس لیے یونان کی تمدنی مملکتوں اور روما کی جمہوریتوں کا افسانہ دردوغم بھی ان مملکتوں کے وارثوں کی زبان سے سن لینا چاہیے۔

یونانیوں کا نظریہ حکومت | یونان دنیائے قدیم کا سیاسی پایہ تخت رہا ہے دنیائے جدید اس سے کافی مرعوب ہے اور یہ اقرار کرتی ہے کہ علم السیاست کی حقیقی ابتدا، اور انسان کی خود آگاہی کا اظہار اول اول یونان میں ہوا۔ یہ دعویٰ بجائے خود صحیح، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یونانی تصور، اجتماعی زندگی کا بہت ہی ناقص ظہور ہے اور اس کے مقابلہ میں اسلامی حکومت ایک کامل و مکمل، اتم اور اکمل سلطنت کی صحیح، جاگتی اور جگمگاتی تصویر ہے۔

یونانی سیاستداں شہر اور سلطنت کو ایک ہی لفظ پولیس ( ) کے نام سے ظاہر کرتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی سلطنت کا تصور شہر پر مبنی تھا۔

جرمن سیاستداں ہنچلی کہتا ہے کہ "اس کے حدود ارضی مختصر تھے۔ طاقت محدود تھی۔ مادی حیثیت بہت ہی حقیر اور اس کی حیثیت طفلانہ تھی"۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اڈورڈ جنکس لکھتے ہیں کہ "اس حکومت میں نا اتفاقی کے اتنے مہلک عناصر تھے جن کی وجہ سے اس پر وقت سے پہلے تباہی آگئی"

یہ تھی یونانی حکومت، اس کے برعکس اسلامی حکومت خلافت ارضی (روئے زمین کی غیر محدود نیابتی حکومت) ہے۔ اس سے چار فرائض متعلق ہیں۔ (۱) آبادکاری (۲) سیاسی رہنمائی (۳) تمدنی اصلاح (۴) احکام حکومت کا اجرار۔ اور یہ چاروں فرائض تمام قلمرو ئے ارضی سے متعلق ہیں۔

یونانی حکومت نسلوں کی تقسیم در تقسیم سے مرکب ہے اسلامی حکومت اپنی شیرازہ بندی کے اعتبار سے ایک ایسی وحدت ہے جس میں نسلی تقسیم کا کوئی گذر نہیں۔ اسلام ایک عظیم الشان انسانی برادری ہے اور دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹ جس کے سایہ میں تمام انسان اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر وہ انسان جو اُس کا رکن بن سکتا ہے یونان کی اس حکومت سے

کوئی اثر نہیں لے سکتا۔ جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے"۔ اس کی وجہ سے قدیم نظام ٹوٹ پھوٹ گیا۔ جدید نظام بن نہ سکا، یورپی تہذیب بیاباں کا نہ عیاشی میں تبدیل ہو گئی اور ایشیا کی پستی مکمل کر دینے میں معاون بن گئی۔

افلاطون کا نظریہ حکومت | افلاطون خدا کا قائل ہے۔ خدا کی بادشاہت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ شاید اسی لیے مسلمان اُس کو افلاطون الٰہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ افلاطون حکومت کی چار قسمیں کرتا ہے۔ (۱) شخصی (شخصی بادشاہی) (۲) شخصی موتمری (چند فلسفیوں کی حکومت جس کا حکمراں شخص واحد ہو) (۳) حکومت خواص (اعلیٰ طبقہ کی سرمایہ دار حکومت) (۴) جمہور (جس میں جمہور حاکم ہوں اور حکام محکوم) افلاطون شخصی موتمری حکومت کا قائل ہے۔

اسلام شخصی حکومت سے بلند و بالا ہے کیونکہ اُس نے اپنے عہد میں شخصی حکومت کو ختم کر کے حکومت کی زمام جمہور انسانوں کے ہاتھ میں دی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ افلاطون کا مشہور و معروف دماغ کیوں شخصی قید سے آزاد نہ ہو سکا۔

افلاطون کے نظریہ میں ایک اور تضاد ہے۔ وہ ایک طرف سوسائٹی کو جسم واحد مانتا ہے (اور یہ اسلام کے عین مطابق ہے) اور دوسری طرف اُس کو چار طبقوں میں اس طرح تقسیم کرتا ہے (۱) حکمراں طبقہ جو سونے سے بنا ہے (۲) فوجی طبقہ جو چاندی سے پیدا ہوا ہے (۳) کاریگر طبقہ جو فولاد سے ڈھلا ہے (۴) مزدور اور غلام محنت کش طبقہ جو چوپایوں کی مانند ہے۔

اسلام کو اس تقسیم کے مسخرے پن پر ہنسی آتی ہے۔ افلاطون محدود یونانی تصور کی بنا پر صرف شہر والوں سے کہتا ہے "شہریو! تم سب بھائی بھائی ہو" مگر اسلام ذاتوں، طبقوں اور نسلوں سے بلند ہو کر دنیا بھر کے انسانوں سے خطاب کرتا ہے "تم سب ایک انسان کی اولاد ہو، سب مٹی سے ہو اور سب اللہ کے بندے بھائی بھائی ہو۔"

آخری بات یہ ہے کہ افلاطون اور اس کا تصور حکومت ناکام رہا اور اسلامی حکومت حکمت عملی کے میدان میں بانصاف پسند انسانوں سے خراج تحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

ارسطو کا نظریہ حکومت | ارسطو (ارسطاطالیس Aristotle) اونچے طبقہ کے لائق و فائق اشخاص کی حکومت کا قائل ہے۔ افلاطون اس حکومت کو حکومت خواص کہتا ہے اور ارسطو ارسطوفراطی (ارسطوکریسی Aristocracy) کا نام دیتا ہے موجودہ اصطلاح میں اس کو اعیانی اور امیر سری کہہ سکتے ہیں۔

دو ہزار برس سے زیادہ ہو گئے یونان کے اس فلسفی نے اچھی حکومت کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ۱۔ بادشاہی (منارکی Monarchy) ۲۔ ارسطوکریسی (Aristocracy) ۳۔ حکومت عامہ۔ جسے ارسطو نے پولیٹی (Polity) کا نام دیا ہے۔ پہلی قسم میں ایک شخص کی حکومت ہوتی ہے دوسری قسم اعلیٰ طبقہ کے چند افراد (اقلیت) کا اقتدار ہوتا ہے اور تیسری صورت میں حکومت کی زمام بہت سے افراد (اکثریت) کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ارسطو بذات خود اونچے طبقہ کی اعیانی حکومت ارسطوکریسی کا حامی ہے۔ اس حکومت میں طبقاتی امتیاز ناگزیر طور پر ہوتے ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا "ادنیٰ طبقہ کو اعلیٰ طبقہ کی اطاعت کرنی چاہیے" ارسطو کہتا ہے کسی شہری کی کوئی ہستی نہیں۔ ہر شخص سلطنت کا جز ہے اور اس کے تابع۔ ظاہر ہے کہ حکومت میں خواص ہونگے اور تابع عوام۔ اور دونوں میں فرق و امتیاز بھی ہوگا۔ اسلامی حکومت میں امت کے بہترین افراد جو خدا اور عوام کی نگاہوں میں منتخب ہوتے ہیں۔ مرضی عامہ کے بعد حکومت کا کام امانت سمجھ کر اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور امیر ایک عامی کے برابر ہو کر امت کی خدمت کرتا ہے۔ یہ سیاسی تصور کی وہ بلندی ہے

جہاں سکندر اعظم کے استاذ ارسطو کا دماغ نہیں پہنچ سکا۔

روما کا نظریہ حکومت

رومی حکومت دنیائے قدیم کی حقیقی حکمراں طاقت تھی۔ زمانہ حال کے علمائے سیاست اور مدبرین اپنی حکومتوں کا سلسلہ حسب و نسب روما ہی سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں "دنیا ایک انگشتری تھی اور روما اس کا نگینہ" مسلمانوں کا جدید علمی دماغ بھی روما کے بوجھ میں دبا ہوا ہے۔ لیکن اسلام کے نقطۂ نگاہ سے یہ جاہلیت کا پہلا دور تھا اور بحر روم کی آخری تباہ حال شہنشاہیت تھی جس کو اسلام نے خدا کے حکم اور جمہور کی طاقت سے پاش پاش کر دیا۔

رومی سلطنت میں ایک طرف تو توہم پرستی کی حد یہ تھی کہ دیوتا پوجے جاتے تھے اور دوسری طرف رومیوں کا خیال تھا کہ وہ دنیا کو اپنے اقتدار کے ماتحت لانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔

بلنچلی کا بیان ہے کہ یونان کی بنیاد قوموں کے اختلاط پر تھی، روما کی بنیاد ایک قوم کی اعلیٰ فطرت پر تھی جس نے چاہا کہ تمام دنیا کو رومی بنا دے یہی اس کا جرم تھا کوئی قوم ایسی جلیل القدر نہیں ہو سکتی کہ دوسری قوموں کو اپنی آغوش میں فنا کر دے یہی وجہ ہے کہ وہ ٹیوٹن قوم کے تازہ جوش جوانی سے ٹکرا کر فنا ہو گئی [1]۔

یونانیوں نے شہری حکومت پیدا کی رومیوں نے قومی مملکت کی داغ بیل ڈالی ان کا دعویٰ تھا کہ حکومت قوم کی تنظیم شدہ ہیئت سے مبنی ہے۔ اکٹاویوس آگسٹس (روم کے پہلے قیصر) کے زمانہ (۴۴ سنہ ق م) سے لے کر اسلام کے ظہور تک روم کے شہنشاہ کو اب لامتناہی اختیار حاصل تھا جو نہ حکمراں کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور نہ قوم کے لیے۔ ایک رومی بادشاہ یہ دعویٰ کر بیٹھا "میں ہی سلطنت ہوں" یہی وجہ تھی کہ رومی شہنشاہ ذہنی اور اخلاقی حیثیت

---

[1] نظریہ سلطنت بلنچلی (رومیوں کا تخیل سلطنت) ص ۲۸ - ۴۰ - عثمانیہ۔

سے تباہ ہوگئے رومی حکومت کا تخیل بہبود عامہ تھا جو بہت کم عمل میں آتا تھا۔ رومی قوم کی اخلاقی تباہی ان کی نہ سیر ہونے والی حرص کا جذبہ بھی جو انہیں فتوحات کے پیچھے لیے لیے پھرتی تھی۔

اسلامی حکومت ایک صاف آئینہ کی مانند تھی جس میں رومی دور کی کوئی خرابی نہ تھی، دیوتا پرستی ختم ہوچکی تھی، شہنشاہیت باقی تھی پیغمبر اعظم اسلام نے پہلے اسلام کا سفیر روم بھیجا اور سفارت کی ناکامی کے بعد فرما دیا قیصر کے خاتمہ کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا" اسلام کی قوت نے یہ معجزہ بھی کر دکھایا۔ یہ تھا وہ دن جب پہلی مرتبہ انسان کے کانوں نے جمہوریت کی زبان سے شہنشاہیت کی شکست کا اعلان سُنا۔

دوسری تاریخی حکومتوں پر نظر (یونان) روما کے بعد جرمن فرانکی قبیلے نے رومی سرزمین پر ایک بہت بڑی سلطنت قائم کرلی اس جرمن رومن متحدہ شاہی نے فرانکی شہنشاہیت کا نام پایا۔ مگر اُسے دو چیزوں نے تباہ کردیا۔ ۱۔ موروثی اصول جس سے حکومت مختلف بیٹوں میں تقسیم ہوگئی اور اس سے قوم و سلطنت دونوں تباہ ہوئے۔ ۲۔ قومیت کا شعور۔ قومیتوں کے افتراق نے فرانس کو جرمنی سے علیحدہ کردیا اور فرانکی شاہی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔

اس کے بعد مغربی شہنشاہیت پیدا ہوئی اور اس نے مذہب عیسوی کی پناہ لی عیسائیت نے یہ ظاہر کردیا کہ سلطنت اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں اور ان میں سخت اختلاف ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس سے مذہب و سیاست کی علیحدگی کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا یورپ کی تمام حکومتوں میں شخصی بادشاہی موروثی ولیعہدی، قوموں کی تفریق، طبقاتی امتیاز تباہی کی حد تک موجود تھا۔ فریڈرک ثانی جیسے مدبر اور ڈانٹے جیسے صاحب فکر معنی آفرین کا خیال شہنشاہیت ہی کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ اسلام نے کارناموں کی دنیا میں جو کارنامہ انجام دیا اس کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے سیاست و سلطنت کے

دائرہ سے اُن تمام خرافات الاصنام کا خاتمہ کر دیا جن کا تعلق شاہ پرستی اور فاسد قومیت پرستی تھا

موسیو گال پیام کا بیان ہے "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" سے پہلے دنیا پر فتنہ و فساد کے گھرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہندوستانی سیاستدان پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں۔ اسلام سے پہلے قدیم چیزیں فنا ہو چکی تھیں جدید ابھی وجود میں نہ آئی تھیں۔ اس لیے سارے یورپ پر تاریکی چھائی ہوئی تھی" اس حالت سے اندازہ کیجیے کہ اسلام نے اور اسلامی حکومت نے دنیا میں آکر انسان کے ہاتھ میں کیا تحفہ دیا۔ قدیم حکومتوں کا سارا فساد ختم کر دیا گیا اور حکومت کی بنیاد خدا کے حکم سے ظالم شہنشاہیت کی جگہ مرضی جمہور (شوریٰ) پر رکھی گئی۔ بادشاہ ہٹ گئے یا مٹا دیے گئے اور ان کی جگہ امیر و امام (رہنمائے مملکت) کو دی گئی۔ حکمراں خدا، امام حکومت کا رہنما اُمت کی مرضی حکومت کی اصل!

مورخ وان کریمر کا بیان ہے "آنحضرتؐ نے ایک مذہب کی بنیاد ڈالی۔ نیا طرز حکومت پیدا کیا اور جب آنحضرت کا وصال ہوا تو تمام قلمرو عرب پر خدائی امن چھایا ہوا تھا۔"[۱]

ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈر نے بڑی عقیدت سے یہ تسلیم کیا ہے[۲]۔ اسلام نے بڑی سلطنتوں اور مستقل مذہبوں کو تہ و بالا کر کے نفوس اقوام کو نئی ترکیب دی اور ایک مکمل جدید دنیا یعنی دنیائے اسلام تعمیر کی جس کا اثر تمام نوع انسان پر پڑ کر رہیگا۔

عرب ہر شے کو یک قلم بھول گئے اور اپنے حقیقی اور واحد خدا کے لیے دنیا کو فتح کرنے کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے نور اسلام سے منور ہو کر ایک عظیم خلافت قائم کی جو اوائل میں خدائی جمہوریت تھی۔

---

[۱] پریچنگ آف اسلام (ترجمہ اُردو اشاعت اسلام ص ۴۰) ڈاکٹر آرنلڈ۔

[۲] جدید دنیائے اسلام۔ ڈاکٹر لوتھر ص ۱۶۵۔

جواہر لال نہرو لکھتے ہیں "اسلام کی سادگی سمجھ میں آنے والی حقیقت، جمہوریت اور مساوات نے بنی نوع انسان پر بڑا اثر ڈالا مطلق العنان بادشاہ اور انہی کی طرح خود سر ظالم مذہبی پیشوا انہیں کچل رہے تھے، وہ تنگ آچکے تھے اور انقلاب کے لیے تیار تھے اسلام یہ انقلاب لے آیا اور وہ ان کے حق میں نعمت ثابت ہوا، نئی بھلائیاں ابھر آئیں اور پرانی خرابیوں کا خاتمہ ہو گیا۔"[1]

دورِ جدید کی حکومت
اور اسلامی حکومت کے خاص خاص فرق

اسلامی حکومت	دورِ جدید کی حکومت
۱۔ مذہب۔ اسلامی حکومت سر تا سر مذہبی حکومت ہے اور مذہب اسلام کے مکمل، اٹل اور اساسی قانون کی پابند ہے[2] اور اس اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے	۱۔ مذہب۔ دورِ جدید کا سیاسی تخیل مذہبی نہیں۔ دنیائے جدید مذہبی حکومت اور اس سے مشابہت پیدا کرنیوالی تمام چیزوں کے علانیہ خلاف ہے۔[3]
۲۔ اسلامی حکومت میں مذہب کا تعلق زندگی کے تمام سیاسی، معاشی، اخلاقی اور تمدنی شعبوں سے ہے مذہب محض عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ حیاتِ اجتماعی کا نظام ہے جس کا	۲۔ زمانۂ حال کا قطعی میلان یہ ہے کہ سیاسی اور اجتماعی حقوق پوری طرح مذہبی اعتقاد سے آزاد ہیں اور مذہب کا تمام و کمال تعلق دل سے ہے۔[4]

۱؎ جگ بیتی جواہر لال نہرو (مکتبہ جامعہ) (۱۹۴۳ء) ص ۲۲۶۔

۲؎ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ اکملت لکم دینکم۔ الدین القیم (قرآن حکیم)

۳؎ نظریہ سلطنت بلنچلی ص ۶۳ ۴؎ ایضاً ص ۲۳۰

اسلوق روح کی اصلاح اور جسم کی فلاح دونوں سے ہے۔

۳۔ جو حکومت مذہب کو نہیں مانتی اور اپنے قانون کی رو سے مذہبی نہیں ہے وہ نہ اسلامی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

۳۔ حکومت کا جدید تخیل مذہبی نہیں ہے مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ غیر مذہبی ہے (سوائے سوویٹ روس کے) کیونکہ دورِ جدید یہ مانتا ہے کہ حکومتِ عالم میں خدا کی مرضی شریک ہے۔[۱]

یادداشت | قرآن حکیم مذہب اور مذہبی سوسائٹی کو سیاسی دائرہ میں یکجا دیکھتا ہے علماء قانون کہتے ہیں مذہب (دین) ایک ضابطہ ہے جو انسان کی عادت[۲] بن جائے اور جس کی اطاعت[۳] کی جائے۔ عادت اور اطاعت یہی دین کے معنی ہیں۔ اس تعریف کی رو سے یہ ظاہر ہے کہ جس مذہب کی یہ تعریف ہے وہ مکمل[۴] ضرور ہوگا اور اس میں انسان کی عادت فطرت پر حاوی ہو جانے کی استعداد بھی بدرجہ اتم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون میں دین کا لفظ اصطلاحی طور پر اجتماعی نظام کے لیے بھی مخصوص ہے۔ وہی مذہب جو خداوند اعلیٰ کا قانون ہے جب پیغمبر کی قوت سے انسانوں کو ایک محکم نظام کے اندر جمع کر دیتا ہے تو وہ ملت (نظامِ اجتماعی) بن جاتا ہے (دیناً قیماً ملۃ ابرٰهیم) اور اس مرحلہ پر مذہب کا مفہوم صرف "نظامِ ملی" ہوتا ہے[۵]۔ یہ مذہب یا نظام کوشش کرتا ہے کہ انسان کو اس کی بہتری اور ترقی کی طرف رہنمائی کرے۔ دنیا کی بہتری کی طرف اور دنیا کے بعد آخرت کی بہتری کی طرف[۶]

---

[۱] پنجلی ص ۶۳ [۲] کلیات العلوم ابی البقاء حنفی۔ الدین ص ۳۲۷

[۳] مفردات القرآن۔ امام راغب اصفہانی (دان) (حاشیہ النہایہ ص ۲۶

[۴] الدین کالملۃ۔ مفردات القرآن امام راغب حاشیہ النہایہ" حدیث" ج ۲ ص ۲۶۔ کلیات ابی البقاء (دین القیم الملۃ القیمہ) (والملۃ منسوب الی الرسول) الدین ص ۳۲۷

[۵] دیکھو مندرجہ بالا حوالے۔ امام ماوردی فرماتے ہیں الدین اقوی القواعد فی صلاح الدنیا وھو الفرد الاوحد فی صلاح الآخرۃ۔ مذہب دنیا کی سود بہبود کا سب سے زیادہ طاقتور قانون ہے اور اسی سے آخرت کی صلاح بھی ہوتی ہے۔ "ادب الدین والدنیا" الماوردی ص ۸۰ دائرۃ المعارف (عربک انسائیکلوپیڈیا) بستانی ص ۲۳۲ (دین)

دورِ جدید کی حکومت مذہب کو اس سے مختلف سمجھتی ہے۔ وہ اپنے حقیر تصور کی رو سے اُس کو دل کا عقیدہ گردانتی ہے۔ اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہ اسے "ایک خیال" سے زیادہ وقعت نہیں دیتی۔ اسلام میں حکومت مذہب ہے اور مذہب حکومت۔ جدید دور میں نہ یہ ہے نہ وہ، مذہب سے دورِ جدید کی یہ جنگ عیسائیت کی متواتر ستم شعاریوں، تباہ کن خیال پرستی اور بیہودہ گردی سے شروع ہو کر مسیحیت سے وحشیانہ نفرت پر ختم ہوئی۔ اس کی ابتدا، اور انتہا دونوں کا تعلق عیسائی مذہب سے ہے۔ یہ ایک مذہب کے لوگوں کا احتجاج ہے اپنے مذہب کی خرابیوں کے خلاف اسلام جو دنیا کی تمام خرابیوں کے خلاف جہاد کر چکا ہے۔ اس احتجاج کا نشانہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے نظم و تنظیم کے دائرہ میں مکمل ہے اور قانون کی دنیا میں سب سے بڑا معجزہ ہے۔

امریکہ نے ۱۷۸۹ء کے اعلانِ حقوقِ انسانی کی رو سے مذہب اور ریاست کی علٰحدگی کا اعلان کیا تھا۔ جرمنی میں فرانکفورٹ اور برلن کے اعلان مصدقہ ۱۸۴۸ء میں اور سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۶۶ء میں اسے مان لیا گیا۔ اشتراکی روس نے ۱۹۱۹ء سے مذہب اور کلیسا کو اپنی تلوار کا نشانہ بنا رکھا ہے، تاہم علٰحدگی کا یہ اصول ابھی عالمگیر طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔[1]

۳۔ حکومتِ الٰہی (خدا کی بادشاہت) اسلامی سلطنت کے اختیار کا سرچشمہ خدا کو سمجھتی ہے حکومت ایک تنظیم ہے جسے خدا نے اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔ حکومت خدائے واحد کا حکم ہے جس کا اقتدارِ اعلیٰ خود خدا کے ہاتھ میں ہے انسان کے لیے یہ ایک نیابتی ذمہ داری

۳۔ حکومتِ الٰہی (خدا کی بادشاہت) جدید علمِ سیاست خدا کے طریقوں پر حاوی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ دورِ جدید کی حکومت انسانی ذرائع سے وجود میں آتی ہے جسے انسان نے انسانی اغراض کے لیے بنایا ہے اور وہی اس کا انتظام کرتا ہے۔ دنیائے جدید صرف یہ

[1] نظریۂ سلطنت بے کے بلنچلی (سلطنت کا تعلق افراد سے۔ مذہب) ص ۲۳۰۔ ۲۳۱ تفصیلی معلومات کے لیے دیکھو (طبقۂ مذہبی، ص ۱۳۲

(اصول [illegible] ص ۳۲۶)

(خلافت) ہے خدا جس کو چاہتا ہے یہ ذمہ داری دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ مانتی ہے کہ حکومت عالم میں خدا کی مرضی شریک ہے۔

یادداشت | اسلام خدا کی بادشاہت کا بلند عقیدہ دنیا میں پیش کرتا ہے۔ کنفیوشش نے ۵۰۰ ق م میں کہا تھا۔ خدا فرمانروائے اعظم ہے، افلاطون الٰہی نے بھی ۴۰۰ ق م حکومت الٰہی کی طرف اپنا رجحان پیش کیا تھا لیکن کنفیوشش جلاوطن کر دیا گیا افلاطون کو انسانی بادشاہوں نے ناکام بنا دیا حضرت عیسیٰ اسلامی سلسلہ کے پیغمبر اور سردار تھے اُنھوں نے اعلان کیا خدا کی بادشاہت آنے والی ہے مگر کلیسا نے ان کی طرف سے اعلان کر دیا جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو" اسلام کی "خدائی بادشاہت" ایک زندہ حقیقت ہے خدا کی حکومت کے معنی یہ ہیں سب انسان برابر ہیں۔ خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ انسان انسان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ خدا اپنے عرش سے سب کو اپنے احکام سُناتا ہے "اچھے قوانین پر عمل کرو تمام برائیوں کو فنا کر دو" تمام انسان اس حکم کو مان لیتے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔

مسیحی دور میں ظالم بادشاہوں نے اپنی شاہی کے وحشیانہ دور میں خدا کی بادشاہت کا نام لیا۔ یورپ کے سیاسی لوگوں نے اسے سراہا۔ ــــ بو نے کہا "سلطنت خدا کا سایہ ہے"[1]۔ ہالر (Haller) نے پلوٹاک کا جملہ نقل کیا "خدا پر ایمان کے بغیر مملکت کا قیام دشوار ہے۔ خدا تمام دنیا پر حکمراں ہے"[2]۔ ادگس برگ کا اقرار ۱۵۳۰ء نقرہ ۱۶ کہتا ہے "تمام قانونی نظم خدا کے حکم کا نتیجہ ہے"۔ اشتال نے کہا "حکومت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے" ہلر کا عقیدہ ہے "قانون کی اصل خدا کی مرضی ہے۔ ایک اور مقولہ ہے "صرف خدا ہی حکمراں ہے"[3] (دیکھو بلنچلی)[4]

قدیم توہم پرست مذہبی حکومتیں بھی اس تصور کو کسی نہ کسی شکل میں مانتی تھیں۔ مگر حکمت عملی کو دیکھا جائے تو حکمران خدا بن بیٹھے، بادشاہوں نے خدائی مرتبہ حاصل کر لیا۔ میروسے میں قسیسیوں کے خدائی اختیارات سے

[1] زمانہ انقلاب کی تاریخ ج ۱ ص ۲۱۴ [2] سوانح عمری واشنگٹن اسپارکس ج ۲ تقریر پلوٹارک ۱۷۸۹ء
[3] گینز و تصانیف (Memoires) ج ۲ ص ۲۳۷۔
[4] دیکھو مندرجہ بالا حوالوں کے لیے نظریہ سلطنت بلنچلی ص ۲۹۷-۳۱۴-۳۹۸-۴۴۵۔

بادشاہ خودکشی کرلیتا تھا۔ مصر میں بھی تسیسوں کو یہی مہیب قوت حاصل تھی قدیم ہندوستان کی بادشاہی میں خدائی موجود تھی گشتاسپ کے زمانہ میں بھی بادشاہ خدائی اختیارات پر قابض[1] تھا۔

یہ حکومتیں خدائی حکومتیں نہ تھیں کیونکہ اُن کے دائرہ میں بادشاہ، قسیس، پروہت، برہمن اور دیوتا خدا کے خلاف بغاوت کر رہے تھے، اسلام کی حکومت راشدہ نے تمام ظالم، خودسر وحشی انسانوں سے ظلم کی تلوار چھین لی، انہوں نے حکومت الٰہی کو صحیح معنی میں قائم کیا۔ صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے دنیا کے تاج اور تخت پر لات ماردی اور عام انسانوں کے برابر زمین پر بیٹھ کر اس طرح خدا کے حکم کی تعمیل کی جس کی مثال نہیں ملتی۔

۵۔ حکومت کے نام۔ دنیا کے تمام انسانوں کی طرح دنیا کی جملہ حکومتیں بھی اپنے ناموں سے پہچانی جاتی ہیں۔ اسلامی حکومت بھی اپنے خاص اور علیحدہ اصطلاحی نام رکھتی ہے اور اس کو صرف انہی ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔ اس کے خاص خاص نام یہ ہیں

ا۔ حکومت الٰہی (اللہ کی حکومت)

ب امامت کبریٰ (عظیم الشان رہنمائی) (قیادت عظمیٰ، زبردست لیڈرشپ)

ج۔ خلافت راشدہ (بہترین نیابتی حکومت) (نیابتی حکومت کی معراج)

۵ حکومت کے نام۔ دنیا کی مختلف قوموں نے حکومت اور سلطنت کے مختلف نام رکھے ہیں۔ یونانی سلطنت کو پولیس (Polis) شہر کہتے ہیں۔ رومی سیوٹاس (Civitas) بمعنی تمدن اور ریس پوبلکا (Respublica) شاہی جمہوریہ کہتے تھے، جرمنوں نے اس کا نام رائش (Rich) سلطنت عظمیٰ اور انگریزوں نے دولت متحدہ کامن ویلتھ (Commonwealth) تجویز کیا۔ اس کو لاطینی میں امپیریم (Imperium) اور انگریزی و فرانسیسی میں (Empire) (قیصریت

---

[1] نظریہ سلطنت پنچلی ب ۶ م ۱۶ مذہبی حکومت ص ۳۶۳۔

د۔ امارت شوریٰ (شوروی ریاستِ عامہ)

ہ۔ ریاست عامہ[1] (یا اقتدار مرکزی ریاست (ہمہ گیر سیاسی ادارہ)

ان ناموں میں حکومتِ الٰہی کا نام سب سے زیادہ جلیل القدر ہے، اور سب پر حاوی ہے۔

اور شہنشاہیت) کا نام بھی دیا گیا ہے، صرف ریاست اسٹیٹ (State) بھی کہہ دیتے ہیں، یہ مملکت کا عام نام ہے اور اس کے عام مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

ارسطو نے حکومت (مملکت) کو تین نام دیے شاہی (Monarchi) حکومت امراء (اعیانی) (Arislocracy) دولت عامہ (پولیٹی (Polity)

زمانہ حال میں سیاسی اوصاف کے لحاظ سے حکومت کو مندرجہ ذیل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے

۱۔ شہنشاہی (Imperial)

۲۔ پارلیمنٹری حکومت (Parliamentary)

۳۔ جمہوری حکومت (Republic)

۴۔ آمریت (ڈکٹیٹرشپ (Dictatatorship)

۵۔ اشتراکی (سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ

(Soviet Socilistic Republic

۶۔ فاشی حکومت (Fascist Government)

(۷) نازی حکومت (Nazi Government)

یہ تمام نام اپنے اپنے جداگانہ مفہوم، طرز حکومت اور سیاسی حکمت عملی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا مکمل مفہوم اسلامی حکومت کے مکمل مفہوم سے بالکل الگ ہے اس لیے ایک کو دوسرے کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا البتہ کسی خاص وصف کی یکسانیت کی بنا پر باہمی مشابہت کا معمولی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

[1] یہ نام علمائے قانون نے تجویز کیا ہے۔ درمختار ج ا ص ۱۱۵۔

۶۔ شوریٰ (استصواب رائے عامہ) شوریٰ اسلامی حکومت کی اصل ہے۔ بلکہ شوریٰ ہی حکومت ہے (وامرھم شوریٰ بینھم)

اسلامی حکومت پہلا ادارہ ہے جس نے شاہی کو ختم کر کے استصواب رائے عامہ کا اصول جاری کیا اور بادشاہ کی جگہ عوام کے انتخاب کردہ امام (قائد حکومت) کو عطا کی۔ یہ اولیت کا ایسا شرف ہے جو اسلامی حکومت کو دنیا کی تمام جمہوریتوں (جمہوریہ فرانس، امریکہ جرمنی، سوئٹزرلینڈ)، پارلیمنٹ انگلستان، سوویٹ اشتراکی یونین اور جمہوریہ چین) پر حاصل ہے۔ شوریٰ پہلا عمومی ایوان ہے جو تمام قومی ایوانوں پر فائق ہے۔

۶۔ جمہوری پارلیمنٹ (ایوان نمائندگان جمہور) دور جدید کے جمہوری ایوان، شاہی درباروں سے افضل ہیں۔ انہوں نے قابلِ تعریف طریقہ پر شخص واحد کی بادشاہی کو ختم کر کے مرضی عامہ کی نمائندگی کا حق حاصل کیا ہے لیکن یہ تمام ایوان اسلامی شوریٰ کی طرح مجرد، مفید، کارآمد اور سادہ نہیں ہیں۔ جمہوری پارلیمنٹوں میں رائے عامہ سونے چاندی کے ساتھ تلنے کے بعد اپنا وزن پیدا کرتی ہے۔ ان میں سرمایہ دار حاکم ہیں اور جمہور محکوم۔ جمہور معیارِ دولت کے مطابق رائے تو دے سکتے ہیں مگر حکومت کی کرسی پر جگہ نہیں حاصل کر سکتے۔ شوریٰ میں رائے کا حصول اتنے سادہ طریقہ پر ہوتا ہے کہ اس کا ذرا سا بار بھی غریب کی جیب پر نہیں ہوتا۔

یادداشت: اسلام کا شوریٰ اس وقت وجود میں آیا جب مصر، چین، بابل، نینوی، یونان، روم کی پوری تاریخ جمہوریت میں کسی جگہ جمہوریت موجود نہ تھی، قدیم حکومتوں میں مطلق بادشاہی کارفرما تھی۔ یونان میں اکلیسیا[1]۔ روم میں سنیٹ یہ دو ایوان موجود تھے مگر بقول بلنچلی ایتھنز یونان میں محض نام کی جمہوریت تھی۔ در اصل

[1] اکلیسیا میں چالاک لوگوں کی رائے چلتی تھی۔ دیکھو نظریہ سلطنت بلنچلی ص ۴۰۶ - ۴۶۳ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۵۸ -

وہاں ایک شخص کی حکومت تھی۔ روما کی جمہوریت اعیانی تھی سینیٹر یہ میں امرار کا غلبہ تھا اور اس میں اعلیٰ طبقے کی قطعی فوقیت تھی" اسلام کے شورٰوی تصور نے یورپ کی شاہی جمہوریت پر ضرب رسید کی۔ دور جدید میں کچھ عمومیت پیدا ہوئی مگر ناکام رہی۔ جدید دور کی جمہوریت میں دولتمند سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ باقی محروم ہیں عوام ووٹر ہیں اور امرا حکام۔

شوریٰ میں ہر شخص براہِ راست رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ مشورہ ایک حق ہے جس کے لیے نہ ایوان کی شرط ہے نہ وقت ہے نہ سرمایہ کی نہ جائداد کی نہ نمائشی تعلیمی ڈگری کی نہ رنگ و نسل کی نہ ملک و قوم کی نہ ذات اور طبقہ کی جمہوری ایوان میں ہر ایک غریب پہنچ سکتا ہے اور جب دولتمند پہنچیگا اُس کو صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی طرح غریبوں کی سطح پر آنا پڑیگا۔ جب غریب ترقی کرینگے حکومت اور حکام بھی ترقی کی طرف بڑھینگے۔

زینوفون یونانی نے لکھا ہے۔ جمہوریت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بدکردار اچھے رہیں اور نیکوکار پریشان ہوں[1] یہ بات آج کل جمہوریت کا خاص وصف ہے۔ شوریٰ اس کے خلاف چاہتا ہے نیکوکار اچھے رہیں اور بدکرداروں کو سزا دی جائے۔

ان فرقوں کے بعد شوریٰ شوریٰ ہے اور جمہوریت جمہوریت اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اسلام کی شورٰوی حکومت کو مطلق جمہوریت کا نام دینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔

۷ حکومت اور عمومیت (قومیت بین الاقوامیت اور انسانیت) سلطنت کا بلند ترین منتہائے خیال یہ ہے کہ سلطنت کی بنا انسانیت پر ہو۔ اسلامی حکومت دنیا کی پہلی

حکومت اور عمومیت (جمہوریت۔ عمومیت، انسانیت) دور جدید کی حکومت انسانیت کو سلطنت کا منتہائے سیاست سمجھنے سے انکار کرتی ہے۔ دور جدید کی حکومتیں

---

۱ نظریہ سلطنت (سلطنت کی عمومی صورتیں) ص ۳، ۴ (اکلیسا کی خصوصیت)

حکومت ہے جس نے اس منتہائے خیال کو
پورا کرنے کے لیے اپنی حکومت راشدہ کی
بنیاد انسانیت پر رکھی ہے۔ اسلامی حکومت
نہ قومیت پر مبنی ہے نہ بین الاقوامیت پر بلکہ ابتدا
سے انسانیت اور عمومیت (Democracy)
پر مبنی ہے۔

یہ حکومت اپنے کاموں میں مرضی عامہ
مساوات حقوق، آزادی ضمیر اور سادگی کا
بڑا خیال رکھتی ہے جب تک ایک شخص بھی
غریب حکومت کا قائد اعظم سرمایہ دار حکومتوں
کے سرمایہ دار صدر کی طرح زندگی بسر نہیں
کرسکتا۔ اس میں عوام حکومت کا معیار ہیں
عوام کے ساتھ حکومت کا معیار ترقی کرتا ہے
اور اسی کے ساتھ امیر حکومت کا معیار بلند
ہوسکتا ہے۔

یا تو قومی ہیں (جیسے انگلستان، جرمنی، جاپان
فرانس، اٹلی کی حکومتیں یا بین الاقوامی ہیں
جیسے جمہوریہ امریکہ یا سوویٹ یونین روس یہ
حکومتیں قومیتوں کے وفاق سے بنی ہیں)
اور قوموں کی نام نہاد ہستی کو تسلیم کرتی ہیں۔ اگرچہ
برائے نام۔ مگر ان میں سے کوئی ناقابلِ تقسیم
انسانیت اور بے واسطہ عمومیت کو نہیں
مانتی۔ ان حکومتوں میں عام حقوق کا بہت
ذکر رہتا ہے مگر غریب عوام کو ووٹ دینے
کے علاوہ کسی حق کا پتہ نہیں ملتا۔ ان جمہوریتوں
کے صدر اور غریب عوام میں اور حکام میں
زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہی فرق
اس امر کی دلیل ہے کہ دور جدید کی جمہوریت
ابھی عمومیت اور انسانیت سے دور ہے۔

یادداشت | سادگی، عمومیت اور انسانیت اسلامی حکومت کا بنیادی اصول ہے۔ اس حکومت میں وہ تمام باتیں
ناجائز ہیں۔ جن کا مظاہرہ غریب عوام کے مقابلہ میں سرمایہ دار جمہوریتوں کا طغرائے امتیاز ہیں۔ ضرورت سے
زیادہ سرمایہ اندوزی، سودی لین دین، امیرانہ عیش، آرام، نمائش ہر چیز خلافِ قانون ہے۔

اسلام میں سب سے پہلے براہ راست انسان کو خطاب کیا ہے۔ اسلامی حکومت دنیا کی سب سے

بڑی پارلیمنٹ ہے، عمومیت کا سب سے بڑا ایوان ہے۔ اس میں محمد عربیؐ کے ساتھ بلال حبشی، صہیب رومی سلمان فارسی بھی نظر آتے ہیں اور ابوبکر مکی اور سعد بن معاذ مدنی بھی۔ یہ وہ عمومیت ہے جس کا اظہار صدیوں تک دورِ جدید کے جمہوری ایوان میں نہیں ہو سکتا۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے عمومیت اور سادگی کا جو معیار پیش کیا اُس کا اظہار سوویٹ یونین کے صدر، قصرِ کریملن کے مکین اور زارِ روس کے جانشین اسٹالن سے بھی نہ ہو سکا۔

۸۔ خلافت (نیابتی حکومت) اسلامی حکومت اصلاً انسانی حکومت نہیں بلکہ نیابتی حکومت ہے[1]۔ اصل حاکم خدا ہے انسان زمین پر اس کا خلیفہ (نائب) ہے جو حکومت در حکومت کے اصول پر مذہبی فرائض کی طرح نیابت کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

۸۔ خلافت (نیابت سیاسی) دورِ جدید کی کوئی حکومت معیارِ خلافت کو تسلیم نہیں کرتی حالانکہ اسلامی حکومت کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اس طرزِ حکومت کو دنیا کی جدید تنظیمات سے الگ کر دیا ہے۔

یادداشت | خلافت کا اصول خدا کی نیابت کے مقدس نظریہ پر مبنی ہے۔ مسلمان دنیا میں پہلی قوم ہیں جنھوں نے مکمل صبر، برداشت اور رضا کے ساتھ ہر حال میں خدا اور خدا کے قانون کی اطاعت کی ہے خلافت کا تصور اُن کو یاد دلاتا ہے کہ وہ حکومت کو اپنی اصل شے سمجھ کر مغرور نہ ہوں بلکہ خدا کے حکم کا لحاظ رکھیں چونکہ خدا کا قانون انسان کی بہتری اور تعمیر و ترقی کے اعلیٰ منہاج پر مبنی ہے اس لیے خلافت میں وہ تمام باتیں ناممکن ہیں جو موجودہ حکومتوں میں عام ہیں اور انسانی قانون کے نت نئے تغیرات کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ظلم قتل، عدالتوں کی بے انصافی۔ رشوت، بیکاری، بیماری، ناداری، غربت، فاقہ کشی، انفرادی غلامی

---

[1] مفردات امام راغب (خلف) (النہایہ ج ۲ ص ۱۴۳۔ مجمع البحار (خلف) ص ۳۶۷ (طبع نولکشور لکھنو)

سیاسی غلامی۔ یہ سب باتیں اس امر کا نتیجہ ہیں کہ انسان سیاسی نیابت کے درجہ کو چھوڑ کر فریب خوردگی کے ساتھ خود حاکم بن بیٹھا۔

۹۔ رُشد[1] (نکوکاری) اسلامی حکومت حکومت راشدہ ہے۔ ایک ایسی حکومت جس کا اصول نکوکاری ہے۔ لفظ رُشد حکومت کے انتہائی اعلیٰ معیار حسن و خوبی کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ حکومت، حکومت کے کارکن اور مملکت کے عوام کا نکوکار ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کو خلافتِ راشدہ اور اُس کے برگزیدہ کارکنوں کو خلفاء راشدین کا لقب حاصل ہے۔

۹۔ رُشد (نکوکاری) دورِ جدید کی حکومت نکوکاری اور رُشد سے منکر ہے[2]۔ اس حکومت نے اپنے رجحان بدکاری کی وجہ سے نکوکاری کے تمام قوانین کو ترک کر دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس حکومت میں تمام حرام کاریاں، زنا، شراب، جوا، سود، گناہوں کی نمائش ہر شی جواز کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔ اسلامی حکومت ان باتوں کو ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتی خواہ اُس کا تعلق حکومت کی عیاشی سے ہو یا عوام کی بدکاری سے۔

اِسلامی حکومت اور اشتراکیت کے خاص خاص فرق

۱۔ اسلام ایک مذہب ہے اور اسلامی حکومت

۱۔ اشتراکیت ایک مسلک ہے اور اشتراکی حکومت

---

[1] مفردات امام راغب (رُشد) (الرشد خلاف الغی) ہر وہ شخص جو حکومت کے دائرہ میں خلافت راشدہ کے طرز پر عمل پیرا ہوگا۔ خلیفہ راشد اور خلافت راشدہ کے لقب کا مستحق ہوگا۔ النہایہ فی غریب الحدیث ج ۲ (رشد) ص ۷۱۔ مجمع البحار ج ۲ ص ۱۰۔ کلیات ابوالبقاء حنفی ص ۳۵۲ (الرشد)

[2] رینوفون کہتا ہے۔ جمہوریت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بدکردار اچھے رہیں اور نکونکار پریشان۔ دورِ جدید کی حکومت اسی نتیجہ پر عامل ہے اور اُس کا مظاہرہ تمام دنیا میں ہو رہا ہے۔

ایک مذہبی نظام ہے[1]

۲۔ اسلام کا موضوع اصلی روح[3] ہے اور مادہ اس کے تابع ہے۔

۳۔ اسلامی حکومت مذہب کی داعی ہے۔

۴۔ اسلامی حکومت مذہب کے فطری قوانین کو انسان کی بہتری کے لیے اٹل قرار دیتی ہے۔

۵۔ اسلامی حکومت دنیا کو مجموعۂ اضداد کہتی ہے یہاں ایک چیز حق ہے اور دوسری باطل دونوں کا تصادم ناگزیر ہے۔ فرد اور جماعت کو حق کا ساتھ دینا چاہیے۔ باطل کو حق بنا دینا چاہیے یا اس کو ختم کر دینا چاہیے[4]۔

ایک معاشی نظام (اتحاد) ہے[2]

۲۔ اشتراکیت کا موضوع خالص مادی ہے اور وہ روح کے حقائق سے انکار کرتی ہے

۳۔ اشتراکی فلسفہ مذہب کا منکر ہے۔

۴۔ اشتراکیت، مذہب، اخلاق اور ابدی صداقتوں کو ختم کر دیتی ہے اور انہیں جدید بنیاد پر بھی استوار نہیں کرتی۔

۵۔ اشتراکیت دنیا کو مجموعۂ اضداد کہتی ہے۔ ہر چیز دوسرے کی ضد ہے دو ضدوں کے تصادم سے ایک نئی چیز (ترقی) پیدا ہوتی ہے جیسے سرمایہ اور محنت کے تصادم سے تیسری چیز اشتراکیت پیدا ہو گئی ہیگل فلسفۂ اضداد کو تصوری مانتا ہے اور کارل مارکس وجودی یعنی یہ کہ یہ ضدیں اور ان کا تصادم اصلاً مادی موجودات میں ہوتا ہے[5]۔

---

[1] قرآن حکیم ان الدین عند اللہ الاسلام۔ الدین النصیحہ۔ الدین یسر (الحدیث)

[2] سوشلزم کی بنیادی حقیقت کارل ڈیل اجتماعی نظام کو اشتراکی اقتصادی پنچایت کہنا چاہیے۔ تقریر ۶ ص ۵۷ سوویٹ روس کی آزاد قومیں۔ سجاد ظہیر "ایک اشتراکی نظام معیشت کی بنیاد رکھی گئی" پیش لفظ ص ۶ کمیونسٹ مینفسٹو ص ۴۳

[3] الروح من امر ربی (قرآن حکیم) لکم فی الارض مستقر و متاع الخ قرآن حکیم

[4] قرآن حکیم میں جا بجا اضداد کا ذکر ہے۔ فرشتہ، شیطان، نیکی، برائی، حق، ناحق، انصاف، بے انصافی۔ اطاعت، طغیان محنت، سرمایہ داری، توحید اور تفریق۔ [5] کمیونسٹ مینفسٹو ۲ کوچک بورژوا اشتراکیت ص ۴۷۔ باری لاہور۔

۶۔ اسلامی حکومت اپنی اصل سے شوریٰ پر مبنی ہے۔

۶۔ اشتراکی حکومت بہ لحاظ انتظام شوروی ہے۔

۷۔ اسلامی حکومت خدائے واحد کے نام پر ساری دنیا کو فتح کر کے ایک نظام میں لانا چاہتی ہے

۷۔ اشتراکی حکومت تمام دنیا کے مزدوروں اور غریبوں کے لیے دنیا کو مسخر کرنا چاہتی ہے

۸۔ اسلام کا کوئی وطن نہیں۔ یہ دنیا تمام مساوی حق رکھنے والے انسانوں کا وطن اکبر ہے۔

۸۔ اشتراکی مزدوروں کا بھی کوئی وطن نہیں۔

۹۔ اسلامی حکومت کے مطمح نظر اور پروگرام کا مخاطب "انسان" ہے۔ نہ قوم نہ اقوام نہ طبقے، نہ ذاتیں۔

۹۔ اشتراکی حکومت دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کر کے ایک کو بناتی ہے دوسرے کو مٹاتی ہے اور انسان کی جگہ آزاد اقوام اور ان کے مزدوروں کا نام لیتی ہے۔

۱۰۔ اسلام سرمایہ داری اور سرمایہ اندوزی کے خلاف ہے[۵]۔ اسلامی حکومت اپنے خاص طریقوں سے (جو اشتراکی طریقوں سے الگ ہیں) جمع شدہ سرمایہ کی مناسب تقسیم کا حکم دیتی ہے، اس کو دائر و سائر رکھنا چاہتی ہے

۱۰۔ اشتراکیت سرمایہ داری اور سرمایہ اندوزی کے بکسر خلاف ہے۔ اشتراکی حکومت اپنے حلقہ اتحاد میں اور اپنے ہم مسلک افراد میں سرمایہ کی مساوی تقسیم کا حکم دیتی ہے اور اس حکم پر تلوار کی قوت سے عمل کراتی ہے[۶]۔

---

[۵] رب کعبہ کی قسم جو سب سے زیادہ سرمایہ دار ہیں وہی سب سے زیادہ خسارہ میں ہیں الخ عن ابی ذر (الحدیث) اخرجہ الخمسہ الا ابا داؤد "ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے میری امت کا فتنہ مال ہے الخ عن کعب بن عیاض الحدیث الترمذی تیسیر الوصول علامہ شیبانی ج ۱ ص ۸۰-۸۲ (ذم المال) [۶] سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی یقینی چیز ہے۔ لینن۔ سرمایہ داری (ملک) ص ۶۹

مگر اس کام کو قانونی طریقہ پر عام خوشدلی عدل اور اعتدال کے ساتھ کرتی ہے[1]۔

اسلامی حکومت	اشتراکیت
۱۱۔ اسلامی حکومت ان لوگوں سے روپیہ لیتی ہے جن کے پاس بہت کچھ مال ہے اور اُن لوگوں کو دیتی ہے جن کے پاس کچھ نہیں[2]۔	۱۱۔ اشتراکی حکومت ان لوگوں کا سرمایہ ضبط کر لیتی ہے جن کے پاس کچھ بھی سرمایہ ہے اور ان لوگوں میں تقسیم کر دیتی ہے جن کے ہاتھ خالی ہیں۔
۱۲۔ اسلامی حکومت محدود شخصی ملکیت کو جائز سمجھتی ہے۔ مناسب حد تک راس المال رکھنے کی اجازت دیتی ہے[3]۔ زائد سرمایہ کے لیے ملی بیت المال قائم کرتی ہے اس میں سب کا اشتراک تسلیم کرتی ہے۔ اور اس سرمایہ کی تقسیم سے سرمایہ و غربت کے درمیان توازن اور مساوات کو بحال رکھتی ہے[4]۔	۱۲۔ اشتراکیت میں شخصی ملکیت سب سے بڑا فساد ہے[5]۔ اور قانونًا ناجائز۔ ہر سرمایہ اور ہر پیداوار (سرمایہ کا ہر حصہ) اجتماعی ملک ہے تمام سرمایہ حکومت کی امانت میں رہتا ہے اور اشتراکی بیت المال میں جمع ہوتا ہے اس سرمایہ میں سب کا اشتراک ہے اور سب کو اس سے برابر حصہ ملتا ہے[6]۔

یادداشت | اسلامی حکومت اور اشتراکیت کے ان خاص خاص فرقوں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا

---

[1] کیلا یکون دولۃً بین الاغنیاء دولت سرمایہ داروں میں قید ہو کر نہ رہ جائے (قرآن حکیم، حشر)
[2] "اشتراکیت ان تمام جماعتوں کی رہنمائی کرتی ہے جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے" لینن، کارل مارکس۔ باری ص
[3] لکم رءوس اموالکم [4] عہد نبوی، عہد صدیقی۔ عہد فاروقی میں یہی قانونی تعامل تھا۔ قرآن حکیم سواء للسائلین بحر المحیط ابو حیان اندلسی ج ۷، ص ۴۸۶ روح المعانی ج ۲۴ ص ۹۰۔ تفسیر الجواہر جوہری ج ۱۹۔ الناس شرکاء۔ مجمع البحار (ضمنی حوالہ ص ۱۸۹) [5] اشتراکیت ملکیت کو ختم کر دینا چاہتی ہے کمیونسٹ مینیفسٹو صفحہ ۳۹ [6] مکتوب کارل مارکس ۱۸۵۲ء۔ کارل مارکس باری ص ۶۱۔

جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کو کس حد تک دوسرے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسلام اشتراکیت ہے؟ اشتراکیت اسلام ہے؟ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکیت کی مادی کرلی میں اگر کوئی روحانیت موجود ہے تو اسلام اس کا اثر اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اشتراکیت نے مذہب کو ظالم سمجھا، اس کی سمجھ کا نقطہ عیسائی مذہب[1] تھا، اس نے مذہب کے خلاف تلوار ہی اُٹھائی اور اس میں اسلام کو بھی شامل کرلیا یہ اس کی قابلِ رحم اور لائقِ اصلاح بے خبری تھی[2]۔

اسلامی حکومت اور اشتراکی حکومت میں سب سے پہلی جنگ فلسفہ کی جنگ ہے۔ اسلامی حکومت کا بنیادی نظریہ علیحدہ ہے اور اشتراکی حکومت کا فلسفہ الگ۔ جب تک اشتراکیت، مذہب اور اس کے قوانین کی منکر ہے اس وقت تک دونوں حکومتیں اس جنگ سے دست بردار نہیں ہو سکتیں۔ مادہ اور مادی پیداوار اخلاق کے تابع اور روحانی عوامل سے وابستہ ہے۔ سب انسان برابر ہیں[3]۔ اجتماعی پیداوار اجتماعی ملک ہے[4]۔ ہر انسان کو روٹی پانی، کپڑا، مکان ملنا چاہیئے[5]۔ حکومت کے عہدیداروں کا معاشی حق فرد جمہور کے برابر ہے[6]۔ یہ سب اصول سب سے پہلے مذہب و اخلاق ہی نے پیش کیے ہیں۔ اگر یہ دونوں نہ ہوں تو انسان کا پیٹ بھر جائے گا روح کبھی مطمئن نہیں ہو گی۔

خدا نے انسانوں کو حق دیا ہے کہ غریب محنت کرے اور اپنی محنت کا مالک ہو اگر معاشی فساد کی وجہ سے ملی بیت المال قائم کیا جانا ضروری ہے اور اجتماعی محنت، اجتماعی سرمایہ اور برابر کی تقسیم ہی انسانی

---

[1] خدا، کلیسا اور روح القدس کے نام پر مزدوروں کی اُجرت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ کارل مارکس۔ ص ۱۱ مسیحی اشتراکیت ایک ایسا مقدس پانی ہے جس سے پادری امیروں کے دل کی آگ بجھاتا ہے۔ پادری اور جاگیردار کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مینی فسٹو ص ۴۶۔

[2] اشتراکیت کو آج بھی معلوم نہیں کہ اسلام دنیا میں غریبوں کا واحد مذہب ہے۔ مشکوٰۃ ص ۴۴۶

[3] تمام انسان (ایک باپ) آدم کی اولاد ہیں (الترمذی) مشکوٰۃ باب المفاخرہ ص ۴۱۸

[4] خلق لکم ما فی الارض جمیعاً۔ زمین کی پیداوار سب کی ملک مشترک ہے۔ قرآن حکیم بہ تشریح شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ایضاح الادلہ ص ۳۶۸ [5] قضاء قاضی [5] حقوق انسان (حدیث ترمذی) عن عثمان التاج الجامع

مصائب کا واحد علاج ہے تو یہ کام شوریٰ انسانوں کی سب سے بڑی پارلیمینٹ طلب کر کے قانونی ذرائع سے مرضی عامہ کے مطابق کرنا چاہیے، افراد اپنی مرضی سے اپنی محنت کے حاصلات کو ملی بیت المال کی امانت میں دے سکتے ہیں اور حق کے مطابق لے سکتے ہیں۔ اس کے بغیر لوگوں کی محنت اور پیداوار کو ایک بڑے سرمایہ دار (حکومت) کے ہاتھ میں دینا اور ایک حاکم مطلق کے سپرد کرنا انصاف نہیں زیادتی ہے، اشتراک نہیں جبر ہے۔ مساوات نہیں اضداد کا مجموعہ ہے جس سے ترقی کی جگہ تنزل ہوگا اور جسے اسلام کا قانون پسند نہیں کرتا۔ اسلام سرمایہ کی جمع آوری اور سرمایہ کو ایک طبقہ میں محدود کرنے کے خلاف ہے، وہ اپنے نظام اقتصادی (زکوٰۃ، صدقات، امداد، خیرات، محاصل، بیت المال کی امداد) سے عام ضروریات کی حد تک سرمایہ کی مساوی تقسیم کا حامی ہے۔ اور فاسد سرمایہ داری کو ختم کرتا ہے۔ اسلامی حکومت محنت کش غریبوں کو امیروں سے افضل سمجھتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اشتراکیت کی تمام خوبیاں اسلام میں موجود ہیں اور تمام خرابیاں اس سے خارج ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اشتراکی انقلاب ایک ایسے عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ ہو، جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔

اسلامی حکومت اور جمہوری حکومت کے خاص خاص فرق

اسلامی حکومت	جمہوری حکومت
۱۔ اسلامی حکومت کے لیے مذہب بنیادی قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلامی حکومت مذہب اسلام کو عام انسانی فائدے کے لیے تمام انسانوں کا مطمع نظر بنانے پر زور دیتی ہے[1]، لیکن دوسرے مذاہب کے	۱۔ جمہوری حکومت کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہوتا[2]۔ جمہوری حکومت نہ مذہبی ہے اور نہ مذہب کی دشمن۔ ہر جمہوریت اپنے جمہور کو عقیدہ اور عمل کی آزادی کا پورا پورا حق دیتی ہے[3]۔

لہ فرمان نبویؐ "یا ایہا الناس قولوا لا الہ الا اللہ وان تفلحوا" سلہ (صفحہ ۵۰۷ پر)

ماننے والے افراد کو عقیدہ کی آزادی کا حق بھی دیتی ہے۔[1]

۲۔ اسلامی حکومت میں امام ہوتا ہے، اُمت ہوتی ہے، قانون کے حکمبردار انساں ہوتے ہیں، بادشاہ نہیں ہوتا۔ تاج، تخت اور ایوان شاہی نہیں ہوتا۔ ولیعہد نہیں ہوتا، شاہی شہزادے اور ان کا موروثی حق نہیں ہوتا۔[2]

۲۔ جمہوری حکومت کا صدر ہوتا ہے۔ ملکی حدود کے اندر ایک قوم ہوتی ہے، جمہور شہری ہوتے ہیں بادشاہ، تاج، تخت ولیعہد، شاہی شہزادے اور ان کا موروثی حق نہیں ہوتا۔[3] آخری باتوں میں جمہوری اسلامی حکومت کی مقلد ہے، کیونکہ اسلامی حکومت جمہوری حکومت کی پیشرو ہے۔

۳۔ اسلامی حکومت امامت، خلافت اور امارت شوریٰ کا نام ہے۔ اس حکومت میں خدا کی مرضی اصل ہے، جمہور کا اختیار منجانب اللہ ہے اور نیابتی ذمہ داری کے طور پر ہے۔ حاکم کا سرچشمہ "اللہ" ہے، رائے عا

۳۔ جمہوری حکومت نام ہے جمہور کی حکومت کا، جمہوریت میں حکم سرچشمہ مرضی جمہور ہے۔ جمہور اپنی حکومت نظام حکومت، قانونِ حکومت سب کچھ خود بناتے ہیں اور خدا کے حکم کی پروا نہیں کرتے، جمہور حکومت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷۷) [2] دنیا کی تمام جمہوریتوں نے مذہب کی حاکمیت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ ولنوا [illegible] الحق حذف کر دیا ہے۔ [3] تمام جمہوریتوں کی حکمت عملی اسی اصول پر مبنی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] لا اکراہ فی الدین [2] عہد نبوی سے لے کر عہد علوی تک تمام قانونی احکام، روایات، سیاسی تعامل اس پر گواہ ہیں، اسلام میں شاہی کا اجرا یزید سے ہوا، اس زمانہ کی شاہی ایک یزیدی روایت ہے جس کو اسلام کے قانون سے کوئی تعلق نہیں۔

[3] دیکھو انقلاب فرانس سنہ ۱۷۸۹ء۔ جمہوریت امریکا سنہ۔ جمہوریہ سوئٹزرلینڈ سنہ ۱۷۹۸ء۔ جمہوریہ روس سنہ ۱۹۱۷ء۔ جمہوریہ ترکی سنہ ۱۹۲۳ء۔ جمہوریہ چین سنہ ۱۹۱۱ء

اسی کے زیر سایہ کام کرتی ہے۔

بنا سکتے ہیں اور ہر نظام حکومت کو بدل بھی سکتے ہیں[1]۔

۴۔ اسلامی حکومت میں امت کا ہر فرد حکومت کی ذمہ داریوں میں براہ راست شریک ہے۔ ہر شخص شوریٰ میں بذات خود پہنچ کر ارکانِ حکومت کے سامنے رائے پیش کر سکتا ہے[2]۔

۴۔ جمہوری حکومت میں جمہور صرف ووٹ دیتے ہیں اور اپنے نمایندوں کے ذریعہ حکومت کے کام میں شرکت کرتے ہیں۔ اصل جمہور نہ حکومت کی کرسی تک پہنچ سکتے ہیں نہ جمہوری ایوان میں داخل ہو سکتے ہیں[3]۔

۵۔ اسلامی حکومت کا امام طاقتور ہوتا ہے عام حالات میں اس کے حکم سے دُنیا ادھر سے اُدھر ہو جاتی ہے، اس کا ہر فیصلہ قانونِ اسلام کے مطابق ہونا چاہیے۔ خاص حالات میں اسے شوریٰ کے فیصلہ کو اپنا فیصلہ سمجھنا چاہیے، اس کے بعد اس کا ایک اشارہ کافی ہے جمہور اس کی اطاعت کرینگے۔ ورنہ باغی طاغی سمجھے جائینگے۔

۵۔ جمہوریت کا مرکز کمزور ہوتا ہے صدر کو جمہوری ایوان کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر جمہور خلاف قانون بھی کسی فیصلہ پر جمع ہو جائیں تو حکومت اُلٹ جاتی ہے۔ حالات عام ہوں یا خاص حکومت کے کاموں کی رفتار سست رہتی ہے۔ جمہور بے لگام آزادی کی وجہ سے ہر وقت مرکز کو پارہ پارہ کرنے اور مرکز سے جُدا ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

[1] عربک انسائیکلوپیڈیا بستانی ج ۸ ص ۲۳۲ - دائرۃ المعارف وجدی ج ۳ ص ۱۷۲

[2] زیر نظر کتاب میں شوریٰ کا عنوان دیکھیے

[3] نظریۂ سلطنت جے کے بلنچلی بنم ۲۲ مب ص ۴۸۰ -

۷۔ اسلامی حکومت کا امیرِ اُمت کا سب سے بڑا رہنما اور سب سے اعلیٰ ماہر قانون فرد ہوتا ہے اور زندگی بھر رہنمائے حکومت (امام) رہتا ہے۔ صرف دو شرطوں کے ساتھ اللہ کے قانون پر عامل رہے۔ خدا کے فرمانبردار جمہور کی مرضی عامہ اس کی حامی ہو[۵]	۷۔ جمہوریت کا صدر جمہوری ایوان کی طرح وقت مقررہ کے لیے ہوتا ہے اور تاریخ مقررہ پر اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو جاتا ہے صدر ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ قوم کا سب سے اچھا فرد ہو اور قانون کا فرمانبردار بھی۔ صرف ووٹوں کی اکثریت شرط ہے[۲]

یادداشت | بادشاہی میں حکومت کی باگ ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اعیانی میں امیر طبقہ کے چند قابو یافتہ افراد کے ہاتھ میں۔ اور جمہوریت میں عوام کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ اس کا ہر حکم بہت سی زبانوں سے نکلتا ہے مگر اس طرح جیسے کہ ایک زبان سے ادا ہو رہا ہے[۳]۔

یہ ہے جمہوریت، سوال ہے کہ جمہوریت کیا ہے۔ تاریخ میں اس کا نام موجود ہے روح موجود نہیں جمہوریت اسپارٹا (سنہ ۹ ق م) کے اٹھائیس رکن تھے اور اونچے طبقے کی جمہوریہ وینس سنہ ق م کا ڈوجے (صدر) مطلق العنان بادشاہ کی مانند تھا۔ روم و یونان کی جمہوریتیں بھی عجیب تھیں۔ ان کے سر پر بادشاہ بھی تھے اور بلند طبقہ کے سرمایہ دار اعیان بھی۔ زمانۂ حال کی جمہوریت کو اس زمانے کے جمہوری بھی جانتے ہیں[۴]۔ بادشاہت سے ہزار درجہ اچھی ہے۔ مگر جمہور رائے دہی (ووٹ) کے قید خانہ میں سیاسی قیدیوں کی مانند ہیں جن کا نام جمہور ہے ان میں سے کوئی صدر جمہوریہ کی کرسی پر نہیں آسکتا۔ ووٹ روپیہ کو ملتا ہے۔ غریب طبقہ کتنا ہی قابل ہو جمہوری ایوان کے قابل نہیں ہوتا۔

---

[۱] دیکھو اسد الغابہ، ذکر خلفاء راشدین ص ۴۴۳ (جماعت عاملہ۔ جمہوریہ)
[۲] مبادی سیاسیات پروفیسر ہارون شروانی جامعہ عثمانیہ ص ۱۶
[۳] انسائیکلوپیڈیا بستانی ج ۶، ص ۲۳۴۔
[۴] مندرجہ بالا حوالوں کے علاوہ دیکھو ریاست افلاطون ص ۴۹۸ (ذکر جمہوریہ)

شاہی میں ایک کا شکنجہ تھا اعیانی میں چند لعیان کا جمہوری میں چند سے زیادہ چالاک دولتمند اور زباں دراز مدبروں کا شکنجہ ہوتا ہے۔ جمہور آج بھی بھوکے ننگے، بیکار۔ بیمار اور نادار ہیں۔ ذلیل ہیں، پسماندہ ہیں اور غلام ہیں۔

اسلام آیا، اس نے شاہی محل گرایا، دربار توڑا، تاج چھینا، تخت اُلٹا، بادشاہ کو ختم کیا۔ ولیعہد کا نام مٹایا۔ اور جمہور کی مرضی پر خدائی جمہوریت قائم کی۔ اس حکومت کا امیر، غریب بن کر رہتا تھا اور جب جمہور کا آخری فرد کھانا کھا لیتا تھا اس وقت امیر سوتا تھا۔ جمہوریت کے قول اور فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلامی حکومت کا جو قانون ہے وہی قانونی حکمت عملی ہے جو بات امیر کے لیے جرم ہے وہی عوام کے لیے جرم ہے، امیر امیر نہیں، غریب غریب نہیں۔ جو امر خلاف قانون ہے وہ سب کے لیے ہے۔ انصاف انصاف ہے۔ ظلم ظلم۔ رشوت رشوت ہے۔ اسلامی حکومت میں ہر قانون حقیقی ہے۔ جمہوریت میں ہر قانون جعلی ہے۔

اسلامی حکومت	فاشی اور نازی نظام
۱۔ اسلام کا تصور حکومت انسانیت پر مبنی ہے۔ اس کی رو سے حکومت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے جس میں تمام انسان برابر کے حقدار ہیں۔	۱۔ فاشی اور آمری نظام کی بنیاد ایک خاص قوم اور نسل کی برتری پر موقوف ہے۔ حکمراں طبقہ اور نسل دوسرے تمام طبقوں اور نسلوں سے افضل ہوتا ہے۔
۲۔ اسلامی حکومت میں اختیار مطلق کا مرکز خدا کی بالادست ہستی ہے۔	۲۔ فاشی اور نازی نظام میں حکومت کا سردار آمر مطلق (ڈکٹیٹر) ہوتا ہے۔
۳۔ اسلامی حکومت میں اعلیٰ رہنمائی کے اوصاف ہوتے ہیں اور صدر حکومت کو رہنمائی	۳۔ فاشی اور نازی نظام میں رہنمائی کی قوت کام کرتی ہے اور حکومت کے صدر کو

حکومت (امام) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔	اٹلی میں ڈیوچے (رہنما) جرمنی میں فیوہرر (رہنما) کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔
۴۔ اسلامی حکومت میں آزادی کا درجہ قانون کے بعد ہے اور قانون اللہ کی کتاب ہے۔	۴۔ فاشی اور نازی آمریت میں آزادی کا درجہ قانون کے بعد ہے اور قانون ڈکٹیٹر کا حکم ہے۔
۵۔ اسلامی حکومت کا امیر تاحیات عہدہ پر رہتا ہے اور مرکزی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔	۵۔ فاشی اور نازی نظام میں بھی امیر تاحیات رہتا ہے۔ اس کی ہستی میں جبار قسم کی مرکزی طاقت ہوتی ہے۔
۶۔ اسلامی حکومت کا مرکز طاقتور ہوتا ہے مگر شوریٰ کی طاقت زندہ رہتی ہے حکومت کا کام جمہور کی مرضی سے ہوتا ہے۔ جبر مطلق سے نہیں ہوتا۔ ہر انسان حکمبردار بن کر ہر وقت قائد حکومت کو مشورہ دے سکتا ہے اور اس کے بعد زندہ رہ سکتا ہے	۶۔ آمری نظام میں مرکز حکومت زبردست طاقت کا مالک ہوتا ہے حکومت کے کام میں جمہور کی مرضی سے زیادہ حکومت کی مرضی کو دخل ہوتا ہے۔ حکومت مملکت کے فائدے کے لیے جو پالیسی اختیار کرتی ہے انسان اس کے خلاف رائے دے کر کہیں پناہ نہیں حاصل کر سکتا۔
۷۔ اسلامی حکومت عوام کی اخلاقی، روحانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے	۷۔ نازی اور فاشی نظام اپنے قلمرو میں عوام کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ روحانی ضرورتوں سے تعلق نہیں رکھتا
۸۔ اسلامی حکومت برابر کے انسانوں کا	۸۔ نازی اور فاشی نظام میں اونچے طبقہ

اور دنیا بھر کے غریبوں کا شیرازہ بند نظام ہے   اور اعلیٰ نسل کے انسان حاکم ہوتے ہیں اور عوام محکوم۔

یادداشت | آمریت (فاشی اور نازی ڈکٹیٹر شپ) دورِ جدید کی جمہوریت کی ایک نئی قسم ہے۔ درحقیقت یہ نظام افلاطون کی حکومت خواص اور ارسطو کی اعیانی ارسطوکریسی طرزِ حکومت کا نیا نقشہ ہے۔ زمانہ بدلا اس کے آب و رنگ بھی بدل گئے۔ سب سے پہلے کارل مارکس نے ۱۸۵۲ء میں ایک دوست کے خط میں غریبوں کی پرولتاری ڈکٹیٹر شپ آمریت کا ذکر کیا۔ اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے روس میں اس ڈکٹیٹر شپ کی بنیاد رکھ دی ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے روم پر کامیاب دھاوا بولا اور فاشی آمریت کی بنیاد رکھی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے جمہوریہ جرمنی کے بوڑھے صدر جنرل ہنڈنبرگ کے ہاتھوں سے حکومت کی زمام اپنی مٹھی میں لی۔ اور نازی ڈکٹیٹر شپ کی بنیاد رکھی۔ ڈکٹیٹری حکومتوں میں ایک بات یہ ہوتی ہے کہ حکومت کی طاقت قوم کی طاقت سے فائق ہے۔ وہ نہ مخالف رائے کو گوارا کرتی ہیں نہ مخالف پارٹی کو۔ اسلامی حکومت میں پارٹی ایک ہی ہوتی ہے کوئی مخالف جماعت نہیں ہوتی مگر مخالف رائے مشورہ ضرور سنا جاتا ہے۔ ایک جگہ قوم کی ہستی اپنے قائد مطلق کی ذات میں مرکوز ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ امت اور قائد امت دونوں ایک سطح پر موجود رہتے ہیں۔ فاشی نظام میں سینٹ ایوان کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی نظام شوریٰ اہم ترین معاملات میں قائد حکومت کی زبردست رہنمائی کرتا ہے۔

۱۔ اسلامی حکومت کا اصل حکمراں خدا ہے امت خدائی اقتدار کا مظہر ہے اور امام (قائد حکومت) امت کی عظمت اور غلبہ کا   ۱۔ پارلیمنٹری حکومت کا اصل حکمراں قانونی بادشاہ ہے جو سلطنت کی آئینی عظمت کا مجسمہ مانا جاتا ہے اور اس میں نام کی حد تک

ف ریاست افلاطون کتاب ۵ ص ۸۴-۴۸۷-۹۴۴۔ مبادی سیاسیات آمری کابینہ ب۱۶ ص ۳۵۶ رسالہ ص ۳۷۴۴ (جرمنی) تمثیلات فریق بندی ب۷ ص ۱۴۲ (اٹلی) ص ۱۴۵ جرمنی۔ یورپ کی حکومتیں جعفری اٹلی ص ۱۵۴۔ جرمنی ۲۱۴۔

اسلامی حکومت	پارلیمنٹری حکومت
نمائندہ اور پیکر ہے	سلطنت کی اعلیٰ ترین قوت جمع ہوجاتی ہے
۲- اسلامی حکومت میں بادشاہ، تاج تخت اور ولیعہد نہیں ہوتا۔	۲- پارلیمنٹری حکومت میں بادشاہ، تاج تخت اور ولیعہد ہوتا ہے مگر برائے نام۔
۳- اسلامی حکومت ایک مکمل تحریری قانون کی پابند ہے جو اٹل ہے۔	۳- پارلیمنٹری حکومت کے لیے قلمبند دستور ہونا ضروری نہیں۔ پارلیمنٹ قانون بناتی ہے اور چاہتی ہے تو قانون بدل بھی دیتی ہے۔
۴- اسلامی حکومت میں شوریٰ ہوتا ہے صرف واضع قانون مشیر قانون یا شارح قانون ہے اور دنیا کے ترقی پذیر معاملات میں زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلے سناتی ہے	۴- پارلیمنٹری حکومت میں پارلیمنٹ (ایوان عام) ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کا قانون سازی کا سرچشمہ ہے۔ اس نظام میں اختیار کا ایک مرکز تو ہے مگر یہ اختیار قانون سے محدود ہے۔[۲]

یادداشت | پارلیمنٹری[۳] حکومت سیاسی علم وتحقیق کے لیے ایک مضحکہ خیز معمہ ہے جسے سب سے زیادہ انگریزی دماغ نے حل کیا ہے یہ ایک ایسی دستوری حکومت ہے جس میں جمہور کی رائے کو بڑا دخل ہے۔ یا ایک محدود شخصی حکومت ہے اگرچہ ظاہر میں مطلق شخصی ہے لیکن کہنے کے لیے وہ ایک ایسی جمہوریت بھی ہے جس میں صدر کی جگہ قانونی بادشاہ ہوتا ہے۔ پارلیمنٹری حکومت میں پارلیمنٹ کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے کیونکہ وہ قانون کا سرچشمہ ہے مجلس وزراء کی قوت بھی محسوس ہوتی ہے کیونکہ وزیراعظم پارلیمنٹ کے اختیار کا نمائندہ ہے مگر

---

۱ دیکھو مرقع پارلیمنٹ انگلستان ص ۵۳-۵۴- یورپ کی حکومتیں۔ ڈاکٹر نجم الدین ص ۴۰-۵۶

۲ پارلیمنٹری حکومت اس جمہوری حکومت کے مشابہ ہے لہذا اس سلسلہ کے باقی فرق جمہوری حکومت کے بیان میں دیکھ لیے جائیں ۱۲۔

۳ اس طرز حکومت کی تفصیلات کے لیے دیکھو نظریہ سلطنت بلنچلی ج۲ ب۱۶ ص ۴۴۴-۴۵۰۔

بادشاہ کی ہستی سمجھ سے بالاتر ہے۔ "بادشاہ کبھی نہیں مرتا" بادشاہ مختار کل ہے، بادشاہ بری اور بحری افواج کا سب سے بڑا سپہ سالار ہے۔ بادشاہ انصاف کا سرچشمہ ہے قومی کلیسا کا سب سے بڑا حاکم اور محافظ ہے۔ بادشاہ عزت کا مرکز ہے اور دین کا نگہبان ہے۔ اوران سب باتوں کے باوجود پارلیمنٹری بادشاہ کاروبار حکومت میں کچھ دخل نہیں رکھتا۔ بادشاہ کے اختیارات عملی نہیں اخلاقی (نام کے) ہیں وہ حکومت کا نہ ذمہ دار ہے نہ جوابدہ[۱]۔

پارلیمنٹری حکومت کے یہ دونوں پہلو انسان کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں وہ کام جو بادشاہ کرتا ہے اس کو دستخط کرنے کی ایک مشین بھی کر سکتی ہے۔ اگر بادشاہ کی ہستی حقیقی ہے تو اُسے عملاً کاروبار حکومت پر اثر انداز ہونا چاہیے۔ اور اگر حقیقی نہیں ہے تو اس کا، اس کے شہزادوں اور شاہی محلوں کا بار قومی خزانہ پر ڈالنا بے ضرورت چیز ہے۔

آئینی بادشاہ اپنے محل کی چوٹی پر اتنا بھی آزاد نہیں ہوتا جتنا ایک عامی انسان، بقول لوتھر "وہ شخص دوسروں کی آزادی کی کیسے وقعت کریگا جس کی آزادی پر خود پابندیاں ہوں[۲]"

کچھ بھی ہو انگلستان نے اس طرز حکومت کو چار چاند لگا دیے۔ یہ صحیح ہے اسلام کا شوریٰ دنیا بھر کے انسانوں کی سب سے بڑی آزاد پارلیمنٹ ہے۔ اور انگلستان کی پارلیمنٹ صرف انگریزی نسل کے لوگوں کا قلعہ ہے جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا، مگر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ انگلستان کی پارلیمنٹری حکومت اگرچہ دنیا بھر کے لیے ڈکٹیٹر شپ ہے مگر انگلستان کے لیے ایک جمہوریت ہے۔ یہ ایک آزاد قوم کی بادشاہی ہے جو ساری دنیا کو غلام بنانے کے ارادہ سے نکلی تھی مگر اب سر پکڑ کر سوچ رہی ہے کہ اس ارادہ کو پورا کیا جائے یا ہندوستان کی سرحدوں پر اس کو ختم کر دیا جائے۔

---

[۱] تھیوریز اینڈ پریکٹس۔ برٹش گورنمنٹ پی آر۔ بی۔ ایس ۱۹۰۴ء ص ۱ ب ص ۱۳-۲۷

[۲] بلنچلی ج ۲ ص ۴۴۷۔

اسلام کے نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ

۱۔حکومت دینی نظام ہے محض دنیاوی تنظیم نہیں۔ ۲۔دین اصل فطرت پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کے تمام (روحانی، مادی، سیاسی) میلانات اور سرگرمیوں پر حاوی ہے۔ ۳۔اسلام (دینی نظام) کی حیثیت سے عین فطرت ہے۔ زندگی کا وہ مکمل اجتماعی دستور جو روح کی امداد سے منجانب اللہ مادہ پر حکومت کرتا ہے اور وجود واجب کو مادہ پر حاوی مانتا ہے اور انسان کو روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے "ارتقا پذیر" تسلیم کرتا ہے "اسلام" ہے ۴۔حکومت فطری (خدائی) تنظیم ہے اور فطرت کے ان اساسی قوانین کی علمبردار ہے جن کی سرحدوں پر انسانی بہتری ترقی اور معراج کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں جو عینی طور پر خدا کے اٹل قوانین ہیں اور اس حیثیت سے ہر نقص اور ہر اعتراض سے پاک ہیں۔ ۵۔اللہ دنیا کا خالق ہے، اللہ دنیا کا مالک ہے۔ وہ عرش عظیم کا پروردگار اور عرش عظیم کا شہنشاہ اعظم ہے۔ دنیا کا حاکم مطلق ہے حکومت اس کے حکم (مجموعہ احکام کی تعمیل) کا نام ہے۔ اور قانون اس کے مستند، معتبر اور ہمیشہ باقی رہنے والے فرامین کا نام ہے۔ وہ انسان کا حکومت کا، قانون کا یکساں موجد ہے۔ ۶۔انسان کی اصل پیدائش (دین) فطرت (فطری نظام) پر ہوتی ہے۔ اس کے پیدا کرنے والے نے اُسے حسن وخوبی کے معیار اصلح اور نمونہ احسن پر پیدا کیا ہے۔ صالح اور صلاحیت مند انسان (کامل اور نکوکار انسان) خدا کی زمین پر خدا کی حکومت کے وارث اور نائب (خلیفۃ اللہ فی الارض) بنائے جاتے ہیں۔ ۷۔اصل حکومت اللہ کی ہے، انسان کو خدائی حکومت کی ذمہ داری سپرد کی گئی اور یہ ذمہ داری نیابتی حق ہے، خداوندی میراث ہے۔ امامت کبریٰ (قیادت عظمیٰ) ہے۔ امارت شوریٰ (ریاست عمومی اور

ریاست عامہ) ہے۔ خلافتِ راشدہ (تمام دنیا کے لیے اعلیٰ سیاسی کردار کا نمونہ) اچھے انسانوں کی اچھی نیابتی حکومت ہے، ایک عظیم الشان آسمانی امانت ہے جس کا امین انسان کو بنایا گیا ہے (مالک نہیں بنایا گیا) خلافت ارضی روئے زمین کی عالمگیر حکومت ہے۔ مملکت عظمیٰ (معمورۂ ارضی کا عظیم وجلیل سیاسی قلمرو) ہے۔

۸۔ اس حکومت میں بادشاہ، تاج وتخت، شاہی محل اور شاہی ولیعہد نہیں ہوتے۔ صدر جمہوریہ اور اس کے سرمایہ دار اعیان نہیں ہوتے۔ ڈکٹیٹر اور ان کے قابو یافتہ ارکان کا وجود نہیں ہوتا۔ قوم نہیں ہوتی، اقوام نہیں ہوتیں۔ شیرازہ بند انسانی برادری (اُمتِ عظمیٰ) ہوتی ہے اور ان کا امام (رہنمائے اعظم) ہوتا ہے اور ان دونوں کا وجود خدا کے قانون کا سایہ ہوتا ہے۔

۹۔ اس حکومت کا سیاسی منتہائے خیال یہ ہے کہ انسان انسان کامل بن جائے ترقی کرے اور ترقی کرتا رہے۔ اس کے دائرہ میں صالح فرد، صالح امت کو پیدا کرتا ہے اور صالح اُمت، صالح فرد کو۔ اس طرح سیاسی معاشرہ معراج آخرت تک ارتقا، کرتا ہوا چلا جاتا ہے جب اس تخلیقی ترتیب میں فرق پیدا ہوتا ہے تو حکومت میں بھی فساد، تباہی، انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ امام وہ ہوتا ہے جو خیر الامت ہو۔ اُمت کا لقب اُسے حاصل ہوتا ہے جو خود خیر امت ہو یعنی ساری دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اُمت ہو۔

۱۱۔ اُمت "شوروی تنظیم" ہے۔ رائے عامہ میں رائے دہی میں آزادی ہے، مگر یہ آزادی کتاب اللہ کے قانون کے بعد ہے اُس سے پہلے نہیں۔

۱۲۔ امام (رہنمائے حکومت)، شوریٰ کا پسندیدہ اور مرضی عامہ کا مظہر اتم ہے۔

اس لیے اجتماعی طاقت کا زبردست نمائندہ ہے۔ اس کا درجہ جمہوریت کے سدر اور ڈکٹیٹر شپ کے ڈکٹیٹر کے درمیان ہے نہ وہ سو فیصدی شوری سے فیصلہ حاصل کرنے کا پابند ہے اور نہ شوری کو سو فیصدی نظر انداز کرنے والا آمر بلکہ امیر ہے۔ اسلامی کارپوریشن کا میئر۔

۱۳۔ عناصر ترکیبی۔ امام (فرمانروائے اعظم کا نائب) امت جس میں چار قسم کے انسان ہوتے ہیں مسلّم (حکمبردار عنصر)، کافر (وہ عنصر جو اس نظام پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ منافق جو ظاہر میں دوست اور دل میں اسلامی نظام کے دشمن ہوتے ہیں۔ باغی۔ نافرمان جنگجو طاغی! کافر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) ذمی۔ وہ لوگ جو کفر کے باوجود اسلام کے دائرۂ امن و سلامتی میں آجاتے ہیں اور اپنے عقیدہ میں آزاد رہتے ہوئے جزیہ (حفاظت کا خاص ٹیکس) دیتے ہیں۔ (۲) حربی جو کفر مطلق کے ساتھ اسلام کے ساتھ برسر جنگ ہوتے ہیں۔

۱۴۔ تمام انسان انسانی حقوق میں برابر ہیں کوئی شخص کسی دوسرے پر حاکم نہیں۔ حاکم ایک مافوق الطبیعۃ بالادست، بالاتر ہستی ہے جس نے عرش کی بلندی سے قانونِ مساوات جاری کیا ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، ہوا، پانی، چراگاہ سب کا حق ہیں۔ حکومت کا رہنما یہ دیکھنے پر مامور ہے کہ رات سے پہلے مملکت کے تمام انسان ان میں سے کسی چیز سے محروم تو نہیں رہے۔

۱۵۔ زمین کی تمام پیداوار تمام انسانوں کی ملک ہے شخصی (اصطلاحی) ملک ایک اشتراکی امانت ہے جس پر رفع نزاع کے لیے قبضہ کو علت ملک قرار دے دیا گیا ورنہ ہر انسان اپنی ضرورت کے مطابق مالک باقی بہ امانت ہے یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کر لینے کے باوجود زائد مال رکھنا قانوناً مکروہ ہے اور بعض صحابہ کے نزدیک حرام ہے۔ خلفاء راشدین اس سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

۱۶۔ امن حقیقی شی اور جنگ جوابی۔

۱۷۔ حق حق ہے۔ انصاف انصاف ہے۔ باطل باطل ہے۔ ظلم ظلم ہے۔ نیکی نیکی ہے۔ برائی برائی۔ ہر نیکی قانون کا منشا ہے اور ہر برائی منشائے قانون سے خارج ہے۔ ہر جرم کی سزا ہر ایک کے لیے یکساں ہے۔ یہ قانون ہے اور قانون سے زیادہ حکمت عملی۔

۱۸۔ ضمیر اور عقیدہ آزاد ہے۔ اسلام اپنی آزاد روحانی قوتوں سے دنیا کے ضمیر کو فتح کرتا ہے اور تلوار کو میان میں رکھتا ہے۔ جب جنگجو قومیں اور سازشی طاقتیں اپنے مرکز میں سازشیں کرتی ہیں تو قانونِ جہاد سامنے آجاتا ہے اور ان طاقتوں کو جارحانہ حملہ کر کے ان کی سرحدوں کے اندر شکست دی جاتی ہے۔

۱۹۔ نظامِ شمسی کی طرح نظام دنیا ایک وحدت ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کے عناصر عقل سے محروم ہیں اور اس کے عناصر عقل سے سرفراز ہیں۔ یہ دنیا ایک ہے۔ اس کا خدا ایک ہے اس کا مذہب اور حکومت بھی ایک ہونی چاہیے۔ زمین انسان کا وطن ہے تمام انسانوں کو اپنی سلامتی ترقی، بہتری، کامیابی اور نجات کے لیے ایک ہونا چاہیے۔ ستارے اپنی اپنی جگہ خدا کی قدرت سے سورج کے حکمبردار ہیں۔ انسان کو ایک خدا کا حکمبردار (مسلمان) ہونا چاہیے اور دنیا کو فتح کر کے ایک کر دینا چاہیے۔ سب سے اشرف وہ ہے جو سب سے زیادہ نکوکار ہو۔

مختصر نقشہ

اسلامی حکومت کا عروج و زوال

اللہ

فرمانروائے اعظم

کتاب اللہ

دستور اساسی

خلیفۃ اللہ فی الارض

روئے زمین پر ——— اللہ کا نائب اور نمائندہ

پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

قانون ——— نبوت

خلافت ارضی

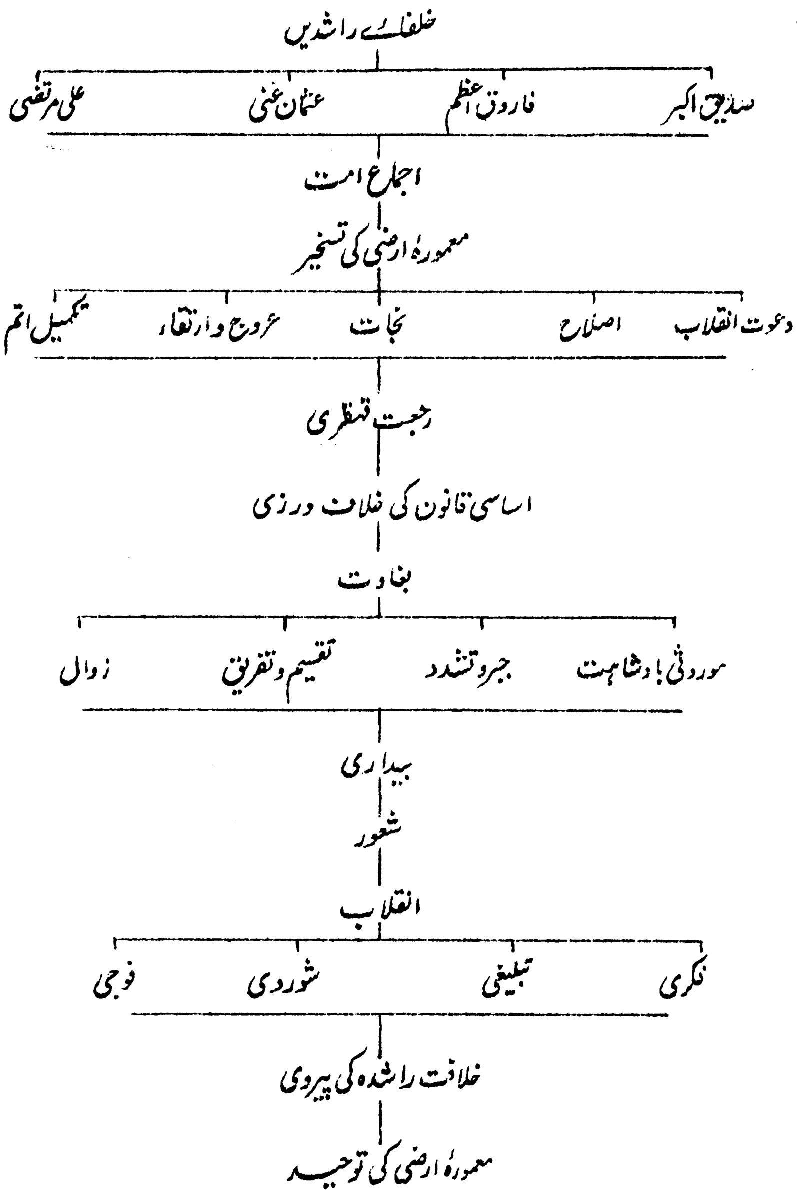
معمورۂ ارضی کی نیابتی حکومت

منہاج نبوت پر

امت وسطیٰ

سیاسی ——— وحدت

امامت کبریٰ	خلافت راشدہ	امارت شوریٰ
امام رہنمائے حکومت	خلفاء راشدین	استصواب رائے عامہ اور مرضی عامہ پر


خلفائے راشدین
صدیق اکبر
فاروق اعظم
عثمان غنی
علی مرتضی
اجماع امت
معمورۂ ارضی کی تسخیر
دعوت انقلاب
اصلاح
نجات
عروج و ارتقاء
تکمیل اتم
رجعت قہقری
اساسی قانون کی خلاف ورزی
بغاوت
موروثی بادشاہت
جبر و تشدد
تقسیم و تفریق
زوال
بیداری
شعور
انقلاب
فکری
تبلیغی
شورودی
فوجی
خلافت راشدہ کی پیروی
معمورۂ ارضی کی توحید

انقلاب اور حق انقلاب

پورے چودہ سو برس ہو چکے ہیں مسلمان خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود خدا کے قانون اجتماعی کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ بغاوت کی سزا کیا ہے موت! اسلامی دنیا پر موت طاری ہے۔

موت کا علاج؟ بیداری شعور۔ انقلاب ۔۔۔ انقلاب کا طریقہ؟ فکری انقلاب پہلا درجہ یہ ہے کہ دلوں میں یہ بات پیدا کر دی جائے کہ اسلام بادشاہت کے جیلخانہ کا قیدی نہیں ہے اور نہ دور جدید کی حکومت کا جمہوری، پارلیمنٹری، اشتراکی، آمری سپاہی ہے۔ اسلامی حکومت کی معراج خلافت راشدہ (دنیا بھر کے مسلمانوں کی معیاری ناقابل تقسیم وحدانی حکومت) ہے اسلامی دنیا کو پھر اس کی بلندی تک پہنچنا چاہیے۔

تبلیغی انقلاب، دوسرا درجہ ہے خلافت راشدہ کی تبلیغ کے لیے کروڑوں انسان پیدا ہو جائیں جن کے پاس ہتھیار کی جگہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہو وہ حکمراں طبقوں کو الدین النصیحۃ (دین خیر خواہی کا قانون) کے مطابق، فاتح عالم کی محبت سے کام لے کر سمجھائیں ہر گھر جائیں جائیں تلوار نہ اُٹھے، پیغام پہنچ جائے۔ سازش نہ کی جائے۔ ورنہ نتیجہ تباہ کن اور قانون شریعت کے خلاف ہوگا۔ فکری انقلاب اور تبلیغی انقلاب کا سلسلہ جاری رہے۔ اس زمانہ میں ایمان کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ مقرر ہو جائے کہ مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت میں فرق ہے اور پہلی حکومت کی جگہ دوسری حکومت کو لینی چاہیے۔

شوروی انقلاب فکری اور تبلیغی انقلاب کے بعد شوروی انقلاب کا نمبر آتا ہے۔ اگر حکمراں طبقہ اور قوم شوریٰ کو حکم مان لیں تو شوروی انقلاب کا دروازہ کھل جائیگا۔ شاہی کی جگہ امامت اور

بادشاہ کی جگہ امام۔ موروثی حق کی جگہ انتخاب کو حاصل ہو جائیگی۔

فوجی انقلاب موجودہ انقلاب کو بدلنے کے لیے انتظار کرنا چاہیے خواہ اس کے لیے ایک صدی درکار ہو۔ فکری، تبلیغی، شورائی انقلاب کی حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان حکومت کے خلاف فوجی انقلاب کا حق نہیں رکھتا۔ فوجی انقلاب کا ایک وقت اور آتا ہے جب مسلمانوں کی حکومت صاف لفظوں میں کفر پر آمادہ ہو جاتی ہے اور خدا سے علی الاعلان بغاوت کا اعلان کر دیتی ہے۔ یہ بغاوت سیاسی نہیں ہوتی بلکہ مذہبی ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں تلوار کا مقابلہ تلوار سے ہوتا ہے۔ قانون امت کو باغی نہیں سمجھتا بلکہ نام نہاد مسلمان حکومت کو باغی قرار دیتا ہے اور مسلمان اس کو سزائے موت دینے پر مامور ہوتے ہیں۔

اجتماعی منشور

دنیائے اسلام کے کروڑوں افراد کے نام

اسلام دنیا کی سب سے بڑی فاتح طاقت ہے۔ مسلمان آج سے پہلے نصف صدی میں نصف دنیا کو فتح کر چکے ہیں[1]۔ اسلام کو ابھی ایک دنیا فتح کرنی ہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک، قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک ــــــ،

ہماری دنیا کے سردار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۱ء میلاد مسیح (سالِ فیل) میں پیدا ہوئے چالیس برس کی عمر میں آپ دین کے پیغمبر تھے اور دنیا کے سردار رسول دنیا

---

[1] عربوں نے آدھی صدی میں آدھی دنیا کو فتح کر ڈالا۔ نپولین۔ حاضر العالم الاسلامی۔ شکیب ارسلان
"ریگستان کے ان باشندوں نے جن کی دنیا میں کوئی اہمیت نہ تھی معروف دنیا کا نصف حصہ فتح کر لیا۔ جواہر لال نہرو۔ جگ بیتی ص ۳۲۳ ج ۱۔

ایک طرف تھی اور آپ تن تنہا ایک طرف تھے۔

قرآن نے انسان کو بتایا تھا "دنیا میں تیرا حصّہ مقرر ہے تو اپنے حصّہ کو فراموش نہ کر" (مفہوم[1]) آپ نے انسان کو اطلاع دی۔ میں معمورۂ انسانیت میں خدا کی حکومت کا سفیر ہوں (انی رسول اللہ الیکم خاصۃ والی الناس عامۃ[2]) میں خدا کا رسول ہوں نہ صرف عربوں کے لیے بلکہ انسانیتِ عامہ کے تمام افراد کے لیے۔ اس کے بعد فرمان جاری ہوا (قد جئتکم بخیر الدنیا والاخرۃ[3]) جو نصب العین میں لایا ہوں اس سے بہتر تمہارے لیے کوئی نہیں لایا۔ دنیا کی بہتری اور آخرت کی بہتری!

یہ تھا حکومت الٰہی کا نصب العین، آنحضرت نے اس کا اعلان فرمایا۔ اس کو اپنے عمل کا محور بنایا[4]۔ اور آخر میں یہاں تک کہہ دیا" میں اللہ کے حکم کا بندہ ہوں یا تو یہ نصب العین فاتح اور غالب ہو کر رہیگا، یا میری جان اس پر قربان ہو جائیگی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور اعلان ہوا "انسانو! میرے ساتھ کلمہ توحید پر جمع ہو جاؤ یہی تمہاری فلاح کا پروگرام ہے ایھا الناس قولوا معی لا الٰہ الا اللہ وان تفلحوا (تاریخ ابن کثیر)

انسانی تاریخ میں انسان کی یہ سرافرازی بالکل نئی چیز تھی، اس لیے مخالفت کی بنیاد بن گئی۔ مخالف بہرحال مخالف رہے البتہ صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ مقصد کی محبت کے سوز سے پگھل گئے۔ مخالفت کی پہلی بال کمانی ٹوٹ گئی۔ انسانیت کے دشمن بگڑی ہوئی گھڑی کے پنڈولم کی طرح کبھی ادھر کبھی اُدھر سر دے دے کر مارتے تھے مگر اسلام ایک قلعہ تھا جو بنتا چلا گیا۔ اور جس کی دیوار آسمان تک اور قلعہ بندیاں

---

[1] قرآن حکیم (لا تنس نصیبک من الدنیا)
[2] تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۲ [3] ایضاً
[4] ثم صدع بامر اللہ ومضی علی امر اللہ مظھرا لامرہ۔ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۳۔

مدینہ سے سائبریا تک پہنچ کر بھی نہ رکیں۔

قرآن کا فرمان تھا "حکومت خدا کی ہے کوئی اس کی حکومت میں نہیں"۔ اللہ کا حکم آیا۔ "انا الملك انا الله" "ہم بادشاہ ہیں ہم اللہ ہیں"۔ اس کے بعد کس کی جرأت تھی کہ یہ کہتا "میں مسلمان ہوں، میں بادشاہ ہوں، حکومت میری ہے۔ میرے بعد میرا ولیعہد خدا کے تخت پر بیٹھے گا"

پلک جھپکنے کی دیر تھی دنیا کی تمام بڑی شہنشاہیتوں (روم، مصر، فارس) کے تخت اُلٹ گئے۔ فرمان ہوا۔ مصر، یمن، عراق، شام ہر ایک فتح ہوگا، ہر ایک فتح ہوکر رہا حکم ہوا اب نہ کسریٰ ہوگا نہ قیصر۔ اسلام کے مجاہدوں نے دونوں کے تاجوں پر پاؤں رکھ دیے دنیا میں پہلی مرتبہ شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا خدا کی حکومت وجود میں آئی اور شاہی کی جگہ "امارت عامہ شوریٰ"[1] کو عطا ہوئی۔

آنحضرت کی مکّی زندگی کے دس سال مدنی زندگی کے گیارہ سال۔ اکیس برس کی مدت میں زمین و آسمان بدل گئے اور زمین کے سارے نقشے میں نیا رنگ بھرا جانے لگا۔

عقل کے دشمنوں نے دولت کا خزانہ، حجی کی مسند اور بادشاہی کا تاج پیش کیا۔ فرمان ہوا "اللہ نے مجھے رشوت نہیں دی، تم مجھ کو رشوت دیتے ہو!" پلک جھپکنے کی دیر تھی۔ چار چیزیں نگاہ وجود پر آراستہ ہوگئیں۔ نیا مذہب، نیا قانون، نئی اُمت اور نئی حکومت

حکومت الٰہی!

مٹی سے جوہر پیدا ہوگیا اور جوہر بھی وہ جس کی قیمت میں روم، فارس اور مصر کے

---

[1] فتح الباری (امارت عامہ) ج ۳ ص ۱۰۴

علاوہ آس پاس کے سارے شاہی تاج لگ گئے مگر قیمت برابر نہ ہوئی۔

آنحضرت نے گیارہ سال تک "امامت کبریٰ" کی پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو پورا کیا آپ کے بعد صدیق اکبر نے دو برس فاروق اعظم نے دس برس، عثمان غنی نے گیارہ برس علی مرتضیٰ نے چھ برس امارتِ شوریٰ اور خلافتِ راشدہ کو زندہ رکھا۔ تاریخ عالم کے یہ چاروں بڑے اصحاب صاحب اولاد تھے مگر انہوں نے خدا کی حکومت کی حکمبرداری میں شاہی تاج و تخت کو نگاہِ غلط سے بھی نہ دیکھا۔

آخر اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ مکروہ واقعہ رونما ہوا۔ یہ روشنی جلد تاریکی سے بدل گئی۔ اور فرمان "لا نورث ولا نورث" کے خلاف امارت شوریٰ کی جگہ پھر مطلق العنان شاہی نے لے لی۔ دن ڈوب گیا پھر رات آئی" وہی جوہر جو بادشاہوں کے تاج سے بھی زیادہ قیمتی تھا مٹی ہو گیا۔ وہ لوگ جو خدا کے حکم پر تیر کی طرح گئے، بجلی کی طرح گرے اور قیصر و کسریٰ کے تاج چھین کر ہوا کی طرح واپس آئے، ان کے جانشین رومیوں کے ایک چھوٹے سے پایہ تخت (دمشق) میں پہنچ کر قیصر کی شہنشاہیت کا شکار ہو گئے۔

تمام پرانے شاہی خاندان (اشکانی، پیشدادی، ساسانی، یونانی، رومی) مٹ گئے اور ان کی جگہ اموی، عباسی، فاطمی، غزنوی، خلجی، تغلقی، تیموری (مغل) تاتاری (ترکان عثمانی) تخت شاہی پر آ گئے سنہ ہجری (سنہ ۶۲۲ء) سے سنہ ۴۱ ہجری (سنہ ۶۶۱ء) تک چالیس سال کا زمانہ منہاجِ نبوت اور سیاستِ شوریٰ کے مطابق گذرا اس کے بعد چودہ سو سال کے اس تاریخی جنگل میں کسی مرد خدا کو یہ خیال نہیں آیا کہ اسلام کا نظام حکومت اپنی اصل قانونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کے دستور، نبوت کے قائم کردہ معیار اور حکومت راشدہ کے اساسی اصول سے ہٹ چکا ہے۔

اُمت وسطیٰ سے خطاب

اُمت اسلامیہ، اُمت وسطیٰ ہے۔ خیر اُمت (دنیا کی بہترین جماعت) ہے۔ ماضی کا غم ہے، حال کا فکر نہیں، آخر مستقبل کا عروج کیسے حاصل ہوگا۔

دنیا کی جابر شہنشاہیتوں اور آمر جمہوریتوں نے خدا کی زمین کو غلاموں کا قید خانہ بنادیا تھا اب یہ قید خانہ بارود کا جہنم بن رہا ہے۔ خلافتِ راشدہ میں سب مسلمان ایک اُمت عظمیٰ تھے اب بہت سی چھوٹی چھوٹی قوموں اور حکومتوں میں تقسیم ہیں یہ خواب کی حالت ہے یا موت کی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اس حالت سے نکلنا لابدی ہے۔ نجات ممکن ہے۔ مگر اس کے لیے شاہراہ نجات تک پہنچنا ایک فرض قطعی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے حکومت کو چار قسموں پر تقسیم کیا تھا۔ دور اوّل حکومت نبوت۔ جس میں پیغمبر کی روح کارفرما تھی۔ دور دوم حکومتِ خلافت و رحمت۔ جس میں نبوت کے نمونہ پر نیابتی حکومت تھی اور دنیا رحم و کرم کے سایہ میں تھی۔ دور سوم حکومت ملک عضوض (سخت گیر شاہی حکومت) دور چہارم حکومت جبریہ (جابر مطلق آمر شہنشاہیت یا جمہوریت[1])

یہ بات کتنی دردناک ہے کہ اُمت آخر کے دونوں طوفانوں میں گھر چکی ہے۔ اسلام ہی اس ٹوٹی ہوئی کشتی کا ناخدا ہے نبوت ختم ہو چکی ہے۔ خلافت راشدہ کا دور جا چکا ہے۔ مسلمان گرجتے ہوئے طوفان میں قانونِ نبوت کے نقش قدم پر خلافت راشدہ کے دور سعادت اور زمانہ سعادت میں داخل ہو سکتے ہیں کیا انقلاب کا وہ پیغام جو اسلام کے ایک سپاہی مغیرہ

---

[1] رواہ الطبرانی عن عبیدۃ بن الجراح عن ابی ثعلبہ بروایت معاذ بن جبل و ابوعبیدہ۔ بدا، ہذا الامر نبوۃ و رحمۃ ثم کائن خلافۃ و رحمۃ ثم کائن ملکا عضوضا ثم کائن عتوا و جبریۃ مجمع الزوائد و منبع الفوائد الہیثمی ج ۵ ص ۱۸۹ کتاب الخلافۃ۔

بن شعبہ نے فارس کے سپہ سالار اعظم رستم کے سامنے نذر ہوکر پیش کیا تھا۔[1] ہم مسلمانوں کے دلوں میں انقلاب نہیں لاسکتا۔

اسلامی زندگی کے دائرہ میں اسلام کے پانچ ارکان کا ذکر ہمیشہ رہتا ہے۔ لیکن آنحضرت نے اسلامی حکمت عملی کے جو پانچ ارکان بیان فرمائے تھے اُن کا کہیں ذکر نہیں۔ انی امرکم بخمس۔ میں تم کو پانچ امور کا حکم دیتا ہوں۔ پہلا حکم ہے (بالجماعۃ)[2] تمام مسلمان ایک منظم جماعت (نظامِ حکومت) کے اندر رہیں۔ ارشاد ہوا جو شخص جماعت سے ایک انچ ہٹیگا اسلام کا رشتہ اس کی گردن سے کٹ کر گر پڑیگا۔ گویا زمانۂ جاہلیت پر لوٹ جائیگا۔ فرمان کے الفاظ ہیں جو جاہلیت کے نظریات کا داعی بنیگا وہ جہنم کا ایندھن ہوگا اگرچہ وہ روزے پر روزے اور نماز پر نماز ادا کرتا ہو اور گمان کرتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔

دنیا کے ستر کروڑ مسلمان جاہلیت کے دستور کے داعی ہیں۔ مشرق سے مغرب تک کہیں حکومت راشدہ کا تصور نہیں اور گمان یہ ہے کہ ہم سب روزہ کے پابند نمازی اور مسلمان ہیں مسلمان ہونے سے انکار نہیں مگر یہ دنیا ہمارے لیے غلامی اور پستی کا جہنم بن چکی ہے اور اس کے علاوہ دوسری دوزخ تیار ہے۔

مسلمان موجود ہیں۔ دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہیں مگر اُمت وسطیٰ نہیں ہے۔ شاہی حکومتیں قائم ہیں، امامت کبریٰ اور امارت عامہ (شوریٰ) نہیں ہے۔ بہت سی حکومتیں نظر آتی ہیں مگر معمورۂ انسانیت کی ایک عظیم الشان برادری اور کرۂ ارضی کی سب سے بڑی پارلیمنٹ (شوریٰ) نہیں ہے۔ خدا کے نائب نہ رہے تو امن و نظم، صلح و خیر، آزادی، مساوات، امانت و عدل،

---

[1] تاریخ طبری (اسلمکم ضعف الشکر الی تغییر الحال ج ۴ ص ۱۰۹

[2] بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والہجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ الخ وان صام وصلی وزعم انہ مسلم ؁ عن الحارث الاشعری۔ رواہ احمد والترمذی، مشکوٰۃ کتاب الامارہ ص ۳۲۱۔

رحم و رعایت کیسے باقی رہتے۔ مسلمان، مسلمانوں کے اجتماعی حقوق دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ امام اور امیر کہاں سے آسکتے ہیں جو اس یقین کے بعد سوتے تھے کہ رات سے پہلے قلمرو کے ہر غریب کا پیٹ بھر چکا ہے۔

سب حقیقتیں افسانہ بن گئیں تمام لباس تبدیل ہوگیا۔ ساری عمارت ڈھیر ہوگئی، پوری بہار مٹ گئی۔ اصل نظام ہی برباد ہوگیا۔

اب دنیا ان مردانِ خدا کی منتظر ہے جو اپنے خدا کے پیغمبر کی ہر بات کو سچ کر دکھائیں۔ خواہ گرجتے ہوئے بادلوں پر سوار ہو کر آئیں یا کوندتی ہوئی بجلیوں کی فوج اپنے ساتھ لے کر زندگی کے اسلامی محاذ پر ظاہر ہوں۔

خدا کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا "جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً وارسلتُ الی الخلق کافۃً[1] الخ میرے لیے روئے زمین کو مسجد اور معمورۂ ارضی کو پاکستان بنا دیا گیا ہے اور میں انسانیت عامہ کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

فرمان ہوا "اُتیتُ بمفاتیح خزائن الارض" مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ تیسرا فرمان "اعطیت الکنزین الاحمر والابیض مجھے دو خزانے عطا کیے گئے ہیں۔ سنہرا اور روپہلا،

آج اُمت کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہر فرمان کا ہر لفظ پورا ہو جائے۔ یہ دنیا ایک بڑی مسجد ہو جانی چاہیے۔ زمین کو تمام خرابیوں سے پاک ہو کر ناقابلِ تقسیم پاکستان بن جانا چاہیے۔ آنحضرت کی پیغمبری کا ثمرہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے دلوں تک پہنچ جانا چاہیے۔ ہمیں زمین کے خزانوں کی کنجیاں سنبھال لینی چاہئیں۔ جغرافیہ کی اصطلاح میں یہ کنجیاں باب المندب (عدن)، سوئز، مالٹا، جبل الطارق، درِ دانیال، آبنائے جوہر (سنگاپور)، پنامہ،

[1] (حدیث کے تین ٹکڑے) پوری حدیث کے لیے دیکھیے مسلم، مشکوٰۃ۔ فضائل سید المرسلین۔ ص ۵۱۲

رود بار انگلستان ہیں اور طبقات الارض کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ زمین کے تمام خزانوں (سونا چاندی پٹرول، کوئلہ، پانی) ہر شے پر ہماری دسترس ہونی چاہیئے۔

ہم مسلمان ہر رنگ، ہر نسل اور ہر براعظم کے مسلمان موجودہ مسلمان اور آئندہ ہونے والے مسلمان دو ایسے فرمانوں کے امین ہیں جنہیں ہزار سال کے بعد بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

پہلا فرمان | ان اللہ زوی لی الارض فرائیت مشارقہا و مغاربہا و ان امتی سیبلغ ملکہا ما زوی لی منہا الخ اللہ نے زمین کو میری مٹھی میں سمیٹ کر دے دیا میں نے اس کے مشرقی منطقوں اور مغربی منطقوں پر نظر ڈالی مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں میری اُمت کی مملکت تمام معمورۂ ارضی پر ہوگی۔

آنحضرت کی اُمت ان الفاظ کو سُن چکی ہے۔ اسے ایک ہی فرض ادا کرنا ہے، اس حکم کی تعمیل، ارضی مملکت کا قیام معمورۂ ارضی کی فتح۔

دوسرا فرمان | لا یبقی علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام الخ کرۂ ارضی کی پشت پر کوئی گھر اور کوئی خیمہ ایسا باقی نہیں رہیگا جہاں اسلام داخل نہیں ہوگا۔

ایک صحابی یہ فرمان سُن کر چیخ اُٹھے فیکون الدین کلہ للہ۔ ساری دنیا میں اللہ کا دین (نظام اجتماعی) قائم ہو جائیگا۔[۲]

بے شک ایسا ہی ہونا چاہیے اور ایسا ہی ہوگا، یہ خدا کا حکم ہے، قرآن کا منشا ہے پیغمبر قرآن کا فرمان ہے۔ نحن الآخرون ․․․․ لا یجمعہم علی الضلالۃ[۲] ہم دنیا کی آخری بہترین

---

[۱] مسند امام احمد مشکوٰۃ کتاب الایمان ص ۱۶ [۲] الدارمی عن عمرو بن قیس۔ مشکوٰۃ ص ۵۱۴۔

قوم ہیں ہم گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتے۔

ہم اسلام کے آخری دور کے نقیب ہیں۔ ہمارے لیے یہ بشارت کچھ کم نہیں۔
"میری اُمت بارش کی تمثال ہے نہیں معلوم اس کا ابتدائی دور زیادہ اچھا ہے یا آخری دور
زیادہ اچھا ہے (انما مثل امتی مثل الغیث لا یدری آخرہ خیر ام اولہ الخ)

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے اس اُمت کے آخری دورِ مستقبل میں ایسے کارفرما افراد ہونگے
جن کا ثواب دورِ اوّل کے اصحاب کے برابر ہوگا، وہ ہر بھلائی کو قانون بنا دینگے اور ہر
بُرائی کو روک دینگے۔ ستر کروڑ مسلمانوں کے لیے آج کے دن کا فرمان یہ ہے کہ وہ اس دور
میں پہلے دور کے مسلمانوں کی طرح اللہ کا قانون ہاتھ میں لے کر اپنے قدموں پر کھڑے
ہو جائیں اور اعلان کر دیں۔

"اسلام آئندہ ساری دنیا کا مذہب ہوگا"

"اسلامی حکومت آئندہ ساری دنیا کی حکومت ہوگی"

حامد الانصاری غازی

یکم رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ